1938

انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم
طلوع اسلام
دور جدید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام

اِسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (القرآن)

بات مانو اللہ اور رسولؐ (یعنی مرکزِ ملت) کی جب وہ تمہیں
اس کام کی طرف بلائے جو تمہارے لئے زندگی بخش ہو

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ - فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ - شُذَّ فِي النَّارِ (قول الرسول)

جماعت کا ساتھ لازم سمجھو۔ کیونکہ جو الگ رہا وہ جہنم میں گیا

لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ (حضرت عمرؓ)

جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے

قوم را ربط و نظام از مرکزے — روزگارش را دوام از مرکزے
دادچوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیتِ ملت شکست
چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

مردۂ از یک نگاہی زندہ شو
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

اقبال

ہم بکمالِ عقیدت ونیازمندی کے ساتھ رسالہ "طلوع اسلام" کو
ترجمانِ حقیقت حکیم الاُمت حضرت علاّمہ اقبال مدظلہ العالی کی خدمت میں
پیش کرنے کی جسارت کرتے ہوئے آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح نئی روشنی کی
پیدا کردہ تاریکی میں اُنکا جلوۂ فکر آفتابِ اسلام کے نئے طلوع کا موجب ہوا
اسی طرح یہ رسالہ اُنکے پرتوِ افکار سے حقیقی معنوں میں اسم بامسمیٰ ثابت ہو۔
"طلوع اسلام" نہایت ادب سے اُن کے حضور میں متقاضی ہے کہ

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن
بہ خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

"ادارہ"

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

طور موجے از غبارِ خانہ اش | کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش | تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم | تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دُعائے نصرت آمیں تیغِ او | قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد | مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
ہر خداوندِ کہن را او شکست | ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست

اے پناہِ من حریمِ کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام دہلی

(دور جدید)

مدیر { مسئول - حکیم ذکی احمد خاں
معاون - محمد عثمان

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ

فی پرچہ
۸

جلد ۱ شمارہ ۱ بابت ماہ مئی ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

طلوعِ اسلام حضرت علامہ کے ان غیر مطبوعہ اشعار کی اشاعت پر جسقدر بھی فخر و مسرّت کا اظہار کرے کم ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اقبال

ایک ضروری گذارش

خریدارانِ طلوعِ اسلام کی خدمت میں

حضرات!

السلام علیکم۔ میں دلی مسرت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ طلوع اسلام کی ترتیب و اشاعت اور نظم و نسق کے فرائض اب مستقلاً ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہیں جو اس کے اغراض و مقاصد یعنی ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی کشاکش میں "اسلامی رائے" کی ترجمانی کو بفضلہٖ تعالیٰ راقم الحروف سے کہیں بہتر اور احسن طریق پر سرانجام دے گی۔ میں خوش ہوں کہ جو کام تنہا ایک فرد سے نہ ہو سکا وہ بالآخر احباب کی متفقہ کوششوں سے پورا ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے قدردانِ طلوع اسلام بھی موجودہ ذمہ داریوں میں ہر طرح سے ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کی معذرت کرنا ہے کہ پچھلے دوڈھائی سال میں طلوع اسلام کی انتظامی دشواریاں اور مالی خسارہ اس کی باقاعدہ اشاعت میں بار بار التوا و انقطاع کا موجب ہوتا رہا۔ بہرکیف یہ ایک دور تھا جو گذر گیا۔ طلوع اسلام کے جدید انتظامات اب ایک مضبوط بنا پر قایم ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ خریدارانِ طلوع اسلام کی عملی ہمدردی اسے مضبوط تر کردے گی۔ انشاء اللہ

مارچ ۱۹۳۸ء

سید نذیر نیازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

ایک کمزور و ناتوان۔ غریب و نادار بھکاری کی یہ حالت تھی کہ بچارا صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا۔ ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو مشکل اتنا پاتا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکے کبھی اتنا بھی نہ ملتا تو فاقہ کاٹتا۔ اس کی ساری عمر یونہی بسر ہوگئی۔ وہ مرتے وقت وصیت کرگیا کہ اسے اس کی جھونپڑی میں ہی دفن کر دیا جائے۔ جب اس کی قبر کھودی گئی تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے دفینوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔ بھکاری کی تباہ حال زندگی اور یہ خزانہ۔۔۔۔ لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

بھکاری اور خزانہ کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے آپ کو سب سے نادار۔ ہر ایک کا دست نگر سمجھ رکھا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کردے۔

بھکاری کے دکھ کا علاج اسے ایک پیسہ خدائی راہ میں دیدینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا۔ بلکہ اس کی سچی مدد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس کے خزانہ کا پتہ دیدیتا۔ آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرادیا جائے جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے۔ یہ متاعِ گراں بہا **قرآن کریم** ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہوچکا ہے اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا!!

آپ کہیں گے کہ مسلمان قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے ترجمے سنتے ہیں۔ تفسیروں کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت کرتے ہیں اور کیا چاہیئے؟ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوجائیگا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی حفاظت یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت قائم رکھنے کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن محض حفاظت اور عقیدت تو مقصود بالذات نہیں۔ قرآن کریم کے متعلق مسلمانوں کا دعوٰی ہے۔ اور یہ دعوٰی خود قرآن کریم ہی پر مبنی ہے کہ خدائے حی و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ایک مکمل دستور العمل ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں

ان کے لئے خضرِ راہ ہے۔ مسلمان کی تو زندگی ہی اس میں تھی کہ وہ ہر ایک قدم اٹھانے سے پیشتر اس امر کا جائزہ لے کہ وہ اپنا قدم اسی جادۂ مستقیم پر لے جا رہا ہے جو قرآن کریم نے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی مدنیت و عمرانیت۔ معاش و معاشرت۔ مذہب و سیاست غرضیکہ ہر مسئلۂ حیات کا حل اسی ایک نظام کی رو سے ہونا چاہیئے اس کے تمام افکار و تخیلات۔ اس کے تمام رجحانات قلبی و ذہنی۔ اس کے تمام تصورات دینی و دنیاوی سب کی تشکیل اسی ایک سانچے میں ہونی چاہیئے۔ اس کے پاس حقائق کے پرکھنے کا معیار ہو تو یہی۔ اور صداقتوں کے ماپنے کا پیمانہ ہو تو یہی۔ یہ سنے تو اس کی مدد سے۔ دیکھے تو اس کی روشنی میں۔ سمجھے تو اس کی بصیرت سے۔ اور اس طرح یہ اس ایک دروازے پر جھک کر ساری دنیا کے دروازوں سے مستانہ وار۔ بے نیاز گذرتا جائے۔

آپ جس مسلمان سے پوچھیئے۔ وہ بلا تکلف کہدیگا کہ الحمد للہ میرا بھی یہی ایمان ہے لیکن کیا آج ہو بھی یہی رہا ہے۔ کیا مسلمانوں کی زندگی کا عملی حل قرآن کریم سے ہی تلاش کیا جاتا ہے!! کیا ان کا دستور العمل حیات واقعی خدا کا یہ آخری پیغام ہے۔!!!

اس کا جواب اپنے گرد و پیش نظر دوڑا کر خود اپنے آپ سے لیجئے۔

لیکن اس تصویر کا اس سے بھی زیادہ بھیانک پہلو ایک اور ہے۔ یہ حفاظت و عقیدت کی بنیاد پر قرآن کریم سے لگاؤ کونسے مسلمانوں کو ہے۔ کیا انہی کو نہیں جواب قصۂ ماضی بننے والے ہیں۔ لیکن ذرا اس طبقہ پر نگاہ ڈالیئے جو کل کو امت مسلمہ۔ ملت اسلامیہ کہلانے والا ہے۔ یعنی آج کے نوجوانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ۔ جانے والے مسلمانوں نے اس فضا میں پرورش پائی جہاں پھر بھی کچھ نہ کچھ مذہب کا چرچا تھا۔ لیکن یہ آنے والے مسلمان اس ماحول کے تربیت یافتہ ہیں جہاں اور سب کچھ ہے لیکن خدا اور رسول کا ذکر نہیں۔ ذرا کسی نوجوان مسلمان تعلیم یافتہ کے مکان پر چلیئے دنیا بھر کا لٹریچر اس کی الماریوں میں ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ملے گا تو قرآن کریم کا نسخہ۔ وہ اپنے بچوں کو بڑے فخر سے آپ کے سامنے لائے گا یہ بتانے کے لئے کہ یہ اتنی سی عمر میں کس طرح فر فر انگریزی بولتے ہیں۔ یہ قابلِ تحسین بات ہے۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ بیٹا! کلمہ بھی آتا ہے۔ تو وہ آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے کہ یہ کس دیس کی بولی بولتا ہے۔!

پھر آپ ان کی درسگاہوں میں جایئے اور دیکھیئے کہ وہاں مذہب سے بیگانگی نہیں بلکہ نفرت پیدا کرنے کے کس قدر سامان موجود ہیں۔ نتیجہ ان تمام اثرات کا یہ ہے کہ آپ کی قوم کے

نوجوان مسلمانوں کا سا نام تو رکھتے ہیں۔ کہ اس پر انہیں اختیار نہ تھا۔ اور اب تو نام کو بھی اس انداز سے مڑوڑتے ہیں کہ اس سے شناخت ہی نہ ہو سکے کہ آپ کس ملت سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کے قلب و دماغ کی تعمیر یکسر غیر اسلامی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ جو ذرا متین و سنجیدہ ہوں گے وہ دل ہی دل میں مذہب کے خلاف بغاوت کی آتش خاموش سلگاتے رہیں گے۔ جو بزعم خویش آزاد قسم کے ہوں گے۔ وہ علانیہ تمسخر اڑائیں گے۔ پھبتیاں کسیں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ وہ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ان کا قصور نہیں۔ قصور سب ہمارا ہے کہ ایک طرف ہم نے انہیں مذہب سے ناآشنا رکھا۔ اور دوسری طرف ان کو تعلیم اس ہجے پر دلائی جس میں مذہب کے خلاف سرکشی کے تمام سامان موجود تھے۔ اور جہاں کہیں مذہب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا وہ اس انداز کا تھا کہ اس سے ان کی بیگانگی الٹی نفرت سے بدل جائے۔

لیکن ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو کہ جب آپ نہ ہوں گے اور انہی نوجوانوں کی جماعت کا نام مسلمانوں کی قوم ہو گا۔ مفاد اسلامی کے تحفظ کے لئے آپ کی ہر کوشش لائق صد تحسین۔ لیکن سوچئے تو سہی کہ جن کی خاطر آپ یہ تحفظ کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہ میں آپ کے اسلام اور اس کے مفاد کی کوئی وقعت بھی ہے! غور فرمائیے کہ کہیں آپ اس نیام کی نگہ پرداخت میں تو مصروف نہیں جس کے اندر تلوار لکڑی کی ہے۔!!

بایں ہمہ نوجوانوں سے مایوس ہو جانے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے نوجوان بہت کم ملیں گے جنہیں اگر صحیح اسلام سے روشناس کرا دیا جائے۔ تو پھر بھی وہ اپنی لادینی پر مصر ہوں۔ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ آنے والی قوم مذہب سے متنفر ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہوں نے پچھلے دنوں چند صاحب ہمت، دردمند مسلمانوں کے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوت غور و فکر دی جن کی اکثریت نوجوانوں ہی پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور و تدبر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ بڑی بڑی سکیموں۔ شاندار پروگراموں۔ تہلکہ انگیز تحریکوں کو چھوڑیئے، وقت وہ آ گیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں "ایک ایک دو دو کرکے ہی خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہو پھر سوچو" کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اس کی متاع گم گشتہ۔ اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرانے کے لیے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلہ شائع کیا جائے جو ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعیہ کا نقیب ہو۔ اور ان کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح کر سکے کہ قرآن کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دور حاضرہ

کی چمکتی ہوئی تہذیب اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑ کر چلا جائے۔ خدا کا یہ پیغام ازلی وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ اور جب ساری دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔

تو اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے۔ عدم سکون و فقدان اطمینان کی اس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹ رہی ہے۔ وہی نظام کارفرما ہوگا جو قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ اور جس کے سوا اور کوئی نظام فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتا کہ یہ نظام خود خالق فطرت کا متعین فرمودہ ہے۔

پھر خدا کے اس پیغام ازلی کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی انگلیاں ملتِ اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے مقیاس پر ہوں۔ اور ان کا اسلوب بیان اس درجہ دلکش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوق ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کریں تو پھر چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اور جب وہ انہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پہ پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دے کہ فی الواقع قرآن کریم خدا کی کتاب ہے اور نوع انسانی کی ہر مشکل کا حل ذہن انسانی کی ہر سطح کے مطابق۔ اس کے اندر موجود ہے۔

رسائل کے اجرا میں سب سے بڑا جاں گسل اور جگر گداز مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں پہنچکر وہ اقتصادی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں اور خریداروں کی کمی سے رسالہ اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتا جو رسالہ اپنے اجرا سے پیشتر اس مشکل کا حل تجویز کر رکھتا ہے وہی چل سکتا ہے۔ ورنہ شروع سے ہی خریداروں کے آسرے پہ جینے کی توقع کرنے والے پرچے کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ .... ہر قدم پر بہنے گمان۔ یاں رہ گیا ...... واں رہ گیا۔

چنانچہ اس مشکل کا حل پہلے سوچ لیا گیا ہے۔ اس جماعت کے ہر رکن نے ایک متعین رقم ادا کر کے اتنا سرمایہ فراہم کر دیا ہے جو رسالہ کے خسارہ کا کفیل ہو سکے اور انہوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک رسالہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا نہ ہو جائے وہ اس خسارہ کو پورا کرتے رہیں گے۔ اور اس کے منافع میں سے ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں لیں گے۔

لہٰذا یہ پرچہ ایک فرد کی بجائے ایک جماعت کا پرچہ ہوگا۔ اور یہی جماعت اُس کی مالک و مختار ہوگی۔ اِس جماعت کا ہر رکن اُس کا محافظ و نگراں ہوگا۔ کہ اس کے ساتھ اس کا قلبی تعلق وابستہ ہے لیکن یہ جس متعین مسلک کا آئینہ دار ہوگا اُس میں کسی فرد کو دخل نہ ہوگا۔ تمام اُمور باہمی مشاورت اور قرآن کریم کے نظام کے ماتحت سرانجام پائیں گے۔ جو حضرات اِس امدادی پروگرام میں عملی حصہ لینا چاہیں۔ وہ اسکی تفصیل دریافت فرمائیں۔ اگر یہ سلسلہ وسیع ہوگیا تو کیا عجب کہ یہی ننھا سا پودا ایک دن ایک بار آور تناور درخت بن جائے کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ اُس شجرِ طیب کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جسکی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں

دورِ حاضرہ کے مسلمانوں کی انتہائی خوش بختی ہے کہ انہیں آج مسائلِ حیات کا حل قرآنی روشنی میں تلاش کرنے کے لئے کچھ زیادہ جگر کاوی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اِس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس ڈوبتی ہوئی قوم میں ایک ایسی گراں قدر ہستی کو پیدا کیا ہے جس نے اپنے دل و دماغ کی بہترین متاع کو تمام عمر انہی مسائل کے حل میں صرف کر دیا۔ اور اسکے نتائج کا درخشندہ موتیوں کی طرح بلا مزد قوم کے سامنے انبار لگا دیا۔ یہ بیش بہا خزانہ آج **کلامِ اقبال** کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اِس پرچہ کی خوش نصیبی ہے کہ پیامِ اقبال کی نشر و اشاعت اِس کا مقصد ہوگا۔ آج ملّتِ اسلامیہ کی زندگی کا راز اِس "پیام" کے اندر ہے کہ یہ پیام دراصل قرآن کریم کا پیام ہے۔ حضرت علامہ مدظلہ العالی کی باریک بین اور دوررس نگاہیں حقائقِ قرآن کے سمجھنے میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اُن سے کوئی دیدہ ور ناواقف نہیں۔ ملّتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی اِس موہبتِ عظمیٰ پر جسقدر بھی ناز کرے بجا ہے۔

سابقہ **طلوعِ اسلام** کا نام بھی حضرت علامہ کا ہی تجویز کردہ تھا۔ اور اس کا مسلک بھی یہی تھا۔ جن زہرہ گداز مشکلات کے ماتحت اُس پرچہ کی اشاعت بند ہوئی۔ اُن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں البتہ اس کے بند ہونے کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اُس کے احساس کا اظہار تو مجبوراً ہو جاتا ہے۔ گذشتہ "یومِ اقبال" کی ترتیب کے سلسلہ میں جب دہلی کا قافلہ، حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نہیں بھی طلوعِ اسلام کے اِحیا کے لئے متردد پایا۔

اِن حالات کے پیشِ نظر اس پرچہ کا نام بھی "طلوعِ اسلام" ہی رکھا گیا ہے۔ اربابِ معنی کے نزدیک گویا یہ سابقہ طلوعِ اسلام کا ہی دَورِ جدید ہے۔ حضرت نذیر نیازی (مدیر سابقہ طلوعِ اسلام) کا اس باب میں اعلان آپ دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ انکی [illegible] اِسی طرح اِس پرچہ کے شاملِ حال رہیں گی جیسی اُنکے اپنے پرچہ کے ساتھ تھیں [illegible]

پرچہ بھی کسی غیر کا نہیں ہے۔ یہ تو ملتِ اسلامیہ کے ہر درد رکھنے والے مسلمان کی مشترکہ متاع ہے۔ یہ
انتظامی معاملات اور ذمہ داریوں کی کفالت کی بنا پر ہے جو اسے اُس جماعت کا پرچہ کہا جائے گا جس کا
پہلے آ چکا ہے۔ سابقہ طلوعِ اسلام کے خریداران اور بہی خواہان اسے اپنا ہی پرچہ تصور فرمائیں۔

پھر ہماری خوش بختی ہے کہ ہندوستان کے ممتاز اہل الرائے اور اہل قلم حضرات کی ایک جماعت
توجہات وعنایات ہمارے شاملِ حال ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات کی نہ صرف قلمی اعانت ہی
رہین منت کریگی۔ بلکہ انکی بالغ نظری اور بلند نگہی ہر مسئلہ میں ہمارے لئے شمع ہدایت ہوگی۔ اس
میں منجملہ دیگر حضرات۔ جناب مولانا اسلم جیراجپوری۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمن صاحب
جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مدیر ترجمان القرآن)
ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بارایٹ لا۔ جناب محمد اسد خان صاحب
اسد ملتانی۔ جناب راجہ حسن اختر صاحب۔ پی۔ سی۔ ایس۔ خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

انکے علاوہ دیگر ممتاز اسلامی مفکرین کی توجہات کو مرکوز کرنے کے لئے پوری کوششوں سے
کام لیا جائیگا۔ جن حضرات نے ”متنوعات“ کے ذیل میں مختصر عنوان مستقلاً اپنے لئے منتخب کئے
انکی ندرتِ فکر۔ وسعتِ نظر اور اصابت رائے۔ ارباب ذوق کے نزدیک مسلم ہے۔ انتظامی معاملات
متعلق اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا۔ کہ جن حضرات کے ہاتھوں میں اس کا نظم ونسق ہے انکی وسعتِ تجربہ
بجائے خویش ایک متاع گراں ہے۔ اور انکی دیانت شک وشبہ سے بالاتر ہے +

لیکن یہ تمام انتظامات۔ اور ان سے متعلقہ مساعی۔ یہ تمام تدابیر اور انکی جزرسی۔ یہ ولولے اور یہ ارا
یہ تجاویز اور انکی تکمیل کے لئے کوششیں۔ یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع۔ یہ سب انسانی
کی تخلیق ہیں۔ جو نہ غلطیوں سے مبرا ہیں نہ سہو اور فروگذاشت سے منزہ۔ جنہیں نہ کل کے آنے وا
واقعات کا علم ہے۔ نہ اُس پر تصرف وقدرت! لہذا یہ تمام انسانی کوششیں پر کاہ جتنا بھی وزن نہ
رکھتیں۔ اگر اُس خدائے حی وقیوم کا فضل اور اسکی رحمت شامل حال نہ ہو۔ کہ موت وحیات۔ کامیابی ونا
فلاح وخسران۔ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُسکی اعانت شریک کار ہو۔ تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش۔ او
سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کردے کہ بڑے سے بڑے ساز وسامان رکھنے والے انگشت بدنداں رہجا
اور اگر وہی شاملِ حال نہ ہو تو دنیا بھر کی قوتیں اور اُن کا ہجوم ایک ذرہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اس
بھروسہ نہ اپنی تدابیر وتجاویز پر ہے۔ نہ قوت واستعداد پر۔ بھروسہ فقط اُسکی ذات پر ہے جو ہر کمزور
ناتوان کا حقیقی آسرا۔ اور ہر نحیف ونزار کا یقینی ملجا ہے۔ بازار مصر میں ایک ضعیفہ کی سوت کی انٹی

یقیناً ہر صاحب دولت وحشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن چہ عجب کہ اُس کے دربار میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اسی اُنٹی کی قیمت دولتِ کونین سے بڑھ جائے۔ ردّ و قبول تو اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شانِ استغنار میں ترحم خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسم پیدا کر دے۔ کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو اور اُس کے ساتھ یہ اُمنگیں اور یہ ولولے!! بہرحال جو کچھ ہمارے پاس ہے اُسے لیکر اُس شاہنشاہ گدا نواز کے آستانے پر حاضر ہو رہے ہیں۔ اِس التجا کے ساتھ کہ

کوہِ آتش خیز کُن ایں کاہ را — زاتشِ ما سوز غیر اللہ را

رہروان رامنزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

اِن دعاؤں اور ان التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اُس کے رستہ میں اُٹھایا جا رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

لمعات

آسٹریا پر ہرہٹلر نے دفعتاً قبضہ کرکے وسطی یورپ کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اور وہ حکومتیں جو جرمنی کی دھمکیوں کو کوئی وقعت نہ دیتی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد سہم گئیں ہیں۔ اور انہوں نے اپنے بچاؤ کے لئے جنگی اسلحہ میں اضافہ شروع کر دیا ہے۔

آسٹریا کا سقوط یوں تو بہت ہی عبرت انگیز واقعہ ہے۔ مگر سقوط کے بعد وہاں کی آبادی پر یاس وقنوط کی جو بلا نازل ہوئی ہے۔ وہ علم اور سائنس کی دنیا کا نہایت دردانگیز حادثہ ہے۔ آسٹریا کے سابق وزراء اور ذمہ دار حکام نے مستقبل سے مایوس ہوکر خودکشی کرلی ہے۔ اور یہودیوں نے اپنی قسمت کا اندازہ لگا کر یہی مناسب سمجھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیں۔ چنانچہ آخری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب تک ۱۸سو یہودی خودکشی کرچکے ہیں اور سات سو یہودی وہ ہیں جنہوں نے خودکشی کا اقدام کیا۔ مگر کامیاب نہ ہوئے اور گرفتار کر لیئے گئے۔

خودکشی کے ان واقعات سے ہمارا ذہن دوسری طرف منتقل ہوجاتا ہے اور بصیرت کی نگاہیں صاف معلوم کرلیتی ہیں کہ مادیت کے غلبہ نے انسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ موجودہ دنیا نے انسان پر علم اور سائنس کی راہیں کشادہ کیں۔ کائنات کے ذرہ ذرہ کو اس کے لیے مسخر کر دیا اختراعات و اکتشافات نے اس کے لئے نئی نئی دنیائیں بنائیں۔ مگر اس میں وہ شجاعت وہ صبر اور وہ استقامت پیدا نہ ہوسکی جس کا سرچشمہ امید ویقین ہے۔ اور جس کی تخلیق مادیت اور روحانیت کے صحیح امتزاج سے ہوتی ہے۔

یہ خودکشی مستقبل سے مایوسی کا نتیجہ ہے اور مایوسی روحانیت کے فقدان اور مادیت کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ علم اور سائنس کا زمانہ روح وجسم کا توازن کھوچکا ہے۔ اس لئے انسان مصائب سے گھبرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کہ دنیا کے مسلمانوں پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ اسپین میں الفانسو اور ملکہ ازابلا کی بدولت لاکھوں مسلمانوں کو دیس نکالا ملا اسی ہزار کے قریب زندہ جلائے گئے اور ایک تہائی مسلمان بنوک شمشیر عیسائی بنائے گئے۔ اسی طرح بیت المقدس کی صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کا جو حشر ہوا۔ اور جس بے دردی کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو اونچی اونچی چٹانوں سے گرا کر ہلاک کیا گیا۔ اس کی تفصیلات تاریخ سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ مگر دیکھو! ان بربادیوں میں کسی ایک مسلمان نے کبھی خودکشی کی؟ کسی کی نسبت سنا کہ اس نے مستقبل سے مایوس ہوکر اور مصائب سے گھبرا کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا ہو؟ یہ اس لئے کہ مسلمان کے

ضمیر و عقل کی تشکیل جن عناصر سے ہوئی ہے۔ اس کا خمیر روحانیت اور مادیت کا صحیح امتزاج ہے اور اس کا سرچشمہ وہ قوت ہے جو ایمان باللہ۔ ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کامیابی اور ناکامی۔ فتح اور شکست۔ عزت و ذلت ہر حالت میں ایک مسلمان کو مسرور اور پر امید رکھتی ہے اور یہی فرق ہے۔ مومن اور کافر کی زندگی میں۔ کہ ایک سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہیں کھوتا۔ اور دوسرا سب کچھ پا کر بھی کچھ نہیں پاتا

ان تکونوا تألمون فانھم یألمون کما تألمون وترجون من اللہ مالا یرجون (پ ۵ ع ۱۲)

اگر تم نے تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تو تمہارے مخالفوں نے بھی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ اور تم کو تو اللہ سے امید بھی ہے مگر ان کو کوئی امید نہیں۔

ہندوستان کے مختلف مقامات میں۔ خصوصیت سے یو پی اور سی پی میں فرقہ دارانہ فسادات نے امن و امان کی فضا بہت زیادہ مکدر کر دی ہے۔ اور ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ نہ صرف اخلاق و مذہب کے دشمن ہیں۔ بلکہ انسان ہو کر انسانیت کے لئے ننگ و عار بن گئے ہیں۔ یہ آسان بات ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق پر الزام لگا کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے۔ مگر یہاں سوال سبکدوشی اور الزام تراشی کا نہیں ہے۔ بلکہ اس مشترک دولت کا ہے۔ جو تعصب اور عناد کے ہاتھوں سربازار لٹ رہی ہے اور جس کا نقصان انسانیت کو برداشت کرنا پڑیگا۔ اور اس پر کوئی ایک قوم نہیں بلکہ ہر قوم ملامت کی مستحق ٹھہریگی۔

اس امر سے بحث نہیں کہ کس فریق کی زیادتی ہے۔ کیونکہ جس ملک کی اکثریت کو ہر اعتبار سے برتری اور تفوق حاصل ہو۔ اور وہ اس برتری کا ناجائز استعمال کر کے "اپنے راج" کے خواب دیکھ رہی ہو۔ وہاں حقائق خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آئندہ ان فسادات کا انسداد کیوں کر ہو۔ ہندوستان کا انسان کس طرح انسان بنے اور دلوں میں انسانی محبت کا پاک جذبہ کس طرح پیدا کیا جائے؟ اس مقصد کے لئے قومی شعور کی بیداری کا وعظ ہرگز کارگر ثابت نہ ہوگا۔ اور نہ یہ تلقین اس مرض کی دوا ہو سکتی ہے۔ کہ ہر فریق حریت اور آزادی کو اپنا نصب العین بنالے۔ کیونکہ ہندوستان میں قومی احساس اور وطنی شعور کو جس قدر ترقی حاصل ہو رہی ہے۔ اسی قدر قوموں میں خود غرضی، نفرت اور عصبیت کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ اور ہر قوم آزادی کے نام پر اپنے گرد حصار تعمیر کرنے میں لگ گئی ہے۔

ہمارے خیال میں اس کا علاج یہ ہے۔ کہ قومی کارکن ملک کے لیڈر پرجوش مقرر اور خطیب اور اخبارات کے ایڈیٹر سکون کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کا جائزہ لیں اور سب سے پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ عوام کچھ نہیں کرتے بلکہ ان سے کرایا جاتا ہے اور انکے دماغ خود گمراہ نہیں ہوتے بلکہ اہل دماغ ہی انکو گمراہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا طریقہ ممکن ہو جس سے ہوشیار ارباب سیاست کی اصلاح ہو جائے۔ تو پھر عوام کی اصلاح کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ مصلحین اور قائدین کی اصلاح کے لئے کوئی نئی مخلوق پیدا نہیں کیجا سکتی مگر اسکے سوا آخر چارہ کار بھی کیا ہے؟ اگر ہمارے قومی کارکن جہاد علی النفس کیلئے اپنے آپکو تیار نہیں کر سکتے تو انکو جہاد آزادی میں حصہ لینے کا بھی کوئی حق نہیں

آجکل ہندوستان میں اردو۔ ہندی کا مسئلہ پھر زور شور سے اٹھا ہے اور کانگریسی ہندوؤں کی ہندی نوازی نے سوئے ہوئے فتنہ کو پھر سر اٹھانے کا موقعہ دیا ہے۔ اور ایک ایسی زبان کو معرض بحث میں لایا جا رہا ہے جو نہ صرف ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان ہے بلکہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی پوزیشن بالکل صاف ہے وہ یہ نہیں کہتے کہ عربی یا فارسی ہندوستان کی مشترک زبان ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترک زبان وہ ہے جو مشترک قوموں کے اشتراک سے معرض وجود میں آئی ہے اور جسکو ہندو مسلمان دونوں نے ملکر ترقی دی ہے مگر ہندی کے حامی زندہ زبان کو دفن کرنے اور مردہ زبان کو زندہ کرنیکا کرشمہ دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔ اور اس بنیاد کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر رہے ہیں جسپر خود انہوں نے قومی عمارت کھڑی کی ہے۔ اور جو مختلف قوموں کے لئے ناقابل تسخیر قلعہ کی حیثیت رکھتی ہے

اس وقت زبان کے معاملہ میں ہندوؤں کے دو فریق ہیں۔ پہلا فریق کھلم کھلا ہندی کو ہندوستان کی مشترک زبان قرار دے رہا ہے اور عقل ونقل کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر سیاہ کو سفید کرنے میں مشغول ہے دوسرا فریق اردو۔ ہندی۔ میں مصالحت کرانا چاہتا ہے اور تقریر وتحریر کے ذریعہ یہ ثابت کرنیکی کوشش کر رہا ہے کہ اردو ہندی کی بنیاد ایک ہے۔ اور وہ ایک درخت کی دو شاخیں ہیں

یہ دوسرا گروہ پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک اور ہوشیار ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مصالحت اور رواداری کے پردہ میں ہندی کے خلاف مخالفت اور تصادم کی قوت کو مضمحل کر کے ایسا موقعہ فراہم کیا جائے۔ جو کسی وقت ہندی کو اردو کی صف میں لے آئے۔ اور پھر اس کو اردو سے آگے نکالکر اپنا مقصد حاصل کر لیا جائے

حالانکہ جس بنیاد پر یہ مصالحت کرائی جارہی ہے وہ سرے ہی سے غلط ہے۔ کیونکہ اس قسم کی مصالحت کسی وقت ہندی فارسی میں کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ جو ناکام رہی۔ اور دونوں کو فرقہ داریت کا الزام لگا کر ترک کر دیا گیا اور ان کی جگہ ایک مشترک زبان کی تخلیق عمل میں آئی جو ہندو مسلمان دونوں کی مشترک میراث ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہندی کی مصالحت کس زبان سے کرائی جارہی ہے؟ پہلے مخالفت تو ثابت ہو مصالحت کا سوال بعد میں آئیگا۔ بلاشبہ ہندی کی مخالفت فارسی زبان سے تھی۔ اگر ہندوؤں کو مصالحت ہی کا شوق ہے تو اجازت ہو کہ پھر فارسی کو میدان میں لایا جائے اور اردو جو ان کی جگہ حکم بن کر آئی تھی۔ اسکو گنگا میں بہا دیا جائے۔ اگر فارسی کی شکل دیکھنی منظور نہ ہو تو کیا ہندی کے حامی مسلمانوں کو اجازت دینگے۔ کہ وہ ہندی کا جواب دینے کے لئے عربی کو میدان میں لے آئیں؟ اگر یہ منظور نہیں تو اردو کے لئے کسی رقیب کو بھی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں

بالشویک روس میں ایک مدت سے "غداروں" کا صفایا کیا جارہا ہے اور سلطنت کے بڑے بڑے ارکان فوجی عدالتوں سے سزا پا کر گولیوں سے اڑائے جارہے ہیں۔ ہر ہفتہ خبر آجاتی ہے کہ بالشویک روس کے فلاں فلاں افسر حکومت کا تختہ الٹنے اور مخالف حکومتوں سے سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتار ہوتے ہی فوجی عدالت میں پیش ہوئے۔ اور جرم کا اقرار کر کے برسر عدالت یہ بھی ارشاد فرمایا۔ کہ "واقعی ہم مجرم ہیں۔ ہم نے بالشویک روس کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی۔ اور فلاں فلاں افسر کو قتل کرایا تھا۔ اس لئے ہمیں دس دس بار گولی ماری جائے" جن لوگوں کو اب تک گولیوں سے اڑایا گیا ہے۔ وہ حکومت کے معمولی ملازم نہ تھے۔ بلکہ مستقل جمہوریتوں کے صدر۔ وزیراعظم فوجی کمانڈر۔ سفیر۔ انجینیر اور حکومت کے اعضاء دارکان تھے جنہوں نے اشتراکیت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں بڑے بڑے خطرات اور مصائب کا مقابلہ کیا تھا

اس امر سے قطع نظر کیجئے کہ اشتراکیت کیا چیز ہے۔ اور وہ دنیا کے اقتصادی نظام میں کہاں تک مفید اور موثر ثابت ہوئی ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھئے کہ روس کے "تجربہ گاہ صحت" میں جن مریضوں پر اشتراکیت کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ وہ کہاں تک اس سے مستفید ہوتے ہیں اور اشتراکیت کے بانیوں نے اس کا کہاں تک ساتھ دیا ہے۔ اشتراکیت کی قوت۔ اس کی صداقت اور اسکی تاثیر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بانی اور علمبردار اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا زیادہ دیر تک ثبوت نہ دے سکے اور اپنی غداریوں سے یہ ثابت کر گئے۔ کہ اشتراکیت پہلے تو انسان کو بہادر۔ پرجوش اور متشدد

بناتی ہے ۔ اور پھر اس کو اپنے ہی خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے ۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہر غیر فطری چیز کا انجام خودکشی ہے ۔ اور باطل اپنا گلا آپ گھونٹ کر مر جاتا ہے ۔

ہندوستان کی انگریزی درسگاہوں میں نوجوانوں کی ذہنی اور علمی تربیت کے لئے جس قسم کا انتظام کیا گیا ہے ۔ وہ دیگر اقوام کے نونہالوں کے لئے مفید ہو تو ہو ۔ مگر مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی مفید نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ وہ نوخیز طلبا کی مذہبی روح کو فنا کرنے کے لئے نہایت ہی خطرناک حربہ ثابت ہوا ہے ۔ جو طلبا ۔ اسکولوں ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں ۔ ان میں ایک فیصدی بھی ایسا نہیں ہوتا ۔ جو اپنے گھر سے تھوڑا بہت واقف ہو اور اسلامی نظریات و خیالات کو سمجھ کر اجنبی ماحول میں قدم رکھتا ہو ۔ وہ درسگاہوں میں سادہ طبیعت لے کر جاتے ہیں ۔ مگر مغربی الحاد کے جراثیم لے کر واپس ہوتے ہیں ۔ ہم ایسے بچے سکولوں کی نذر کرتے ہیں ۔ جنکی دماغی سطح بہت صاف ہوتی ہے مگر وہاں پہونچتے ہی مغربی تعلیم کے نقوش اس پر مرتسم ہو جاتے ہیں ۔ اور رفتہ رفتہ ان کے سر میں فرنگی دماغ اس طرح اتار دیا جاتا ہے کہ پھر اس میں اسلامی نظریات کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ اور ان کی نگاہیں ہیگل ۔ اسپنسر ۔ ڈارون اور ڈیکارٹ کے سوا اور کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتیں حیرت یہ ہے ۔ کہ ہمارے علمار کو خبر بھی نہیں ۔ کہ وہ جس الحاد کا رونا رو رہے ہیں وہ کہاں سے آرہا ہے

ان تعلیمی خرابیوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے حکومت سے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا کہ درسگاہوں میں اسلامی تعلیم کا انتظام کیا جائے ۔ مگر آج تک اس طرف توجہ نہیں کی گئی ۔ اب سنا جاتا ہے کہ ہندوستان میں قومی حکومتیں قائم ہو گئیں ہیں ۔ اور نصاب تعلیم میں بہت کچھ ردو بدل ہونے والا ہے اس لئے اگر ہم اپنے مطالبہ کا اعادہ کرتے ہوئے یہ عرض کریں تو شاید بیجا نہ ہوگا ۔ کہ سرکاری درسگاہوں میں مفکر علمار کے مشورہ سے مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے اگر اب بھی اس طرف توجہ نہ کی گئی ۔ تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آئندہ اس سے بہتر اور کونسا وقت آئیگا اور مسلمانوں کی اس خواہش کو کونسی حکومت پورا کرے گی

کیا اِسی کو زندگی سمجھا ہے تو اے ہمنفس
بحرِ ہستی میں بہے جا ہیں مثالِ خار و خس

ذوقِ آزادی سے ہیں بیگانہ مُرغانِ چمن
کچھ اسیرِ آشیاں ہیں کچھ گرفتارِ قفس

خاک کے ذرّوں پہ روشن کر گیا یہ اک شرر
عمرِ گمنامی سے بہتر ہے فروغِ یک نفس

طاقتِ پرواز اُڑی ذوقِ پرافشانی گیا
بن گئے تیرے لیے اپنے ہی بال و پر قفس

تھا کبھی رنگِ مجاز آئینۂ اسرارِ حق
عشق کے پردے میں اب ہوتی ہے تعلیمِ ہوس

کیا بڑھائینگے کسی دامن کی جانب دستِ شوق
جن کی خود اپنے گریباں تک نہیں ہے دسترس

(اسد مُلتانی)

فہم قرآن

(حضرت مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

قرآن کریم کامل اور مکمل کتاب ہے اور اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "نور مبین" رکھا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ۔ ۱۷۴/۴ | اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اُتارا

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور اردگرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنی تشریح آپ ہے۔ اس کی تلاش کے لئے کسی روشنی کی ضرورت نہیں جس طرح آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈھا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان جملہ حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملے اور قدیم آسمانی کتابوں کی جملہ تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ۔ ۸۹/۱۶ | اور ہم نے تجھ پر کتاب اُتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔

مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ ۱۱۱/۱۲ | یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

مَا کَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ ۳۷/۱۰ | یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنالے بلکہ یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے

آیت بالا میں الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے۔ جس کو قرآن میں جابجا اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ ۔ ۷۰/۲۲ | کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان و زمین میں ہیں۔ بیشک وہ لکھی ہوئی ہیں۔

اس علم کو کتاب مبین فرمایا ہے

وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۔ ۵۹/۶ | وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو کچھ خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین میں ہے۔

اسی کتاب مبین کو اللہ نے عربی قرآن بنایا۔

وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۔ ۲/۴۳ | اور کتاب مبین شہادت دیتی ہے کہ ہم نے اس کو عربی بنایا تاکہ تم سمجھ سکو۔

کتاب مبین صحیفۂ فطرت ہے جو فعل الہیٰ ہے۔ اب صحیفۂ فطرت فعل الہیٰ اور کتاب مبین علم الہیٰ اور قرآن کریم قول الہیٰ۔ ان تینوں کی حقیقت کا متحد ہونا واضح ہوگیا۔ جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ان کو کبھی ختم نہیں کرسکتیں۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

مزید توضیح کے لئے یہاں یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کرلیتا ہے۔ مثلاً زمین۔ دریا۔ پہاڑ اور جنگل دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہوجاتا ہے کہ یہ فطرتی چیزیں ہیں۔ اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا پہاڑ میں کوئی بُت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کسی مشین کا ٹکڑا نظر آئے تو ہر شخص بلا اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔ درخت پر سے گرا ہوا ایک پتا۔ گھاس میں سے جھڑا ہوا ایک تنکا۔ چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں۔ بھیڑ کا گرا ہوا ایک بال اگر سارے عالم کے ماہر اور کاردان کاریگر جمع ہوکر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسانی اقوال میں ہے۔

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۔ ۸۸/۱۷ | کہدے اگر سارے جن و انس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا۔ بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی قرآن کا اعجاز ہے جو اہل بصیرت پر نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیات الہیٰ کا موازنہ اقوال انسانی کے ساتھ کرکے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ حقیقت میں اعجاز قرآن کے سمجھنے سے بہت دور تھے۔

دوسرا فرق مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی معین حد نہیں ہوتی بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے کہ ان کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جس کو پہلے سے مد نظر رکھکر وہ بنائی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول، ایک زبان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ماحول، ہر زمان اور ہر مکان میں انسان کا اشیاء فطرت کے متعلق جس قدر علم بڑھتا جائے گا اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائینگے۔ اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہوجانے والا اور

ختم ہونے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہد صحابہ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہیں کی فہم پر قناعت کرنا چاہئے۔ وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علم قرآن دیگر علمائے قرآن سے اس لحاظ سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا۔ اور جو کچھ سمجھا۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا اس کی حرف بحرف تعمیل کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے۔ بلکہ عملی بھی۔ اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہوا کہ ساری اُمت بھی ان کے رُتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں اُلجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرام سے مروی اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی ایک ماحول کی کتاب نہیں ہے اگر کسی ایک زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لیا گیا بس ختم ہو گیا اور آئندہ کے لئے نصاب نہیں رہا۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے نصاب ہے۔ اور ہر زمانہ میں نئی رہنمائی کے لئے اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ ان پر قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں لوگ ان کے شان نزول سے واقف تھے اس لئے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا۔ دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شان موقع نزول یا واقعۂ نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ با

ہماری تمام تفسیریں آغاز عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہ تک اسی قدامت پرستی کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے آج تک ایک ہی ہے۔ یعنی وہ سلسلہ بسلسلہ آیات کے چلتی ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کی تو ضرور تشریح ہو جاتی ہے مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آتے وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی کے لئے تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا جو مفید حصہ ہو سکتا ہے تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں جمع کر دیا ہے بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی شرح آپ ہے۔ اس کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ ۱۹/۷۵ | پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

آیات قرآنی بیشتر محکم ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسانی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات۔ صفات۔ جنت۔ دوزخ اور میزان عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ سے بیان کیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔

محکم آیات جوام الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں ان کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۱/۱۱ | (یہ مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۵۲/۷ | ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

اسی لئے قرآن کو کتاب مفصل کہا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۱۱۴/۶ | اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

یہ تفصیل اہل علم اور اہل فہم کے لئے ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۹۷/۶ | ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۹۸/۶ | ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا۔ اسی قدر وہ قرآنی تعلیمات کی تفصیلات زیادہ سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر معانی سمجھنے میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے جس طرح کہ اشیاء فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن مزید غور و فکر سے رفتہ رفتہ آخرکار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیل الفاظ و عبارات جا بجا اُلٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں۔ ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۱۰۵/۶ | اور اسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کے لاتے ہیں تاکہ وہ کہہ دیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اہل علم کیلئے اس (قرآن) کی تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم ایسی جامع اور کامل کتاب ہے کہ اس کی آیات۔ الفاظ اور تعلیمات کی تشریح، توضیح اور تفصیل سب اس کے اندر ہے۔ اور سمجھنے کے قواعد اور ضوابط بھی بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جن کو انشاء اللہ ہم آئندہ لکھیں گے۔

دین فطرت

(از چوہدری غلام احمد پرویز بی اے)

حیات ایک مسلسل شے ہے اور جمادات سے انسان تک کی مختلف صورتیں اس حیات کے سلسلہ ارتقاء کی متنوع کڑیاں ہیں۔ جمادات کی زندگی ہیں۔ جہاںتک جدید معلومات کا تعلق ہے۔ اختیار وارادہ تو کجا۔ نشو ونمو کی اہلیت بھی مشکوک ہے۔ نباتی زندگی میں نشو وارتقا ہے۔ لیکن ان میں اختیار وارادہ مشکوک ہے اس سے آگے بڑھیئے تو عام حیوانات ہیں نشو ونما کے ساتھ ایک حدتک اختیاروارادہ بھی شامل ہے لیکن صرف اتنا ہی کہ وہ اپنی طبعی ضروریات کے لیئے ارتباط جسم وجاں کی خاطر۔ یہاں وہاں چل پھر سکیں۔ پیاس لگے توکسی جوہڑ کیطرف رُخ کرلیں۔ بھوک لگے تو چراگاہ کی جانب قدم اُٹھ جائیں گرمی ستائے توکسی درخت کے نیچے سستانے کو ٹھہر جائیں اس سے زیادہ۔ شعور وادراک توایک طرف رہا۔ اچھے اور بُرے کے امتیاز کو بھی اُنکے اپنے ارادہ پر نہیں چھوڑا۔ کون سی شے اُنکے مناسب حال ہے اور کون سی مُضر، کون سی حیات بخش ہے اور کون سی ہلاکت آفریں۔ یہ سب امتیازات اُن کی فطرت میں ودیعت کرکے رکھ دیئے گئے ہیں۔ اور وہ ان غیر شعوری امتیازات کی پابندیوں پر مجبور کردیئے گئے ہیں۔ ایک شیر جنگل میں بھوکوں مرجائے گا لیکن گھاس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھاکر نہیں دیکھے گا۔ حالانکہ وہ میلوں اُس کے گرد وپیش بچھی ہوگی۔ ایک بکری سوکھ کر کانٹا ہوجائیگی۔ لیکن کبھی گوشت کو منہ نہیں لگائے گی۔ ایک بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کیطرف دوڑے گا لیکن ایک مُرغی کا بچہ جواسکے ساتھ کھیلتا ہو کبھی پانی کا رُخ نہ کرے گا۔ ان اُمور میں یہ سب مجبور ہیں۔ مختار نہیں ہیں ان کے اپنے ارادوں کو اسمیں کچھ دخل نہیں۔ حیوانات سے آگے بڑھیئے تو انسانی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ان میں نباتات کی سی نشو ونما کی اہلیت اور حیوانات کی سی طبعی ضروریات کے لیئے تجسس وکاوش کی تڑپ موجود ہے۔ لیکن ان سب سے جُداگانہ انسان کو چیزوں کے امتیاز میں اختیار وارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اور یہی شعور وادراک۔ یہی قوت امتیاز۔ یہی ارادہ واختیار انسانی زندگی کو سلسلہ ارتقار کی سابقہ کڑیوں سے ممتاز کرتا ہے اور اسی ادراک اور قوت تمیز

کی خصوصیت کی وجہ سے اس پر تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک بکری بے شک گوشت کو
مُنہ نہ لگائے گی۔ لیکن اُسے اس بات کی تمیز قطعاً نہ ہوگی کہ وہ گھاس اپنے ہی مالک کے کھیت سے
چرے۔ دوسرے کے کھیت سے نہ کھائے۔ یہ امتیاز انسان ہی سے شروع ہوتا ہے کیونکہ وہ فطرۃً
مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اور عمرانی اور تمدنی حدود بندیوں کی ضرورت بھی اسی وقت پڑتی ہے جب
انسانوں کو مل جُل کر زندگی بسر کرنی ہو۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ واسطہ پڑتا ہو۔ جہاں تک
انسان کی طبعی ضروریات کا تعلق ہے، اسکی عقل اور عقلی نتائج کا مجموعی اثر۔ جسے تجربہ کہتے ہیں۔ اس
بات کے امتیاز میں ایک حد تک اسکی رہبری کر سکتے ہیں کہ کون سی چیز مُمد حیات ہے اور کون سی
مُہلک سنکھیا اور نمک کے اثرات میں امتیاز اسکے مشاہدہ اور تجربہ نے ہی کیا ہے ورنہ طبعی طور پر
تو انسان کے بچے کے ہاتھ میں سنکھیا اور مصری کی ڈلی دیدیجئے وہ دونوں کو اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لیگا
لیکن ان اُمور میں جن کا تعلق نظام جسمانی سے ماوراء ہے۔ تنہا عقل اسکی صحیح رہبری نہیں کر سکتی
اس لیے کہ عقل ہمیشہ جذبات کے تابع رہتی ہے۔ پروفیسر جوڈ جس کا شمار علم النفس کے ماہرین میں
ہوتا ہے۔ اپنی کتاب (Guide to Modern Thought) میں لکھتا ہے کہ:۔

"عقل دَرحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو مقاصد ہم
غیر شعوری طور پر حاصل کرنے کی خواہش کریں۔ انکے حصول کے لیئے ذرائع بہم
پہنچا دے۔ اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اُسکے جواز کے لیئے دلائل تلاش کرکے مہیا کر دے"

اور دُنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے محض اسلیئے کہ ہر شخص۔ اور اشخاص کے مجموعہ یعنی قوم۔ کی
یہی خواہش ہوتی ہے کہ دُنیا اُن کی مرضی کے تابع چلے یعنی اُن کے جذبات کے بر لانے کا رآنے میں کوئی
چیز مزاحمت نہ کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے پھر وہ عقل کو آلہ کار بناتے ہیں جس کی ہنرمندی
زیادہ چلتی ہے۔ وہی غالب آجاتا ہے۔ جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ تنہا عقل انسان کی کیا رہبری
کرے گی۔ انسان کی سرکشی کا تو یہ عالم ہے کہ نظام جسمانی میں بھی جن اُمور پر عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ
یہ ہلاکت آفریں ہیں۔ جب اسیر جذبات غالب آتے ہیں تو یہ اس حکم اور اس فیصلہ کی قطعاً پرواہ
نہیں کرتا۔ اور کرتا وہی ہے جو اُسکے جی میں آتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ اُمور ہیں جن میں قانون شکنی کی
سزا فوراً ملجاتی ہے۔ دُنیا میں جس قدر بیماریاں ہیں سب اسی قانون شکنی کا نتیجہ ہیں۔ اور مشاہدہ

بتا رہا ہے کہ انسان جس قدر مہذب ہوتا جا رہا ہے یہ امراض یعنی قانون شکنی کی وارداتیں، بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اور عقل سے صرف اتنا کام لیا جا رہا ہے کہ وہ ان امراض کا علاج یعنی اس مکافات عمل کے نتائج کا ازالہ کر دے۔ جب طبعی امور میں انسان کی یہ کیفیت ہے تو نظام جسمانی سے ماوراء امور ہیں جنہیں۔ تمدنی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ معاشی امور کہہ لیجئے۔ تنہا عقل اس کی کیا دستگیری کر سکتی بالخصوص اس لیئے کہ ان امور میں قانون شکنی کے نتائج بڑے غیر محسوس اور دیر کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ سنکھیا جائیے۔ دو منٹ میں فیصلہ ہو جائے گا لیکن جھوٹ بولنے والے کو احساس بھی نہ ہوگا کہ اُسنے کوئی ہلاک کر دینے والا کام کیا ہے تو سب سے بڑی چیز جو انسان کو صحیح راستہ پر چلنے سے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسکے جذبات، عقل یا فطرت سلیمہ پر غالب آجاتے ہیں، جذبات کا قایم رہنا بھی ضروری ہے اور اُن کا قایم رکھنا بھی لیکن اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ اُنہیں فطرت سلیمہ کے تابع رکھا جائے اس پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ قرآن کریم نے۔ مثلاً۔ اسی لیئے مؤمنین کی تعریف کی ہے کہ وہ کاظمین الغیظ ہوں گے یعنی غصّہ کو دبالینے والے۔ فنا کر دینے والے نہیں۔ اسے فطرت صحیحہ کے تابع رکھنے والے۔ صحیح راستہ پر چلنا اُس کی فطرت میں داخل تھا۔ صحیح اور مناسب چیزوں کا استعمال اور غلط چیزوں سے اجتناب عام حیوانات کی فطرت میں داخل تھا لیکن برعکس حیوانات کے۔ انسان کے سینہ میں فطرت اور جذبات کے درمیان ایک کش مکش جاری رہتی ہے۔ اس کا قلب اس کش مکش پیہم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ یہ دو قوتیں ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہیں جب فطرت غالب آجاتی ہے، تو انسان کا قدم اس منزل کی طرف بڑھ جاتا ہے جسکے حصول کے لیئے یہ پیدا کیا گیا ہے جب جذبات غالب آجاتے ہیں تو یہ منزل مقصود سے ایک قدم اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اُس کی منزل مقصود کیا ہے! اسے ہم کسی دوسرے وقت بیان کرینگے۔ اسوقت صرف اس قدر پیش نظر رکھنا کافی ہو گا کہ وہ سلسلۂ ارتقا جو تغیر سے بڑھتے بڑھتے انسان تک پہنچا۔ انسان پر آکر ختم نہیں ہو جاتا اسے ابھی بہت آگے چلنا ہے۔ اس سلسلۂ ارتقا میں انسان کی موجودہ زندگی کے بعد کی کڑی اُس کی اگلی منزل ہے۔ نظریۂ ارتقا کا یہ اٹل قانون ہے کہ باقی رہنے اور پھر آگے بڑھنے کے لیئے اصلح (The fittest) ہونا ضروری ہے۔ یہ جہد للبقار (Struggle for existence) آگے بڑھانے والی اور پیچھے ہٹانے والی دو قوتوں کے درمیان جنگ کا نام ہے، وہی دو قوتیں جنہیں

ہم نے فطرت اور جذبات کہا ہے۔ جن کا نام قرآن کریم نے نفس لوامہ اور نفس امارہ رکھا ہے
جب نفس امارہ غالب آجاتا ہے تو انسان کا قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جب نفس لوامہ جیت جاتا
ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کش مکش کے بعد اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اسی کیفیت کی
آخری منزل کا نام نفسِ مطمئنہ ہے قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۹۵/۴-۶	ہم نے انسان کو بہترین ہیئت کذائی میں پیدا کیا پھر اسے نیچے نیچے کے درجہ میں لوٹا دیا۔ مگر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح کیے پس اُن کے لیے غیر منقطع اجر ہے۔

نچلے درجہ میں جا پہنچنا رجعتِ قہقری ہے۔ پیچھے کی طرف ہٹنا ہے۔ جذبات کا غالب آجانا
قانون ارتقار کے مطابق اس معرکہ جہد للبقا میں شکست کھا جانا ہے۔ اسکے خلاف فطرت کا
غالب آجانا گویا اصلح بنجانا ہے۔ اسی لیے ایسے اعمال کو قرآن کریم نے اعمال صالح کہا ہے یعنی
ایسے اعمال جو انسان کو اصلح و (The fittest) بنا دیں جو اسکے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت
پیدا کر دیں۔ یہی کامیابی ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۹۱/۸-۱۰	اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کی جسے اسے ریوں مکمل کیا یا غور کرو نفس انسانی میں اور اس ذات میں جسنے اُسے یوں سنوارا پھر اسمیں راستہ سے ہٹ جانے اور ایسے امُور سے بچ جانے کی تمیز ودیعت کر کے رکھ دی۔ یقیناً کامیاب ہوگا۔ وہ جس نے اس نفس کو (جذبات کے غلبہ سے) پاک رکھا اور شکست کھا جائے گا وہ جس نے اس نفس کو (جذبات کے نیچے) دبا دیا

فطرتِ صحیحہ انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ لیکن اس فطرت کے خلاف کیا
یا قوتیں غیر محسوس طور پر کار فرما ہوتی ہیں اس کی تفصیل کے لیے ہمیں علم تجزیہ نفس (Psycho-analysis)
مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ علم اہل یورپ کے سامنے ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں
راکہ وی آنا کے مشہور ڈاکٹر فرائڈ (Freud) نے اس کی سائنٹیفک طریقہ سے ابتدا
ہے۔ اور اسکے شاگرد۔ لیکن ایک جداگانہ نظریے کے امام۔ ایڈلر (ADLER) نے اسے کسی حد

تک عام فہم بنانے کی کوشش کی اُس نے اپنی کتاب (Understanding Human Nature) میں شرح و
بسط سے بیان کیا ہے کہ اس فطرت انسانی کے خلاف کیا کیا قوتیں کام کرتی ہیں۔ اسکی تحقیقات کے مطابق
تو انسان کی فطرت صحیحہ کا بہت بڑا حصہ اسوقت سے بیشتر ہی خارجی پردوں میں چھپ جاتا ہے جب بچہ بولنا
سیکھتا ہے۔ وہ اپنے گہوارہ میں لیٹے لیٹے آنکھوں ہی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کے نقوش اس شدت سے
اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ وہ گویا پتھر کی لکیریں بن جاتے ہیں۔ یہ ماحول کا اثر۔ سوسائٹی کے قوانین۔
کہنہ روایات۔ خاندانی رواج۔ نسلی رجحانات۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اگر فرائڈ کے ایک دوسرے شاگرد ڈاکٹر
جونگ (Jung) کا نظریہ درست تسلیم کر لیا جائے۔ تو اسکی جسمانی ساخت اور اُس میں مختلف اخلاط کا تناسب۔
یہ سب کچھ اسکی فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فطرت ان تمام مخالف قوتوں کے اس
ہجوم کا کسطرح مقابلہ کریگی۔ اور تنہا عقل اسکی کیا رہبری کریگی جو خود جذبات کی غلام بنکر رہ جاتی ہے۔
فطرت صحیحہ باوجود ان تمام زنجیروں کے خطرے سے آگاہ ضرور کرتی رہتی ہے۔ جونہی جذبات (نفس امارہ)
ابھرنے شروع ہوئے۔ انسان کا قدم صحیح راستہ سے ڈگمگایا۔ اور اسے (نفس لوامہ) نے للکارا۔
لیکن اگر جذبات غالب آتے رہیں تو رفتہ رفتہ اسکی آواز بھی دب جاتی ہے۔ اور اگر ایک مدت تک یہ کیفیت
جاری رہے تو یہ بیچاری بالکل بھولی بسری ہو جاتی ہے۔ اس حالت کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں فسق ہے
فرمایا۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥
اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ تو اللہ نے (اس جرم کے فطرتی نتیجہ کے مطابق)
انکی فطرت (نفس) کو ان سے بھلا دیا۔ (فطرت صحیحہ بھولی بسری ہو گئی) یہ لوگ فاسقین ہیں۔

گویا انسان کو اس کے صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ اسکی فطرت اگر بالکل
خاموش کر دی گئی ہے۔ تو اسکی یاد تازہ کر دی جائے۔ اگر وہ خارجی اثرات کے پردوں میں چھپ کر
غافل ہو چکی ہے۔ تو اسے بیدار کر دیا جائے۔ اگر وہ اخلاط فاسدہ کے امتزاج سے نحیف و کمزور
ہو چکی ہے تو اسمیں دوبارہ قوت پیدا کر دی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرے کون؟

ظاہر ہے کہ تنہا عقل اس کام کو نہیں کر سکتی کہ اسکی بے بسی ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ (اور ہر روز
دیکھ رہے ہیں) نہ کوئی انسان اپنی طرف سے ایسا کر سکتا ہے کہ انسان کبھی جذبات سے خالی
نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا ہونے کے مدعی ہیں یا اسکی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل خود فریبی میں
مبتلا ہوتے ہیں۔ لہذا اس کے لئے ہمیں ضرورت ہے کہ کوئی ایسی "عقل کل" ہو جس پر

جذبات غالب نہ آسکیں۔ کوئی ایسی ہستی ہو جو ان "جذبات" سے ماوراء ہو۔ اِس بیرونی قوت کا نام ہے وحی۔ خدا کی طرف سے ھدایات۔ اور اِن ہدایات کے مکمل ضابطہ کا نام ہے قرآن۔ (یہ مکمل کیونکر ہے۔ اِس کے لئے کسی دوسرے مضمون کا انتظار کیجئے۔) ۔ قرآن کریم نے اُن لوگوں کی بابت جو صحیح راستہ سے ہٹ جاتے ہیں فرمایا ہے۔ کہ

عَلٰی قلوبھم اَکنّۃً ۔ اِن کے دلوں پر پردے ہیں۔ پردے ہٹا دیجئے۔ قلب اپنا صحیح کام کرنے لگ جائیگا۔ دوسری جگہ ہے۔

اَمْ عَلٰی قلوبھم اَقفالھا۔ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ تالے کھول دیجئے۔ قلب آزاد ہو جائیگا۔ کہیں ہے کہ وعلی ابصارھم غشاوۃ ان کی آنکھوں پر پردے ہیں۔ کہیں وفی اذانھم وقرًا۔ کہ اُن کے کانوں میں ڈاٹ لگ رہی ہے۔ یہ دلوں کے غلاف اور تالے۔ یہ آنکھوں کے پردے۔ یہ کانوں کی ڈاٹ وہی خارجی اثرات ہیں جو فطرت صحیحہ کو اپنے نیچے دبا لیتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ فطرت اپنا کام نہیں کرسکتی۔ دب جاتی ہے۔ سو جاتی ہے اور کبھی یوں سمجھئے کہ مرہی جاتی ہے۔

وَھُمْ فی غفلۃ معرضون۔ اور لوگ (فطرت کی اس) غفلت کی وجہ سے روگردانی کرتے ہیں صحیح راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ فطرت کو جن غیر فطری اثرات نے گھیر رکھا ہے۔ جس پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ اسے محبوس کر رکھا ہے۔ قرآن کریم کا منصب یہ ہے کہ اُن اثرات کو الگ کردے۔ فطرت آزاد ہو جائیگی۔

آنکھ کا اپریشن کیا ہے؟ یہی کہ جو جھلی آنکھ کی پتلی پر آچکی ہو۔ یا جو پانی اسکے اندر جمع ہو کر اسکے عمل کو روک رہا ہو۔ اسے نوک نشتر سے الگ کر دیا جائے۔ بینائی خود بخود آجائے گی۔ لیکن یہ بینائی کہیں باہر سے نہیں آئیگی۔ انجکشن کے ذریعہ سے داخل نہیں کیجائیگی۔ بلکہ پردہ اٹھ جانے سے آنکھ خود بخود اپنا کام کرنے لگ جائیگی۔ بس اسی کا نام بینائی کا عود کر آنا ہے۔ آنکھ کا آزاد ہو جانا ہے۔ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد عظیم یہی قرار دیا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم یعنی نوع انسانی (فطرت صحیحہ) جس بوجھ کے نیچے دب چکی ہے وہ اسے اس بوجھ سے آزاد کردینگے۔ وہ جن زنجیروں میں جکڑی جا چکی ہے ان زنجیروں کو توڑ دینگے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رسولوں کو نذیر کہا ہے۔ انذار کے معنی ہیں آگاہ کرنا۔ بیدار کرنا۔ سونے والے پر غفلت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسے بیدار کرنیوالا بیشاری اور آگہی کہیں باہر سے لاکر اسکے اندر داخل نہیں کرتا۔ بلکہ کرتا یہ ہے کہ اسے جنھوڑ کر غفلت کی خاک جھاڑ دیتا ہے۔ بیداری خود بخود پیدا ہو جاتی ہے پیدا ہی کیا ہوتی ہے

بس اپنا چھوڑا ہوا کام کرنے لگ جاتی ہے قرآن کریم نے اپنے آپ کو تذکرہ کہا ہے۔ ان ھٰذہٖ تذکرۃ
تذکیر کے معنی ہیں کسی بھولی ہوئی بات کو یاد دلا دینا۔ جو شخص کسی بات کی یاددہانی کراتا ہے وہ کوئی نئی
بات نہیں بتاتا۔ بلکہ وہ بات فوراً اس بھولنے والے کے اندر موجود ہوتی ہے۔ صرف نسیان کا پردہ
اٹھا دینا ہوتا ہے وہ گم گشتہ بات خودبخود سامنے آجاتی ہے کہیں ان لوگوں کے متعلق جو صحیح راستہ
سے ہٹ جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ فی قلوبھم مرض انکے دلوں میں بیماری ہے اور اسکے علاج کے
لیے فرمایا کہ قرآن کریم شفاءلما فی الصدور ہے۔ دل کے امراض کے لیئے شفا ہے۔ بیماری کے معنی یہ
ہیں کہ فطرت اپنا صحیح کام نہیں کررہی ہوتی۔ اس پر غیر فطری اسباب وعلل کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور شفا کے
یہ معنی ہیں کہ ان خارجی اثرات کا غلبہ دور کردیا جائے۔ شفا کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ نظام
جسمانی پر جو غیر فطری اثرات چھا جاتے ہیں انکے دور کرنے کا نام ہی شفا
ہے یعنی اس نظام طبعی کو اپنی اصلیت پر لے آنے کا نام شفا ہے۔ قرآن کریم بھی یہی کرتا ہے کہ
فطرت صحیحہ پر جو غیر فطری اثرات غلبہ پالیتے ہیں انہیں دور کرکے فطرت کو آزاد کردیتا ہے کہ وہ جس غرض
کے لیئے پیدا کی گئی تھی۔ اسے صحیح طور پر سرانجام دے سکے۔ یہ ہے دین فطرت

فطرۃ اللہِ الّتی فطر النّاس علیھا | اللہ کا وہ قانون فطرت جس پر نوع انسانی کو پیدا کیا گیا ہے

اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم جس راستہ پر چلنے کا حکم دیتا ہے وہ راستہ وہ ہے جس پر چلنے کے
لیئے فطرت انسانی کو پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ خارجی اثرات فطرت کو اس راستہ پر چلنے سے روکے
رکھتے ہیں۔ اس لیئے جب فطرت اور جذبات میں باہمی کش مکش پیدا ہو اور آپ فیصلہ نہ کرسکیں کہ آپ کو
کیا کرنا چاہیئے۔ اور فیصلہ بھی کس طرح کرسکتے ہیں کہ فیصلے ہوتے ہیں عقل کے زور پر اور عقل بیچاری خود جذبات
کے تابع ہو چکی ہوتی ہے۔ تو اس وقت آنکھ بند کرکے وہ کچھ کر دیجیئے جس کا حکم قرآن دیتا ہے۔ آپ دیکھیں گے
کہ مخالف قوت (شیطان) کو شکست ملجائے گی۔ اور فطرت آزاد ہو کر سیدھے راستہ پر چلنے لگے گی اور نہایت
اطمینان سے اپنے فرائض پورے کرنے میں منہمک ہو جائے گی۔ اب آپ کا قدم آگے کو اٹھے گا آپ
ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس "آنکھ بند کرکے" گزرنے کا نام "ایمان بالغیب"
ہے۔ اسکے بغیر چارہ نہیں۔ کہ اگر اس کش مکش کے وقت آپ نے عقل کی رو سے جھگڑنا شروع کیا
تو عقل چونکہ جذبات کی ہی ترجمانی کررہی ہوگی۔ آپ کو فطرت کا صحیح راستہ بھی غلط نظر آئے گا۔

اُسوقت جذبات اور اُن کے وکیلوں کا کہنا مت مانیئے۔ اور قانونِ فطرت کے مطابق (قرآن کریم کے مطابق) قدم اُٹھایئے۔ جب اس طرح عقل پر سے جذبات کا غلبہ اُٹھ جائے گا، عقل اپنی آنکھ سے حقائق کو پرکھنے کے قابل ہو جائے گی۔ تو یہ خود گواہی دیدے گی کہ یہ قدم فی الحقیقت عقل کے عین مطابق تہا۔ مخالفت نہ تہا، وہ تو جذبات نے عقل کا نقاب اوڑھ رکہا تھا۔ جو تمہیں اسوقت کہہ رہے تھے کہ یہ قدم خلاف عقل ہے۔ دین فطرت کبھی خلاف عقل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیئے دین فطرت کیطرف دعوت دینے والے نے پکار پکار کر کہہ دیا ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی میں اور میرے متبع جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں۔ عین علم وبصیرت۔ عقل وشعور کے مطابق دعوت دیتے ہیں کوئی بات خلاف عقل نہیں پیش کرتے۔ بلکہ ہمارا تو کام یہ ہے کہ عقل وفطرت کو ان خارجی اثرات سے آزاد کرکے اُنہیں پوری طرح اپنے کام کرنے کے قابل بنا دیں یہ ہے دینِ فطرت۔ جسے عالم اسلامی کے مُفکرِ اعظم علامہ اقبال مدظلہٗ احساس خودی سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور جس کی ابجد خوانی یورپ میں حال ہی میں شروع ہوئی ہے اور جسکے متعلق اس مکتب کے سر مدرس فرائڈ کا قول ہے کہ:۔

> سب سے آخری بات جو ایک انسان معلوم کرنا اور سمجھنا چاہتا ہے وہ اس کی اپنی ذات ہے
> (نفس ہے۔ خودی ہے۔ فطرت ہے۔)

اور یہ سوائے قرآن کریم کے اور کہیں سے نہیں سیکھا جا سکتا۔ یورپ ادہر اُدھر کے ناکام تجربات کے بعد اب رفتہ رفتہ قرآن کی طرف آ رہا ہے اور آ کر رہے گا کہ اُسکے بغیر چارہ نہیں۔ حقایق اور کہیں دُنیا میں مل نہیں سکتے۔ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ

سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق	کہ ہم انسانوں کو اپنی نشانیاں اس نظام کائنات میں اور خود اُنکی ذات (نفس) کے اندر دکھائینگے حتیٰ کہ اُنپر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائیگی کہ قرآن ہی حق ہے

نظام کائنات کی آیات دیکھی جا رہی ہیں۔ اور یورپ خواہ زبان سے اس بات کا اقرار نہ کرے لیکن دل میں جانتا ہے کہ ہر انکشاف کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو قرآن کریم کے اندر پہلے سے موجود ہے۔ اب "فی انفسہم" کیطرف آ رہا ہے اور یہاں بھی اُسے معلوم ہو جائیگا کہ حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے کہ قرآن دین فطرت کا ضابطہ ہے۔ کسی انسان کی قیاس آرائیوں کا مجموعہ نہیں۔ وذالک الدین القیم۔

جوئے رواں :- "ادارہ"

قرآن کریم کے متعلق

ایک گرانبہا اورعظیم الشان کتاب جو ایک صاحب نظر۔ قرآن فہم کے عمر بھر کے غور و تدبر کا ماحصل سالہا سال کی پیہم دیدہ ریزی اور جگر گدازی کا نتیجہ ہے۔

طلوع اسلام کے

آخری جزء پر مختلف عنوانوں کے ماتحت مسلسل شائع ہوگی۔

ہر عنوان

فی ذاتہ مکمل بھی اور ایک سلسلۂ دراز کی متعدد کڑیوں کی طرح باہمدگر پیوستہ بھی۔ اس کتاب

قرآنی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا)

سمجھئے۔ جس میں سینکڑوں عنوان ہیں اور ہر عنوان کے تحت قرآن کریم کی تعلیم ایک مربوط مضمون صورت میں اس انداز سے ترتیب دی گئی ہے کہ قرآن کریم خودبخود سمجھ میں آتا چلا جائے اور ایسا سمجھ آئے کہ اس سے نگاہوں میں بصیرت۔ ذہن میں جلا اور قلب میں تسکین و طمانیت کا نور پیدا ہو جائے

آئندہ پرچہ میں

اس گرامی قدر کتاب کا تفصیلی تعارف ملاحظہ فرمائیے۔ اور اس کے بعد اس کا سلسلۂ مربوط

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
این کتابے نیست چیزے دیگر است

نظریۂ قومیت

کتاب وسنّت کی روشنی میں

رازی

احوال وظروفِ زمانہ کی ستم ظریفی بھی بعض اوقات داد کے قابل ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ایسی ایسی چیزیں جو مسلّمات میں سے تسلیم ہوتی چلی آئی ہیں معرکہ بحث میں آجاتی ہیں اور اُن کو پھر سے مسلّمات کی شق میں لانے کے لیئے مخالف وموافق دلائل کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی قسم کی ستم ظریفی کی تازہ مثال وہ نظریۂ قومیت ہے جو حضرت مولانا حسین احمد دیوبندی مدظلہٗ نے پیش کیا ہے، اور جو کچھ عرصہ سے ہر سمجھنے والے کے لیئے جاذبِ توجّہ بن رہا ہے۔ اس نظریہ کا اعلان حضرت مولانا نے دہلی کی ایک تقریر میں کیا۔ جب تک بات ہوا میں رہی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ خدا جانے اُنھوں نے کیا کہا اور دوسروں نے کیا سمجھا۔ مولانا کے تبحر علمی کے ارادتمند یہ کہہ کر دل کو سمجھاتے رہے کہ جو کچھ اُن کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے محض پروپیگنڈا ہے حقیقت کچھ اور ہوگی لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دیر تک ساتھ نہ دیا اور جب مولانا نے اخبارات میں ایک مفصل اور مبسوط بیان شائع کرا دیا تو صاف صاف معاملہ سامنے آگیا۔ اسوقت میرے سامنے ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء کا اخبار مدینہ ہے جس میں یہ بیان چھپا ہے۔ حضرت مولانا کے نظریہ کے عناصر ترکیبی یہ ہیں جو انہی کے الفاظ میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب سے۔

(۲) قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو۔ خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت۔ یا نسل۔ یا پیشہ یا رنگت یا اور کوئی صفتِ معنوی یا مادّی وغیرہ وغیرہ

(۳) یہ دعوی کہ اسلام کی تعلیم قومیّت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے (جیسا کہ مدیر احسان کا دعوی

ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کون سی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔
اب بات صاف ہو گئی کہ حضرت مولانا کے نظریے کے مطابق۔
(ا) مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لیے کوئی وجہ جامعیت۔ کوئی قدرِ مشترک (common denominator) ہونا ضروری ہے۔
(ب) یہ وجہ جامعیت مذہبیت ہو سکتی ہے، وطنیت ہو سکتی ہے وحدتِ نسل یا پیشہ وغیرہ ہو سکتی ہے یعنی ان میں سے کوئی ایک وحدت۔ کسی امر میں اشتراک۔
(ج) کبھی یہ وجہ جامعیت مذہبیت بھی ہوئی تھی۔ لیکن
(د) موجودہ زمانہ میں یہ وجہ جامعیت اوطان (وطن) کی وحدت ہے، یعنی ایک وطن کے رہنے والے ایک قوم ہوتے ہیں

یہ ہے حضرت مولانا کے نظریۂ قومیت کا تجزیہ اگر یہ نظریہ حضرت مولانا کی محض ذاتی رائے ہوتی تو ہمیں اس سے چنداں سروکار نہ تھا۔ لیکن چونکہ انھوں نے فرمایا ہے کہ انھیں اس نظریہ کے خلاف کوئی "نصِ قطعی یا ظنی" نہیں ملتی۔ اور یہ دعویٰ ایک ایسی ہستی کی طرف سے ہے جس کا دین کے معاملہ میں ہر لفظ ایک کثیر طبقہ میں فتوے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر:

اگر خاموش بنشینم گناہ است

آیئے تو ہم بھی دیکھیں کہ اس نظریے کے خلاف واقعی کوئی نصِ قطعی یا ظنی موجود نہیں ہے۔ واضح رہے کہ نہ مجھے حضرت مولانا کے سیاسی مسلک سے کچھ واسطہ ہے نہ میں اُسے اس بحث میں لاؤنگا۔ میرے سامنے تو یہ نظریہ ایک تحقیقاتی مسئلہ کی حیثیت سے ہے اور ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و سُنّت کی بارگاہ سے ہمیں اس اہم دینی معاملہ میں کیا فیصلہ ملتا ہے۔ وَمَا توفیقی اِلّا باللہ

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل و مذہب سے" یعنے انہیں خود تسلیم ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی تھا جب قومیتیں مذہب سے بھی بنا کرتی تھیں یعنی وہ افراد جن میں وجہ جامعیت۔ قدرِ مشترک۔ مذہب ہوتی تھی۔ ایک قوم بناتے تھے لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اَب دَورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب نے ان دقیانوسی خیالات کو نئے نئے

نظریوں سے بدل دیا۔ اور موجودہ زمانہ میں قوم کے لیے وجہ اشتراک وطن قرار پایا گیا ہے، کیا حضرت مولانا فرمائینگے کہ وہ کون سا دَور تھا جس میں قوم کے لیے وجہ جامعیت مذہب تھا۔ انسانیت کی تاریخ میں وطن نسل۔ رنگ۔ زبان۔ حکومت وغیرہ کی وحدت سے اقوام کی تشکیل کی مثالیں آپ کو بکثرت ملیں گی۔ لیکن دُنیا کے کسی حصّہ میں اور تاریخ عالم کے کسی دَور میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہیں مذہب وجہ جامعیت نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں قوم عاد۔ قوم ثمود۔ قوم لوط۔ قوم بنی اسرائیل۔ قوم فرعون۔[۱] سب اقوام میں وجہ اشتراک نسل یا وطن تھا۔ وہ عام طور پر قبائلی زندگی کا زمانہ تھا۔ انسانیت کی طفولیت کا وقت تھا۔ قوموں میں وجہ جامعیت نسل یا وطن ہی ہوا کرتا تھا۔ حتےٰ کہ خود حضرات انبیاء کرام کی بعثت بھی انہی کی قوموں کی طرف ہوتی تھی ...... والیٰ عادٍ اخاھم ھودا۔ ۱۱/۵ والیٰ ثمود اخاھم صٰلحًا ۱۱/۶ وغیرہ عاد کی طرف اُنکے بھائی ہود اور ثمود کی طرف اُنکے بھائی صالحؑ۔ دوسری دُنیا میں آجایئے تو یونانی۔ رومی۔ مصری۔ ایرانی۔ تورانی۔ ساسانی وغیرہ سب اقوام میں وجہ جامعیت نسل اور وطن ہی تھا۔ مذہب نہ تھا۔ آریہ ورت۔ میں تو قوم چھوڑکر دونوں کی تقسیم بھی نسل سے ہوتی چلی آئی ہے۔ مذہب وجہ جامعیت کہاں ملتا ہے اس کا جواب تو ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہی دنیا میں وہ قوم تھی جس میں وجہ جامعیت مذہب تھا۔ سو اگر جواب یہ ہی ہے تو پھر حضرت مولانا اور کون سی نصِ قطعی کی تلاش میں ہیں؟ اُن کے دعوے کا بطلان تو خود اسی ایک حقیقت کے اندر موجود ہے لیکن وہ تو یہ فرماتے ہیں "موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل و مذہب سے نہیں" یعنی انہیں بھی تسلیم ہے کہ اسلام جب دُنیا میں آیا ہے تو اس وقت (آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر) دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے کہ قومیت مذہب کی بناء پر بنی۔ لیکن ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

آج وہ زمانہ نہیں اس دَور میں تو قومیت وطن سے ہی بنتی ہے۔ اللہ اکبر! مولانا نے اتنا بھی غور نہ فرمایا کہ ع

میرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو ۱۱/۸۵ - ۱۴/۹ - ۱۴/۹ (اوپر سورت اور نیچے آیت کا شمارہ ہے)

بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔ اُنکے نزدیک گویا اِسلام نے ایک وقتی نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ نظریہ کوائف وحوائج کے بدلنے سے ناقابل عمل ہوگیا۔ (out of date) اور آج اسکی جگہ ایک اور نظریہ آگیا۔ اِس لیئے "قدامت پرست" مسلمانوں کو زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے "پُرانی باتوں پر جمے رہنے سے یہ تباہ ہوجائینگے۔ یہ ہے مفہوم اِس جدید نظریہ کا!!

اب آیئے قرآنی وجہِ جامعیت کیطرف۔ فرمایا۔

واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا۔ | سب کے سب ملکر اللّٰہ کی رسّی کو مضبوط تھام لو۔

یہ سب کو ایک مرکز پر "جمع" کرنے والی کون سی چیز ہے؟ حبل اللّٰہ۔ تو اب اِس آیت کی رو سے "وجہِ جامعیت" حبل اللّٰہ ہوئی۔ اسکی تفسیر دوسری آیت میں یوں فرمادی:۔

ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللّٰہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی لا انفصام لھا	اور جسنے ہر سرکش قوت سے انکار کرکے اللّٰہ پر ایمان رکھا اسنے ایک ایسے مضبوط رشتہ کو تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا

یعنی حبل اللّٰہ جو وجہِ جامعیت تھی۔ وہی محکم رشتہ۔ "العروۃ الوثقیٰ" ہے۔ اور یہ اللّٰہ پر ایمان۔ اور اسکے سوائے ہر قوت سے انکار ہے یعنی دوسرے الفاظ میں۔ لاالٰہ (انکار) - الا اللّٰہ (اقرار)

یعنی دُنیا میں ایمان و کفر صرف دو چیزیں وجہِ جامعیت رہ گئیں پہلی مومنین کی جماعت کی وجہِ جامعیت دوسری غیر مومنین کی جماعت کی وجہِ جامعیت۔ اب دیکھئے کہ ان دونوں جماعتوں کے لیئے کہیں وطن کی حدود و قیود بھی آئی ہیں!

عرب ایک مُلک تھا۔ وطنی نظریہ قومیت کی رو سے وہاں کے سب باشندے ایک قوم ہونے چاہیئے تھے۔ لیکن اسی ایک مُلک کے اندر دو مختلف قوموں کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اور انکی الگ الگ وجہِ جامعیت بھی موجود ہے۔ سُورۂ توبہ میں ہے۔

الا تقاتلون قومًا نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدءُوکم اول مرۃ اتخشونھم فاللّٰہ احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین۔ قاتلوھم یعذبھم اللّٰہ بایدیکم ویخزھم وینصرکم علیھم ویشف	کیا تم اس قوم سے نہ لڑوگے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسول کے جلاوطن کردینے کی تجویز کی۔ اور انہوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی۔ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ سو اللّٰہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے تم اس سے ڈرو۔ اگر تم ایمان والے ہو تو۔ اُن سے لڑو:

۲۹ صدا ور قوم مومنین ٥ | اللہ ان کو تمہاری ہاتھوں سے سزا دیگا۔ اور ان کو ذلیل و خوار کرے گا۔ اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور ایمان والوں کی قوم کے سینے کو شفا دیگا۔
$\frac{9}{13-14}$

ایک قوم جو ایمان نہیں رکھتی۔ خدا و رسولؐ کی دشمن ہے اُس کے بالکل برعکس دوسری قوم جو ایمان رکھتی ہے اور خدا و رسولؐ کے احکام کے تابع ہے جاں نثار ہے ان دونوں اقوام میں الگ الگ وجہ جامعیت وہی کفر اور ایمان ہے۔ وطن نہیں ہے۔ وطن کے اعتبار سے تو یہ سب کا فر و مومن ایک ہی قوم ہونے چاہیئے تھے پھر اس قوم مومنین میں دیکھئے کہ جس کا ایمان اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ جن کی اس امتیازی خصوصیت میں کمزوری واقعہ ہو جاتی ہے۔ تو اس کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے فرمایا

هَاَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ $\frac{47}{38}$	ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیئے بلایا جاتا ہے تو بعض تم میں سے بخل کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تو غنی ہے تمہیں محتاج ہو اور اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آے گا پھر وہ تمہارے جیسے نہ ہونگے۔

کیا اس سے یہ مطلب ہے کہ کسی عربی قوم کی جگہ ایرانی قوم آجائے گی۔ کیا یہ قوم کی تبدیلی اُنکے وطن کی تبدیلی سے ہوگی!! وہاں تو یہ بھی ساتھ ہی بتا دیا ہے کہ وہ دوسری قوم کیسی ہوگی۔ ثم لایکونوا امثالکم۔ وہ تمہاری طرح نہ ہوگی۔ اس کی خصوصیتیں کچھ اور ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دوسری خصوصیتوں والی قوم بھی اس وطن سے پیدا کردی جائے۔ پھر یہ خصوصیت بھی وہی ہوگی جو قوم مومنین کی خصوصیت ہوتی ہے۔ فرمایا

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥ اِنَّمَا	اے ایمان والو! جو شخص تم سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ بہت جلد ایسی دوسری قوم کو پیدا کر دیگا جسے اللہ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ سے محبت ہوگی وہ مومنین کے سامنے جُھک جانیوالے اور کافرین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت ہوں گے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہیں کھینچے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمادے اور اللہ وسعت والا علم

وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا ہے۔ تمہارے دوست تو اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ لوگ ہیں جو نماز کو قایم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان
وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ○ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ میں خشوع ہوتا ہے۔سو جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور
رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ اس کے رسول سے اور ایمان والوں سے۔سو اللہ کا گروہ
هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ بے شک غالب رہے گا۔

یعنی جو تمہارے دین میں سے نکلتا جائے گا دوسری قوم بنتا جائے گا اور ایسے لوگوں کے خلاف اللہ ایسی قوم پیدا کردے گا جن میں ایمان والوں کی خصوصیات ہوں گی۔ دیکھ لیجئے وجہ جامعیت مذہب ہے وطن نسل وغیرہ کچھ نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ جو تمہارے وطن سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں جا بسے گا۔ اس کا شمار تمہاری قوم میں سے نہیں ہوگا۔ اور برعکس اس کے جو باہر سے آکر تمہارے ملک کا باشندہ ہو جائے گا۔ وہ تمہاری قوم میں سے ہو جائے گا۔ اسلامی قومیت کی وجہ جامعیت۔ اسلامی خصوصیات ہیں نہ کہ جغرافیائی حدود۔ جو ان خصوصیات سے باہر ہو جائے وہ اسی ملک میں رہتا ہوا بھی "غیر قوم" میں سے ہو جائے گا۔ دین سے ارتداد کے ساتھ یہ کہیں لازم نہیں آتا کہ وہ ملک بدر بھی ہو جائے۔ تمہارے دین کے اندر ہے تو تمہاری قوم میں سے ہے، دین سے باہر ہو گیا تو خواہ ہمسایہ ہی کیوں نہ ہو تمہاری قوم سے الگ ہو گیا۔ حزب اللہ میں سے نہ رہا، وہی حزب اللہ جس کی دوسری جگہ یوں تشریح فرمادی۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تو ان کو کبھی نہ
يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا دیکھے گا کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے
اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ رسول کے برخلاف ہیں خواہ وہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا
اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان
بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے وہ انکو
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ ایسے باغات میں داخل کرے گا جنکے نیچے نہریں جاری ہیں۔
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اللہ ان سے راضی ہے یہ لوگ ہیں اللہ کا گروہ۔ حزب اللہ اور
اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ یاد رکھو کہ اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہوگا۔

ذرا غور فرمایئے اس آیت کے مختلف ٹکڑوں پر۔ یہ بیٹے اور باپ۔ بھائی اور اہل خاندان۔ ان میں تو وجہ جامعیت نہ صرف وطن ہے بلکہ نسل بھی ہے۔ یہ پھر دوسری قوم کیوں بن گئے! یہ باپ سے بیٹا الگ کس طرح ہوگیا! یہ بھائی سے بھائی کس لیئے جُدا ہوگیا! یہ حزب اللہ کے مقابلہ میں حزب الشیطان کیسے بنگئے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ ۔ ان پر شیطان نے پُورا پُورا تسلّط کرلیا ہے اور اُن کو خدا کی یاد بُھلادی۔ یہ لوگ حزب الشیطان ہیں اور یاد رکھو شیطان کا گروہ ناکام رہے گا۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ لوگ سخت ذلیل ہوں گے۔

اگر وطن ہی وجہ جامعیت ہو تو ظاہر ہے کہ ایک وطن میں حزب اللہ بھی ہوگا اور حزب الشیطان بھی اب یہ دونوں ملکر کس طرح ایک متحدہ قوم بن سکیں گے۔ ایک کی خصوصیات کچھ۔ دوسرے کی کچھ۔ دونوں کے عناصر ترکیبی میں بُعد المشرقین۔ ایک کے حصّہ میں خدا کے وعدوں کے مطابق غلبہ اور کامیابی۔ دوسرے کے مقدر میں اسی کے قوانین کے ماتحت ذلّت و خواری۔ اگر یہ دونوں ملکر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ اسی بنا پر کہ وہ ایک ہی مُلک کے رہنے والے ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک ہی قوم ایک ہی وقت میں غالب و کامیاب بھی ہوسکتی ہے اور ذلیل و ناکام بھی۔ اور اگر اس قوم میں دو گروہ ہوں گے ایک کامیاب اور دوسرا ناکام۔ تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک متحدہ قوم کبھی نہیں کہلا سکتے۔ قوم کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ابھرے تو ساری کی ساری اور ڈوبے تو ساری کی ساری۔ اسلیئے کہ اس کا ابھرنا اور ڈوبنا موقوف ہوتا ہے ان خصوصیات پر جو اس قوم کے مابہ الامتیاز نشانات ہوتے ہیں اور قرآن کریم کی رو سے یہ امتیازی شان جو ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرتی ہے ایمان اور کفر ہے۔ ایمان والوں کی قوم کے متعلق ہم نے دیکھ لیا کہ ان میں سے جو دین سے پھرتا گیا۔ دوسری قوم کا فرد شمار ہوتا گیا۔ باوجودیکہ اسی کا وطن وہی رہا جو پہلے تھا۔ اس کے برعکس کفار کی جماعت میں سے جو ایمان اختیار کرتا گیا۔ وہ اُس قوم سے نکل کر اس نئی قوم کا جزو بنتا گیا۔ فرمایا کہ یہ کفار۔ اور یہ مشرکین۔ تم سے الگ جماعتیں ہیں۔ لیکن

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ ۔ اگر یہ توبہ کرلیں (یعنے کفر و شرک سے باز آجائیں) اور نماز قایم کریں

فاخوانکم فی الدین . . . . $\frac{9}{11}$ | اور زکوٰۃ دیں تو یہی لوگ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے۔

یہ لوگ توبہ کرنے سے پیشتر بھی تو اسی ملک میں رہتے تھے۔ اُسوقت بھائی کیوں نہ بن سکے۔ اگر وطن ہی وجہِ جامعیت تھی تو اُسوقت اُن میں مواخات کیوں نہ پیدا ہو گئی۔ اس کے برعکس یہ توبہ کرکے یدخلون فی دین اللہ افواجًا۔ اللہ کے دین میں داخل ہونے والے کہیں کے باشندے ہوں تمام مومنین کے بھائی بنجاتے ہیں گے۔ سب ایک ہوجائینگے۔ وطن نسل۔ رنگ۔ زبان پیشہ کا اختلاف اُن کی اخوت۔ انکے ایک برادری بننے، کے راستے میں حائل نہ ہوسکیں گے۔ کہ جہاں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ انما المومنون اخوۃ (تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں) وہاں کسی وطن کی قید نہیں لگائی۔ حتےٰ کہ یہ رشتہ تو ایسا ہے کہ بُعدِ مکانی کی طرح بُعدِ زمانی بھی اُسکے راستے میں حائل نہیں ہوسکتا آج کا مُسلمان آج سے ہزار برس پیشتر گزرے ہوئے مُسلمان کا بھی بھائی ہے کہ یہ قوم۔ یہ اُمّت۔ خدائے حی وقیوم کے ایک زندہ پیغام کے واسطے سے باہمدگر پیوست ہے اور زمان ومکان کا بُعد اُنکے اس تعلق میں مُخل نہیں ہوسکتا۔ یہ شروع سے ایک ہی قوم چلی آرہی ہے اور اخیر تک ایک ہی قوم رہے گی۔ جس طرح آج کے مُسلمانوں کو اخوۃ (بھائی بھائی) کہا گیا ہے۔ اسی طرح اُنکے پیشرو مسلمانوں کو بھی اُنکا بھائی کہا گیا ہے۔

وَالذین جاؤامن بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا وَلاخواننا الذین سبقونا بالایمان . . . $\frac{59}{10}$	اور جو لوگ انکے بعد آئیں گے وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے بھائیوں کو بھی جو ہم سے پیشتر ایمان کے ساتھ رخصت ہوئے ہیں (جنہوں نے ہم پر ایمان میں سبقت کی ہے)

اس دُعا میں قیامت تک کے آنیوالے مُسلمان شامل ہیں اور تمام آنیوالے مُسلمان اپنے پیشرو ایماندار لوگوں کے بھائی قرار دیئے گئے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم تو مستقبل اور ماضی۔ آنے والے زمانے اور گزرے ہوئے زمانہ۔ دونوں میں ایک ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ ماضی میں اُمّتِ مُسلمہ بظاہر بعثت نبی اکرمؐ کے بعد سے وجود میں آئی ہے لیکن دراصل اس کا سلسلہ نوع انسانی کی ابتدا سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ مختلف حضرات انبیا کرام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:-

ان ھذہٖ اُمّتکم اُمّۃً واحدۃً وانا ربکم فاعبدون $\frac{21}{92}$	یقیناً یہ تمہاری (سب انبیا کرام کی) جماعت ایک اُمّتِ واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری ہی عبادت اختیار کرو۔

یعنی یہ تمام حضرات علیہم السّلام جو دینِ فطرت کے حامل تھے بشروع سے اخیر تک ایک اُمتِ واحدہ کے افراد تھے۔ اِسی اُمّتْ واحدہ کی آخری کڑی (یہ سلسلۂ انبیار) نبی اکرمؐ پر آکر ختم ہوئی۔ نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن وہی اُمّت یعنی دین فطرت کی حامل جماعت مؤمنین کی شکل میں دُنیا میں قایم رکھی گئی۔ جو آخر تک قایم رہے گی۔ اِس اعتبار سے مومنین کی قوم۔ یہ اُمّت مسلمہ ایک مسلسل اور غیر منقطع قوم ہے جو دُنیا میں برابر چلی آرہی ہے اور یوں ہی چلی جائے گی۔ نہ مکان (Space) کا بُعد اُس میں خلا واقع ہونے دے گا نہ زمان (Time) کا کٹنے کہ اس زندگی کے بعد، دوسرے دَور میں بھی یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ وہاں بھی "قوموں" کی تقسیم انہی خصوصیات کی بنا پر ہوگی جو خصوصیات اس دُنیا میں ضابطہ خداوندی کی رو سے اقوام کی تقسیم کرتی ہیں یعنی وہی کفر و ایمان کا امتیاز۔ انسانوں کے وضع کردہ امتیازات نہ یہاں قابل قبول ہیں نہ وہاں درخورِ اعتناء ہونگے۔ فرمایا۔

وترىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعىٰ إِلىٰ كِتَابِهَا۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ ۴۵/۲۸ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

تو اس روز ہر قوم کو دیکھے گا کہ زانوں کے بل گری ہوئی ہوگی ہر اُمّت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بُلائی جائے گی۔ آج تم کو تمہارے کیے کا بدلہ ملے گا۔ پس جو لوگ ایمان و عمل صالح والے ہوں گے تو اُن کا رب انہیں اپنی رحمت میں داخل کرلے گا اور یہ کھلی ہوئی کامیابی ہے اور جو لوگ کافر ہوں گے تو اُن سے کہا جائے گا کیا میری آیات تم کو پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے ان سے تکبر کیا اور تم (اس وجہ) قوم مجرمین بن گئے۔

اُس وقت جو ہر قوم اپنے اپنے نامۂ اعمال کے مُطابق حاضر ہوگی تو اس سے مطلب یہ نہیں کہ اب ہندی آجائیں گے۔ اب ایرانی۔ پھر عربوں کو بُلایا جائے گا۔ پھر مصریوں کی باری آئے۔ بلکہ اُن کی تقسیم اعمال کے لحاظ سے ہوگی۔ پھر ۲ دو قومیں الگ الگ کردی جائیں گی۔ قوم مومنین الگ۔ قوم کافرین الگ۔ خواہ اُنکے اوطان ایک ہی کیوں نہ ہوں۔ انہی میں سے ایک گروہ کو قوم مجرمین کہا گیا ہے یعنی جن میں وجۂ جامعیت جرم ہوگا۔ ایسے ہی جیسے دوسری جگہ فرمایا کہ هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقِيْنَ (کیا فاسقوں کی قوم کے سوا اور بھی کوئی ہلاک ہوگا یعنی فاسقوں کی ہلاکت یقینی ہے) سو اگر

قوم بننے کے لیے ایک وطن کا ہونا ہی ضروری ہے تو فرمایئے کہ یہ قوم الفاسقین کون سے جزیرہ میں رہتی ہے۔ اس قوم الفاسقین کا مطلب تو ظاہر ہے کہ دُنیا کے کسی حصہ میں کسی مُلک میں جہاں کوئی فرد ایسا موجود ہو جس میں فسق کی خصوصیت ہو۔ تو وہ اس وجہ جامعیت۔ اس قدر مشترک کی بدولت قوم فاسقین میں شامل ہو جائے گا۔ اسی طرح ہندی عربی۔ ترکی چینی سب مُلکے فاسقین کی ایک قوم بن جائے گی۔ اسی طرح قرآن کریم میں قوم الظالمین۔ قوم الکافرین آیا ہے یعنی وہ افراد جن میں وجہ جامعیت ظلم۔ کفر وغیرہ ہوگا۔ اور اسکے مقابل میں قوم الصالحین، قوماً مومنین کے معنی بھی واضح ہیں کہ دُنیا میں بسنے والے کہیں کے دو انسان جن میں ایمان وعمل صالح وجہ جامعیت ہو۔ وہ ایک قوم کے فرد ہونگے اسکے برعکس ایک ہی وطن کا کافر اور مومن دو الگ الگ فرد ہونگے۔ جیسے بوجہل و عمر ابن خطاب رضؓ اور دو مختلف و متبائن ممالک کے اہل ایمان ایک قوم کے فرد ہونگے۔ جیسے صہیب رومیؓ اور سلمان پارسیؓ اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہ قوم چونکہ سلسلہ انبیاء کرام کی وجہ سے شروع سے ایک قوم بنتی چلی آئی ہے اور اس دنیا کے اخیر تک بلکہ قیامت کے بعد اہل جنت کی تقسیم کے اعتبار سے بھی ایک ہی قوم رہے گی۔ اس لیے حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کے الفاظ میں یہ کہنا کس درجہ حقیقت پر مبنی ہے کہ اس قوم کا فرد اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدیؐ۔ یہ ہے منصب ملتِ اسلامیہ کا۔" وہی ملتِ اسلامیہ جسکے متعلق فرمایا:۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ | تم بہترین قوم ہو جو نوع انسانی کے فائدہ کیلئے پیدا کی گئی ہے۔

اس کنتم میں خطاب تمام اہل ایمان سے ہے اور انہی کے مجموعہ کا نام بہترین قوم ہے مومن ہندی ہو یا ایرانی اس خیر اُمّت کا فرد ہے کہ اس کا شمار کنتم میں ہو جائے گا۔ اس کُم (تم) میں ہو جائیگا جسکے متعلق ارشاد ہے کہ:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا۔۔۔۔ اس طرح ہم نے تم کو ایک بہترین قوم بنا دیا۔۔۔۔

لہ قرآن کریم میں قوم اور اُمّت دونوں جماعت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو مفردات امام راغب اصفہانی فارسی زبان میں ملت کے معنی جماعت کے ہی ہیں ملاحظہ ہو غیاث اللغات۔ انہی معنوں میں حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ نے اس لفظ کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ شعر فارسی میں کہے گئے ہیں۔

یہ تو تھی مختصراً قرآنی تعلیم۔ اب اسکی عملی تفسیر نبی اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ میں دیکھئے۔ کم از کم یہ حصّہ تو وہ ہے جس کے متعلق بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ حضرت مولانا کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگا کہ آپ دیوبند میں شیخ الحدیث ہیں لیکن کیا کہا جائے۔ اگر آپ کا نظریہ دُرست تسلیم کر لیا جائے کہ وطن کے بدل جانے سے قومیت بھی بدل جاتی ہے تو مسلمانوں کا سب سے پہلا قافلہ جو ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا تھا۔ وطن کی تبدیلی کی بنا پر انہیں وہاں کی قومیت میں شامل ہو جانا چاہیئے تھا۔ کیا حضرت مولانا کا خیال ہے کہ اسوقت حبشہ کے مسلمان ایک الگ قوم تھے اور مکّہ کے مسلمان ایک الگ قوم! یہ تو زمانہ جاہلیت کا خیال تھا۔ کیا آپ کو یہ واقعہ یاد نہیں کہ غزوہ بنی المصطلق میں ایک غفاری اور ایک عوفی کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ غفاری نے عوفی کو تھپیڑ مارا۔ بنی عوف انصار (اہل مدینہ) کے حلیف تھے۔ اور بنی غفار۔ مہاجرین (مکہ سے گئے ہوئے مسلمانوں) کے حلیف۔ عوفی نے انصار کو مدد کے لیئے آواز دی۔ اور غفاری نے مہاجرین کو یعنی وہی وطنیت کا کلّی۔ مدنی جذبہ اُبھر آیا۔ اور غصّے میں یہ چیز بھول گئے کہ اب مکّی اور مدنی۔ مہاجر اور انصار ملکر ایک قوم بن چکے ہیں۔ جب حضورؐ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی جو تمہاری زبانوں سے نکل گئی؟ اس کے برعکس عبداللہ بن اُبی جو مدینہ کا وطن پرست تھا۔ اُس نے جاہلیت کے اس جذبہ کو مشتعل کرنا چاہا اور انصار سے کہا کہ یہ مہاجرین "ہمارے ملک" میں آکر پھل پھول گئے ہیں اور اب ہمارے ہی سامنے سر اُٹھاتے ہیں (اس کے بعد اور بھی خرافات اُسکے مُنہ سے نکل گئی تھیں جن کا دُہرانا مناسب نہیں) حضورؐ کو جب اس کا علم ہوا تو اُسکے بیٹے حضرت عبداللہ کو بلا کر کہا کہ تمہارا باپ یہ کیا کر رہا ہے!! ان کی اپنے باپ سے محبّت ضرب المثل تھی۔ لیکن یہ وطنیت کے جذبات کی پرورش اور اس کی بنا پر اُمّت مسلمہ۔ مومنین کی جماعت میں تفرقہ اندازی کی کوشش اتنا سنگین جُرم تھا کہ مدینہ میں آکر یہی وفا شعار بیٹا تلوار سونت کر باپ کے سامنے کھڑا ہوگیا کہ تو مدینہ میں نہیں گھُس سکتا۔ بالآخر جب خود نبی اکرمؐ نے اُسے معاف کیا تو اُنہوں نے باپ کو گھر میں جانے دیا۔

کیا اس کے بعد بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ وطنیت کی بنا پر قوموں کی تشکیل کس عہد کی یادگار ہے!! اور خدا اور اسکے رسولؐ کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے!! اگر وطن ہی وجۂ جامعت ہوتا تو مدینہ میں آنے کے بعد مسلمان وہاں کے یہودیوں سے الگ معاہدہ کیوں کرتے اور پھر اس معاہدہ

کی خلاف ورزی پر انہیں وہاں سے نکال کیوں دیتے! معاہدہ تو ہمیشہ دو مختلف اقوام میں ہوا کرتا ہے۔ اس معاہدہ کا وجود ہی اس بات پر دال ہے کہ مسلمان ایک وطن۔ بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مکہ کے مسلمان اور مدینہ کے مسلمان دونوں ملکر ایک قوم بن جائینگے۔ لیکن مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کے یہود ایک قوم نہیں بن سکتے۔ دو جداگانہ قومیں رہیں گے۔ کہ مسلمانوں میں وجہ جامعیت، ایک قوم بننے کی قدر مشترک۔ اسلام ہے۔ وطن نہیں ہے۔

مدینہ میں کفار میں سے ایک شخص قزمان نامی تھا جسکے متعلق حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جہنمی ہے۔ غزوۂ احد میں صحابہؓ نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کفار مکہ کے مقابلہ میں بڑی جانفشانی سے لڑ رہا ہے۔ حتےٰ کہ وہ لڑتے لڑتے گر پڑا۔ صحابہؓ کو بڑی حیرت تھی کہ یہ اس قدر اسلام کا جاں نثار نکلا اور حضورؐ نے اس کو جہنمی بتایا ہے۔ وہ اسکے قریب پہنچے، دیکھا تو مرنے کے قریب تھا انھوں نے کہا کہ مبارک ہو کہ تو خدا اور رسولؐ کے راستہ میں لڑتا ہوا جان دے رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میں کسی کے راستے میں نہیں لڑا۔ مجھے تو یہ قومی عصبیت اُبھار کر میدان جنگ میں لے آئی کہ مدینہ والوں کی مکہ والوں سے لڑائی ہے کہیں مکہ والے فتح نہ پا جائیں۔ اب صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ مخبر صادق نے جو کچھ فرمایا تھا، وہ کس بنا پر تھا۔ یہ تھے زمانہ جاہلیت کے وہ نظریئے جنکو مٹانے کے لیے حضورؐ تشریف لائے اور ۲۳ سال کے مسلسل جہاد سے حضورؐ نے اُنہیں مٹا کر چھوڑا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں پُورے زور کے ساتھ اعلان کر دیا کہ لا فخر للانساب۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی۔ نسب میں کوئی فخر نہیں۔ یہ فرما کر تو نسلی امتیازات کا جذبہ مٹایا اور عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی تفوق نہیں۔ اس ارشاد سے وطنی امتیازات کی حدود و قیود توڑ دیں۔ یہی کچھ آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی ارشاد فرمایا۔ کہ جسکے بعد دین کے کامل ہونے کی تصدیق قرآن کریم میں آگئی۔ یہی اخوت بشری اور عالمگیر برادری کی وہ تعلیم ہے جسے ان الفاظ میں دُہرایا

مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم و تعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکیٰ منہ عضو تداعیٰ لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمی ۔	باہمی محبت۔ رحمت اور مہربانی میں مسلمانوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم اُس کے لیئے بے خواب و آرام ہو جاتا ہے ۔

اگر وطن ہی وجۂ جامعیت ہو تو ایک ہندی مسلمان کو اس سے کیا غرض کہ ایک افریقی مسلمان پر کیا بیت رہی ہے ان دونوں کے درمیان تو وجۂ جامعیت مذہب ہی ہے جس نے انہیں ایک جسم کے دو اعضا بنا دیا ہے کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا لگ جائے تو آنکھ کے آبگینہ میں آنسو چھلک آسے۔ لیکن اگر مذہب کا وجۂ جامعیت ہونا۔ بقول حضرت مولانا۔ پُرانے زمانہ کی یادگار ہے۔ دَورِ حاضرہ میں یہ وجہ وطن سے بدل چکی ہے۔ تو یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کریم کی یہ تمام آیات، حضورؐ کے یہ تمام ارشاداتِ گرامی۔ یہ سب اُسوہ حسنہ۔ایک وقتی چیز تھا۔ جو حضورؐ کے زمانہ تک ہی محدود تھا۔ اس کے بعد کم از کم موجودہ زمانہ میں یہ سب نظریئے بدل گئے۔ اور اُن کی جگہ نئے نظریوں نے لے لی۔ آج ہندی مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور افغانی مسلمان ایک الگ قوم۔ اسلیئے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا پہاڑ حائل ہے جو اُن کی وجۂ جامعیت۔ یعنی ایمان۔ کو آر پار نہیں ہونے دیتا۔ حیرت ہے کہ حضرت مولانا نے اس پر بھی نہیں غور فرمایا کہ اُنکے اس نئے نظریے سے کسی فرعی مسئلہ پر ہی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ تو وحدت فی الحیات کے اس مہتم بالشان اُصول کی جڑ کاٹ رہا ہے جس کی بنا پر اسلام تمام ادیانِ عالم سے متمیز اور سربلند ہے۔ یہ دریاؤں اور پہاڑوں کے حدود و ثغور کہ جن کی بنا پر اوطان کی تمیز و تقسیم ہوتی ہے، سب ذہن انسانی کی پیداوار ہیں۔ اس لیئے کہ جس طرح نگاہ کی ایک حد ہے۔ سماعت کی ایک حد ہے، اسی طرح ذہن انسانی کی پرواز کی بھی ایک حد ہے۔ جس چیز کا تعین تنہا عقل انسانی سے کیا جائے گا وہ یقیناً خاص حدود میں گھر کے رہ جائے گی۔ لیکن اسلام تو عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں یہ تو اُس ذاتِ مطلق کا قانون ہے جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے بلند و بالا تر ہے۔ جو رب المشرقین اور رب المغربین ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی لاشرقیۃ ولا غربیۃ۔ ہے لیکن محسوسات کے خوگر انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس بسیط حقیقت کو اپنے ذہن کے دائرے میں محصور کر لے۔ اور جب کبھی اُس نے ایسا کیا ہے۔ ایسے ایسے ہی تنگ دائرے وضع کر لیئے ہیں لیکن چونکہ یہ تنگ دائرے فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہوتے اس لیئے انسانیت انکے اندر ہمیشہ مرغ رشتہ بر پا کی طرح بیتاب رہتی ہے بعض اوقات وہ کسی ایک قفس کی تیلیاں توڑ بھی ڈالتی ہے لیکن چونکہ پھر تنہا عقل سے ہی دوسرا دائرہ وضع کرتی ہے۔ اس لیئے پھر ایک

نئے قفس میں گرفتار ہو جاتی ہے عقل کی تاریخ اپنی مختلف دائروں اور زنجیروں کی بست وکشاد کا نام ہے:

می تراشد فکرِ ما ہردم خداوندے دگر　　رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

یہی وہ طوق و سلاسل تھے کہ جنسے انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بیان فرمایا۔ کہ

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ۔ (اعراف)	اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق ہوں گے اُن کو اُتار دے گا۔

نبی اکرمؐ نے دُنیا کو بتا دیا کہ کس طرح انسانیت ان طوق و سلاسل سے آزاد ہو کر فضائے بسیط میں بال کشا ہو سکتی ہے کہ جہاں اس کی پرواز حدود نا آشنا اور قیود فراموش ہو یہ تھی اسلام کی تعلیم لیکن آج یہ حالت ہے کہ خود وہ حضرات جو اس تعلیم کے علمبردار ہونے کے مُدعی ہیں۔ آزادی کی اِن ہواؤں میں اُڑنے والے شہبازکو پکڑ کر پھر سے اپنی تنگ و تاریک پنجرے میں ٹھونس رہے ہیں جہاں اُس کا جگر خون ہو کے رہ جائے اگر ایسا کرنیوالوں کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ ع

چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

تو اس میں کیا مبالغہ ہے کہ مقامِ محمدِ عربیؐ تو وہ ہے جو اوپر کی آیت میں جلوہ گر ہے۔ نہ وہ جو وطن کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ جائے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی تفسیر آیت مذکورہ صدر کی اگلی آیت میں ان الفاظ میں فرما دی گئی۔

قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	کہہ دو کہ اے نوعِ انسانی میں تم سب کی طرف۔ اس خدا کی طرف سے رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام ارض و سما میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگی دیتا ہے وہی موت۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اُسکے رسول اُمّی پر جو خود اسپر ایمان رکھتا ہے اور اسکی باتوں (قرآن کریم) اور اسی کی اتباع کرو۔ تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ

لہذا ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

بصائر

دیدہ ور

اس عنوان کے ماتحت اسلامی تاریخ میں سے ایسے امثال و نظائر پیش کئے جایا کرینگے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے کہ جب کوئی انسان۔ یا کوئی جماعت۔ اپنی زندگی اس نظام کے ماتحت بسر کرے جو "خدا کی بادشاہت" کا نظام ہے، تو خود اس انسان یا اس جماعت کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے اور اس تمام فضا کا کیا رنگ ہو جاتا ہے جس پر ان کے اعمال حیات اثر انداز ہوں۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی نظام کا تصور نہ ہوگا ان کے اعمال کبھی نتیجہ خیز نہ ہو سکیں گے۔ (طلوع اسلام)

حضرت عمرؓ کے عہد میں بیت المقدس فتح ہوا تو غیر مسلم مفتوح و مغلوب قوم کے ساتھ ایک فاتح و غالب قوم نے جو معاہدہ کیا وہ قابل غور ہے۔ یہ معاہدہ حضرت عمرؓ کی موجودگی میں اور انہی کے الفاظ میں لکھا گیا تھا۔

"یہ امان وہ ہے جو خدا کے غلام۔ امیرالمومنین۔ عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان انکی جان۔ مال۔ گرجا صلیب۔ تندرست۔ بیمار۔ اور ان کے تمام مذہب والوں کیلئے ہے اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے۔ نہ ان کو۔ نہ ان کے احاطہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔ ایلیا والوں پر فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں۔ اور یونانیوں کو نکال دیں۔ یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال کو امن ہے۔ تا آنکہ وہ اپنی جائے پناہ میں پہنچ جائے۔ اور اگر وہ ایلیا میں ہی رہنا چاہے تو اس کو بھی امن ہے بشرطیکہ وہ جزیہ دینا قبول کرے۔ اور ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنا جان و مال لیکر یونانیوں کے ساتھ جانا چاہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں۔ اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا عہد ہے۔ اور اس کے رسول اور خلفاء اور مومنین کی جماعت کا ذمہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اس تحریر پر گواہ ہیں خالد بن ولید عمرو بن العاص۔ معاویہ ابن ابی سفیان اور عبدالرحمن بن عوف۔ اور ۱۵ھ میں لکھا گیا" (الفاروق)

دو ایک باتیں تشریح طلب ہیں۔ عیسائیوں کے خیال میں چونکہ حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے صلیب دیا تھا اور واقعہ بیت المقدس میں ہی ہوا تھا لہٰذا ان کی خاطر سے یہ شرط منظور تھی کہ ایلیا میں اگر یہودی آباد نہ ہوں عیسائیوں کے مذہبی احساسات کو ٹھیس نہ لگے۔ یونانی باوجودیکہ مسلمانوں کے ساتھ لڑے تھے۔ ان کو بھی

ہر قسم کی امان دی گئی۔ اگر وہ جزیہ دینا قبول کریں تو مسلمانوں کی امان میں رہیں۔ اور اگر چلے جانا چاہیں تو امن امان میں دوسری جگہ چلے جائیں۔ حتیٰ کہ اگر بیت المقدس کے عیسائی چاہیں کہ مسلمانوں کے دشمنوں (رومیوں) سے مل جائیں۔ تو بھی ان سے تعرض نہ کیا جائے اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے گرجوں کی حفاظت کی جائے۔ جزیہ کے معنی یہ تھے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کی امان و حفاظت میں رہنا چاہے۔ وہ چونکہ فوجی خدمت سے مستثنےٰ قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے اپنی حفاظت کے معاوضہ میں ایک خفیف سا ٹیکس ادا کر دیا کرے۔ یہ ٹیکس کمزوروں۔ بچوں۔ عورتوں۔ بوڑھوں۔ معابد کے پجاریوں سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ نہ ہی ان سے جو اپنے آپ کو فوجی خدمات کے لئے پیش کر دیں۔ برعکس اس کے خود مسلمانوں کو فوجی خدمات بھی سر انجام دینی ہوتی تھیں اور اس کے ساتھ زکوٰۃ بھی۔ جو جزیہ سے کہیں زیادہ ہو جاتی تھی۔

ان معاہدوں کی توقیر کس طرح سے ہوتی تھی اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگا لیجئے کہ جب حمص فتح کیا گیا تو وہاں کی غیر مسلم رعایا سے انکی حفاظت کے لئے سال بھر کا جزیہ لیا گیا۔ اتفاق سے چھ ہی مہینے کے بعد مسلمانوں کی فوج کو کسی دوسری جگہ ضرورۃً منتقل ہونا پڑا۔ بارگاہِ خلافت سے حکم آگیا کہ چونکہ باقی چھ ماہ کے لئے ہم انکی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہونگے۔ اس لئے نصف زر جزیہ ان کو واپس دیدیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج کو کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھی اور حمص کے عیسائی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ان کو الوداع کہتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ جلدی واپس آجانا کہیں ہم پر پھر وہی عیسائی حکومت دوبارہ تسلط نہ جمالے۔

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن   ہمہ زخویش بریدند و با تو پیوستند

اس دور کو بھی چشم فلک نے دیکھا۔ اور اس سے پیشتر اس دور تہذیب کو بھی جس میں مشہور مقنن سولن کا یہ نظریہ دنیائے سیاست میں ضرب المثل تھا کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے۔ جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے۔ لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹھیر سکتا" اور اس کے بعد اس نے دور حاضرہ کی اس تہذیب کو بھی دیکھا جس میں میکیاولی کے سیاسی نظریات نصب العین حیات بن رہے ہیں۔ جو سب اس انداز کے ہیں کہ

"حکمران جسقدر طاقتور۔ مکار اور فریبی ہوگا اسی قدر اسکا اقتدار قایم ہوگا۔ میدان جنگ میں تقویٰ۔ طہارت خدا ترسی۔ اور نکوکاری مطلق کار آمد نہیں ہو سکتی۔ مکاری کے سامنے خدا ترسی اور نکوکاری سب دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ خدا ان کی مدد کرتا ہے جن کے پاس بڑی بڑی توپیں ہوں۔ نہ ان کی جو حق پر ہوں"
لیکن اس کا انجام ——— یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد۔

کانگریس، لیگ اور مسلمان

(ڈاکٹر تصدق حسین خالد۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ بار ایٹ لا)

پچھلے دنوں رسالہ جامعہ میں عنوان بالا کے ماتحت مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا ہے۔ جس میں موجودہ سیاسی کشمکش کے ہر دو زوایۂ نگاہ یعنی مسلمانوں کے کانگریس میں شریک ہونے کے موافق اور مخالف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اسی سلسلہ میں رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن چونکہ انہوں نے اب اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے وہاں شائع نہیں ہو سکا۔ ہر چند اس کا اصلی محل وہی رسالہ تھا مگر چونکہ موضوع ایسا ہے جس سے آج تمام ہندوستان کے مسلمان متعلق ہیں اس لئے اس کی اشاعت طلوعِ اسلام میں ضروری سمجھی گئی ہے۔

مذکورہ صدر رسالہ مضامین میں جتنی بحث ہوئی ہے وہ عام طور پر سیاسی دلائل تک ہی محدود رہی ہے۔ لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کو ہر مسئلہ کے لئے اور بالخصوص ایسے مسئلہ کے لئے جس سے قوم کی موت اور حیات کا رشتہ وابستہ ہو۔ قرآن کریم کی روشنی میں ہی کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہی اختلافی مسائل میں فریقین کے لئے حکم ہو سکتا ہے، اور اسی کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنی نقطۂ نظر سے بھی اس مسئلہ پر کچھ بحث کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ موجودہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال تک پہنچیں یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ موجودہ کشمکش میں آزادی سے مفہوم کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے موجودہ غلامی کے خلاف جو جدوجہد شروع کی ہے تو وہ اس جذبہ سے متاثر ہو کر کی ہے کہ ان کے ملک کی دولت ایک غیر قوم کے ہاں چلی جا رہی ہے۔ یہاں کی پچاس فیصدی آبادی کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ یہاں کی ستر فی صدی آبادی کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں میسر آتا۔ نوے فیصدی آبادی قرضے کے وبال میں جکڑی ہوئی ہے۔ لہذا وہ اس نظام کو الٹنا چاہتے ہیں جس کی رو سے ہندوستان کے رہنے والوں پر عرصۂ حیات

تنگ ہو رہا ہے اور اس کے بدلے ایک ایسا نظام قایم کرنا چاہتے ہیں جس کے ماتحت ان کے ملک کی پیداوار کی داد وستدان کے اپنے ہاتھ میں ہو اور جس سے ملک کی بربادی خوشحالی میں بدلجائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک غلامی سے مفہوم معاشی اور اقتصادی غلامی ہے اور آزادی سے مقصود معاشی اور اقتصادی آزادی اور بس یعنی ان کو اگر آج ملک کے معاشی نظام پر پورا پورا اختیار دیدیا جائے تو آج انکی سیاسی جنگ ختم ہو جائے کیونکہ انکے نقطۂ خیال کے مطابق اس طرح ان کو آزادی حاصل ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پورنیہ سوراج کی پہلی کڑی بدیشی مال (بالخصوص کپڑے) کا مقاطعہ تھا تاکہ ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ جو یوں بدیش کھنچا چلا جا رہا ہے اپنے ہی ملک میں رہے۔ لنکا شائر کے کارخانوں کی چہل پہل "برلا ملز" میں منتقل ہو جائے۔ ہندوکو اس معاملہ میں صرف باہر کے لوگوں کا ہی خطرہ ہے اس لئے کہ جہانتک اندرون ملک کا تعلق ہے ہندو حتی الامکان کسی غیر ہندو کے پاس اپنا پیسہ نہیں جانے دیتا یعنی انجیل کے الفاظ میں بھارت ماتا کے سپوت کبھی بیٹوں کی روٹی کتوں تک نہیں پہنچنے دیتے"

یہ ہے وہ غلامی کی لعنت جس کے خلاف آزادی کی جنگ جاری ہے اور اسی لئے پنڈت جواہر لال نہرو برملا کہتے ہیں کہ انکے نزدیک صرف ایک ہی مسئلہ اہم ہے یعنی جمہور اور روٹی لیکن کیا مسلمان کے نزدیک بھی غلامی اتنی ہی بات کا نام ہے اور اس لئے اس کے نزدیک آزادی یہی کچھ ہو سکتی ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمان کے نزدیک معاش اور اقتصادیات کی غلامی سے کہیں زیادہ اندوہ ناک اور جگر سوز غلامی اس کی مذہبی غلامی ہے۔ یہ موجودہ نظام حکومت سے محض اس لئے نالاں نہیں کہ اسکی رو سے اس پر معاش کے دروازے تنگ ہو رہے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس نظام کے ماتحت اسے مذہب کی آزادی حاصل نہیں لہذا اسکی آزادی کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کو مذہبی آزادی حاصل ہو جائے۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذہبی آزادی کا نام محض نماز روزہ کی ہی آزادی نہیں کیونکہ نماز۔ روزہ کی آزادی تو اسے آج بھی حاصل ہے۔ اس آزادی کے باوجود اگر یہ اپنے آپ کو مذہبی حیثیت سے غلام کہتا ہے تو اس لئے کہ اسکا قرآن آزاد نہیں۔ اس کا اسلام آزاد نہیں۔ آج حالت یہ ہے کہ۔ اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد اور اسی "آزادی" کا نام ہے غلامی"

اب یہیں سے دونوں راستے الگ الگ ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندو جس وقت پورے اطمینان سے سانس لے کر پرماتما کی کرپا سے اسے پورنہ سوراج، مل گیا ہے۔ مسلمان اس وقت بھی ایک سرد آہ کھینچے کہ وہ تو ہنوز ویسے کا ویسا ہی غلام ہے۔ لہذا مسلمان کے نزدیک آزادی کا مفہوم اور ہے اور ہندو کے لئے اور۔ اور جب تک مسلمان کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ جس آزادی کے لئے جد وجہد جاری ہے جس کے لئے اتنی قربانیوں کی طلب ہے۔ وہ وہی آزادی ہے جو اس کے مفہوم میں آزادی کہلا سکتی ہے۔ اس کے لئے آزادی کی جنگ اپنے اندر وہ کشش نہیں رکھ سکتی جو ایک ہندو کے لئے رکھتی ہے۔ مسلمان کے لئے آزادی کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہے،

ان الحکم الا للہ	حکومت صرف اللہ کی حکومت ہے

اور غلامی اس کے نزدیک یہ ہے کہ

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون نیز- اولئک ھم الفاسقون اولئک ھم الظالمون (المائدہ)	اور جو اس کے مطابق حکم نہیں کرتا۔ فیصلے نہیں کرتا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کافر ہیں۔ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں۔

اس لئے کہ

ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون	ایمان و ایقان والوں کے لئے خدا سے بہتر اور کون فیصلہ کرنے والا۔ حکم ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کانگریس۔ حصول آزادی کے بعد ملک میں جو نظام حکومت قایم کرنا چاہتی ہے۔ اس کی رو سے کیا مسلمان کو اس کی مطلوبہ آزادی مل سکتی ہے؟۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کانگریس کا سیاست ہند میں بنیادی مسلک یہ ہے کہ مذہب۔ اگر کوئی قابل ذکر شے ہے بھی تو۔ صرف خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام ہے۔ ایک مسلمان محراب کے سائے میں سہی۔ ایک ہندو مندر کے گھنٹے کے نیچے۔ آنکھیں بند کر کے دو چار منٹ سستا لے۔ اور اس میں کوئی مخل نہ ہو (باجہ تو خیر مخل ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو مذہبی شعبہ پورا ہو گیا۔ ان چار دیواریوں سے جب وہ باہر آئے تو پھر وہ ہندی ہو۔ مسلمان اور ہندو کچھ نہیں۔ ملک کا نظام حکومت ہندیوں کے لئے ہو گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے نہیں ہو گا۔ ہندو کو تو اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے کہ جو کچھ بھی ہندی نظام ہو گا۔ وہ ہندو نظام ہو جائے گا۔ یا یوں کہئے کہ جو ہندو نظام ہو گا۔ وہی ہندی نظام ہو جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان کا مذہب وہی ہے جو قرآن و سنت کے اندر

اور وہ نہیں جو قوم پرست مسلمانوں کی تقاریر میں ہے تو ظاہر ہے کہ آج کی غلامی اور آنے والی آزادی میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ اور اگر یہ باجہ۔ گائے جھٹکا کے مسائل یونہی جاری رہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ آزادی آج کی غلامی سے بھی زیادہ گلوگیر ہو جائے اس لئے کہ آج اگر مسلمان کا تمدن یا عمرانیت یورپ کی ملوکیت کے خلاف نہ جائے تو اس تمدن و تہذیب سے کوئی نہیں الجھتا۔ برعکس اس کے مسلمان اور ہندو کے تمدن کا آٹھوں پہر آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ لہذا اس تصادم کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ نظام حکومت تمدن اور عمرانی مسائل میں بھی دخل انداز ہو۔ مسلمان کانگریس سے صرف اتنا پوچھتا ہے۔ اور بار بار پوچھتا ہے کہ اس حیثیت سے اس کی آزادی کا کیا رنگ ہوگا۔ لیکن کانگریس اسے کبھی مطمئن کرانے کی کوشش نہیں کرتی (نہ شاید ضرورت سمجھتی ہے) کہ آئندہ آزادی میں وہ فی الحقیقت ایسا ہی آزاد ہوگا جیسا وہ آزاد ہونا چاہتا ہے۔ بلکہ قرائن اس کے برعکس جاتے ہیں اور یہ حقیقت تو چھپانے سے بھی نہیں چھپ سکتی کہ جو مسلمان آج "قوم پرست" ہو جاتا ہے وہ اسی اسلام کے سطح سے یقیناً پانچ سات درجے نیچے اتر آتا ہے جس پر وہ اس دور قوم پرستی سے پیشتر تھا اس زمرہ میں صرف کسی نگار اور کسی کلیم کے ارباب ترتیب و تدوین ہی نہیں جو بالکل دہریے ہو چکے ہیں بلکہ بڑے بڑے جید مسلمانوں کی بھی یہی کیفیت ہو چلی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۳ء میں آیت

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ --- کا ترجمہ لکھتے تھے۔

آج سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ دوسری تعلیم تلاش کریگا تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی...... (الہلال بابت ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء)

اور وہی مولانا ۱۹۳۲ء میں اسی آیت کا ترجمہ یہ فرماتے ہیں۔

اور جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا۔ تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائیگی (ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۵۸)

اور اس "عالمگیر سچائی" کی تفسیر یہ فرماتے ہیں۔

"دین حق کی اس اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کرلی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔" (ترجمان" ص ۲۲۹)

یعنی ۱۹۱۳ء میں اسلام کے معنی "احکام اسلامی" تھے۔ جو لا محالہ عبادت کی مخصوص شکل۔ کھانے پینے کی چیزوں کی

خاص پابندیوں کا نام تھا لیکن وہی اسلام ۱۹۳۲ء میں ان تمام پابندیوں سے آزادی کا نام ہوگیا اور دین نام رہ گیا۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی کا۔ یعنی وہی چیز کہ " مذہب خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام ہے " احکام میں کسی خاص اسلامی قانون کی ضرورت نہیں۔ یہ قانون ملکی بھی ہو جائے تو بھی کوئی بات نہیں۔ مسلمان مسلمان ہی رہیگا۔ وہی مولانا آزاد جو ۱۹۲۰ء میں لکھتے تھے کہ۔

" بس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت۔
اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح
کی گئی ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور طاعت امام سے الگ
ہوگیا گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا اور اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی
اگرچہ نماز پڑھتا ہو روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب صفحہ)

انہی مولانا آزاد کے سامنے پنڈت جواہر لال نہرو بہانگ دہل کہتے ہیں کہ میں ہندوستان میں صرف دو جماعتوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہوں۔ گورنمنٹ اور کانگریس۔ مسلمانوں کی الگ جماعت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اور وہی مولانا جو کبھی تحریر و تقریر کے بادشاہ تھے اپنے بے پناہ سکوت سے عملاً اس کا اعلان کرتے ہیں کہ پنڈت جی نے کتنی بڑی حقیقت "ثانیہ کا انکشاف فرمایا ہے۔

سیٹھ یعقوب حسن صاحب جنہوں نے کشاف الہدیٰ۔ تفسیر قرآن کا غالباً مقدمہ اس غرض سے لکھا کہ قرآنی تعلیم کو دنیا کے تمام ادیان کی تعلیم سے بہترین ثابت کیا جائے۔ کانگریس کی وزارت کے بعد مدراس کے جینیوں کے ایک جلسہ کی صدارتی تقریر فرماتے ہیں کہ کسی مذہب کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے مذہب پر اپنی برتری اور فوقیت کا اظہار کرے (بحوالہ ٹرتھ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

یہ بھی ظاہر ہے کہ آزادی کے نظام حکومت میں قوانین کی تدوین و ترویج اسی طریق جمہوریت سے ہوگی جو آج عام طور پر جاری و ساری ہے۔ اور جس میں مسائل کا فیصلہ آراء کے شمار پر منحصر ہوتا ہے یعنی آج اگر کسی مجلس میں یہ سوال پیش ہو جائے کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ اور عدم وجود کے حامی ایک رائے سے جیت جائیں۔ تو اقلیت کو ماننا پڑے گا کہ حقیقت وہی ہے جو اکثریت نے فیصلہ کیا ہے۔ اور خدا کے وجود کا اقرار جرم قرار دیا جائے گا۔ لیکن مسلمان جس اسلام کی آزادی چاہتا ہے

اس کے حقائق اپنی صداقت کے لئے کثرت آراء کے محتاج ہیں۔ وہ ازلی اور ابدی حقائق ہیں۔ کہ اگر دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہ رہے جو ان کے موافق رائے دے سکے۔ تو بھی وہ حقیقت، حقیقت رہے گی یعنی جیسے اگر دنیا میں کوئی بھی آنکھوں والا نہ رہے۔ تو بھی سورج ایسی ہی روشنی دے گا۔ جیسی آج۔ مثلاً قرآن کریم نے تقسیم وراثت کا ایک مکمل قانون مسلمانوں کو دیا ہے۔ اگر کسی مجلس وضع قوانین میں سو فیصدی آراء سے بھی کوئی قانون اس قانون کے خلاف منظور ہو جاتا ہے۔ اور نافذ العمل قرار دے دیا جاتا ہے۔ تو مسلمان اسے حق تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوگا۔ اور اگر اس سے ایسا قانون بجبر منوایا جائے گا تو یہی اس کی غلامی ہوگی۔

مسلمان کانگریس سے پوچھتا ہے۔ اور بار بار پوچھتا ہے کہ ایسے معاملات میں آزادی ملنے کے بعد اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ لیکن کانگریس کبھی اس کو ضمانت نہیں دیتی کہ آزادی ملنے کے بعد اس کا قرآن آزاد ہوگا سب سے قوی دلیل کانگریس کی شرکت کے جواز میں یہ دی جاتی ہے کہ اگر ہندوستان سے انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو اس کا اثر اسلامی سلطنتوں اور مسلمانوں کے اماکن مقدسہ پر پڑے گا۔ اور وہاں بھی انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دوسرے اسلامی بھائیوں کی خاطر اس جنگ میں شریک ہونا چاہیئے۔

یہ دلیل بظاہر خوش آئندہ ہے اور مسلمانوں کے اس مقدس جذبہ کو اپیل کرتی ہے جس کی خاطر وہ بہت کچھ قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ اس دلیل کی سطحی نظر فریبی سے ذرا گہرے اتریئے اور دیکھئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ کہدے کہ ع

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" تو قوم پرست طبقہ اس کے پیچھے اس طرح پڑ جاتا ہے گویا وہ "اشدھ" ہو گیا۔ اور اگر وہ کہیں اس جذبہ کو ظاہر کر دے کہ "آرزو دارم کہ میرم در حجاز" تو پھر تو وہ گویا گنگا جانے پر بھی پوتر نہیں ہو سکتا۔ مسلمان کے خلاف سب سے بڑا جرم یہی عائد کیا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اپنے دلی رشتوں کو۔ افغانستان۔ ایران ترکی حجاز سے وابستہ کیے رہتا ہے اور اس کی اس اخوت اسلامی کو دور جہالت کی یادگار اور سنگین قسم کی "فرقہ پرستی" قرار دیا جاتا ہے۔ اور وہ بھارت ماتا کے مندر میں داخل ہونے کے قابل نہیں سمجھا جاتا جب تک وہ اپنی جبین نیاز سے اس داغ سجود کو نہ مٹا ڈالے۔

اب ظاہر ہے کہ جب دیگر اسلامی ممالک سے کوئی قلبی واسطہ رکھنا شریعت قومیت پرستی میں

اس درجہ گناہ عظیم ہے تو پھر ایک ہندی مسلمان کو اس سے کیا کہ ان ممالک پر انگریز کی گرفت سخت ہے یا ڈھیلی۔ اس صورت میں اس مسلمان کے لئے۔ ایران اور جاپان میں کیا فرق رہ جائیگا اس کی بلا سے کہ کس کی گرفت کس پر ہے۔ دور حاضرہ کے مسلمان تو پھر بھی حجاز اور ترکی سے کچھ نہ کچھ تعلق محسوس کرتے ہیں لیکن ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو جبکہ ایک قوم پیدائشی قومیت پرست ہو۔ یعنی موجودہ مسلمانوں کی آئندہ نسل۔ اور ممالک اسلامی سے رابطۂ اتحاد انکے نزدیک ٹھہرے جذبہ وطنیت کے خلاف اور انتہائی تنگ نظری تو رفتہ رفتہ اس بات کا تو احساس ہی مٹ جائیگا کہ مسلمان کہیں اور بھی بستے ہیں اور اگر یہ سچ ہے کہ آزادی حاصل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انگریز کی گرفت ممالک اسلامی سے ڈھیلی پڑ جائے تو پھر اس کے معنی کچھ سمجھ میں نہیں آتے کہ مہاتما جی انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کو ایسا حادثہ (calamity) کیوں خیال کرتے ہیں کہ جسے ٹالنے کے لیے وہ ہر آن تک دینے کو تیار ہیں (بحوالہ ٹروتھ مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء) اس سے تو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے پیش نظر آزادی سے مفہوم محض درجۂ نو آبادیات ہے جس میں خارجی امور کے متعلق ہندوستان بدیشی سلطنت کی پالیسی کے ہی ماتحت رہیگا۔ اب یہ کون نہیں سمجھ سکتا کہ اس وقت انگریز کا اثر ممالک اسلامی پر سے کتنا کم ہو جائیگا مسلمان کانگریس سے اتنا ہی تو پوچھتا ہے کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ انگریز کے تعلقات کسی اسلامی مملکت سے کشیدہ ہو جائیں تو اس آویزش میں ہندوستان کی حکومت کی کیا روش ہوگی۔ لیکن کانگریس کبھی مسلمان کو اس باب میں مطمئن کرانے کی سعی نہیں کرتی اور کرے بھی کسطرح۔ کیا کانگریس یا آزاد ہندوستان کی حکومت پرائے شگون کی خاطر اپنی ناک کٹوالے گی، امور خارجیہ میں انگریز سے بگاڑنا! ہندو اسکا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے اماکن مقدسہ سے ہمدردی بھی کیا ہو سکتی ہے! برعکس اس کے مسلمان ان ممالک اسلامی کے مسلمانوں سے قلبی تعلقات قایم کرنے پر مجبور ہے کہ جب اس کے قرآن نے کہا ہے کہ انما المؤمنون اخوۃ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایسے بھائی گویا تمام ایک جسم واحد کے مختلف اعضا ہیں تو اس سے مقصود محض ہندوستان کی چار دیواری کے مسلمان ہی نہیں ہیں، ہندو اس وسعت کو صحیح معنوں میں سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس کی کل کائنات اسی ہندوستان کے اندر محدود ہے۔ اس کی اہمیت پوچھئے انگریز سے کہ اگر مغربی افریقہ میں ایک گورے پر مصیبت آجائے تو لندن میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔

مسلمان اگر آج اپنی غلامی کو محسوس کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ اس اخوت اسلامی کے معاملہ میں آزاد نہیں اور اگر اسے آزادی کے بعد بھی اس مسئلہ میں ایسا ہی رہنا ہے تو اس کی غلامی اور آزادی میں چنداں فرق نہیں!

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ قطع نظر دیگر امور کے۔ خالص ہندی سیاست کے مسائل میں بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مطامح نگاہ ایک دوسرے سے الگ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مختلف افراد کی ایک قوم بننے کے لیئے دنیا نے مختلف معیار قائم کیئے ہیں۔ نسلی اشتراک۔ لسانی اشتراک جغرافیائی اشتراک۔ لونی (رنگ کا) اشتراک وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کی قومیت ان معیاروں سے ایک بالکل جداگانہ معیار پر قایم کی گئی ہے اور وہ بنیاد وحدت تخیل ہے جسے ایمان کہتے ہیں اور یہی عناصر تخیلی ہیں جو اسے دوسری اقوام عالم سے متمیز کرتے ہیں اور انہی عناصر کی آزادی کا نام مسلمان کے نزدیک آزادی ہے اور مسلمان چاہتے بھی یہی ہیں کہ بیشتر اسکے کہ وہ اس جنگ آزادی میں سربکف شریک ہو جائیں۔ وہ اس بات کا اطمینان کر لیں کہ آزادی مل جانے کے بعد ان کے ان عناصر تخیلی کا تحفظ ضرور ہو گا۔ یعنی انکا قرآن آزاد ہو گا۔ برعکس اس کے دوسری جماعت جسے قوم پرستوں کی جماعت کہا جاتا ہے۔ انکا یہ مسلک ہے کہ مسلمانوں کو حصول آزادی کے لیئے (جو ان کے نظریہ کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ نصب العین ہے اور جو تصریحات بالا کے مطابق دراصل ایسا نہیں ہے) ہندوؤں پر کلیتہ اعتماد کر کے بلا کسی شرائط و قیود کے انکے ساتھ شامل ہو جانا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اتحاد فی العمل کے لیئے جو شرائط و قیود کی سطح سے بلند ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانونکا قلبی تعلق۔ دلی دوستداری ضروری ہے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے قلبی تعلقات کا نام تولی رکھا ہے اور اس قسم کے دوست کو ولی کہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے کسی مومن کا کسی غیر مومن کے ساتھ (جسے قرآن کی اصطلاح میں کافر کہا جاتا ہے۔ اور جس میں کسی منافرت یا دشمنی کا جذبہ پنہاں نہیں) اس قسم کے تعلقات پیدا کرنا جائز ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں تولی کیلیے آیا ہے کہ:۔

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی دوست۔ ولی ہیں۔

نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ بُرائی سے روکتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔
زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ۹/۷۱

دوسری جگہ ہے۔

تمہارے دوست تو صرف اللہ اور اسکا رسول۔ اور ایماندار لوگ ہیں
جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے ۵/۵۵

اس کے برعکس غیر مسلموں کے متعلق فرمایا۔

اے ایمان والو۔ اپنے سوا کسی اور کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ
تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی
کی تمنائیں رکھتے ہیں بعض (منصوبے) تو ان کے مُنھ سے ظاہر ہوتے ہیں
لیکن جسقدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔
ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم
ان لوگوں سے محبّت رکھتے ہو۔ مگر وہ کبھی تم سے محبّت نہیں رکھتے۔
حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب یہ تمسے ملتے ہیں تو کہدیتے
ہیں کہ ہم بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور جب تم سے الگ ہوتے ہیں تو تمہارے
خلاف غصّے سے اپنی اُنگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہدیجئے کہ جاؤ۔ اور
اپنے غصّے میں مر مٹو۔ اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی
اچھی بات پہنچ جائے تو انکے لیئے موجب غم ہوتی ہے۔ اور اگر تمپر کوئی مصیبت
آجائے تو اس سے یہ خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم استقلال سے رہو اور ان سے
اپنے آپ کو محفوظ رکھو (ان سے بچتے رہو) تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی
ضرر نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ انکے اعمال کو محیط ہے۔ ۳/۱۱۹-۱۲۰

یہ حقائق کسی تبصرہ یا تشریح کے محتاج نہیں واقعات ان کی تائید کے لیئے کافی ہیں۔ کون
نہیں جانتا کہ ڈاکٹر مونجے اور مالوی جی کیا چاہتے ہیں۔ کون نہیں سمجھتا کہ مہاتماجی کا سچے
چھوڑ چھاڑ۔ اچھوتوں کے سدھار۔ اور "ہندی ہندوستانی" کو ہندوستان کی مشترکہ زبان
بنانے میں کیوں مصروف ہیں۔ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو

جب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا تمدن ایک خاص وضع کے لوٹے اور ٹخنے سے اونچے پاجامہ سے زیادہ ہے کیا! تو انکا منشا کیا ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ واقعات سامنے نہ بھی ہوں۔ تو بھی ایک مسلمان کے لیئے جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے ان میں کسی شک اور تردد کی گنجائش نہیں اس لیئے کہ آیات الٰہی تائیدات زمانہ کی محتاج نہیں۔ تائیدی دلائل غیر مسلموں کے لیئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم صرف مسلمانوں سے بات کر رہے ہیں۔ جنہیں یقین ہونا چاہیئے کہ جب انکا خدا غیر مسلموں کی قلبی کیفیات کو یوں بیان کر رہا ہو تو اس میں کسی شبہ کی گنجائش سمجھنا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ اسی لیئے فرمایا کہ۔

> جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور رسول کے خلاف ہوں۔ گو وہ انکے باپ۔ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں..... ۵۸/۲۲

مسلمان ملت ابراہیمی کا پیرو ہے اور قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے اعمالِ حیات میں مسلمانوں کے لیئے اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ کس مقام پر فرمایا ہے قابل غور ہے

> اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ کہ انسے دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو کچھ حق کے ساتھ آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں...... اگر انکو تم پر دسترس ہو جائے تو وہ فوراً تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئینگے ..... تمہارے لیئے ابراہیم اور انکے ساتھیوں (کی زندگی میں) ایک اسوۂ حسنہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کیلئے عداوت اور بغض ظاہر ہے۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ...... ۶۰/۱-۴

فطرۃً سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تولّی سے اتنی شدت سے کیوں روکا ہے۔ اگر یہ غیر مسلموں پر اعتماد اور بھروسہ کریں گے تو انکا کیا بگڑیگا۔ اس کی وجہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے اور کتنی واضح طور پر موجود ہے۔ قرآن کریم کے اپنے الفاظ میں دیکھیئے فرمایا

ودّوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء فلا تتخذوا منهم اولیاء.... ۴/۸۹

وہ لوگ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود کافر ہیں۔ اسی طرح تمہیں بھی کافر بنا لیں
تاکہ تم اور وہ سب برابر ہو جاؤ۔ بس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔

اس میں یہ ٹکڑا " فتکونون سواء " قابل غور ہے یعنی غیر مسلموں کی اور منافقوں کی (کہ یہاں منافقوں کا ذکر چلا آرہا ہے اور قرآن کریم کی رو سے منافقت اور کفر ایک ہی چیز ہے۔) ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ تم کو اپنے جیسا کر لیں۔ اور تم سب اس طرح برابر ہو جاؤ۔ ایک جیسے ہو جاؤ۔ کیا کانگریس کا یہی نصب العین نہیں کہ ہندوستان کی اقلیتیں اپنے مخصوص امتیازی شعائر کو چھوڑ کر۔ جن کی وجہ سے وہ الگ اقلیتیں کہلاتی ہیں۔ ایک قوم بن جائیں یعنی قوم غالب میں مدغم ہو جائیں اور کیا "قومیت پرست" حضرات کا یہی وعظ نہیں کہ مسلمانوں کو تنگ نظری چھوڑ کر کشادہ ظرفی اختیار کرنی چاہئے۔ اور انہیں پہلے ہندی اور بعد میں مسلمان بننا چاہئے۔ اور پھر پنڈت جواہرلال نہرو کا ملک کے نوجوانوں کو مذہب سے بیگانہ۔ بلکہ متنفر بنا دینا اسی غرض کے لئے نہیں کہ ہندو مسلمان سب قومیت کو اپنا بنا لیں۔ اور مسلمان جس چیز کو اپنا مخصوص تمدن بنائے بیٹھا ہے۔ اسے ان کی نظر کے مطابق اعلیٰ مفاد کی خاطر قومیت کے سمندر میں ڈبو دے۔ حالانکہ مسلمان کا امتیازی نشان ہی اسی میں ہے کہ وہ صرف خدا کے رنگ میں رنگا ہو صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے) یعنی اس کے لئے امتیازی نشان اس کے خدا کے مقرر کردہ شعائر ہوں۔ جسے قرآنی تمدن کہا جائے گا۔ اور یہی وہ امتیازی زندگی ہے جو ایمان و عمل صالح سے ملتی ہے۔

یا ایھا الذین امنوا۔ ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا [۸/۲۹]

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کریگا

یعنی مسلمان اس وقت تک ہی مسلمان ہے جب تک وہ اپنا الگ امتیازی نشان رکھتا ہو۔ اس کی زندگی ہی امتیازی ہو۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دوسروں کے اندر جذب ہو جانا ہی قابل فخر ہے۔ جب برابر اور یکساں ہو جانا ہی اصل غایت ہے۔ تو پھر یہ " فرقان " یہ امتیازی رنگ کہاں رہے گا!!۔

البتہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے مودت کی اجازت ہے جو تولی سے بالکل الگ شے ہے لیکن وہ بھی ان حالات میں جبکہ مسلمان احسان اور عدل کرنے کی قوت رکھتے ہوں

یعنی بالاوست یوں فرمایا۔

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف سے نہیں روکتا جو تم سے
دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور جنہوں نے تمکو تمہارے گھروں سے
نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ۶۰/۸

ان تمام آیات کو اور اسی قبیل کی متعدد آیات کو جو قرآن کریم میں جا بجا مذکور ہیں ساتھ ملا کر دیکھنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ایک مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم سے تولّیٰ دلی دوستی۔ بلا ضمانت و شرائط۔ اعتماد اور بھروسہ کے تعلقات کسی طرح بھی جائز نہیں نہ صرف یہ کہ جائز ہی نہیں بلکہ اس کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی ہے۔ بڑی تاکید سے روکا گیا ہے۔ اب جو حضرات ہندوؤں کے ساتھ بلا شرائط و ضمانت اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ تولّی کے قائل ہیں عملاً اس پر کار فرما ہیں۔ اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے ہیں وہ دو صورتوں سے خالی نہیں۔

(۱) اگر وہ فی الحقیقت ہندوؤں کے ساتھ قلبی رابطہ اتحاد تولّی کو قائم کئے ہوئے ہیں تو یہ چیز قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہے جسکی کوئی تاویل نہیں کیجا سکتی۔ اور

(۲) اگر وہ ہندوؤں کے ساتھ دلی دوستی نہیں رکھتے بلکہ اسوۂ ابراہیمی کے ماتحت ان کی ہندوؤں سے "ابدی عداوت اور بغض ہے" تو ہندوؤں کو خود سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ان کو اور اپنی قوم کو کسقدر فریب دے رہے ہیں۔ ہندوؤں کو چاہیئے۔ اور مسلمانوں کو سب سے پہلے چاہیئے کہ وہ "قومیت پرست" حضرات سے واضح طور پر پوچھیں کہ انکے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ کس قسم کے ہیں۔ دلی تعلقات ہیں یا محض ظاہر داری کے۔ معاملہ صاف ہو جائے گا یا انھیں ہندوؤں سے الگ ہونا پڑیگا یا مسلمانوں سے۔ یہ بین بین کا راستہ کہ

گاندھی جی بھی خوش رہیں۔ راضی رہے قرآن بھی

چل نہیں سکیگا۔ آج تک کسی قومیت پرست مسلمان نے اس مسلک کو واضح نہیں کیا اور اس کی سخت ضرورت ہے۔ یا وہ غیر مسلموں کے ساتھ تولّی کو جائز ثابت کریں۔ لیکن قرآن سے تو یہ جائز ثابت ہونے سے رہا۔ فَأْتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

اب ایک آخری دلیل باقی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مسلمان کو حکم ہے تعاونوا علے البر والتقوی (یعنی نیکی اور تقوی کے کاموں میں معاونت کرو) تو مسلمانوں کو موجودہ جنگ آزادی میں ہندوؤں کی معاونت ضرور کرنی چاہیئے کہ یہ برّ اور تقوے کا کام ہے۔ سو پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ یہ فی الحقیقت برّ اور تقوی کا کام ہے بھی یا نہیں یہ ظاہر ہے کہ جس قسم کی آزادی کا تصور ہندو کے دھیان میں ہے وہ مسلمان کے نزدیک آزادی ہی نہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب معاشی آزادی ملجائیگی تو مسلمان کا اس میں کچھ تو حصہ ضرور ہوگا سو اوّل تو یہ بات بھی محل نظر ہے کہ مسلمان کا اس میں کچھ حصہ ہوگا بھی یا اس کی حالت ایسی ہی رہے گی لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسوقت مسلمان کی معاشی حالت کچھ سدھر جائیگی تو دیکھنا یہ ہے کہ اُس وقت مسلمان ہندوستان میں کہیں موجود بھی ہوگا۔ جس روش پر مذہب کے خلاف تحریک بڑھائی جا رہی ہے۔ جس نہج پر مسلمان نوجوانوں کو مذہب سے متنفر کیا جا رہا ہے اس سے تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی مدافعانہ قوت بروئے کار نہ لائی جائے تو بیس سال کے اندر اندر ہندوستان میں مسلمان۔ مسلمان کی حیثیت سے باقی ہی نہیں رہے گا۔ ہندی کی حیثیت سے باقی رہے گا۔ تو اس وقت اگر معاشی حالت کچھ بہتر بھی ہوگی تو ایک ہندی کی ہوگی۔ ایک مسلمان کی نہیں ہوگی۔ اور اگر ایک مسلمان نے اپنی امتیازی خصوصیتیں کھوکر معاشی۔ فلاح حاصل بھی کر لی تو "مسلمانوں" کو اس سے کیا خوشی۔ آج لفظ "ٹوڈی" اسی لیئے اسقدر گھناؤنا نظر آتا ہے کہ ایسا شخص گویا اپنی معاشی خوش بختی کی خاطر اپنی اسلامی خصوصیت کو مٹا ڈالتا ہے۔ اگر یہی چیز آزادی کے بعد بھی رہی (اور آج تو انفرادی حیثیت سے ہے اُس وقت اجتماعی رنگ میں ہوگی) تو مسلمان کو اس آزادی سے کیا مسرت! مسلمان معاشی نکبت سے اس لیئے نالاں ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی قوم اسلام بیچ ڈالتی ہے اور معاشی خوشحالی اس لئے چاہتا ہے کہ اس کا اسلام منڈی میں آنے سے بچ جائے۔ لیکن اگر معاشی خوش بختی حاصل ہی ہوا اسلام کی فروخت سے تو اس خوش بختی کو ایک سچا مسلمان لیکر کیا کرے! مسلمان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے۔

اگر اس کا نام "مٹا کر" یہ اچھی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس زندگی سے تو موت بہتر۔
اس قسم کی آزاد حکومت کا قیام جس میں قرآن محبوس رہے۔ مسلمان اپنی ملی خصوصیات کو مٹا ڈالے۔ مسلم و غیر مسلم برابر ہو جائیں۔ یقیناً ایسا ہی اثم و عدوان ہے۔ جیسا کسی اسلام کی مخالف حکومت کے استحکام میں کچھ امداد کرنا۔ اور اگر تعاونوا علی البر والتقویٰ کے ساتھ ساتھ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ بھی خدا ہی کا حکم ہے تو اس نئی "آزاد" حکومت کے حصول میں معاونت کیسے جائز ہو جائے گی؟

لہذا مسلمان قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق تحریک آزادی میں تعاون ایسی صورت میں کر سکتا ہے کہ
(۱) کانگریس۔ جو اکثریت کے اعتبار سے ہندوؤں کی ہی جماعت ہے اور انہی کی جماعت رہے گی واضح الفاظ میں بیان کر دے کہ آزادی سے ان کا مفہوم ایسی مکمل آزادی ہے جو مسلمان کے لیئے معاشی آزادی کے ساتھ ساتھ مذہبی آزادی کا بھی حکم رکھتی ہو۔ یعنی
(۲) حصول آزادی کے بعد مسلمان کا قرآن آزاد ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں کے تمام معاملات قرآنی قوانین کی رو سے فیصل ہو سکیں گے۔
(۳) ممالک اسلامیہ کے ساتھ ہندوستان کی حکومت کی وہ روش ہو گی جو خود مسلمان طے کیا کریں گے۔

ان اصولوں کا جزئی تصفیہ مسلمانوں کی جماعت سے کر لیا جائے۔ نہ یہ کہ مسلمانوں کو فرداً فرداً شمولیت کانگریس کی دعوت دی جائے۔ ہمارے مخاطب اس وقت مسلمان ہی ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ من حیث الجماعت ان امور کا کانگریس کی اکثریت سے فیصلہ کر کے پھر کانگریس کی تحریک آزادی سے تعاون کریں۔ فرداً فرداً اکثریت میں جا کر گم ہوتے جانا تو خودکشی ہے۔

یاد رہے کہ اسلام اور محکومیت دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو مسلمان محکومیت پر قانع ہو جاتا ہے اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس لیئے مسلمان کو تو مسلمان بننے کے لیئے حصول آزادی کی ضرورت ہے۔ یہ آزادی کی جنگ میں پیچھے کیسے رہ سکتا ہے۔ اس نے تو دنیا کو سکھایا ہے کہ آزادی کے لیے جنگ کیسے

کی جاتی ہے۔ لیکن آج ہندوستان کے مسلمان ایک وسیع و عریض صحرا میں ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ دریا کی ایک موج آتی ہے اور ان میں سے کچھ ذرات اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ دو سکنڈ کے لئے دریا کا پانی خاک آلودہ سا ہو جاتا ہے۔ یہ ذرے سمجھتے ہیں کہ ہم دریا پر اثرانداز ہو گئے۔ لیکن چار ہی قدم پر جا کر یہ ذرے یا تو اس میں جذب ہو جاتے ہیں یا سطح کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر یہی ذرے اپنی تنظیم و مرکزیت سے ایک جگہ سمٹ کر اکھٹے ہو جائیں تو ایک محکم چٹان بن سکتے ہیں کہ بڑی سے بڑی موج بھی آئے تو اپنا سر ٹکرا کر لوٹ جائے۔ پہلی حالت جو تشتت و انتشار کی حالت ہے۔ لامرکزیت کی حالت ہے وہ شرک کی حالت ہے جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

> اور جو اللہ سے شرک کرتا ہے (اس کی حالت) یوں سمجھئے کہ وہ گویا آسمان (کی بلندیوں) سے (زمین کی پستیوں پر) آگرا۔ یا اسے کوئی پرندہ اُچک کر لے گیا یا ہوا کا طوفان اسے کسی دور دراز مقام پر اڑا کر لے گیا (یعنی وہ اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا رہا) ۲۲/۳۱

اسی لئے کہ قرآن کریم میں بصراحت موجود ہے کہ انتشار و افتراق۔ تشیع و تحزب۔ دراصل شرک کی حالت ہے۔ اور دوسری حالت ایمان کی ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ۔

> یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے دوسرے لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے تمہارے خلاف بہت سا ساز و سامان جمع کر رکھا ہے۔ ان سے ڈرو۔ تو اس سے ان کا ایمان اور بھی بڑھ گیا۔ اور کہنے لگے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ اور وہی بہترین کارساز ہے۔ ۳/۱۷۲

مسلمانوں کی زندگی کا راز۔ بشرطیکہ انھوں نے مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنی ہو۔ آج ان کی مرکزیت کے اندر ہے۔ آج اسلام کا سچا خیرخواہ وہی ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کے اندر مرکزیت پیدا کر دے ورنہ ان ریت کے ذروں کو دریا کے اندر ملنے کی دعوت دینا۔ ان کو زہر دینے کے مرادف ہے۔ یاد رہے کہ ایک ڈھیلہ جب پانی میں پھینکا جائے تو وہ ذرا سی آواز بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے پانی کے کچھ چھینٹے بھی اڑتے ہیں۔ دو چار لہریں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس ڈھیلے کی موت ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے موت!! موجودہ "قوم پرست" حضرات میں سے ممکن ہے بعض

اس فریب میں بھی ہوں کہ ان کی وجہ سے دریا میں کچھ ہلکورے پیدا ہو رہے ہیں لیکن یہ سب عارضی ہیں۔ انہی کے اندر اون کی موت کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمان زندگی چاہتے ہیں تو انکے لئے ایک ہی پیغام ہے کہ ؎

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی
مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

جو اللہ کا بندہ آج مسلمانوں کے بکھرے ہوئے ذرّوں کو ایک محکم چٹان میں بدل دے اور اس طرح انھیں اس اُمنڈتے ہوئے سیلاب سے بچالے۔ وہی اسلام کا سچا خدمت گزار ہے۔ جب یہ حالت ہو جائے گی تو پھر دوسری جماعتیں خود بخود ان کے جذبات کا احترام کریں گی۔ ان سے میثاق و وفاق کی ضرورت سمجھیں گی انھیں ایک جماعت تسلیم کریں گی۔ ان سے معاہدے کرکے اشتراک عمل حاصل کریں گی۔ اور پھر ان میں وہ قوت بھی موجود ہوگی کہ یہ اُن معاہدوں کو پورا ہوتا بھی دیکھ لیں۔ اس راستہ کے علاوہ کوئی اور راستہ "صراطِ مستقیم" نظر نہیں آتا۔ ان کنتم تعقلون۔

باب المراسلت

اکل حلال!

(جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی مدیر ترجمان القرآن)

ذیل میں ایک خط اور اس کا جواب شائع کیا جاتا ہے، یہ خط میرے نام سے ایک صاحب نے بھیجا۔ میں جانتا ہوں کہ اس زمانہ میں اکثر حضرات کو اس قسم کی دقتیں پیش آئی ہیں اور ان دقتوں کا میری دانست میں یہی ایک حل ہے جو میں نے اپنے اس نوجوان مستفسر کو سمجھایا ہے۔ لہٰذا اس خط اور اس کے جواب کی اشاعت انشاء اللہ خالی از فائدہ ثابت نہ ہوگی۔

جناب سید صاحب السّلام علیکم

دارالاسلام کے پراسپکٹس کے لیے تو مجھے آپ کے نیجر صاحب کو لکھنا چاہیئے تھا لیکن مجھے آپ سے بھی کچھ پوچھنا تھا۔ اس لیے آپ کو یہ مزید تکلیف دیتا ہوں کہ آپ انہیں ایک کاپی پراسپکٹس کی میری طرف بھیجنے کو بھی کہدیں بہت مہربانی ہوگی۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں میں نے ایل ایل بی کیا تھا۔ آج کل پریکٹس کے لیے لازمی ہے کہ چھ ماہ پہلے کسی تجربہ کار وکیل کے ساتھ رہ کر کام سیکھا جائے پھر اُسکے سارٹیفکٹ پر ہائی کورٹ اُسے انڈی پنڈنٹ کام کی اجازت دیتی ہے۔ وہ اجازت بھی میں نے لے لی۔ اس دوران (apprenticeship) اور زمانہ مابعد میں موجودہ پریکٹس کے طرق اور ذرائع کا میں بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اور جس نتیجہ پر آخر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور یہ بھی چاہتا ہو کہ احکام قرآنی کے عین مطابق یا اُنکے قریب قریب اپنی زندگی کے دن گزارے اُس کے لیے مشکل کیا ناممکن ہے کہ ایک دن بھی ان عدالتوں میں جاکر اپنی روزی کا سامان پیدا کر سکے۔ مقدمہ کی ہر سٹیج پر جھوٹ کی اتنی آمیزش کرنا لازم ہو جاتی ہے جتنی وکیل صاحب کو اپنی روزی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ خواہ وہ مستغیث کیطرف سے ہو یا ملزم کیطرف سے، یہ حقیقت شب دیجور کی طرح واضح ہے کہ مقدمہ کی کامیابی راستی پر نہیں۔ بلکہ کذب و افترا پر مبنی ہے۔ Touting کا مرض تو ایک عام مرض ہے لیکن میں فی الحال اُسے چھوڑتا ہوں میرا روئے سخن صرف مقدمہ کے مختلف مراحل کیطرف ہے۔ جن پر وکیل صاحبان کو بے اختیار ہو کر مقدمہ کی کامیابی کی خاطر جھوٹ سکھانا جھوٹ

بلانا اور جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ محض اس مقدمہ کی خاطر اتنا گناہ عظیم اپنے سر لینا کسی صورت میں قابل معافی ہو سکتا ہے۔ جب وکیل صاحب کے لئے اور کوئی چارہ کار بھی نہ ہو۔ میرا (Moral Conviction) ہے کہ فی زمانہ وکلا سند یافتہ ڈاکو ہیں۔ وہ پچانوے فیصدی جرائم کرتے ہیں جنکی تعریفوں اور سزاؤں سے تعزیرات ہند بھری پڑی ہے۔ اور میں خود اسی کام کے لئے تعلیم لیکر یہاں آیا ہوں۔ یہ آج کل ناممکن ہے کہ کوئی وکیل بنا دامن بچائے بھی رکھے اور وکالت کا کام بھی کرتا رہے ہاں پندرہ بیس برس کی ان شیطانی حرکات کے بعد اسکا کام چل نکلا اور وہ (Original work) چھوڑ کر محض اپیلیں ہی لینا شروع کردے تو اُس وقت وہ کہہ سکتا ہے کہ میں مقابلۃً حلال کی روزی کما رہا ہوں لیکن اپنی پریکٹس کے پہلے پندرہ بیس برس اُس کی عاقبت سوزی کے لئے کچھ کم نہیں۔

میرے تمام اقربا مجھے یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اب تنا زر کثیر صرف کرکے جو تعلیم لی ہے اُس سے استفادہ بھی کرنا چاہیئے۔ لیکن اُنکے یہ مشورے مجھے نہیں بھائے۔ اس سال مجھے حج بیت اللہ کا بھی موقع نصیب ہوگیا۔ وہاں منیٰ کے مقام پر ایک صاحب اسی موضوع پر ایک آیۂ شریفہ بھی مجھے سُنا گئے جس کا مفہوم جتنا مجھے یاد رہا ایسا ہی تھا کہ اُن لوگوں کی روزی حرام ہے جو دو فریقوں کو قاضیوں یا منصفوں کے پاس لیجاتے ہیں اور حقیقت کا اخفا اور جھوٹ کا اظہار کرتے ہیں لیکن چونکہ عربی زبان سے نابلد ہوں۔ اس آیت شریفہ کے الفاظ ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکا میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کس پارہ میں آئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالباً تیسرے پارہ میں۔ لیکن اس میں تو مجھے کہیں نہیں ملی۔ آپ کو یاد ہو تو لکھدیں وہ بھی ایک مزید ضمنی دلیل ہو جائے گی۔

لیکن آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان حالات کے موجود ہوتے ہوئے جنکا میں نے ایک نہایت سرسری الفاظ اور مختصر سے پیرایہ میں نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ جو فی الحقیقت ان گھناؤنے حقائق کا ایک پہلو بھی پوری طرح ظاہر نہیں کرتے میرے لئے اپنے آپ کو ایک ایسے کام پر لگا دینا کہاں تک مناسب ہے۔ جس وقت اور راہیں بھی بظاہر مسدود ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میرا یہ سوال دیکھکر جو اگرچہ چنداں وضاحت کے ساتھ یا مدلل طور پر تو نہیں لکھا جا سکا مجھے جواب سے فخر بخشیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کا یہ جواب ہی میرے اس indecision کا کوئی حل پیش کردے۔ والسلام۔

جواب

محترمی! السلام علیکم! عنایت نامہ مورخہ ۲۸ مارچ وصول ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو کسب معیشت کے طریقوں میں حرام اور حلال کی تمیز کرنا چاہتے ہیں ورنہ مادہ پرستی جس طرح ذہنیتوں پر چھائی ہوئی ہے اُس کا اثر تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کیا جدید تعلیمیافتہ اور کیا قدیم تعلیمیافتہ سب کے پیش نظر جلب منفعت اور کسب زر ہے اور جو طریقہ زیادہ پُرمنفعت نظر آتا ہے۔ اُس میں حرام و حلال کی تمیز کرنے کو حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وکالت کے متعلق جو کچھ آپنے لکھا ہے وہ حقیقت سے کچھ کم ہی ہے۔ زیادہ نہیں ہے وکیل اگر اس نیت سے اور اس شرط کے ساتھ کام کرے کہ حقدار کو اس کا حق دلوانے میں قانونی مدد کرے گا تو اُسکا پیشہ جائز ہے اور اگر اس نیت سے بیٹھے کہ جو شخص اُس کو پیسہ دے گا۔ خواہ وہ برسرحق ہو یا برسرظلم بہرحال یہ اُس کی مقصد برآری میں مدد دے گا، تو یہ اُسکے پیشہ کو اُصولاً حرام کردے گا۔ لیکن "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"[1] وہ اصل الاصول ہے جو تمام دُنیاوی معاملات میں قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور اسکی خلاف ورزی بہرحال ایک معصیت ہے اب اس معصیت کی راہ اختیار کرکے آدمی جس جس درجہ کے مرتکبین حرام کے ساتھ تعاون کرے گا۔ اُسی درجہ کے حرام کا گویا وہ خود مرتکب ہوگا۔ اگر آپنے سُود خوار کو سُود دلوایا تو گویا خود سود خواری کے مجرم ہوئے اگر زانی کو سزا سے بچایا تو خود زنا میں معین ہوئے۔ اگر غاصب کو کسی جائز ملکیت پر قبضہ دلایا تو خود غصب میں شریک ہوئے وقس علیٰ ہذا۔

آپ کی روح مجھے سعید معلوم ہوئی ہے۔ اس لیئے میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔ اس پر آپ غور کریں گے تو آپ کو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

انسان کے لیئے دُنیا میں دو راستے ہیں۔ اگر وہ آخرت پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ اور خدا کے سامنے حاضر ہونے اور اپنی دُنیوی زندگی کے اعمال کی جواب دہی کرنے کا اُس کو کوئی خیال نہیں اور کامیابی اور ناکامی کا معیار اُس کی نگاہ میں صرف اِس دُنیا کی خوش حالی و بدحالی ہے تو اُس کو حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی اخلاقی و مذہبی قیود کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ اور پُوری تندہی کے ساتھ دولت دُنیا

[1] نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو۔ اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو

سمجھے اور اس سے لذت وعیش کے سامان فراہم کرنے میں لگ جانا چاہیئے اُس کے لیئے حرام وہ ہے،
جو حصول منفعت اور طلب لذات میں مانع ہو اور حلال وہ ہے جو اِس میں معاون ہو اور اگر وہ
آخرت پر یقین رکھتا ہے اور خدا کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہے اور اُس کے نزدیک میابی یہ
ہے کہ خدا کی آخری عدالت میں وہ کم از کم من حیث المجموع نیکو کار ٹھہرے اور ناکامی یہ ہے کہ آخری
(Balance Sheet) میں وہ خائب و خاسر (Bankrupt) نکلے تو پھر دنیوی
زندگی میں اُسے اپنے نقطۂ نظر میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اِس کو پھر اپنی کامیابی و ناکامی کا اندازہ
اس لحاظ سے نہ کرنا چاہیئے کہ اُس نے کس قدر خوش حالی حاصل کی۔ کیسے کپڑے پہنے، کیسے مکان
میں رہا، کیا کھانا کھایا اور کس قدر اسباب تعیش فراہم کیئے۔ بلکہ اس لحاظ سے اندازہ کرنا چاہیئے
کہ اپنے واجبات کو ادا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا لوگوں کے حقوق اور خدا کے حقوق سے کہاں
تک سبکدوش ہوا۔ اور افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی بال سے زیادہ باریک راہ پر قائم رہنے
میں کہاں تک کامیابی اُس نے حاصل کی۔ زندگی کا یہ نقطۂ نظر جب وہ اختیار کرے گا تو پیوند
لگے ہوئے کپڑوں اور سوکھے ٹکڑوں میں اُس کو وہ اطمینان قلب نصیب ہوگا جو حرام کھانے والوں
کو حریر و دیبا پہنے اور ایوان نعمت کھانے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔

برادرم دُنیا میں خدا کا رزق فراواں ہے۔ رزق بجائے خود طیب و طاہر ہی ہے۔ اب یہ انسان
کی اپنی پسند پر موقوف ہے کہ حرام طریقہ سے اُس کو حاصل کرے یا حلال طریقہ سے، یہ چور کی اپنی
دوں ہمتی ہے کہ جو پاک روٹی اس کو پاک ذریعہ سے مل سکتی تھی۔ اُس نے ناپاک ذریعہ سے اُس کو
نجس کر کے کھایا۔ دُنیا میں پاک ذرائع بھی اس کثرت سے موجود ہیں جس کثرت سے ناپاک ذرائع موجود
ہیں۔ اگر آپ اپنی نیت کو پاک کرلیں اور اتنا عزم اپنے اندر پیدا کرلیں۔ کہ اپنے ضمیر کے خلاف کوئی
(Temptation) آپ کے قدم لغزش پیدا نہ کرسکتا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ناپاک ذرائع
زیادہ مشکل اور پاک ذرائع زیادہ آسان ہیں۔ اور اگر نیت میں ناپاکی موجود ہو یا عزم موجود نہ ہو،
تو پھر ناپاک ذریعہ آسان اور ہر پاک ذریعہ مشکل نظر آئے گا، نیک نیت اور سچے عزم والے آدمی
کے لیئے سڑک پر بیٹھ کر جوتی گانٹھنا آسان اور لوگوں کے حقوق مار کر کروڑپتی بننا دشوار ہے۔ بخلاف
اس کے بدنیت اور کم حوصلہ آدمی کو رزق حرام کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور رزق حلال تلاش
کرنا اُسے جوئے شیر سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔

یہ ہے اصلی صورت حالات۔ اب آپ لوگوں سے مشورہ کرتے اور اُنکی مختلف آوازوں پر کان

دہریے کے بجائے صرف اپنے دل کی طرف نگاہ کیجیے، اور اس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ اس کا میلان کس طرف ہے،
اور پھر اگر وہ اسلامی نقطۂ نظر کی طرف مائل ہو تو یہ دیکھیے کہ آیا اس میں اتنا عزم بھی موجود ہے۔ کہ وہ
رزق حلال کی ایک نانِ جویں کو رزق حرام کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھے گا۔ اس امتحان میں
اگر آپ کا قلب پورا اترے تو مسلمان کی زندگی اختیار کیجیے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً آپ کی زندگی میں برکت
عطا فرمائے گا۔ اور اگر اس امتحان میں آپ کو محسوس ہو جائے کہ آپ کا قلب بودا ہے تو پھر ٹھیٹھ مادہ
پرست بن جائیے۔ اور خدا و آخرت کا خیال دل سے قطعی نکال دیجیے۔ تاکہ کم از کم دوسرے ہی راستے
میں آپ انتہا کو پہنچ سکیں۔ بیچ کے مقام پر ٹھہرنے کا میں آپ کو کبھی مشورہ نہ دوں گا۔ کیونکہ جو شخص
آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر ہوتا ہے وہ دہرے نقصان میں ہے، نہ مسلمان ہی کی حیثیت سے کامیاب اور
نہ مادہ پرست ہی کی حیثیت سے کامیاب!

دارالاسلام کا پراسپکٹس آپ نے طلب فرمایا ہے۔ اگر شوال ۱۳۵۶ھ کا ترجمان القرآن آپ
دیکھ چکے ہیں یا مارچ ۱۹۳۸ء کا پیغام حق ملاحظہ سے گزرا ہے۔ تو اسی کو پراسپکٹس سمجھیے۔ اور اگر ان
میں سے کوئی پرچہ آپ کو نہیں ملا ہے۔ تو لکھیے تاکہ یہاں سے بھیج دیا جائے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ
(پنجاب)

(ہمارے بھائی نے صرف وکالت کے پیشہ کا ہی ذکر کیا ہے کہ یہی چیز ان کی اپنی ذات سے متعلق
تھی لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ جب رزق کی تقسیم خدا کے مقرر کردہ
نظام کے بجائے انسانی ہاتھوں میں چلی جائے تو موجودہ ماحول میں بمشکل کوئی شعبہ ایسا ملے گا جس میں
کوئی نہ کوئی ایسی خرابی نہ نکل آئے جس کا ذکر استفسار میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا صحیح احساس رکھنے والے
مسلمان کا تو نصب العین ہی یہ ہونا چاہیے کہ اس ماحول کو بدل کر دنیا میں پھر سے وہی خدائی نظام
قائم کیا جائے جس کا مکمل دستور اساسی خدا کی آخری کتاب ہے۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے اس
عزم راسخ والے قلبِ مومن کی ضرورت ہے جس کی طرف مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔
ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا قلب آج اس تمام ماحول کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن جو اس
جدوجہد میں فنا ہو گیا۔ اسی کو درحقیقت بقا ہو گئی۔ ہلاکت تو اُس کے لیے ہے جو اس ماحول کے ساتھ بہ چلنے

تکلف برطرف

از رازی

نئے جال لائے پرانے شکاری

جب سے ہندوستان میں اشتراکیت کی وبا پھوٹی ہے ہر ادیب اپنے مضمون میں ہر افسانہ نگار اپنے افسانہ میں اور ہر شاعر اپنی نظموں میں سرمایہ داری کی لعنت اور مزدور کی حمایت میں چشم پرنم اور آہ برلب دکھائی دیتا ہے اور چونکہ اس نظریہ کی ابتداء موجودہ تحریک آزادی کے ایک قاید سے ہوئی ہے اس لئے ہمارے قوم پرست شعراء حضرات تو اس دل سوزی اور جگر گدازی سے مزدور کی بپتا بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچارے دن بھر کلیجہ تھامے ایک ایک بھوکے۔ ایک ایک نادار۔ ایک ایک مصیبت زدہ کی دُکھ بھری کہانی سُن سُن کر خون کے آنسو بہاتے ہونگے اور مزدور کی ستم رسیدگی کا تصور راتوں کو انکی نیند حرام کر دیتا ہوگا۔

مرزا سودا کو ساغر دیکھ کر کسی کی "کیفیت چشم" یاد آتی تھی۔ حافظ پیالہ میں "عکس رخ یار" دیکھتا تھا لیکن ان حضرات کو چائے کے پیالہ اور روٹی کے ٹکڑے میں کسی مفلوک الحال بیمار مزدور کی حسرت بھری نگاہیں اور کسی "پتھر کوٹنے والی" کا مرجھایا ہوا زرد و خشک چہرہ نظر آتا ہوگا۔ کوئی دو برس ادھر کا ذکر ہے کہ ہمیں شملہ کی چوٹیوں پر ایک مشاعرہ میں اسی قسم کے ایک اشتراکی انقلاب پسند شاعر کا کلام سوز التیام سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاحب نہایت درد و اثر میں ڈوبی ہوئی اپنی ایک نظم سنا رہے تھے۔ موضوع یہ تھا کہ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ایک سٹیشن پر دو گاڑیاں آمنے سامنے آکر رکیں۔ اور اتفاق سے ایک سیکنڈ کلاس کا ڈبہ دوسری گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے کے مقابل آکر ٹھہر گیا۔ اب انہوں نے سیکنڈ کلاس کے سرمایہ داروں کے عیش و تنعم کا موازنہ سامنے کے تھرڈ کلاس کے مزدوروں اور غریبوں سے اس انداز سے کرکے دکھایا کہ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سُننے والوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ سرد آہوں سے محفلِ مشاعرہ بزم ماتم بن گئی۔ اس دردناک منظر کا سامعین پر دن بھر اثر رہا۔ شام کی گاڑی سے شعراء حضرات واپس آرہے تھے لوگ ان کو الوداع کہنے کے لئے سٹیشن پر گئے۔ اشتراکی حضرت لوگوں کے توجہات کے خصوصیات کے ساتھ مرکز بن رہے تھے۔ مزدور۔ سرمایہ دار۔ سیکنڈ کلاس ظلم ستم۔ انقلاب۔ اس قسم کے الفاظ ادھر اُدھر سے کان میں پڑ رہے تھے کہ ریل نے سیٹی دی۔ اور وہ اشتراکی حضرت مسکراتے ہوئے ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں سوار ہوگئے۔ جب سمجھ میں آیا کہ انہوں نے تھرڈ کلاس کے مزدوروں کا منظر کہاں سے دیکھا تھا۔

اور اس پر بھی مزدوروں کو شکایت ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی غمخوار نہیں۔ پتہ نہیں ان کو اور کس قسم کے غمخوار مطلوب ہیں۔ اے کاش کوئی ان احسان ناشناس جاہلوں کو سمجھا سکے کہ چونکہ غمخواری بھی ایک فن ہے

جسے اب سائنٹفک طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے پُرانے وقتوں کے اناڑی غمخواروں کے مقابلہ میں یہ لائسنس یافتہ حضرات بہرحال انسانیت کے دورِ ترقی کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا مستحقِ شکریہ۔ نہ مستوجبِ شکایت۔ اگر ان کی مساعیٔ جمیلہ کے باوجود مزدور کی حالت بہتر نہ ہو تو اسے اپنے مقدر سے گلہ کرنا چاہئے نہ کہ معالج کی فنی قابلیت میں شبہ!

سچ کہا ہے کسی نے کہ سرمایہ داری تو لعنت تھی ہی لیکن اس قسم کی اشتراکیت بھی کچھ کم لعنت نہیں!!

حسابِ بیباق

مقابل کُفر کے تھی وہ نمودِ اسلام کی اکبرؔ

مگر اَب انقلابِ دَہر سے باقی کہاں کافر

نصارٰی قبلۂ مقصود ہیں ہندو برادر ہیں

زمینِ شعر میں بس رہ گئی زُلفِ بتاں کافر

پیدائشی اچھوت

پچھلے دنوں مسٹر ساورکر، صدر ہندو مہا سبھا نے اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں فرمایا:۔

"ہم ہندو ان لوگوں کو ووٹ دے کر خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں جو علانیہ طور پر کہتے ہیں کہ وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اور ساتھ ہی وہ مسلم جماعتوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان سے راہ و رسم بھی رکھتے ہیں اور ہندوؤں کے نام پر ہندوؤں کے مفاد کے خلاف ان سے سمجھوتے بھی کرتے ہیں"

پتہ نہیں پوجیہ پردھان جی کو اس بات میں کونسی خطرے کی بو آئی۔ اگر ایک مسلمان اپنے آپ کو کہتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے تو یہ اعلان تو ایک ہندو کے لئے خوشی کا موجب ہونا چاہئے۔ اور اگر ایک ہندو یہ کہتا ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک ہندو ایک بار چھوڑ لاکھ بار کہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ وہ ہندو ہی رہے گا۔ ہندو مت اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ سند ملاحظہ ہو۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشت سوانح عمری کی جلد اول صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۳ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہندو مت کے دائرے میں بہت مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا۔۔۔۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارواک تھے) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں سے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔"

تو معلوم ہوا کہ مسٹر ساورکر کے لئے اصل خطرہ کی وجہ یہ نہیں۔ کہ یہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان نہیں ہوں۔ بلکہ حقیقی خطرہ جو ان کو یوں راتوں کو سونے نہیں دیتا یہ ہے کہ یہ لوگ مسلم جماعتوں کو تسلیم کیوں کرتے ہیں اور ان سے راہ و رسم کیوں رکھتے ہیں۔

سچ ہے۔ براہمن تہذیب کی رُو سے ملیکش ملیکش ہی رہتا ہے۔ خواہ لاکھ قوم پرست بنے۔

اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بُت سے خدا سمجھے

رفتار زمانہ

مصر میں انتخابات

آجکل مصر میں جدید انتخابات کی چہل پہل ہے اور یہ انتخابی دور مصر کی سیاست کا مرکزی نقطہ بنا ہوا ہے۔ گزشتہ انتخاب مئی ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا جسکے تحت مصری پارلیمنٹ نے زمام حکومت سنبھالی اور وفد پارٹی نے اپنی اکثریت کی بنا پر دستور کو ترتیب دیکر چلایا اور وادیٔ نیل میں ایک جمہوری حکومت قائم کرکے مصری سیاست کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔

چونکہ مصر میں وفد پارٹی کی بدولت جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لئے اسکو مزید تقویت پہونچانیکے لئے وفدیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مصطفےٰ نحاس پاشا وزیر اعظم نے گذشتہ تجربوں کی بنا پر پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جسکا مفاد یہ تھا کہ مصر کے دستور اساسی کا احترام حکومت کیلئے ضروری ہے اگر کوئی شخص دستور اساسی کے خلاف وزارت مرتب کردے تو اس پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے وزیر اعظم کا یہ طرز عمل گذشتہ تجربات اور آئندہ کے خطرات پر مبنی تھا کیونکہ شاہ فواد مرحوم کے زمانہ میں جمہوری رُوح کو کئی بار کچلا جا چکا تھا اور شاہ مرحوم نے تین بار دستور اساسی کو بالائے طاق رکھکر اور وزیر اعظم کو برطرف کرکے شخصی حکومت قائم کی تھی ۱۹۳۷ء کے اواخر میں مصطفےٰ نحاس کو پھر یہی خطرہ پیدا ہوا اور انہوں نے مندرجہ بالا مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کرنے کیلئے پیشقدمی کی لیکن اقلیت والی جماعت نے شاہ فاروق سے تبادلہ خیال کرکے اس مسودہ قانون کو پارلیمنٹ میں پیش نہ ہونے دیا اور شاہ نے وزیر اعظم کو برطرف کرکے پارلیمنٹ کو توڑ دیا۔ مصر کا دستور اساسی بغیر پارلیمنٹ کے تین ماہ تک چلتا رہا اور آئندہ انتخابات کیلئے مصر کی سیاسی جماعتوں نے میدان تیار کرنا شروع کر دیا۔

مصر کی تاریخ میں ۲ اپریل ایک تاریخی دن ہوگا کیونکہ اس روز مصر میں عام انتخابات کے نتائج منظر عام پر آجائینگے۔ چنانچہ انتخابات کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئی ہیں۔

مصری پارلیمنٹ کی ۲۶۴ نشستوں کیلئے ۶۰۸ امیدواروں میں زبردست مقابلہ ہو رہا ہے سابق وزیر اعظم مصطفےٰ نحاس پاشا نے وفد پارٹی کی طرف سے ۱۳۵ امیدوار کھڑے کئے ہیں اور ۱۱۶ اُمیدوار موجودہ مشترک حکومت نے کھڑے کئے ہیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ انتخاب میں وفد پارٹی کو شکست ہو رہی ہے اور مخالف پارٹی کے امیدوار کامیاب ہو رہے ہیں مصر میں وفد پارٹی

تمام سیاسی پارٹیوں پر ہمیشہ غالب رہی ہے مگر اس انتخاب میں معاملہ بالعکس نظر آتا ہے۔ اسکی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مصر کا مشہور ترین روزنامہ "البلاغ" جو وفد پارٹی کا ترجمان خصوصی اور نحاس پاشا کا زبردست حامی تھا وفدی جماعت کا مخالف ہو گیا ہے۔ اس نے اس مخالفت کی ابتداء برطانی۔مصری معاہدہ سے کی تھی اور مصطفٰے نحاس پاشا پر انگریزوں کے ہاتوں مصر کو فروخت کرنے کا الزام لگایا تھا۔ چونکہ یہ اخبار گھر کا بھیدی تھا اس لئے اس نے نہایت شدت کے ساتھ وفد پارٹی کی مخالفت کی اور اسکے خفیہ رازوں سے ملک کو آگاہ کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے وفدی جماعت کا اثر بہت کچھ زائل کر دیا اور لوگوں کی ہمدردیاں جو اسکے ساتھ قائم تھیں وہ سب ختم ہو گئیں یہی وجہ ہے کہ موجودہ انتخاب میں مصطفٰے نحاس پاشا کو سخت مشکلات پیش آرہی ہیں اور باوجود کوشش کے کامیابی کے آثار انکو بہت کم نظر آرہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وفدی جماعت میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ کچھ وفدی مصطفٰے نحاس پاشا کے ساتھ ہیں اور کچھ احمد ماہر پاشا کے ساتھ اگر احمد ماہر پاشا کے حامیوں اور محمد محمود پاشا (موجودہ وزیر اعظم) کے ساتھیوں کی اتنی تعداد منتخب ہو گئی کہ دونوں ملکر نحاس پاشا کے حامیوں سے بڑھ گئے تو وہ دونوں مل جائینگے۔ اور نحاس پاشا کے ہاتھ سے انتخاب ثانی تک حکومت نکل جائے گی۔

فرض کرو کہ وفد پارٹی کامیاب ہو گئی تو شاہ مصر کو دستوری حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑیگا اگر نہیں کرینگے تو تخت سے دستبردار ہونا پڑیگا اگر وہ ہار گئی تو شاہ مصر کے راستہ سے کانٹا ہٹ جائیگا۔ اور دستوری حکومت صحیح بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے گی۔

انتخابات کے سلسلے میں اس وقت تک (یعنی ۵ اپریل تک) جو اطلاعات موصول ہو چکی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ انتخابی دور خونریزی کے بغیر ختم نہ ہوگا۔ چنانچہ نحاس پاشا کے وطن طنطا میں فساد ہو گیا اور بقول ریوٹر مصطفٰے نحاس پاشا کے سات سو آدمیوں نے بہت سی دوکانوں کو لوٹ لیا اور برطانی قونصل خانہ پر حملہ کر دیا پولیس نے بہت سی گرفتاریاں بھی کی ہیں اور منفلوط میں کسی شخص نے پولیس چیف پر فائر بھی کر دیا اور چاقو سے بھی اسکو زخمی کرنے کی کوشش کی۔ زیریں مصر سے بالائی مصر کو فوج اور پولیس کے جتھے روانہ ہو گئے ہیں۔ ابھی تک پچاس اشخاص گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ قاہرہ کا تازہ ترین تار مظہر ہے کہ شمالی مصر کے انتخاب میں حکومت کو کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ اور فساد کے باعث ۴ اشخاص ہلاک ہو گئے ہیں۔ مانیہ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور مارا گیا۔ اور طنطا میں بہت سے آدمی زخمی ہوئے ہیں جنمیں ۲۵ پولیس کے سپاہی بھی شامل ہیں

طلباء مصر میں وحدت اسلامی

قاہرہ کی ایک اطلاع ہے جمعیۃ شبان المسلمین کی عمارت میں مسلم طلبا کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جامعہ ازہر۔ جامعہ مصریہ اور دیگر مدارس کے طلبا نے شرکت کی اور طلبا و علما نے اپنی تقریروں میں یہ حقیقت واضح کی کہ اسلامی اصول جغرافیائی حدود سے منزہ ہیں کائنات کا ہر گوشہ مسلمان کا وطن ہے اور ہر وطن ہمدردی اور حمایت کا مستحق ہے جامعہ مصریہ کے نمائندے نے اتنا اور اضافہ کیا کہ اسلام نے ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ کے پیش نظر دین اور دنیا کی سرحدیں جدا قرار نہیں دیں بلکہ یہ فرمایا کہ مسلمان کا ہر قدم اسلام کی سربلندی اور رفعت کے لئے ہونا چاہیئے۔ آج دنیا نظام سیاست کی کمزوریوں سے نالاں ہے اور بیتابی کے ساتھ ایک فطری قانون کی تلاش میں ہے۔ اس لئے علماء کو ان کی دستگیری کے لئے کوئی اہم قدم اٹھانا چاہیئے۔ اس کانفرنس میں ذیل کی قراردادیں منظور ہوئیں۔

(۱) ملک کی جماعت بندیوں کو ختم کر کے الٰہی نظام حکومت کی بنیاد پر ایک جماعت کی تشکیل کیجائے۔

(۲) بلاد عربیہ میں ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کیلئے کوشش کیجائے اور مغربی صنعتوں سے اجتناب کیا جائے

(۳) ممالک اسلامیہ سے روابط قائم کر کے وحدت اسلامی کی روح زندہ کیجائے۔

ترکی

ترکی حکومت اپنے اقتصادی نظام سے مطمئن ہو کر اپنا جنگی نظام مستحکم کر رہی ہے اور ایک نئے پروگرام کے تحت بری۔ بحری اور فضائی قوتوں میں بیش از بیش اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ایک امریکن کمپنی سے معاملہ طے کر کے حکومت ترکیہ نے اسلحہ کی خریداری کا انتظام کیا ہے۔ چند ہفتے پہلے امریکہ سے ہوائی جہاز بھی خریدے تھے۔ مگر جدید اسلحہ کی خریداری میں آبدوز کشتیوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ ترکی حکومت کا ایک امریکن ایجنٹ ترکی کے لئے فولاد اور ضروری سامان جنگ خریدنے میں لگا ہوا ہے۔ ترکی حکومت نے اپنے ہوائی بیڑے کو زبردست تقویت پہونچائی ہے اور ہوائی جہازوں کی تعداد ایک ہزار تک پہونچا دی ہے۔ اس سال کے لئے حکومت نے صرف ہوائی جہازوں پر خرچ کرنے کے لئے ساڑھے تین کروڑ ڈالر منظور کئے ہیں اسکے علاوہ جرمنی کا کارخانہ کروپ رور زکوسلاواکیہ کا کارخانہ سکوڈا اس وقت دردانیال کے فوجی قلعوں کے لئے سامان جنگ بنانے میں مشغول ہیں اور خود ترکی بھی اپنے یہاں فولاد کے کارخانہ قائم کر رہا ہے۔ استنبول میں آبدوز کشتیوں کے کارخانہ رات دن چل رہے ہیں۔ اور اس نے حال ہی میں حکومت کو دو آبدوز بنا کر دیئے ہیں

چند روز ہوئے انگورہ میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں ریاستہائے بلقان کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حبش پر اٹلی کا اقتدار تسلیم کرلیا گیا۔ اور اس کے جواب میں اٹلی نے دردانیال پر ترکی کا حق تسلیم کرلیا۔ کانفرنس مذکور میں غازی کمال پاشا نے ایک تقریر بھی کی جس میں بلقانی اتحاد کو امن وسلامتی کیلئے ضروری قرار دیتے ہوئے اپنے فوجی نظام کی اہمیت بتائی اور فرمایا کہ ہم موجودہ سیاسیات سے علیحدہ رہ کر ہر حکومت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اور اپنی داخلی آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے ضرورت سے غافل نہیں ہیں اگر دنیا کی کوئی حکومت ہم سے چھیڑ چھاڑ کریگی تو ترکی کا بچہ بچہ اسکا مقابلہ کرنے کیلئے میدان میں نکل آئیگا۔ اگر ہم اقدام کو پسند نہیں کرتے تو مدافعت سے بھی گریز نہیں کرینگے۔

ترکی کے مندرجہ بالا حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ترکی حکومت یورپ کی سیاسیات سے بے خبر نہیں ہے اور نہ اسکو معاہدوں پر کسی قسم کا اطمینان ہے وہ خود اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر دوسروں کا احترام کرنا چاہتی ہے اور جنگ عظیم کے بعد اسکو سب سے بڑا سبق یہی ملا ہے کہ اپنی قوت کے بعد دوسروں سے تعاون کرنا چاہئے۔

فلسطین

ارض مقدس فلسطین میں ابھی تک شورش برپا ہے اور روزانہ مسلح عربوں اور برطانی فوج میں مڈھ بھیڑ ہورہی ہے۔ یہودی عربوں کی جان لے رہے ہیں اور عرب ظالموں کو باہر نکالنے کیلئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں، فوجی عدالتوں سے عربوں کو پھانسی کی سزا مل رہی ہے حملہ آوروں پر طیاروں سے بم برسائے جارہے ہیں۔ قصبات و دیہات پر تعزیری ٹیکس لگادیئے گئے ہیں اور عرب ججوں اور قاضیوں کو برطرف کیا جارہا ہے۔ دوسری طرف عرب بھی برطانی فوج اور یہودی آبادیوں پر حملے اور برقی تار اور ٹیلیفون کے سلسلے منقطع کررہے ہیں غرض ایک سال پہلے جو حالت تھی وہ اب بھی باقی ہے اور ارض انبیاء سے امن وامان مفقود ہوگیا ہے۔ اس سلسلہ میں عرب جو کچھہ کررہے ہیں وہ بدرجہ مجبوری ہے کیونکہ وہ اپنے وطن پر یہودیوں کے تسلط کو برداشت نہیں کرسکتے اور جب سے فلسطین کو تقسیم کرنے کی اسکیم تیار ہوئی ہے وہ مایوس ہوکر کھلم کھلا مقابلہ پر آگئے ہیں۔

خیر یہ تو سب کچھہ ہو ہی رہا تھا مگر حکومت برطانیہ نے حال ہی میں عربوں کے خلاف جو قدم اٹھایا ہے وہ فلسطین کی مجلس الاسلامی الاعلیٰ کا تعطل ہے۔ حکومت کو معلوم تھا کہ یہ مجلس عرب اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اسلامی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس نے گذشتہ سات سال میں عالم اسلامی کو فلسطین کی طرف متوجہ کرنے کا زبردست فرض انجام دیا ہے۔ اور جب تک اسکا وجود باقی ہے اور آزاد مسلمان اسکے نگراں ہیں اسوقت تک فلسطین سے مسلمانان عالم کا رشتہ منقطع نہیں ہوسکتا چنانچہ

اس نے بطور آخری تدبیر کے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

گذشتہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سید امین حسینی مفتی اعظم فلسطین کو دینی قیادت سے محروم کرنے کی غرض سے صدارت سے معزول کر دیا گیا اور مجلس اسلامی کو، جسکے تحت لاکھوں روپیہ سالانہ کے اوقاف ہیں اور جنکی آمدنی سے واعظین و مصلحین اور محاکم شرعیہ کے قضاۃ کا تقرر عمل میں آتا تھا، ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جسکے ارکان میں سے دو رکن انگریز ہیں۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے جو کام انجام دیا وہ اسلامی اوقاف پر تسلط تھا چنانچہ اوقاف پر قبضہ کیا گیا۔ اس کے مخصوص معاملات پر سرکاری نگرانی قائم کر دی گئی اور اس کے عہدہ داروں کو برطرف کر کے اس میں سرکاری افسر متعین کر دیے گئے۔

اس کے بعد صرف یہی نہیں کہ محاکم شرعیہ اور محکمہ اوقاف سے دس عہدیداروں کو برطرف کر دیا گیا ہو۔ بلکہ ان کی جگہ اپنی گوں کے عہدیدار رکھے گئے۔ اور اوقاف کے میزانیہ میں جابرانہ دراندازی کی گئی اور ان سب سے زیادہ خطرناک اقدام یہ ہے کہ محاکم شرعیہ کو مجلس الاسلامی الاعلیٰ سے ہمیشہ کے لئے جدا کر کے برطانی عدالتوں سے ملحق کر دیا گیا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام کی قوت تشریع مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مستعمرین کے ہاتھوں میں چلی گئی — اور مسلمان قاضی حکومت انتداب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے۔ کہ ان کو حکومت جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محاکم شرعیہ کے جو قاضی برطرف کئے گئے تھے انکو حکومت نے الزام لگا کر عکا کی جیل میں بند کر دیا ہے اب اسکے بعد فلسطین کا اسلامی اور مذہبی شعبہ حکومت کے قبضہ آگیا ہے اور یہ ثبوت ہے حکومت کے اس دعوی کا کہ "وہ مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی"!۔

اس کے بعد حکومت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ کہ اس نے مجلس الاسلامی الاعلیٰ کا دفتر مسجد اقصیٰ کے پہلو سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے۔ تاکہ جو مسلمان اس میں آنا چاہے۔ وہ سرکار سے اجازت لیکر آئے اور مسجد اقصیٰ سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہے

یمن اور اٹلی حکومت یمن کو اٹلی کی طرف سے زبردست خطرہ ہے اور بحر سویز پر اٹلی کے نئے مطالبہ نے یہ اندیشہ اور قوی کر دیا ہے چنانچہ یمن کے ساحل پر جنگی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ اور ایسی خندقیں کھودی جا رہی ہیں۔ جن میں بیک وقت بیس ہزار سپاہی قیام کر سکیں۔ ان خندقوں کو ضروری سامان سے لبریز کر دیا گیا ہے۔ بالائے عرب سے پندرہ ہزار بے قاعدہ بدو یہاں پہونچ گئے ہیں۔ اور ان سے دو فوجی دستے تیار کر لئے گئے ہیں۔

باب المندب کے اطراف کی پہاڑیوں کو مستحکم کرلیا گیا ہے اور اس وقت ہزاروں مزدور شبانہ روز باؤلیاں کھودنے اور سڑکیں بنانے میں مصروف ہیں یہ سڑکیں دار لحکومت ضعاء کو یمن کی عظیم الشان بندرگاہ حدیدہ سے ملا دینگی۔ مساجد میں واعظین کرام لوگوں کو ہدایت کر رہے ہیں کہ اگر اٹلی ساحل ارٹیریا سے یمن پر حملہ کردے تو وہ زہریلی گیس سے محفوظ رہیں

اس کے ساتھ ولی عہد یمن نے ایک برطانی کارخانہ کو بارود اور گولیوں کے لئے آرڈر دیا ہے۔ اس میں دس گولہ باری کرنے والی بڑی توپیں بھی شامل ہیں۔

امام یمن نے حکومت عراق سے فوج طلب کی ہے۔ تاکہ وہ وقت ضرورت ساحل یمن کی حفاظت کر سکے۔ یمن کے معاملہ میں اٹلی کی بدنیتی کا حال اس سے معلوم بھی ہو سکتا ہے۔ کہ عدیس ابابا (حبش) سے اطالوی حکام نے یمن کے چند عربوں کو نکل جانے کا حکم دیدیا ہے اور باقی یمنیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشہ اور نام درج رجسٹر کرائیں! اس کے جواب میں یمن میں بھی اطالوی باشندوں کو اپنے پاسپورٹ دکھانے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اور پولیس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس اطالوی باشندہ کو چاہیں یمن سے نکال دیں۔

مہاپاپ

کانگرسی صوبوں میں ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے لکھا ہے، کانگرسی حکومت برطانوی حکومت کا کچھ اچھا بدل ثابت نہیں ہوئی کیونکہ فسادات کو روکنے کے لئے انھیں تشدد کا استعمال کرنا پڑا ہے۔ جو مہاپاپ ہے۔ غالباً گاندھی جی کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فوج کا شعبہ حکومت برطانیہ نے اپنے پاس ہی رکھا ہے۔ پولیس کا شعبہ بھی اسی طرح اپنے ہی پاس رکھتی تو اچھا تھا تاکہ ایسے فسادات کو روکنے کے لئے جب قوت کا استعمال کرنا پڑتا تو اس کا پاپ انگریزوں کے سر ہوتا۔ کانگرسی وزراء کے سر نہ ہوتا۔ ہندی سیاست کی لغت میں اہنسا (عدم تشدد) کی تعریف یہ لکھی ہے کہ گائے کے سینگ تو انگریز پکڑے رہیں اور اس کا دودھ ہندو دوہتے رہیں۔ تاکہ پاپ کے ذمہ دار دوسرے لوگ ٹھہریں اور اس کا منافع یہ حضرات اُٹھاتے رہیں۔ جس طرح گئو ہتیا کے مجرم تو بیچارے چار ہوتے ہیں اور چمڑے کی تجارت کے مالک تمام بھلے اور بابو جی کہ جن کے آسرے گئو رکھشا سبھائیں چلتی ہیں۔

کشتِ خیال

"مفکر"

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گُل

اسلام چونکہ بنی نوع انسان کے لئے مکمل ترین اور آخری دستورِ حیات پیش کرتا ہے۔ یہ فطرتاً اُن تمام تحریکوں کو اپنے اندر احاطہ کئے ہوئے ہے جو انسان کی حقیقی بھلائی کے لئے آج تک جاری ہوئیں یا آئندہ ہونگی یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں بہبُود خلائق کی جو بھی نئی تحریک اُٹھتی ہے اُس کے کچھ نہ کچھ اصول اسلام سے ضرور مطابقت رکھتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مُسلمان اسی قسم کی ذرا سی بھی تائید پا کر اُس تمام تحریک کو اسلام کے ہم آہنگ تصوّر کر لیتے ہیں اور نئی تحریک کے تازہ جوش کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ یہ نہیں خیال کرتے کہ ایسی تحریکوں کے بانیوں کی محدود نظر انسانی زندگی کے بعض مخصوص پہلوؤں ہی پر ہوتی ہے اس لئے اُن کے پیش کردہ اصول بالعموم انہی پہلوؤں کے متعلق مبالغہ آمیز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے خداوندی نظام کے اندر ایک ایسا تناسبُ توازن قایم کر دیا گیا ہے جس کا ذرا بھی درہم برہم کرنا افراط و تفریط کے خطرات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نئی تحریک کا جایزہ لیتے وقت مُسلمان نظام قرآنی کے اس اعتدال و توازن کا لحاظ رکھ لیا کریں تو بہت سے فتنوں کی راہ بند ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کے سلسلے میں ایک جماعت کی طرف سے یہ کوشش جاری ہے کہ کہ اُردو یا ہندوستانی زبان سے غیر ملکی زبانوں بالخصوص عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کر کے ملک کی قدیم زبان سنسکرت کے الفاظ بھرے جائیں اور اس طرح اُردو یا ہندوستانی کو شدھ کر کے ہندی بنا لیا جائے لیکن شاید یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ خود "ہندی" بھی تو عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ اس لئے اس ادبی شُدھی کی تحریک کا سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ لفظ "ہندی" کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے!

عیسائی مستشرقین جو بظاہر اپنی عمریں اسلامی علوم کے لئے وقف کر دیتے ہیں عام طور پر اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح قرآن کی تعلیمات کا تجزیہ کر کے اُنکی ایسی نفسیاتی علتیں پیدا کریں جن سے یہ وحی و الہام کے بلند مقام سے اُتر کر عام سطح پر لائی جا سکیں۔ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں بعض اوقات مضحکہ انگیز صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ مثلاً ایک بلند پایہ مستشرق نے اسلام کے اصولِ توحید کی توجیہ اس طرح فرمائی ہے کہ عرب

کی منظری یکسانی اور صحرائی یکرنگی دلوں میں ایک خدا کا خیال پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ اگر یہ بات تھی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ توحید کی آواز عرب کی طرح آسٹریلیا کے ریگستانوں اور افریقہ کے صحراؤں خصوصاً صحرائے اعظم سے کیوں نہ بلند ہوئی اور خود عرب میں بھی اسلام سے پیشتر اس کا چرچا کیوں نہ ہوا۔ کیا یہ صحرائی یکرنگی اور منظری یکسانی آنحضرت صلعم کی بعثت کے ساتھ یکایک پیدا ہو گئی تھی؟ کیونکہ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ اس سے پیشتر خود کعبہ کے اندر اتنے بُت موجود تھے۔ جتنے کہ ایک سال کے دن ہوتے ہیں۔

کیا انسان کے لئے اپنے طبعی رجحانات کو اقتضائے فطرت سمجھ کر رہبر حیات بنا لینا چاہیئے۔ یا ان کو کسی اور معیار سے جانچ لینا ضروری ہے؟ اس بارے میں اسلام کا فیصلہ تو صاف ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اس قدر تعلیم و ترقی کے باوجود مغرب کی مادی تہذیب ابھی تک کسی خاص نتیجہ تک نہیں پہنچ سکی۔ کیونکہ دیکھا یہی گیا ہے کہ بعض امور میں تو انسانیت کا خاص تصور پیش کر کے فطرت کا مقابلہ کرنے کا درس دیا جاتا ہے۔ مثلاً ضبط تولید اور بعض باتوں میں حیوانوں کی پیروی کرنے کو عین اتباع فطرت ٹھیرایا جاتا ہے۔ مثلاً تحریک عریانی

ہندوستان میں دیہات کی مسلمان عورتیں بالعموم پردہ نہیں کرتیں۔ اور کام کاج میں مردوں کا ہاتھ بٹانے کے لئے آزادانہ باہر پھرتی ہیں۔ لیکن ان کی بے پردگی کے متعلق کبھی آواز بلند نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس شہروں میں عورتوں کی آزادی اور بے پردگی ہمیشہ ہدف ملامت بنی رہتی ہے۔ اس امتیازی سلوک کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ دیہاتی عورتیں کسی عذر و علت کے احساس کے بغیر ضرورتاً پردہ نہیں کرتیں اور شہری عورتوں میں مغربی تہذیب کے زیر اثر بے پردگی اختیار کی جاتی ہے اور پھر اس کی ضرورت ثابت کرنے کی کوشش میں اخلاقی نفسیات اور حفظان صحت کی بے سروپا دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ مذہب کی آڑ لینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔

حسنِ تدبیر

ہندوستان میں متحدہ قومیت بنانے کی اہم ترین وجہ یہ قرار دی جاتی ہے کہ اس سے یقیناً انگریز ہندوستان سے بھاگ نکلیں گے۔ خدا بخشے مرزا غالب نے بھی ایک اسی قسم کی تجویز سوچی تھی۔ فرماتے ہیں

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

مقصد تو انگریز کو بھگانے سے ہے۔ اس کے لئے جو ذریعہ بھی اختیار کیا جائے جہاد کہلائے گا۔ میکیاؤلی نے ایسے ہی مقامات کے لئے تو یہ نظریہ وضع کیا تھا کہ "حصول مقاصد کے لئے جو ذرائع بھی اختیار کئے جائیں۔ مباح ہوتے ہیں۔" (Means are justified by the ends achieved)

مشرق اور مغرب اس طرح آپس میں ملتے ہیں!!!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکز ملت ← [لا الٰہ الا اللہ
محمد الرسول اللہ] → مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین اٰمنوا

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم	اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا
مانو بات اللہ و رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے	اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

یعنی

مرکز۔ مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار — لا اسلام الا بالجماعۃ

(فرمان رسول) — (قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

طلوع اسلام کا

مسلک۔ جیسا کہ پہلے پرچہ میں بالوضاحت بتایا جا چکا ہے طلوع اسلام کا مقصد حضرت علامہ اقبال کے پیام حیات بخش کی اشاعت ہوگا جسکا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا جائے مفکرین عالم کے سامنے اس حقیقت کبریٰ کو بے نقاب کیا جائے کہ عالمگیر امن فلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دنیا کا نظام زندگی وہ ہو جو خدا کے اس آخری ضابطۂ حیات میں مرتب کر کے دیا گیا ہے۔ اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں یہ یقین راسخ کیا جائے کہ دنیا علم و بصیرت کی جن بلندیوں تک چاہے پہنچ جائے۔ قرآن کریم اس سے بھی کہیں آگے نظر آئیگا۔

نظام۔ طلوع اسلام کے نظام کے متعلق بھی اعلان کیا جا چکا ہے کہ یہ پرچہ کسی فرد کی ملکیت نہیں بلکہ تمام ملت اسلامیہ کا متہ کہ پرچہ ہے۔ اسکا نظم و نسق ایک ایسی جماعت سے متعلق ہے جسکے ارکین نے محض اللہ کے لئے اس فریضہ کو اپنے ذمہ لیا ہے انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس پرچہ کے خسارہ کو پورا کرتے جاینگے لیکن اسکے منافع میں سے کوئی شخص ایک پائی بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھیگا گذشتہ سال بعض مخلص احباب نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ طلوع اسلام کو پائدار بنیادوں پر قایم کرنے کیلئے ایسے ایثار پیشہ معاونین پیدا کئے جائیں جو ۲۵ عہ یکمشت ادا کر کے اس کی سرپرستی فرماتے رہیں اور رسالہ کو مستقبل کے خطرات سے نجات دلاویں۔ دائرہ طلوع اسلام نے اس مقدس تحریک کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ تجویز کیا ہے کہ اس طرح جب تین ہزار روپیہ جمع ہو جائے تو اس کو محفوظ سرمایہ قرار دیکر اطمینان کے ساتھ رسالہ کی ترقی کے وسائل اختیار کئے جائیں تا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں اب تک تیرہ سو روپے کے وعدے ہو چکے ہیں جن میں سے چھ سو روپیہ وصول بھی ہو چکا ہے۔ انشاءاللہ دائرہ طلوع اسلام کی کوششیں برابر جاری رہینگی یہاں تک کہ تین ہزار کا محفوظ سرمایہ جمع ہو جائے۔ لہذا

جو حضرات

اس جماعت کی رکنیت پسند فرمائیں وہ پچیس ۲۵ روپے یکمشت یا بالاقساط ادا فرما کر ان خدمتگزاروں کے حلقہ میں شامل ہو جائیں رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (دائرہ طلوع اسلام دہلی)

حضرتِ علامہ اقبالؒ علیہ الرحمہ نے اپنی وفات سے دس منٹ پہلے حسبِ ذیل قطعہ پڑھ کر اپنے
سفرِ آخرت کی اطلاع فرما دی

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام دہلی

(دورِ جدید)

مدیر		
مسئول حکیم ذکی احمد خاں	بدل اشتراک	فی پرچہ
معاون محمد عثمان	پانچ روپیہ سالانہ	۸ر
جلد ۱	شمارہ ۲	بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

لمعات

کیا خبر تھی کہ "طلوع اسلام" جس اسلامی مفکر کے فلسفۂ حیات کا صور پھونکنے، اور مسلمانوں کو صحیح اسلام سے روشناس کرانے کے لیئے میدان میں نکلنے والا ہے، وہ علم و عرفان کی دُنیا کو یتیم اور غمزدہ چھوڑ کر خدائے کون و مکاں کی لقا رکے لیئے بے تاب بیٹھا ہے اور مادی قبا کو تنِ نورانی سے اُتار پھینکنے پر تُلا ہوا ہے! سچ یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال مرحوم و مغفور کو فان اجل اللّٰہ لآت کی نے اتنی پیاری لگی کہ پیاسی دُنیا کو سیراب کرنے کا خیال ہی نہ رہا اور شیفتگی اور وارفتگی کے عالم میں اتنے تیز قدم اُٹھائے کہ علم و فکر کی آبادی اس نقیب زندگی کو دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی مرحوم کو خیال ہی نہ رہا کہ فطرت کی نجتانشیں کن اُمور کی منتظر ہیں اور علم و حکمت کو ابھی اُنکی کس قدر ضرورت ہے۔ حقیقت میں یہ عاشق رسول، یہ حکیم اسلام۔ یہ علم و معرفت کا بحر قلزم اور اسلام کا یہ بے مثال فلسفی من کان یرجو القار اللّٰہ فان اجل اللّٰہ لآت کی صبر شکن صدا کو سُنکر کب تک صبر کرتا؟ اُسنے غیب سے یہ صدا سُنی، لبیک کہا اور علم و حکمت کو روتا ہوا اور خود مُسکراتا ہوا اپنے محبوب کے پاس چلدیا!

مرحوم نے اپنے عزیب خانہ پر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صُبح کو ۵½ بجے انتقال فرمایا اور جس خوف سے ساری عمر مسلمانوں کو بے خوف کرتے رہے اُس سے یہ کہہ کر۔

"مَیں مسلمان ہوں اس لیئے خوشی سے موت کا استقبال کرتا ہوں"!

بغلگیر ہوگئے اور اپنے آخری وقت میں بھی دُنیا کو اسلام کی تفسیر بتا دی!

آپ کی وفات سے نہ صرف مشرق کی تابندہ و پایندہ شاعری کو نقصان پہونچا ہے۔ نہ صرف علم و حکمت کی دُنیا یتیم ہوگئی ہے نہ صرف اجتماعی زندگی کی شمع گُل ہوئی ہے بلکہ انسانی ضمیر کا

وہ احساس گم ہوگیا ہے جو وحدۃ انسانی کی بنیاد رجائیت وعمل کی اساس اور فکرِ حیات کا سرچشمہ تھا،
مرحوم ومغفور اقبالؔ نہیں نہیں عزائم وخودداری کے پیکرِ نورانی ۔ اُردو شاعری کے باعث
ہندوستان میں اور فارسی کلام کے باعث دُنیا کے گوشہ گوشہ میں متعارف ہیں اور ہر شخص
اُنکے خیالات ، نظریات سے اُنکے کمالات علمی کا اندازہ لگا سکتا ہے اور گو انھوں نے اپنی عمر کا
بیشتر حصّہ لاہور میں گزارا اور ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کہلائے مگر حقیقت میں وہ کسی
ایک ملک ، کسی ایک قوم اور کسی ایک دَور کی شخصیت اور ملکیت نہ تھے بلکہ وہ دَورِ حاضرہ کی
انسانیت کے امانت تھے وہ حکیم تھے اُن کی تشخیص درست تھی اور بیماری کے اسباب کو اچھی طرح سمجھتے
تھے اور انھوں نے انسان کی مصیبتوں کا جو علاج تجویز کیا تھا اُس کی بنیاد بھی انسانیت اور ضمیر کی
آواز تھی ۔
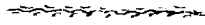
اقبالؔ کا خزانہ علم وحکمت عام ہے ۔ دُنیا تیس سال سے اُنکے موتیوں سے اپنے دامن بھرتی
رہی ہے اور خدا جانے کتنی سعید روحیں ہیں جنھوں نے اقبالؔ کے پیام کو سُنا اور انکے نظریاتِ اسلام
کے اس سانچہ میں ڈھل گئے جس سے بہتر فطرت نے کوئی دوسرا سانچہ تیار نہیں کیا ہے گو شاعری
کا اعلیٰ سے اعلیٰ تصور اور بہتر سے بہتر تخیل بھی مرحوم کے مخصوص علم کلام کا آئینہ دار نہیں ہوسکتا تاہم انکی
بے مثال شاعری نے جس طرح اسلامی ضمیر کی تشکیل کی ہے اور موجودہ مذہبی اور سیاسی ماحول پر
اسلام کے فلسفہ کو جس بلندی پر پہونچایا ہے اس کی مثال موجودہ صدی میں ملنی محال ہے ۔
اقبالؔ ، ہمیشہ مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار رہے ۔ انکا ایمان تھا کہ جب
تک مسلمان دورِ اول کی زندگی کو اختیار نہیں کرینگے اور کتاب وسُنت کو اپنے عمل وفکر کی بنیاد قرار
نہیں دینگے ۔ اسوقت تک انکو نہ مغرب پرستی تباہی سے بچاسکتی ہے اور نہ یورپ زدگی انکے
کی دوا ہوسکتی ہے ۔ چنانچہ وہ ساری عمر اسی فلسفۂ حیات کا درس دیتے رہے اور یہی سرچشمہ ان
مسلم کی زندگی میں نظر آتا رہا ۔ اسی لیئے وہ مسلم بنکر جیئے ۔ مسلم بن کر میدان میں آئے اور مسلم بن

واصل بحق ہوئے اُنکے نزدیک زندگی کا راز، فلسفۂ حیات کا نکتہ، اور عظمت و کامرانی کا جوہر کتاب الٰہی کے صرف اُس ٹکڑہ میں پوشیدہ تھا

رب توفنی مسلما والحقنی بالصّالحین

اے پروردگار! مجھے مُسلم بنا کر اُٹھا اور صالحین کی معیت نصیب کر!
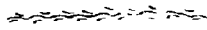
مرحوم کا دائرہ خدمت سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ انھوں نے دُنیا کو اجتماعی زندگی کا درس عمل دیا۔ رجائیت اور خودداری پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی، زندگی کے جذبات میں تلاطم پیدا کیا، دماغوں کو رفعت اور بُلندی بخشی، قوم کی ذہنیت اور مزاج میں ایسا انقلاب پیدا کیا جو آئندہ ایک عرصہ تک ہر اصلاحی تحریک میں بُنیادی عنصر کا کام دیتا رہے گا،

اقبال کا عقیدہ تھا، اور کون اسلام کا عارف اور حکیم ہے جو اس کا قائل نہ ہو کہ اسلام میں اتنی وسعت، اتنی ہمہ گیری اور اتنی صلاحیت موجود ہے کہ جو قوم اپنے نظام حیات کو قرآن حکیم کے سپرد کر دے گی قرآن زندگی کے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرے گا اور قوم کا مزاج عقلی اس سے تقویم پاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی کے کسی نظام سے مطمئن نہ تھے اور دنیا کی کوئی غلط تحریک اُنکے دماغ کو متاثر نہ کر سکی۔ اُنکے نزدیک زندگی کا مکمل نظام اور ضابطۂ حیات صرف اسلام ہے اور بلا شبہ جو شخص بھی مرحوم کی سی گہری نظر رکھے گا وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔
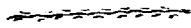
مثل مشہور ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی قدر ہوتی ہے مگر مرحوم اس کُلیہ سے مستثنیٰ ہیں آپ کو اپنی زندگی میں رفعت وعظمت کا وہ بُلند مقام حاصل ہوا جو صرف آپ ہی کے لئے مقدر تھا آپکا کلام نہ صرف انگریزی میں بلکہ یورپ کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا اور اس سے مغرب کے دانش فروشوں نے انسانیت، عزم، خودداری اور رجائیت کے سبق سیکھے۔ اگرچہ مغرب کو معلوم تھا کہ

اقبال مغرب کے مادی رجحانات کے سخت مخالف ہیں اور وہ اسلام کے عملی نظریہ کے مطابق اور مادیت کا صحیح امتزاج چاہتے ہیں تاہم انکے فلسفہ حیات کی تشریح نے مغربی مفکرین کے فکر کو جلا بخشی اور انکو کلام اقبال کے صدقہ میں زندگی کا راز معلوم ہوا۔

اقبال کبھی اپنی زندگی میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، پان اسلامزم کے خلاف فرانس کا پروپیگنڈہ آپ کے اسلامی جسم میں وحدۃ اسلامی کی نئی اور تازہ روح پھونک دیتا ہے وطنیت اور قومیت کا وہ فرنگی تصور جسنے اسلامی ممالک کے بڑے بڑے اسلامی مفکرین تک کو اپنے چنگل میں پھنسایا ہے وہ اس سے ذرّہ برابر بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ ساری عمر ان بتوں کو توڑنے میں گزاری یہاں تک کہ میر مسلم یورپ کا سفر کرتا ہے اور وہاں سے اسلامی حرارت لے کر واپس ہوتا ہے حالانکہ یورپ ہی وہ مقام ہے جہاں جاکر بڑے سے بڑے متقی کا قلب و دماغ کمزور ہوجایا کرتا ہے، مگر اقبال اس امتحان میں بھی ثابت قدم رہتا ہے اور یورپ کے طواف سے اس کا اسلامی دماغ اور پختہ ہوجاتا ہے۔
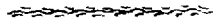
غرض علامہ اقبال مرحوم و مغفور اقوام مشرق کے لیے اپنے کلام میں فکر و حیات کی وہ آگ سلگتی چھوڑ گئے ہیں جس سے قومیں زندگی اور قوت کی حرارت حاصل کرتی رہیں گی۔ کیونکہ وہ ایک معلم و مفکر ہی نہ تھے، بلکہ انسانی ضمیر کے محرک بھی تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ جب تک علم و حکمت باقی رہے گا جب تک انسانیت کے احترام کا جذبہ سینوں سے ابلتا رہے گا جب تک ملوکیت اور حکمرانی کی اصلاحی تحریکیں جاری رہیں گی اسوقت تک اس حکیم اسلام اور مصلح اعظم کی یاد بھی تازہ رہے گی!

بقول اخبار "اسٹیمن" اقبال کے نقدان سے ہم فقیر ہوگئے ہیں مگر انکے زندہ کلام نے ہم کو اس قدر غنی کردیا ہے کہ ہم ہمیشہ دارائی اور سکندری کرتے رہینگے۔

اے خدا مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازیے اور اپنے بندوں کے اس محبوب بندہ کو اپنی محبوبیت

اور مغفرت کی چادریں ڈہانک دے اور جملہ متعلقین کے قلب حزین پر صبر جمیل کا القا فرما آمین ؎

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(اقبالؒ)

مئی کا طلوع اسلام انتظامی سہولتوں کے خیال سے اپریل کے وسط میں ہی شایع ہوچکا تہا کچھ پرچے باہر جاچکے تھے اور کچھ باقی تھے کہ مرحوم کے انتقال کی خبر پہنچی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خبر سے قلوب پر کیا گزری اور کیا کیا خیالات پیدا ہوئے مگر دل کو تھام کر "نالہ یتیم" کے عنوان سے مرحوم کے انتقال کی خبر علیحدہ چھپوائی گئی اور مئی کے جو پرچے دفتر میں موجود تھے اُنکے ساتھ لگادی گئی۔

اس سلسلہ میں بعض احباب کا خیال تہا کہ طلوع اسلام کا آئندہ پرچہ (یعنی جون کا موجودہ پرچہ) اقبال نمبر ہونا چاہیئے مگر چونکہ طلوع اسلام آپ ہی کی یادگار ہے اسلیئے اسکا ہر پرچہ گویا اقبال نمبر ہے اور اسوقت کسی خاص نمبر کی ضرورت نہیں ہے گو حضرت علامہؒ کے متعلق ساری عمر لکھا جائیگا مگر پورے انتظام کے ساتھ جو خاص نمبر نکالیں گے وہ انشاءاللہ اقبال نمبر ہی ہوگا۔

اگر مسلمانوں نے علامہؒ کی مستقل اور پائدار یادگار قایم کرنے میں عجلت نہ کی اور اُن کی شایان شان کوئی نشانی آئندہ نسلوں کے لیئے نہ چھوڑی تو طلوع اسلام کے اقبال نمبر سے کچھ نہ بنے گا اور یہ مسلمانوں کی نہیں علم و حکمت کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی۔ اگر اسلام کے اس حکیم یگانہ کی کوئی یادگار قایم نہ ہوئی۔

اقبالؒ کی یادگار کے سلسلہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کمیٹی لاہور میں قایم کی گئی ہے اس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، انگریز سب ہی شامل ہیں جس سے مرحوم کی مقبولیت اور محبوبیت

کا پتہ چلتا ہے۔ اس کام کا آغاز پنجاب سے ہونا چاہیئے اگر صوبہ کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں اور پنجاب کے دیگر مسلم دوست اس کام کو انجام تک پہنچانے کا تہیہ کرلیں تو یقیناً ہندوستان میں مرحوم کی ایک بے مثل یادگار قایم ہوسکتی ہے ہم انشا اللہ اس سلسلہ میں آئندہ مفصل گفتگو کریں گے
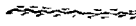
ذرا تصور میں لایئے اس کیفیت کو کہ آپ کسی بیابان صحرا میں راہ گم کردہ کھڑے ہوں منزل کا کہیں نشان نہ ملے چاروں طرف کوسوں تک کسی ذی روح کا پتہ نہ چلے۔ شام کا سناٹا آنیوالی شب تیرہ و تار کی بھیانک سیاہی کو دامن صحرا پر پھیلا رہا ہو۔ واہمہ کے عفریت پھلائے ہر طرف سے ڈرا رہے ہوں ایسے میں کہیں دُور سے کسی انسان کی ایک مبہم سی آواز آپکے کانوں میں آ پہونچے۔ جو کیفیت آپ کے قلب کی اسوقت ہوگی کچھ اسی قسم کی اضطرابی کیفیت کے آئینہ دار وہ خطوط اور پیغامات ہیں جو ہمیں قارئین کرام کیطرف سے طلوع اسلام کے پہلے ہی پرچے کے مطالعہ کے بعد موصول ہوئے ہیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا یہ راہ گم کردہ۔ مایوس قافلہ ہر اُس آواز کے لیئے ہمہ تن گوش ہونے کے لیئے بیتاب ہے جس میں کچھ بھی اُمید کی جھلک نظر آئے۔ یہ علامات بڑی جراءت آفریں ہیں۔ اس سے پیشتر تو یہ حالت تھی کہ متاع کارواں لٹ جانے کے بعد۔ کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا تھا لیکن اب اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احساسِ زیاں پھر سے پیدا ہو رہا ہے اور یہی احساس ہے جو ایک قوم کے اجزائے پریشاں کو ایک مرکز پر لانے کا اولیں ذریعہ ہوتا ہے اس اضطرابی کیفیت کا اس سے اندازہ فرمایئے کہ کسی نے پوچھا ہے کہ صاحب! سب باتوں کو چھوڑیئے اور یہ بتایئے کہ ہمارے لیئے راہِ عمل کونسی ہے کسی نے دریافت کیا ہے کہ یہ کہئیے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ایک اتنی بڑی غیر مسلم اکثریت میں گھیری ہوئی ہے مسلمانوں کا طرزِ عمل دوسروں کے ساتھ کس قسم کا ہونا چاہیئے کسی نے سوال کیا ہے کہ اگر غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا تولّی جائز نہیں تو پھر باہمی تعاون و اتحاد کی کونسی شکل ہے۔ کسی کا استفسار ہے کہ جب دینِ فطرت یوں عجمی افسانوں کی وجہ سے ایک چیستاں بن چکا ہے تو حقیقی اسلام کا اب کیسے پتہ چلے گا

غرضیکہ اسی قسم کے گوناگوں سوالات ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قوم کے دل میں صحیح راستہ کی تلاش کے لیے کتنی بڑی تڑپ اور خلش موجود ہے۔ ہمیں ان مستفسرین حضرات کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے لیکن ہم گزارش کرینگے کہ وہ اپنے وفور شوق کو تھوڑی سی زحمت انتظار اور دیں۔ طلوع اسلام کا نصب العین ان تمام سوالات کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ آپ اگر اسے شرف نظر بخشتے رہے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ محسوس کرینگے کہ آپکے وہ تمام شکوک و شبہات جو آپکے دل کی گہرائیوں سے ابھرتے بھی نہیں ہیں۔ خود بخود رفع ہوتے جائینگے اور آپکا یہ تمام اضطراب و تردد جو آپکے سینے میں آتش خاموش کی طرح سلگ رہا ہے مبدل بہ سکون و طمانیت ہو جائیگا۔ بعونہ تعالیٰ سب کچھ ہوگا لیکن آہستہ آہستہ، کہ کانٹوں میں اُلجھے ہوئے دامن کو جھٹکے سے چھڑانا دانشمندی نہیں ہوتی۔
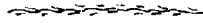
موجودہ اشاعت میں کتاب "معارف القرآن" کا دیباچہ شائع ہو رہا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب کیا ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے ذریعہ مسلمان حقائق قرآن تک کس طرح رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور نتائج کے لحاظ سے کتاب کی قدر و قیمت کیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا اعلان مئی کے طلوع اسلام میں کیا گیا تھا اور جو اس رسالہ میں مسلسل شائع ہوتی رہے گی۔ کتاب معارف القرآن رسالہ کے آخری جزو سے شروع ہوگی اور اس کے صفحات مسلسل اور علیحدہ ہوں گے تاکہ قارئین کرام ہر ماہ اس جزو کو علیحدہ کر کے کتاب کی شکل میں لے آئیں اور ان کو رسالہ کے ساتھ ایک مستقل کتاب مل جائے۔

معارف القرآن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا دیباچہ غور و تدبر کے ساتھ پڑھ لیا جائے۔ یہ دیباچہ اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے اور آئندہ نمبروں کے تسلسل کے ساتھ اصل کتاب بھی برابر شائع ہوتی رہیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

اصول قرآن

(حضرت مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ)

قرآن کریم دینی کتاب ہے جس کی غرض عملی رہنمائی ہے نہ کہ محض تعلیم۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۱۴/۱

کامل کتاب ہے جو ہم نے تیری طرف اُتاری ہے تاکہ تو لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لائے!

اس کا مقصد انسان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے جو اسکے لیے دین و دنیا دونوں میں سعادت و فلاح کا موجب ہیں اور اسی کا نام دین فطرت ہے۔

میں گزشتہ نمبر میں لکھ چکا ہوں کہ قرآن کی تفصیل کی بنا علم پر ہے اور قرآن اور صحیفہ فطرت دونوں متحد ہیں جس قدر فطرتی حقایق کے متعلق انسان کا علم زیادہ ہوگا اسی قدر وہ زیادہ قرآن سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اسلیے تفسیر قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائق فطرت سے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لیے ایک خاص شعبہ کو جس میں انکو مہارت ہوتی ہے، مخصوص کر لیتے ہیں اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل اپنے ذمہ لیں اور ان میں اپنی عمریں صرف کریں جو انکے علم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنے عقائد، اخلاق، قانون، سیاسیات، معاشیات، نفسیات اور ہیأت وغیرہ وغیرہ کے اہل فن اپنے اپنے متعلق آیات جمع کر کے انپر علمی بصیرت کے ساتھ غور کریں اس طرح پر قرآن کی تفصیل ہوتی جائے گی، اور عالم فطرت کی طرح اسکے حقائق بھی

آشکارا ہوتے جائینگے لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بے شک قرآن سے نصیحت حاصل کرنا اور اسپر عمل کرنا عوام کے لیۓ بھی سہل ہے جس طرح کہ عالم فطرت کی نعمتوں سے متمتع ہونا جاہلوں کے لیۓ بھی آسان ہے، مگر عالمِ فطرت پر غور کرنے والوں نے جو ہزارہا چیزیں ایجاد کی ہیں وہ اُن کی فہم سے بالاتر ہیں، اسی طرح قرآنی حکمتوں تک رسائی علوم صحیحہ ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ پھر جس طرح فطری حقائق کی توضیح خود فطری اشیاء ہی سے ہوتی ہے اسی طرح قرآن بھی اپنا شارح آپ ہی ہے، وہ مفصل کتاب ہے اور اُس کی محکم آیات کی تفصیل اسکے اندر ہے جیسا کہ قرآنی دلائل کے ساتھ میں پہلے نمبر میں لکھ چکا ہوں۔

اسلیۓ فہم قرآن کا اصل الاُصول یہ ہے کہ اس کی آیات اسکی تفاصیل سے سمجھی جائیں۔ اور جس حد تک الفاظ لے چلیں اُس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جاۓ۔ کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنے کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۶/۱۱۵

اور تیرے رب کے کلمات سچائی اور عدل کی رو سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۱۵/۲۵

ہم کو تم میں سے آگے جانیوالوں کا بھی علم ہے، اور پیچھے آنے والوں کا بھی علم ہے حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب اُنکو حشر میں لاۓ گا!

مستقدم اور مستاخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے مرنے والوں کے لیۓ مستعمل ہوۓ ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۱۰/۴۹

ہر اُمت کا وقت مقرر ہے جب اُنکا وقت آگیا تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہینگے،
نہ آگے بڑھیں گے۔

یعنی اپنی اجل معینہ پر اُنکی ہلاکت واقع ہوجاتی ہے اسلیئے قرآن کی تفصیل کے
مطابق "وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ" - الآیۃ کے معنے یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے
اور جو لوگ بعد میں مرینگے اُن سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کرینگے
لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے پیچھے نماز جماعت پڑھنے کے لیۓ مسجد میں آیا کرتی تھی۔ کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے
تھے تاکہ اُسکو نہ دیکھیں اور کچھ لوگ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کیحالت میں
بغل میں سے اسکی طرف جھانکتے تھے انہیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم آگے بڑھنے
والونکو بھی جانتے ہیں اور پیچھے رہنے والونکو بھی +

یہ معنے نکالنے کے لیئے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کا اضافہ کرنا پڑتا ہے اور یہ
صحابہ کرام کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے جس کو کوئی شخص جو اُنکے
سے واقف ہے تسلیم نہیں کرسکتا اگرچہ یہ روایت صحاح ستہ کی تین کتابوں، ترمذی
نسائی اور ابن ماجہ میں درج ہوگئی ہے لیکن خود قرآنی تفصیل کے مخالف ہونے کی وجہ
قابل قبول نہیں +

یہ ایک مثال نہیں بلکہ کتب تفسیر سے ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس سے
یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر بالروایت خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ چونکہ میں اس کے اوپر
جداگانہ مقالہ لکھ چکا ہوں جو رسالہ بلاغ امرتسر کے اپریل ۱۹۳۶ء نمبر میں شائع ہو چکا
اسلیئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا +

تفسیر بالروایت ہی کی ایک شاخ اختلاف قراۃ بھی ہے یعنی مفسر آیات کے الفاظ
دوسری شاذ قراتوں کی روایات سے اضافے کرلیتے ہیں۔ مثلاً :-

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ

یہاں اخ و اخت کے الفاظ کو جو قرآن میں بلا قید بیان کیے گئے ہیں اخیافی بھائی بہن کے لیے مخصوص کیا گیا اس روایت کی بنیاد پر کہ بعض صحابہ لِأُمٍّ پڑھا کرتے تھے۔ اس لِأُمٍّ کے بڑھا دینے سے وراثت کے اُصول میں بدیہی غلطیاں واقع ہو گئی ہیں جن کو میں نے اپنی عربی کتاب الوراثۃ فی الاسلام میں مشرح طور پر بیان کیا ہے۔ اسلیے اختلاف قرأت کی جتنی روایتیں ہیں اُن سے تفسیر میں کام لینا روا نہیں ہے کیونکہ یہ قرآن میں اضافہ ہے جس کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۹/۱۵

ہمنے قرآن کو اُتارا ہے اور ہم اُسکے محافظ ہیں۔

ایک ایک لفظ کی حفاظت کا وعدہ ہے۔

اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۲۷/۱۸

تیرے رب کی جو کتاب تیری طرف وحی کیگئی ہے اُس کی تلاوت کر، کوئی اُسکے لفظوں کو بدلنے والا نہیں۔

لہذا یہ روایتی اضافے خود قرآن کے وعدۂ الہی کے خلاف ہیں قرآن سی قدر ہے جو بین الدفتین محفوظ ہے اور اسی پر ہمارا ایمان ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۱۹۵/۲۶

واضح عربی زبان میں۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ ۲۸/۳۹

عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں ہے

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ ۴۴

ہم نے بس اس کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے

لہذا قرآنی الفاظ کے وہی معانی لیئے جائینگے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں ایسے معانی نہیں لیئے جا سکتے جنکو اہل زبان نہ سمجھتے ہوں۔ مثلاً:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۳۱

اور بعض آدمی ہیں جو دل بہلانیوالی باتوںکے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو بلا یقینی علم کے گمراہ کریں۔ اور اللہ کی راہ کو مذاق بنالیں۔

یہاں لہو الحدیث کا ترجمہ غنا کیا گیا ہے یعنی راگ لیکن عرب کبھی لہو الحدیث سے غنا نہیں سمجھ سکتا۔ نہ عربی زبان میں کہیں اس معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ خود آیت اس مفہوم کو قبول کرنے سے انکاری ہے کیونکہ اس میں لہو الحدیث کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اس سے گمراہ کرنیکا کام لیا جاتا ہے دوسری یہ کہ وہ یقین کے درجے تک نہیں پہنچتی تیسری اللہ کی راہ اس سے مذاق بنجاتی ہے۔ یہ تینوں صفتیں راگ میں کہاں ہیں راگ سے تو غرض نشاط وطرب ہے نہ کہ گمراہ کرنا یا دین کو مذاق بنانا۔ اور پھر اُس کو یقینی یا غیر یقینی ہونے سے کیا واسطہ۔ یہ تو صرف روایات اور افسانے ہیں جن میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔

الفاظ کے جو معنی لغت میں بیان کیئے گئے ہیں اُنکی بنیاد سماع پر ہے اور کتب لغت کے جامع تمامتر عجمی تھے جنھوں نے چوتھی صدی سے اُنکی تدوین شروع کی اسوقت تک الفاظ کے جو معانی عام طور پر تفسیر و حدیث و فقہ میں رائج ہو چکے تھے اُنھوں نے درج کرلیے ہرچند تحقیق و جستجو میں کمی نہیں کی لیکن پھر بھی انسانی کوشش ہے۔ اسلیئے لغت کوئی حتمی دلیل نہیں ہے۔ الفاظ کے معانی اختلاف کیصورت میں خود قرآن سے متعین کیئے جا سکتے ہیں۔

اُصول و قواعد لسانی کی ترتیب بھی نزول قرآن کے بعد ہوئی ہے بلکہ انکا بڑا حصہ ائمۂ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے لہذا ان اُصولوں کا جو سراسر قیاسی اور ظنی ہیں۔ اسی حد تک لحاظ رکھا جائے گا۔ جب تک کہ کوئی قوی سبب اختلاف کا موجود نہ ہو

ایک اہم اُصول فہم قرآن کا یہ ہے کہ اسکی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے +

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۴ع

اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی دوسرے کیطرف سے ہوتا تو اسمیں لوگ بہت اختلاف پاتے

اس لیئے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کیجا سکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ مثلاً:۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۱۱ع

اور پوجتے ہیں اللہ سے نیچے جو چیز نہ بُرا کرے نہ اُنکا بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ تو کہہ کہ تم اللہ کو جتاتے ہو جو اسکو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمینوں میں۔

یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر مرحوم کا ہے۔ میں نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں لکھا کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں لایعلم کا فاعل اللہ کو قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری آیت میں اللہ نے فرمایا ہے +

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۲۹ع

جس شخص کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اسکو جانتا ہے

اسلیئے شاہ صاحب کا ترجمہ براہ راست قرآنی تصریح کے خلاف ہے، علاوہ بریں مشرکین اللہ کو اپنے معبودان باطل کی خبر نہیں دیتے تھے بلکہ اُنکے توسط سے خود اپنی خبر اللہ تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اور یہی معنی سفارشی بنانے کے ہیں۔ ورنہ اگر وہ خود اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو اپنا حال بھی اُس سے کہہ سکتے تھے۔ بیچ میں سفارشی کی کیا ضرورت تھی۔ اس

آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے:-

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو انکو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع،
اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو
انکے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جنکو آسمان اور زمین کی کسی شئے کا علم نہیں ہ

بعض قدامت پرست مولویوں نے نہایت سخت لہجے میں میری مخالفت کی۔ اور دلیل یہ لائے کہ قرآن میں ہر جگہ "نبا" کے بعد جب آئی ہے، وہ تعدیہ کی ہے استعانت کی نہیں حالانکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ قرآن میں ایک ایک لفظ کئی کئی معنوں میں مستعمل ہوا ہے ب اگرچند آیتوں میں تعدیہ کے لیئے ہے تو استعانت کے معنے اس سے کیسے سلب ہوگئے اور کیوں اس معنی میں نہیں آسکتی حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مخالفت کی وجہ یہ نہ تھی بلکہ شخصیت پرستی تھی۔ انکے نزدیک اللہ لاعلیم ہو تو ہو مگر شاہ عبدالقادر کے علم پر حرف نہ آنے پائے۔ انکا خیال یہ ہے کہ مشرکین کے معبود چونکہ باطل ہیں اور حقیقتاً وجود نہیں رکھتے اس لیئے اللہ انکو جانتا ہی نہیں مگر کیا مشرکوں کے عقیدوں میں اُنکا وجود نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ موجودات ذہنی کا علم نہیں رکھتا۔؟

قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بھی بہت خرابیاں پیدا کی ہیں، حالانکہ قرآن میں جو کچھ تغیر و تبدل ہونا تھا وہ اسکے نزول ہی کے زمانہ میں ہو چکا۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَا اَوْ مِثْلِھَا ۲/۱۰۶

ہم جو آیت منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں اُس سے بہتر یا اسی جیسی لا دیتے ہیں

دو ہی صورتیں تھیں۔ منسوخ کردینا یا پیغمبر علیہ السلام کے دل سے بھلا دینا ان ہر دو صورتوں میں اسکے بجائے دوسری آیت نازل کردی جاتی تھی۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ وَّ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۱۶/۱۰۱

اور ہم جب ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لاتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے

جو کچھ اتارتا ہے تو کفار کہنے لگتے ہیں کہ تو اپنے دل سے بناتا ہے

آیت کے بدلہ میں آیت اتار دینے سے واضح ہوگیا کہ جو آیت منسوخ کیگئی یا جلادی گئی اُس کی جگہ دوسری آیت آگئی۔ اس لیئے قرآن میں جو آیتیں موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں اور جن لوگوں نے بعض آیات کو باہم متعارض سمجھ کر ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا ہے وہ خود انکی فہم کا قصور ہے۔ قرآنی تعلیمات میں مطلق تعارض نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی طرف سے قرآن میں کسی لفظ کی تبدیلی کا حق نہ تھا۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۱۰/۲

کہدے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اسکو بدل سکوں

جب رسول اللہ کو قرآن کے کسی لفظ بدلنے کا اختیار نہیں تھا تو اُس کی کسی آیت کو منسوخ کرنیکا اختیار کیونکر ہوسکتا ہے۔ جن لوگوں نے روایات کی بناء پر آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انھوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ مثلاً۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۲/۱۸

تمہارے اوپر فرض کیا گیا کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقرباء کے لیئے وصیت کر جائے۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں پر ایک حق ہے!

صریح الفاظ میں اللہ نے مالداروں پر ورثہ کے لیئے وصیت فرض کی اور متقیوں پر اس کو لازمی قرار دے کر موکد فرمایا۔ پھر آیت وراثت میں بھی تین جگہ "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ" فرما کر توضیح کردی کہ توریث کا اجراء وصیت کے بعد ہوگا۔ مگر لوگوں نے "الا لا وصیۃ لوارث" دیا ور کھو وارث کے لیئے وصیت نہیں ہے، کی روایت سے وصیت کی اس موکد آیت کو منسوخ

کرڈالا۔ اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وصیت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لیئے ہے جو توریث میں ممکن نہیں کیونکہ وارثوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرض کرو ایک شخص کے ۲ بیٹے ہیں جن میں سے ایک پر اُسنے ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے اور اُس کو تعلیم دلاکر اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ خوب کماتا ہے اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے اور دوسرا بیٹا آج پیدا ہوا ہے وراثت کا قانون کُلّی ہے وہ شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر حصّے دیدے گا۔ لیکن مصالح عائلی کا تقاضا اُسکے خلاف ہے اسی قسم کے حالات کے لیئے وصیت فرض کیگئی ہے تاکہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضرورتوں کا لحاظ رکھ سکے جس کو فقہا نے ایک خبر آحاد کی بنا پر منسوخ کرڈالا ۔

لہذا قرآن جو بین الدفتین ہے اُس کی کوئی آیت یا کوئی حرف منسوخ نہیں ہے، اس عنوان پر مفصل بحث ہماری کتاب تاریخ القرآن میں ہے۔ یہ چند موٹے موٹے اُصول ہیں باقی ہر قسم کے جزی قواعد بھی قرآن سے نکالے جاسکتے ہیں ۔

مرثیۂ اقبال علیہ الرحمۃ

(جناب اسد ملتانی)

حضرت علامہؒ نے جو فلسفۂ غم کے متعلق فرمایا ہے کہ ساز حیات کے بہت سے خوابیدہ نغمات مضراب غم سے بیدار ہوتے ہیں۔ اُس کی تصدیق جناب اسد کے اس مرثیے سے ہوتی ہے، جناب اسد کی شاعری میں جوش و امید اور بصیرت و ایقان کی وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے انکے بربطِ ہستی کے تاروں میں اثر و درد اور سوز گداز کے لیے لمبے نغمات شاید اسی حادثۂ جانکاہ کے لیے چھپا رکھتے تھے باینہمہ بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمارے خوددار شاعر نے ان نواہائے غم کو کچھ ایسا پردہ ہائے ساز میں چھپایا ہے کہ مرثیہ بجائے اظہار غم کے پردہ دار غم ہوگیا ہے، آنکھ میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کو آبگینۂ دل کیطرف لوٹا دینا اور یوں آبروئے ضبط کو قایم رکھ لینا کچھ آسان مرحلہ نہیں ہے

پھر یہ امر قابل غور ہے کہ ہجوم غم نے جناب اسد کی خصوصیاتِ شاعری کو اس مرثیہ میں بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور اس طرح سحابِ اشک میں سے گزری ہوئی شعاع اُمید نے جو اثر و جذب میں ڈوبی ہوئی قوسِ قزح پیدا کی ہے وہ اُردو زبان کے مرثیوں میں پہلی مثال ہے۔

کس قدر مبارک ہیں وہ آنکھیں کہ جیسے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو فرشتوں کے

دامن پونچھ لیں اور کس قدر بلند مقام ہیں وہ ہستیاں جن کی یاد میں
کسی کی خون فشانی کو یہ مرتبہ حاصل ہو جائے۔ (طلوعِ اسلام)

الٰہی کیسی قیامت کی یہ سحر آئی — جو آج رحلتِ اقبال کی خبر آئی
وفاتِ شاعرِ مشرق کی اطلاع سُنی — کہ روح و قلب میں برقِ بلا اُتر آئی
زمانہ ہو گیا آنکھوں میں ایسا تیرہ و تار — کہ زندگی میں جھلک موت کی نظر آئی
خدا کرے غلط ہو یہی تھی خواہشِ دل — خبر اگرچہ نہایت ہی معتبر آئی
ہمارا گنجِ گرانمایہ اسکے ہاتھ لگا، — کٹے جو ہم تو قضا کی مراد بر آئی
ہزار حیف دوا کوئی کارگر نہ ہوئی — دعا فلک پہ گئی اور بے اثر آئی
سیاہ روز ہوئی آج ملتِ بیضا — کہ شامِ غم سے بھی اک تیرہ تر سحر آئی

امامِ فلسفہ و شاعری کا ماتم ہے
مہِ صفر بھی ہمارے لیے محرم ہے

جو کائنات مسخر بھی ہو تو کیا حاصل — نہیں ہے موت پہ انساں کا اختیار افسوس
نہیں ہے ہستیٔ موہوم کا یقیں کچھ بھی — نہیں ہے عمرِ دو روزہ کا اعتبار افسوس
روانہ ہو گیا ملت کے باغِ ویراں سے — خزاں کے دور کا پیغمبرِ بہار افسوس
بھڑک نے پائی نہ اُسکی نوا سے آتشِ گل — کہ جل کے رہ گئی خود عندلیبِ زار افسوس
چمن میں ایک نئے دور کا کیا آغاز — اور آپ چل دیا صد ہزار افسوس
ابھی نہ آیا تھا اُن گلبنوں پہ رنگِ بہار — جنہیں وہ کرتا تھا اشکوں سے آبیار افسوس
خود اپنی آنکھوں سے وہ فصلِ گل نہ دیکھ سکا — تمام عمر کیا جس کا انتظار افسوس

جو بعد مرگ ملا عیش کا پیام تو کیا
پسِ فنا ہوا محفل کا اہتمام تو کیا

کمی نہیں ہے زمانے میں رہنماؤں کی — مگر وہ راہنماؤں کا رہنما نہ رہا

زمانہ کانپتا تہا جسکی بے نیازی سے — وہ مردِ مومن و درویشِ بے نوا نہ رہا
کھلے نہ اُسکے مقامات اہلِ ظاہر پہ — کہ انجمن میں وہ عارف قلندرانہ رہا
کریگا اب دلِ یزداں بھی یہ کمی محسوس — کہ ایک بندہ گستاخ لب کشا نہ رہا
تھا جسکا زمزمہ غالب نوائے فطرت پہ — جہاں میں آج وہ شاعر غزل سرا نہ رہا
جہاں کو شعرِ دلآویز کے بہانے سے — سُنا رہا تہا جو پیغام آشنا نہ رہا
بجُھا دل ایسا کہ اقبال کی وفات کے بعد — اسدؔ مرے لیے جینے میں کچھ مزا نہ رہا

ذرا بھی جی نہیں لگتا جہانِ فانی میں
خلا سا ہوتا ہے محسوس زندگانی میں

تجھے خدا نے جو واپس بُلا لیا اقبال — ترے پیام کی تکمیل ہو گئی ہو گی
اب آسمان تری آمد کے منتظر ہونگے — زمیں پہ تیری ضرورت نہیں رہی ہو گی
جہاں اُورجو آگے ہیں ان ستاروں سے — وہاں طلب ترے فکرِ بلند کی ہو گی
جو پڑ گئی ہے ضرورت تری نواؤں کی — فضائے خُلد کے نغموں میں کچھ کمی ہو گی
ہم ایسی باتوں سے دل کو ہزار بہلائیں — مگر نہ دُور طبیعت کی بیکلی ہو گی
مٹے گا داغ نہ دل سے تری جُدائی کا — خلش نہ کم ترے دردِ فراق کی ہو گی
میں تجھ سے چند مہینے ہوئے کہ مل آیا — خبر نہ تھی یہ مُلاقات آخری ہو گی

کہاں کرائیگی "جاوید منزل" اب تری دید
کہ تو نے جا کے بسا لی ہے منزلِ جاوید

ترا مقام تو ہے شاعری سے بالا تر — ہے تیری ذات پہ البتہ شاعری کو ناز
یہ شاعری ہے کہ شعر و سخن کے پردے میں — خودی کی جلوہ نمائی خُدا سے راز و نیاز
دلوں کو دے جو نئی زندگی وہ درد و اثر — کرے جو رُوح کی نشو و نما وہ سوز و گداز
نگاہ جاتی ہوئی کائنات کے دل تک — سخن پہنچا ہوا تا بہ سرحدِ اعجاز

بہت طویل زمانے کے بعد آیا تھا　　　فضائے ہند میں اک موجۂ نسیم حجاز
شمیم بیز، دل آویز اور جنوں انگیز　　　ولیک حیف! بہت تیز اور سبک پرواز
جو اس قدر سفرِ آخرت میں جلدی کی　　　تھا تیرے واسطے کارِ جہاں بس اتنا دراز؟

کسی کو اور گراں تھا انتظار ابھی
کچھ اور دن اُسے رکھنا تھا بے قرار ابھی

یہ کیا قضا و قدر کی ستم ظریفی ہے!　　　اسیرِ دامِ اجل شاعرِ حیات ہوا
نہیں، ایک اور جہاں کی تلاش میں شاید　　　رواں وہ طالبِ اسرارِ کائنات ہوا
جو مطمئن نہ ہوا جلوۂ صفات سے وہ　　　تو رہ نوردِ سوئے حریمِ ذات ہوا
حیات کے حرمِ پاک میں وہ اب بھی ہے　　　فنا کا بتکدہ محرومِ التفات ہوا
کہاں میں موت سے ڈرتا نہیں مسلماں ہوں　　　بوقتِ نزع بھی ثابت ترا ثبات ہوا
خوشی سے خلد میں جا اے رسول کے عاشق!　　　یہ عشق تیرے لیے ضامنِ نجات ہوا
ترے تو گوشۂ تربت میں روشنی ہوگی　　　مگر ہمارے لیے آہ! دن بھی رات ہوا

ہوا جہاں میں یکایک یہ انقلاب، افسوس
غروب ہوگیا مشرق کا آفتاب، افسوس

بہت دنوں سے یہاں عارفانِ صاحبِ دل　　　نہ مسجدوں میں تھی باقی نہ خانقاہوں میں
جو تھے فقیر تو رہبانیت کے گوشہ نشیں　　　جو تھے امیر تو شاہوں کی بارگاہوں میں
ترے وجود نے اک بار کردیا تازہ　　　زمانہ رومی و رازی کا پھر نگاہوں میں
کبھی جو تھی دلِ رومی سے عقلِ رازی سے　　　وہ روشنی نظر آئی تری نگاہوں میں
ترے کلام نے توڑا فرنگ کا وہ فسوں　　　سراغِ زیست دکھاتا ہے جو نگاہوں میں
کلیم و خانۂ فرعون کی مثال ہوئی　　　وہ تربیت تری مغرب کی درسگاہوں میں
صراطِ عشق پہ تو نے لگا دیا اُن کو　　　بھٹک رہے تھے جو عقل و ہوس کی راہوں میں

یہ رمز ہے شعرا پر تری فضیلت کی
دلوں میں ہے تری عظمت بھی اور محبت بھی

وہ شعر و فلسفہ کا بحرِ بیکراں اقبال
جنونِ عشق و محبت کا رازدان اقبال

وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال
وہ شاعری میں حقیقت کا ترجمان اقبال

وہ جسمِ قوم میں مثلِ دماغ و دیدہ و دل
وہ روحِ فطرتِ اسلام کی زبان اقبال

یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات
وہ میرا مرشد و استادِ مہربان اقبال

نہیں نہیں کبھی اقبال مر نہیں سکتا
سپردِ خاک ہوا جو وہ ہے کہاں اقبال

وہ کر رہا تھا کئی دن سے اپنے پر پیدا
گیا نہ عاقبت آں سوئے آسماں اقبال؟

دلوں میں تا بہ قیامت رہیگی یاد اُسکی
اگرچہ آج نگاہوں سے ہے نہاں اقبال

جہاں میں اُس کا قیام اور جہاں میں اسکا کلام
دوگونہ ہو گئی حاصل اُسے بقائے دوام

نظر ہے کتنی ہی محدود نارسا اُنکی
جنہیں گلا ہے کہ اقبال سخت کوش نہ تھا

شعاعِ مہر کی صورت حیات پرور تھا
عجب نہیں جو بظاہر وہ گرمجوش نہ تھا

نسیمِ صبح کے مانند تھا وہ غنچہ کشا
تباہ کاریٔ طوفانِ پُرخروش نہ تھا

اُسی کی مے کا اثر تھا یہ سب اگرچہ خود
شریکِ شورشِ رندانِ بادہ نوش نہ تھا

خریدنا اُسے چاہا جہاں نے بہتیرا
مگر وہ بندۂ آزاد خود فروش نہ تھا

تمام زندگی اُسکی تھی اک جہادِ عظیم
وہ گرچہ تیغ بدست و کفن بدوش نہ تھا

نگاہِ اہلِ محبت میں تھا ولی اقبال
کمی جو تھی تو یہی تھی کہ خرقہ پوش نہ تھا

اگرچہ آج جہاں سے گزر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

وہ خود نہیں مگر اُس کا پیام باقی ہے
وہ چُپ ہوا مگر اُس کا کلام باقی ہے

وہ آسماں کی طرف اُڑ گیا، مگر اُس کا زمینِ شعر نقشِ دوام باقی ہے
اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی وہ مَے وہ خُم، وہ صُراحی وہ جام باقی ہے
جو رہ گئی ہے رگِ تاک میں وہی نہ سہی کبھی ہوئی تو مَے لالہ فام باقی ہے
وہ مردِ پاک نظر جس کی طرح ڈال گیا ابھی وہ کام بہت ناتمام باقی ہے
وہ جس نظام کی رکھتا تھا آرزو دل میں بہت کچھ اُسکا ابھی انتظام باقی ہے
اگرچہ صدمہ ہے صبر و ثبات سے بڑھ کر سنبھال ہوش کہ دُنیا میں کام باقی ہے

کہیں نہ جوشِ عمل سیلِ اشک میں بہہ جائے
جو بات کہہ گیا اقبال وہ یونہی رہ جائے

اُٹھو مقابلۂ گردشِ زمانہ کریں حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں
فنا یہی ہے کہ دلمیں نہ ہو یقینِ بقا بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں
عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کی ہمارے توسنِ ہمت کو تازیانہ کریں
اسی سے ملّت خوابیدہ جاگ اُٹھے شاید وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں
نہ مل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں
جمالِ یار تو بیتاب خود نمائی ہے پر اہلِ دل بھی تو پیدا کوئی بہانہ کریں
اسی لیئے ہوا تسلیم رفعتِ جبیں کی طلب کہ سجدہ کرکے بلند اُنکا آستانہ کریں

یہی ہے حضرتِ اقبال کا پیامِ حیات
اسی پیام سے حاصل کریں دوامِ حیات

سوراجی اسلام

رازی

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب کانگریس کے دستور اساسی میں یہ بات موجود ہے کہ سوراج حاصل ہونے کے بعد ہندوستان کی مختلف اقوام کی مذہبی آزادی برقرار رکھی جائیگی تو پھر مسلمان اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے اور کیا ضمانت چاہتے ہیں یہ دلیل ایسی نظر فریب اور خوش آئند ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار اسکے دام تزویر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور عوام جو بالکل سطح بیں ہوتے ہیں انکے پاس تو اسکا جواب ہی کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آیئے تو ذرا دیکھیں کہ قرائن سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اسکی رو سے سوراج حاصل ہونے کے بعد جس مذہب کی آزادی مسلمانوں کو حاصل ہوگی وہ کونسا مذہب ہوگا کیا وہ اسلام ہی ہوگا یا کسی اور چیز کا نام اسلام رکھدیا جائیگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سوراج کے بعد ہندوستان کی "متحدہ قومیت" کا نظام حکومت جمہوری ہوگا اور اس متحدہ قوم کی تقدیروں کے مالک مختلف خیالات کے نمائندوں کی جماعت کے افراد ہونگے جنکی کثرت آراء سے تمام معاملات کا فیصلہ ہوا کریگا اور جو معاملہ اکثریت کی رائے سے طے ہو جائیگا وہ ملک کا قانون بن جائیگا جسکی خلاف ورزی جرم ہوگی۔ لہذا ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ مختلف سیاسی معتقدات کی جماعتیں جنکے ہاتھ میں زمام حکومت ہوگی۔ مذہب سے مفہوم کیا لیتی ہیں۔ اس لئے کہ جب مذہبی آزادی یا مذہبی معاملات میں دخل اندازی کا سوال پیدا ہوگا تو سب سے پہلے تو یہی سوال اٹھے گا کہ وہ مذہب جسکی آزادی کا حکومت نے وعدہ دیا ہوا ہے اسکی تعریف کیا ہے کون کون سے معاملات مذہب کی حدود کے اندر رہیں اور کون کون سے اسکے باہر۔

سب سے پہلے قدامت پسند ہندوؤں کی اس جماعت کو لیجئے جسکے نمائندے مہاتما گاندھی ہیں

ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ یہ جماعت اپنے اس اعلان میں مخلص ہے کہ سوراج کے بعد مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اس جماعت کے نزدیک مذہب نام ہے چند رسومات کا اور چند عبادات کا اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عقائد یا عبادات میں بھی کسی کا اشتراک یا اتحاد ہو ایک فرقہ کرشن بھگت ہے اور دوسرا رام اوپاسک۔ سناتن دھرم والے مورتی پوجا کرتے ہیں لیکن آریہ سماج والے مورتی کھنڈن (بُت شکنی) کے قائل ہیں۔ ویدانت کے قائل مادہ کو مایا (سراب) سمجھتے ہیں۔ اور آریہ سماجی روح مادہ دونوں کو ازلی اور ابدی مانتے ہیں بنگال کے ہندو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں۔ ورستیارتھ پرکاش اس دیوی کو ڈائن قرار دیتی ہے سناتن دھرمی ورنوں کی تقسیم پیدائش کے لحاظ سے کرتے ہیں اس لئے اچھوت ان کے نزدیک پیدائشی اچھوت ہیں لیکن آج خود مہاتماجی اس بات کے لئے پران تیاگنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ اچھوت کو اچھوت کیوں سمجھا جاتا ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود یہ سب ہندو ہیں اور ان میں سے کوئی بات بھی ہندو دھرم کے خلاف نہیں ہے حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو جو ناستک ہیں خدا کے بھی منکر ہیں وہ بھی ہندو ہیں اس لئے اس جماعت کے نزدیک تو مذہب محض کسی ذہنی نظریہ کا نام ہے جسکی کوئی تعریف ہی نہیں کیجا سکتی۔ باقی رہے معاشرتی معاشی سیاسی معاملات تو وہ مذہب کے احاطہ سے باہر ہیں انکا حل ارباب سیاست کے ذمہ ہے۔ مذہب سے متعلق یہی نظریہ آج انگریزوں کے سامنے ہے۔ انکے سامنے بھی کلیسا اور سلطنت دو الگ الگ شعبے ہیں بلکہ وکٹوریہ کے منشور کی رو سے آج بھی مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں کامل آزادی حاصل ہے۔ اور حکومت مذہبی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوتی لیکن یہ مذہب ہے کیا جو حکومت کی دخل اندازی سے باہر ہے۔ وہی چند رسومات اور عبادات آپ دن رات قرآن کریم کا درس دیتے رہئے کوئی مزاحم نہیں ہوگا لیکن اگر آیت کی تفسیر حکومت وقت کے قانون سے ٹکرا جائے تو اس مذہبی آزادی کا جو حشر ہوتا ہے اسکا حال مقدمۂ کراچی کے اسیران اور مالٹا کے نظر بندوں سے پوچھئے۔ اس لئے کہ

قرآن کی تلاوت تو مذہب میں داخل ہے لیکن ملکی اور سیاسی معاملات میں تو آپکو ملک کے قانون کے تحت رہنا ہوگا - مذہب "ثواب" حاصل کرنے کے لیئے ہے نہ کہ زندگی کے معاملات کا عملی حل تلاش کرنے کے لیئے - اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اس نظریہ کے ماتحت آپ کو جس قسم کی مذہبی "آزادی" حاصل ہوگی وہ آج کی "غلامی" سے کتنی بہتر ہوگی؟

قدامت پرستوں کی دوسری جماعت وہ ہے جسکی نمائندگی کا شرف ہندو مہا سبھا کو حاصل ہے اور یہی وہ جماعت ہے جسکی ملک میں اکثریت ہے کچھ وقت ہوا کہ انکی اکثریت میں کچھ شبہ ہونے لگا تھا جبکہ اچھوتوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمیں جداگانہ نیابت حاصل ہونی چاہیئے - اسوقت ان مظلوموں کی ہمدردی کے جذبہ نے جوش کھایا بڑے بڑے مہاتما منش ہندوؤں نے کھانا پینا چھوڑ دیا - پونہ میں چاں تیاگ برت رکھے گئے بڑے بڑے اونچی گوت کے ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہریجن کہلانا شروع کر دیا -

اور اس مظلوم طبقہ کی زبوں حالی کے احساس نے اسوقت تک چین نہ لینے دیا جبتک یقین نہ ہوگیا کہ ہندو مہا سبھا کی اکثریت خطرے میں نہیں ہے مہاتما جی نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ اب زندگی کا مقصد اسی اکثریت کے تحفظ کو قرار دے لیا ہے - اس طبقہ کے جو خیالات مسلمانوں کے مذہب سے متعلق ہیں اس کے لئے دیوتا سروپ بھائی پرمانند - ڈاکٹر مونجے اور مسٹر ساورکر کے شبھ نام کافی ہیں' ظاہر ہے کہ جس حکومت کے نظام میں اکثریت اس جماعت کی ہوگی اسمیں اقلیت کے مذہب کا کیا حشر ہوگا - اکثریت کی تو آج بھی یہ حالت ہے کہ سناتنی بیچارے لاکھ چلا رہے ہیں کہ سارد ا ایکٹ ہمارے دھرم کے خلاف ہے کوئی ایک نہیں سنتا وہ چیخ رہے ہیں کہ اچھوتوں کے لیئے مندروں کے دروازے کھولدینا گویا ہندو دھرم کو ابوتر کر دینا ہے لیکن سیاست کی مصلحت کوشیاں اکثریت کے کان بند کیئے ہوئے ہیں جب بچے خود اپنے ہاں یہ حالت ہے کہ مہا سبھائیوں کی اکثریت سناتن دھرمیوں کے مذہبی احساسات کی کچھ پرواہ نہیں کرتی تو یہی اکثریت ملیکش مسلمانوں کے مذہب کا جسقدر پاس کرے گی ظاہر ہے -

اب اس جماعت کو لیجئے جو روشن خیال جدت پسند (ADVANCED)

طبقہ کہلاتا ہے اور جسکی قیادت پنڈت جواہر لال نہرو کو حاصل ہے یہ اشتراکی خیالات کے حامی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں خدا اور آخرت پر ایمان کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اس میں اسلام ہی نہیں بلکہ خود عیسائیت کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ جوان خیالات سے متاثر کیا جا رہا ہے۔ ایمانیات سے اسکا استہزاء خود بتا رہا ہے کہ مذہب سے متعلق انکا زاویہ نگاہ کیا ہے۔ پنڈت جی اور انکے رفقائے کار کی یہ کوشش ہے کہ اشتراکیت آنیوالے ہندوستان کا سیاسی مذہب بن جائے اس نظریہ کی عملی اشاعت میں بعض سیاسی مصالح ابھی انکے راستہ میں حائل ہیں لیکن بایں ہمہ جس سرعت کے ساتھ اس کو عام کیا جا رہا ہے اسکا نتیجہ ظاہر ہے اسلام خود سرمایہ داری کا دشمن اور اشتراکیت کا حامی ہے لیکن اس اشتراکیت کا نہیں جسکی تخلیق اس انقلاب پسند طبقہ کے اس انتقامی جذبہ کی رہین منت ہے جو زار کی حکومت کے خلاف اسکے دل میں موجزن تھا اور جسکا اصول صرف یہ تھا کہ ہر وہ چیز جو زار کے وقت میں دنیا میں موجود تھی۔ تباہ کر دینے کی لائق ہے۔ یہی وہ اشتراکیت ہے جو ہندوستان کے انقلاب پسند طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور جو محض روس کی نقالی ہے۔ غلام نژاد قوم ہمیشہ مقلد ہوا کرتی ہے طوافِ اندر سرشت برہمن است۔ رسالہ کلیم اس مسلک کی نشر و اشاعت میں بڑا سرگرم رہتا ہے کہ اس سے نوجوانوں میں مقبولیت بڑھ جاتی ہے چنانچہ اسکا کوئی پرچہ ایسا ہوتا ہوگا جسمیں خدا اور آخرت پر ایمان کی تضحیک نہ کیجاتی ہو مثلاً مارچ کے پرچہ میں ناظر کے نام سے ایک مضمون چھپا ہے جسمیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

> خدا کے تصور کی ابتدا انسان کے اس دور سے شروع ہوئی جبکہ ذہن انسانی عالم طفولیت میں تھا وہ فطرت کے عظیم الشان مظاہر کی توجیہ نہ کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ انکو فوق العادت ہستی سے منسوب کر دے۔۔۔۔ مذہب کا توہم پرستی کے ساتھ ہونیکا ثبوت یہ ہے کہ آج تک بھی جہاں جہاں جہالت زیادہ ہے اور علم کی روشنی کم ہے وہاں مذہب کا دور دورہ ہے مذہب ایک غیبی چیز ہے اور غیبی چیزوں کو تاریکی میں زیادہ فروغ ہوتا ہے

اسکے بعد حیات بعد الممات کے عقیدہ کی مخالفت کی گئی ہے اخیر میں رقمطراز ہیں کہ ہندوستان چونکہ علوم و فنون اور تہذیب تمدن میں بہت پیچھے ہے اس لیے یہاں فی الحال مذہب کو رہنے دیا جائے لیکن "مذہب کو اجتماعی حیثیت نہ دیجائے اسکو خالص شخصی یا انفرادی چیز سمجھنا چاہیئے اسطرح اسکی پبلک حیثیت رفع ہوکر خالص پرائیوٹ یا نجی حیثیت باقی رہے گی۔

یہ تو تھے غیر مسلم حضرات کے مختلف طبقے یا مسلمان کہلانے والوں میں سے وہ طبقہ جسے متجددین کہا جاسکتا ہے لیکن آنے والے اسلام کے متعلق جو نظریہ عام "قوم پرست" مسلم حضرات پیش کررہے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن ہے ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کا اسلام وہ پیش کررہے ہیں وہ خود انکے اپنے ہی دماغوں کی ساخت ہے کتاب و سنت کے اسلام سے اسکو کچھ علاقہ نہیں انکے نزدیک بھی مذہب چند رسومات وعبادات کا ہی نام ہے۔ اس کے بعد عام معاشرتی، معاشی، سیاسی معاملات سب "دنیاوی" امور ہیں جنکا مذہب سے کچھ واسطہ نہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مشہور "قوم پرست" مسلم حضرات کے خیالات ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر سید محمود سابق سکرٹیری آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریسی حکومت صوبہ بہار کے وزیر کا ایک مضمون رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے اس امر کی تلقین کی تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں مذہب اس قسم کا ہونا چاہیئے جس قسم کا دین اکبر نے ایجاد کیا تھا۔ اکبر جیسوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ

> "بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہوکر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیش نظر ایک ایسے جدید مذہبی نظام کی نشوونما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جاسکتیں"

آنے والے نظام حکومت کے ماتحت اس نئے "دین الٰہی" کے ماننے والوں کا نام کیا ہوگا۔

اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

لفظ ہندی کو زبان کے لئے نہیں بلکہ اہل ہند کے لیے اختیار کرنا چاہئیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جسمیں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اسکا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بنجاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس براعظم کی علٰحدہ علٰحدہ "مذہبی اقوام" ہیں اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کرلیں۔[1]

کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد ڈاکٹر اشرف صاحب کا ایک مضمون جمعیۃ العلمائے ہند کے آرگن الجمعیۃ بابت رجب ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوا تھا جسمیں انھوں نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں نے پہلے کونسی بات میں یگانگت اور وحدت کھی جو وہ اب اپنی الگ وحدتِ قومی کے پیچھے چلا رہے ہیں۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ۔

اس اعتبار سے ہم آج ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے"

اسی شعبۂ اسلامیات کے ایک رکن جناب منظر رضوی کا ایک مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار مدینہ بابت یکم نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے جسمیں وہ فرماتے ہیں

مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانوں ملجاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپسمیں کیوں ملے اس اتحاد کی ضرورت کیا ہے۔ اسکا

---

[1] یعنی خدا نے تو یہ فرمایا تھا کہ **ھو سمّٰکم المسلمین** - اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے - اور **من احسن قولہ ......** ۳۳/۴۱ کہ اس سے بہتر بات کرنے والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے - عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں لیکن مسلمانوں کے یہ نمایندہ حضرات ہیں کہ ان کو اس بات سے شرم محسوس ہو کہ کوئی اپنے آپ کو مسلمان کہے - یہ ہے سورہ آج اسلام کی ایک خفیف سی جھلک - آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا - (رازی)

مقصد کیا ہے جہانتک توحید رسالت مذہبی معتقدات اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپسمیں ملے ہوئے ہیں بالکل متحد ہیں انمیں کوئی اختلاف نہیں اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے وہ ہرگز متحد نہیں ہوسکتے۔ اور نہ انکو متحد ہونا چاہیئے (اقتباسات بحوالہ ترجمان القرآن)

رسالہ کلیم کے مدیر جناب جوش ملیح آبادی دسمبر ۳۷ء کے پرچہ کے اشارات میں فرماتے ہیں

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جاسکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے! ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جسکا تبدیل کر دینا طاقت بشری سے باہر ہے[۱]

ایک اور قوم پرست" بزرگ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں وہ حضرت علامہ علیہ الرحمہ کے مشہور نظریہ قومیت سے متعلق بیان کے جواب میں اپنے اخبار "ہند" بابتہ ۱۲ مارچ ۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ہمارے مدعیان علم نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسلام نے اسلامی سوسائٹی کا ایک ایسا نظام بنایا ہے جو ہمہ گیر اور اٹل ہے مگر یہ کہتے ہوئے ان لوگونکو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے اس قول سے اسلام کی عالمگیری کو توڑ رہے ہیں۔"

یعنی انسان کے نزدیک اسلام کی عالمگیری یہ ہے کہ اسے چند عقائد کا مجموعہ تصور کر لیا جائے باقی رہا نظام سو وہ تو ایک وقتی چیز تھی جو اسلام نے عربوں کے سامنے پیش کی تھی۔ فرماتے ہیں کہ

اس حقیقت سے عام طور پر چشم پوشی کیجاتی ہے کہ اسلام عربی دین ہے اسکی روح عربی ہے اور عربوں ہی نے سب سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھایا میرے کہنے کا یہ مطلب

---

[۱] جی ہاں۔ بالکل طاقت بشری سے باہر۔ کل تک اہل برہما "ہندوستانی" تھے۔ اور آج سیاسی مدبرین کی ایک جنبش قلم سے "برمی" ہو گئے (رازی)

نہیں کہ عجمی قومیں اسلام میں داخل نہیں ہو سکتیں وہ داخل ہوئیں اور مسلمان بنیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اسلام ہے عربی دین ہی جسکی شہادتیں خود قرآن مجید میں موجود ہیں (مثلاً؟ رازی)

یہ چند تصریحات محض نمونتہً پیش کی گئی ہیں ورنہ اگر ان حضرات کی تمام و کمال تحریریں آپکے سامنے ہوں تو آپ حیران رہجائیں کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ماحصل ان سب کے نظریوں کا یہ ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے جسکا عملی سیاسیات اور معاشی اقتصادی۔ عمرانی معاشرتی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں وہی چیز جسکا نام مولانا ابو الکلام آزاد نے "خدا پرستی اور نیک عملی" کی زندگی رکھا ہے اور جسمیں اس متحدہ قومیت کا مشترکہ مذہب بننے کی صلاحیت موجود ہے جسکی بنا، بقول حضرت مولانا حسین احمد "اوطان" پر ہے یہ ہے وہ مذہب جسکی آزادی کا اعلان بھارت ماتا کے مندر کے دروازہ پر لٹکا یا جائے اب آپ خود فیصلہ فرمایئے کہ اس قسم کے مذہب کی کیا فی الواقعہ "آزادی" ہوگی۔

یاد رکھئے۔ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے جو نظام زندگی کے ہر شعبہ پر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہیئت پر چھایا ہوا ہے بقول حضرت علامہ علیہ الرحمہ

> اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے..... اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔

اس اجمال کی تفصیل طلوع اسلام کے مسلسل مطالعہ سے آپکی نگاہوں کے سامنے آجائے گی۔ جب تک مسلمانوں کو اس قسم کے مذہب کی آزادی حاصل نہو۔ وہ اپنے آپ مذہبی حیثیت سے آزاد نہیں سمجھ سکتے۔ یہی وہ مذہبی آزادی ہے جسکے تحفظ کے یہ

آج مسلمانوں کا ہر سوچنے والا دماغ غور و فکر کر رہا ہے اور اسی کا نام آج "فرقہ پرستی" رکھا جاتا ہے اور یا للعجب! کہ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے رکھا جاتا ہے!!

از باغبان شد است کہ صیاد آن نکرد

(۲) گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ ہمارا "قوم پرست" فرقہ اپنی پوری قوت اس نظریہ کے استحکام میں صرف کر رہا ہے کہ مذہب ایک نجی اور ذاتی عقیدہ ہے (PRIVATE AFFAIR) جماعتی زندگی سے اسے کوئی علاقہ نہیں اجتماعی زندگی سے متعلقہ معاملات سیاسی اور تمدنی مسائل ہیں جن کا حل اور تصفیہ اس نظام حکومت کی رو سے ہونا چاہیے جو ہندوستان کی "متحدہ قومیت" پر مشتمل ہو گا۔ اسکا نام ہے سوراج۔ اس کے برعکس ہم نے ابھی ابھی چند سطور میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے۔ (ORGANISED RELIGION) جسمیں دین اور دنیا مذہب اور سیاست گرست آشرم اور سنیاس آشرم الگ الگ شعبے نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق کوئی مسئلہ ہو اور دنیا اسے اپنی تقسیم کے اعتبار سے کسی ذیل میں لے آئے اسلام کی رو سے وہ خالص مذہبی مسئلہ ہوتا ہے۔ اسلام کی رو سے فرد کوئی ہستی نہیں رکھتا اس لئے اسکے انفرادی اور ذاتی اعمال بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے وہ ایک جماعت کا رکن ہے اور اسکی ہستی اس جماعت کے وجود سے ہے لہذا اسکے اعمال بھی وہی صالحہ ہیں جو اس جماعتی نظام کے اندر رہتے ہوئے کیے جائیں" پرائیویٹ مذہب" زیادہ سے زیادہ چند اخلاقیات کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے اور یہ سطحی مجموعۂ اخلاقیات وہ ہے جو قریب قریب دنیا کے ہر مذہب میں مشترک ہے۔ کون سا مذہب ہے جو یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نکرو زنا نہ کرو۔ اگر مذہب اتنی ہی چیز ہے تو پھر اسلام میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی رو سے اسکا دعویٰ ہے کہ یہ خدا کا آخری دین ہے اور اس سے پیشتر کے تمام ادیان اب

اس لئے ناقابل قبول ہیں کہ وہ اپنی اصل شکل میں دُنیا کے پاس نہیں ہیں جو لوگ اسلام کی رُوح سے کچھ بھی واقف ہیں انھیں اس خصوصیت کا معلوم کر لینا کچھ زیادہ دشوار نہیں جس خصوصیت کی رو سے اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا سچا دین ہے آپ اسلام کے سوا کسی مذہب کو دیکھئے وہ ایک پرائیویٹ حیثیت رکھتا ہوگا۔ وہ انفرادیت کی زندگی بسر کرنا سکھائیگا۔ ہندوؤں کے پجاری ہوں یا سنیاسی۔ عیسائیوں کے پادری ہوں یا راہب وہ "دنیا داروں" کے طبقہ سے الگ ہونگے دُنیا داروں میں سے جو شخص "خدا پرست" ہوتا جائیگا وہ ان سے کٹ کر الگ ہوتا جائیگا۔ اسے پھر جماعتی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رہیگا۔ اسکا مطمح نگاہ پھر اپنی مکتی حاصل کرنا ہوگا۔ اسلام نے جب رہبانیت کو ناجائز قرار دیا تو اس لئے نہیں کہ لوگوں کے گیروے رنگ کے کپڑے پہننے اسے پسند نہ تھے ان کپڑوں میں کیا رکھا ہے! اسلام نے رہبانیت کی اس لئے مخالفت کی کہ رہبانیت اس نظریہ زندگی کا نام ہے جس میں انسان انفرادیت کی زندگی بسر کرتا ہے جس میں اسے صرف اپنی نجات کی فکر دامنگیر رہتی ہے جس میں دین اور دُنیا دو الگ الگ شعبے بن جاتے ہیں۔ جس میں مذہب ایک ذاتی اور پرائیویٹ عقیدہ کا نام رہ جاتا ہے جس میں خدا پرستوں کے طبقہ کو اجتماعی معاملات سے کچھ علاقہ نہیں رہتا۔ یہ ہے بنیادی فرق اسلام اور دیگر ادیان میں اس خصوصیت کو مٹا ڈالئے۔ اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح رہ جائیگا اور اسی بنیادی فرق کے مٹا ڈالنے کا نتیجہ ہے کہ قوم پرست حضرات کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ دُنیا کے سب مذاہب سچے ہیں البتہ ان مذاہب کے پیروں میں خرابیاں آگئی ہیں اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی سچائی پر عمل پیرا ہو جائیں تو پھر کسی میں کوئی فرق نہیں رہتا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد اوّل از مولانا ابوالکلام آزاد) ہم اپنے اس دعوے کو کہ اسلام پرائیویٹ عقیدہ نہیں بلکہ ایک جماعتی مذہب ہے بتوفیق الٰہی کتاب و سنت آثار و تاریخ سے پوری طرح ثابت کر سکتے ہیں

طلوع اسلام کا وجود ہی اس غرض کے لئے ہے لیکن اسوقت ہم اس دعوے کے اثبات میں ایک دوسری روش اختیار کریں گے۔ حصۂ اوّل میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ قوم پرست طبقہ کے اپنے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ وہ مذہب کو کیا سمجھتے ہیں اب ہم اس مسلم قوم پرست طبقہ کے امام مولانا آزاد کے الفاظ میں اس بات کو ثابت کریں گے کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک منظم مذہب ہے جماعتی مذہب ہی فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ تحریریں اُسوقت کی ہیں جب انھوں نے ہنوز "قوم پرستی" کا مسلک اختیار نہیں کیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۳ کا ذکر ہے کہ انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک ریزولیشن پاس کر دیا کہ شاہی مسجد میں "سیاسی تقریریں کرنے کی اجازت نہیں اسپر مولانا آزاد نے اپنے رسالہ الہلال میں چار مبسوط اور مفصل افتتاحی مقالے تحریر فرمائے جس میں اس جوش اور ولولے کے ساتھ جو زمانہ قومیت پرستی سے بیشتر انکی نمایاں خصوصیت تھی انہوں نے کتاب و سنت سے ثابت کیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ سمجھنا کفر ہے شرک ہے۔ جہالت ہے۔ فرماتے ہیں

میں اگر انکو کفر پرست کہوں تو تم کہوگے کہ یہ ایمان و کفر کی بحث ہے میں اگر انکو مشرک کہوں تو تم پکار وگے کہ یہ بہت ہی بڑی جسارت ہے۔ ہاں یہ جسارت ہی لیکن جن ظالموں نے اللہ کے آگے جسارت کی ہے کیوں نہ ہم بھی انکے لئے جسارت کریں۔ وہ نہ مومن ہیں نہ مُسلم انکا حال یہی جو کہا گیا۔ نؤمن ببعض و نکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا ان لوگوں کی اصطلاح میں جس چیز کو سیاست اور پالیٹکس کہتے ہیں اسلام کے نزدیک عین دین و مذہب ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ..... (الہلال بابت ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء ص)

اس لئے کہ ۔

حضرت ختم المرسلین علیہ الصلاۃ والسلام نے تمام عالم کی ضلالتوں و تاریکیوں کو دور کرنا چاہا

اور اپنی وہ پہنی جماعت مقدس کی زندگی اس راہ میں صرف کردی، یہ محض اصلاح اقوام و زمین کا کوئی خاص شعبہ نہ تھا جسکو تم نے پالیٹکس تمدن اخلاق اور مذہب کے نام سے تقسیم کر دیا ہے بلکہ انکی دعوت عام اور انکی اصلاح عالمگیر تھی (ایضاً)

اسی زمانہ کے الہلال میں ایک سلسلہ بعنوان الحریت فی الاسلام شروع کیا گیا تھا اسکی تمہید میں تحریر ہے: اسلام خود اپنے بیان کے مطابق رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً۔ دین و دنیا کی اصلاح کیلئے آیا تھا اور اسی لئے دونوں جہان کی برکات اسکے ساتھ تھیں پھر اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اسلام کے خزانہ میں حسنات سیاست دنیاوی کا وجود نہیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ نصف خدمت انسانی کی سرانجام دہی سے وہ مقصر رہا جسکا تخیل بھی کوئی مسلمان نہیں کرسکتا...... (الہلال بابت ۲ جولائی ۱۹۱۲ء)

اس زمانہ میں مولانا صاحب نے مسلمانوں کے مصائب کا حل ایک ایسی جماعت کے قیام میں تلاش کیا جسکا نام تھا حزب اللہ۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں انہوں نے الہلال کی متعدد اشاعتوں میں مقالات تحریر فرمائے جنمیں شروع سے اخیر تک صرف ایک چیز کو پوری قوت کیساتھ نمایاں کیا کہ اسلام ایک جماعتی مذہب ہے اگر مسلمانوں کی الگ جماعتی زندگی مقصود نہیں تو اسلام بھی مقصود نہیں یہ مقالات اس قابل ہیں کہ یہاں تمام و کمال نقل کئے جاتے لیکن اس سے یہ مضمون ایک کتابی شکل اختیار کرلیگا اس لئے انکے جستہ جستہ اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں کہتا ہوں اور از فرق تا بقدم ایک صدائے ربانی بنکر کہتا ہوں جبکہ یقین کی وہ لازوال طاقت میرے ساتھ ہے جسکے لئے کبھی فنا نہیں جبکہ وہ بصیرت الٰہی میرے دل کے اندر موجود ہے جس میں کبھی تذلل و تذبذب نہیں اور جبکہ وہ شہادت الٰہی میرے سامنے ہے جسکی رویت میں کبھی دھوکا اور فریب نہیں۔ کہ زندگیوں اور کامیابیوں کا وہ تخم مقدس کوئی انجمن۔ کوئی اسکیم۔ کوئی بے شمار خزانہ۔ کوئی عہد حفاظت۔ کوئی اقرار خدمت۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی آواز اور انسانوں کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی۔ مگر وہ صرف ایک ہی تحریک حق و صداقت جو مسلمانوں کو اُن کی حیات

انفرادی و ملّی کی ہر شاخ میں "مسلمان" بننے کی دعوت دے۔ (الہلال ، ، ص)

ہم حضرت مولانا سے باادب استادریافت کرنیکی جسارت کرتے ہیں کہ آج وہ صدائے ربانی وہ یقین کی لازوال طاقت وہ بصیرت الٰہی۔ وہ شہادت ایقانی کیا ہوئی جو صرف اس ایک تحریک کو حق و صداقت کی تحریک قرار دیتی تھی جو مسلمانوں کی حیات انفرادی و ملّی کی ہر شاخ میں انھیں "مسلمان" بننے کی دعوت دے کیا وہ تحریک یہی تحریک کانگریس ہے جو مسلمانوں کا الگ نام بھی سننا پسند نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ مسلمان مت کہلاؤ۔ ہندی کہلاؤ۔ جو مسلمانوں کی "حیات ملّی" کو تسلیم ہی نہیں کرتی اور کہتی ہے کہ ملک میں دو ہی جماعتیں ہیں ایک حکومت اور دوسری کانگریس۔ لیکن ٹھہرئیے۔ خود حضرت مولانا کی زبانی ہی سنئیے کہ وہ تحریک جس کے اندر آج وہ خود شامل ہیں اور جس کی شمولیت مسلمانوں کے لئے "فریضۂ مذہبی" قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کی تحریک کے متعلق اسلام کی کیا شہادت ہے۔ فرماتے ہیں۔

"پھر جب آپ ایک انجمن قائم کرتے ہیں جس کے مقاصد و اعمال کی فہرست بیسوں دفعات پر مشتمل ہے۔ لیکن نہ تو اس میں کہیں احیاء دعوت اسلامی کی دفعہ ہے نہ کہیں اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہے۔ نہ کوئی صورت عمل و طریق کار ایسا پیش نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو اور ان کی مجاہدانہ روح عمل کو واپس لانا ہو۔ تو پھر فرمائیے۔ آپ کا مقصد تو ضروری اور آپکے کام یقیناً اچھے اور مستحق اعانت و شرکت جمیع مسلمین لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے آپنے کیا کیا اور اس کے لئے ہم کہاں جائیں"! (الہلال بابت ۱۶ جولائی ۱۹۱۳ء ص)

کیا حضرت مولانا فرمائیں گے کہ کانگریس کی دفعات میں وہ کونسی دفعہ ہے جس کی رو سے احیاء دعوت اسلامی ضروری اور اسلام کے احکام و اوامر پر عمل کرنے کی قید ہو۔ کانگریس کے دستور اساسی میں وہ کونسی صورت عمل اور طریق کار پیش نظر ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہو! اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر فرمائیے کہ آپ کا مقصد تو ضروری (یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا) اور آپکے کام یقیناً اچھے (یعنی ہندوستان میں ایک

متحدہ قومیت پیدا کرنا) اور مستحق اعانت و شرکت جمیع مسلمین (جسے پنڈت جواھر لال نہرو MUSLIM MASS CONTACT سے تعبیر کرتے ہیں) لیکن ہمارے اصلی مرض کے لئے تجویز کیا کیا! اور اس کے لئے کہاں جائیں! کیا حق و صداقت کی تحریک یہی ہے جس کا نام کانگریس کا شعبۂ اسلامیات ہے۔ اور جس کے انچارج ڈاکٹر اشرف اور ایک ذمہ دار رکن جناب منظور رضوی کے خیالات ابھی ابھی پیش کئے جا چکے ہیں! مولانا! خدا کے لئے سوچئے کہ جس قسم کی تحریک کو ۱۹۱۳ء میں۔ اس حتم و یقین۔ اس بصیرت و ایقان۔ کے ساتھ مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے سامان قرار دیتے تھے۔ اُسی تحریک کو آپ آج "عین کتاب و سنت" اور "صراط مستقیم" قرار دے رہے ہیں کیا آج قرآن بدل گیا یا مسلمانوں کے کعبہ کی سمت تبدیل ہو گئی! اس کا جواب بھی مولانا ہی سے سنئے

> "اسلام ایک آخری دین الٰہی تھا جس نے نہ صرف احکام شریعت ہی میں بلکہ حیات قومی کی ہر شاخ میں ہم کو سب سے آخر اور سب سے بہتر اصول دیدیئے۔ اور دنیا خواہ کتنی ہی بدل جائے لیکن آزمایا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کی صداقت کو بدلنے کی ضرورت نہیں.....
>
> تکمیل دین کے لئے ضروری تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کے پیرو اپنی تمام اصولی ضروریات میں مستغنی اور بے پرواہ ہو جائیں اور ان کو کسی نئی تلاش اور نئے اصولوں کی جستجو باقی نہ رہے
>
> ...... میرا عقیدہ ہے کہ آج حیات ملت و حصول عظمت ملی کے لئے مسلمانوں کو اپنے اعمال کی کسی شاخ میں بھی "تاسیس" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف "تجدید" کی ضرورت ہے کہ جن اصولوں کو ہم نے بھلا دیا ہے اُن کو دوبارہ زندہ کریں اور جس متاع کو حاصل کر کے گم کر دیا ہے اس کے سراغ میں پھر نکلیں۔ ہمارا جیب و دامن آج کی طرح ہمیشہ خالی نہ تھا۔ اگر آج اوروں کے پاس لعل و جواہر ہیں تو ہمارے پاس بھی اس کی کانیں تھیں۔ آج اگر ہم مفلس ہیں تو دوسروں کے لعل و جواہر پر نظر حسرت و طمع سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو اپنی گم کردہ کانوں کے سراغ میں نکلنا چاہئے جن کی دولت لازوال تھی اور ہمیشہ لازوال تھی" (ایضاً صفحہ ۸)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی جماعتی زندگی کی تنظیم اپنی مساجد سے شروع کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی تقلیدی رنگ کی تحریک مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہو سکتی (ایضاً ص ۹)

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کے لئے "تجدید" ہے یا "تاسیس"! کیا یہ تحریک مسلمانوں کی "حیات ملت اور حصول عظمت ملی" کے لئے ہی عمل میں لائی گئی ہے! کیا وہ لعل و جواہرات کی کانیں وہی تو نہیں جن کا آج اس تحریک کے علمبردار ان کھلے بندوں تمسخر و استہزا اڑاتے ہیں! کیا وہ آپ کے اٹل اور غیر متبدل اصول وہی تو نہیں جن کے مٹانے کی آرزو تحریک آزادی کے قائد اعظم کے دل میں دن رات موجزن ہے! (اس کا ثبوت ابھی آگے آئیگا)۔ کیا کانگریس میں شامل ہونے والے مسلمان "دوسروں کے لعل و جواہر کو نظر حسرت و طمع" سے نہیں دیکھ رہے! کیا اس تحریک سے آپ کو "اپنی گم کردہ کانوں کا سراغ" مل رہا ہے! کیا اس سے وہ تنظیم ملی عمل میں آرہی ہے جس کی ابتدا مساجد سے ہونی تھی!!

اللہ اکبر! انسان بھی ایک تماشہ ہے! جب اس کے مصالح اور رجحانات اس کی نگاہ کا ایک زاویہ بدل دیں تو وہ پھر کس قدر تضاد کا مجموعہ بن جاتا ہے اور کس طرح زہر کو آب حیات بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور کتنی جلدی بھول جاتا ہے کہ جب اس کی آنکھوں پر مصلحت کوشی کے رنگین چشمے نہ تھے تو سامنے کی چیزوں کے اصلی رنگ کیا تھے! یخٰدعون اللہ والذین آمنو۔ وما یخدعون الا انفسہم۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ جس چیز نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ کیا تھی۔ فرماتے ہیں۔

> "ایک بہت بڑی چیز جس کی ہم میں کمی ہے۔ تنظیمات عمل (آرگنائزیشن) ہے اور اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ایک مقصد مشترک سامنے ہو اور سب میں اس کے نام سے ایک رشتہ باہمی قائم ہو جائے" (ایضاً ص ۶)

آج اسی تنظیمات عمل (آرگنائزیشن) کا نام ہے "فرقہ پرستی" (COMMUNALISM) جو حضرت مولانا اور دیگر "قوم پرست" حضرات کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی معافی

نہ یہاں مل سکتی ہے نہ خدا کے حضور۔ پھر اُس وقت مقصد مشترک "حیات ملت اور عظمت ملی" تھا۔ اور آج وہ مقصد تمام اہل ہند کی ایک متحدہ قومیت" کی تشکیل ہے!

پھر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ اسلام کی رو سے مسلمانوں کے لئے صحیح نظام زندگی یہ ہے کہ ان کی اپنی جماعت ہو اور اس جماعت کا مرکز اُن کا اپنا امیر ہو۔ یہی جماعتی نظام مسلمانوں کے تمام "دینی اور دنیاوی" مسائل حیات کا فیصلہ کرے۔ اسلام کسی مخلوط جماعت کا قائل ہی نہیں۔ اس کے نزدیک ایمان اور کفر دو مستقل بالذات الگ الگ نظریۂ زندگی ہیں جن میں باہمی امتزاج ہو ہی نہیں سکتا۔ اب دیکھئے کہ حضرت مولانا کا اس اپنی جماعت کے متعلق کیا خیال تھا۔ ذرا غور سے سنئے۔ فرماتے ہیں:

"اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور "حیات جاہلی" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل آئے گا۔ (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب از مولانا آزاد)

اس کے بعد حضرت مولانا نے متعدد احادیث سے ثابت کیا ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا سیدھا جہنم میں پہنچا۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

"قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے۔ اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لئے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئت اجتماعیہ پیدا ہو۔" (ایضاً)۔

اس سے ذرا آگے ہے۔

"اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے..... سو ان تمام تصریحات میں بھی اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے۔ دیوار کا نام ہے۔" (ایضاً)۔

کیا حضرت مولانا اتنا ارشاد فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ مسلمانوں کی اس اجتماعی زندگی کا تصور آج کہاں چلا گیا! ان کی الگ جماعت کے اسلامی نظریہ کو آج کیا ہوا! یہ اسلامی "متحدہ قومیت" آج ہندی "متحدہ قومیت" سے کس طرح بدل گئی کہ جس کی اساس اسلام پر نہیں بلکہ وطن پر رکھی جا رہی ہے! یہ اجتماع کی بجائے افراد کی الگ الگ زندگی۔ جو کل تک قرآن و سنت کی رو سے "جاہلیت" کی زندگی تھی۔ آج کس طرح عین اسلامی زندگی بن گئی! یہ اسلامی "اینٹیں"، کہ جنہیں باہمی اتحاد و ائتلاف کے سیمنٹ سے مل کر ایک ایسی مستحکم دیوار۔ ایک ایسی بنیان مرصوص، بننا تھا جو کفر کی ہر بڑھتی ہوئی رو کا مقابلہ کر سکے۔ آج یہی اینٹیں۔ ایک ایک کر کے اس دیوار میں کیوں چنی جا رہی ہیں کہ جس کی بنیاد ہی یکسر غیر اسلامی ہے! کیا حضرت مولانا۔ معہ اپنے تمام رفقاء کار کے۔ کوئی ایک آیت۔ کوئی ایک حدیث ایسی پیش کر سکتے ہیں جس میں یہ لکھا ہو کہ ملت اسلامیہ کی یہ اینٹیں کسی دوسری ملت کی اینٹوں کے ساتھ ملکر ایک مخلوط دیوار بھی قائم کر سکتی ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ ہم حضرت مولانا۔ یا اُن کے دوسرے ہم مسلک مسلم قوم پرست حضرات کو کسی طرح بھی مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ان استفسارات کا جواب دیں۔ لیکن اگر انہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ قرآن و سنت کا بھی بالآخر کوئی حق ان پر واجب آتا ہے تو خدا کے لئے اپنی اس بے پناہ خاموشی کی مہر کو توڑیں اور ایک مرتبہ اتنا تو بتا دیں کہ اس تبدیلیٔ مسلک کی تائید میں کون سی سند ان کے پاس ہے! اس مسلک کی تبدیلی کے جواز میں جس کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ۔

"احادیث صحیحہ سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں۔ اور عہد صحابہ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کرونگا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ انی آمرکم بخمس اللہ امرنی بھن۔ الجماعۃ۔ والسمع۔ والطاعۃ۔ والھجرۃ۔ والجھاد فی سبیل اللہ۔ انہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ الا ان یراجع۔ ومن دعا بدعوی الجاھلیۃ فھو من جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ وان صام وان صلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم۔

یعنی فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کے لئے حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے آج دیا ہے۔ جماعت - طاعت - ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بیقیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ (حضور!) کیا ایسا شخص جہنمی ہو گا خواہ وہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو! فرمایا۔ ہاں۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزہ رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔"

اس کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

"پہلی چیز جماعت ہے۔ یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کر رہنا چاہئے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہئے۔ آگے چل کر شہرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہو گا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امر کے تابع نہ ہو۔ اسلام نے غیر اسلامی اور جاہلیت کی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی جماعت ہے" (ایضاً)

کیا حضرت مولانا کبھی رات کی تنہائیوں میں۔ دماغی مصلحت کوشیوں کو یکسر الگ رکھ کر۔ اتنا سوچیں گے کہ آج جس روش پر وہ خود گامزن ہیں اور جس پر چلنے کی وہ مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ وہ اُن کے اپنے ہی الفاظ میں کس قسم کی روش ہے! مسلمانوں کا اپنی جماعت کی تنظیم کرنا۔ اُن کا اپنے

مرکز قومی سے جڑ کر رہنا - یہ اسلامی زندگی ہے - یا ان کا ایک ایک کرکے ایک ایسی مخلوط جماعت میں جاکر جذب ہوتے جانا جس کے عناصر ترکیبی میں کوئی عنصر بھی اسلامی نہیں! کیا یہی مسلمانوں کا "اپنا مرکز قومی" ہے! ہم جانتے ہیں کہ آج بیچاری کمزور و ناتوان ملت اسلامیہ کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ ان حضرات کی مہر سکوت کو توڑ سکے - لیکن بالآخر ایک دن ایسا بھی تو آنے والا ہے جبکہ زبانیں خاموش ہونگی لیکن جسم کا ایک ایک حصہ گواہی دیگا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا! یہ قرآن وسنت کی تصریحات ہم اپنی طرف سے نہیں پیش کر رہے - یہ تو خود انہی حضرات کی پیش فرمودہ ہیں! کیا آپ سمجھتے ہیں ان سے قطعاً اس چیز کی بازپرس نہ ہوگی کہ ان تمام تصریحات کو خود ہی بیان کرنے کے بعد تم لوگ کس راستے پر چل پڑے اور دوسرے لوگ اس خیال سے کہ تم قرآن وسنت کے جاننے والے ہو- تمہارے تتبع میں تمہارے پیچھے ہو لئے - کیا ان سب کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد نہ ہوگی - ذرا قرآن کریم کو کھول کر دیکھئے کہ اس باب میں احکم الحاکمین کا کیا فیصلہ ہے! نہیں انہی حضرات کی زبانی سنئے - فرماتے ہیں -

"پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہوگیا - گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا - اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی - اگرچہ نماز پڑھتا ہوا اور روزہ رکھتا ہو- اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" (ایضاً)

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ یہ ان حضرات کی شان میں سوء ادبی ہو جائیگی - جب خدا اور اس کا رسول یہ کچھ فیصلہ کر رہا ہو تو ہمیں کسی اضافہ کی کیا ضرورت ہے - اب یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ مسلمانوں کے لئے راہ عمل کیا ہے - فرماتے ہیں -

"مسلمانوں کے لئے راہ عمل" ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے - یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں جس میں وہ

ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے ہیں۔ جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک "جماعت" بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اُس گلے کی طرح ہیں جس کا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔" (ایضاً)

ایسی غیر اسلامی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

"قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔" (ایضاً)

ہمیں بالعموم بتایا یہ جاتا ہے کہ صاحب! مسلمانان ہند کے سامنے دو چیزیں ہیں۔ ایک تو اپنی جماعتی تنظیم اور دوسرا ہندوستان سے انگریزوں کا نکالدینا۔ چونکہ انگریزوں کی غلامی بہت بڑی لعنت ہے اس لئے مقدم یہ مسئلہ ہے۔ جب یہ حل ہو جائیگا تو پھر مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا سوال ہاتھ میں لے لیا جائیگا۔ آج یہ دلیل دی جاتی ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ دلیل بڑی محکم ہے۔ لیکن۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ خود حضرت مولانا کو اقرار ہے کہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔ اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اب فرمائیے کہ مقدم جماعتی زندگی کی تنظیم ہوئی یا انگریزوں کا ہندوستان سے نکالنا۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ کانگریس کے ساتھ مل کر آپ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے لیکن جب آپ آزاد ہونگے تو اُس وقت ملت اسلامیہ کہاں ہوگی! وہ تخم ہلاکت جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے۔ "پوری قوم کی قوم" تباہ نہ کر چکا ہوگا۔ اُس وقت کی آزادی سے آپ کو خوشی کیا ہوگی! پچھلے دنوں لندن میں ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے ایک معرکۃ الآرا اپریشن کیا۔ اپریشن بڑا نازک تھا۔ تمام دنیا کے اہل فن حضرات کی آنکھیں نتیجہ کی طرف لگ رہی تھیں۔ وہ اپریشن سے فارغ ہوا تو ساری دنیا میں مسرت کے تار آئے

کہ اپریشن بڑا کامیاب رہا۔ نہایت صفائی سے نازک ترین مراحل طے ہو گئے۔ البتہ صرف اتنا ہوا کہ مریض چل بسا۔ اسی قسم کے اپریشن میں یہ حضرات مصروف ہیں اور پھر متمنی ہیں کہ قوم ان کی خدمات جلیلہ کی شکر گذار ہو۔ کیا ان حضرات کو اتنا بھی علم نہیں کہ انگریزوں کی غلامی میں مسلمان اسی لئے آگئے تھے کہ ان میں جماعتی زندگی کا فقدان ہو چکا تھا۔ اور اب "مسلمان" غلامی سے نکل بھی اسی وقت سکیں گے جب ان میں نظام جماعتی پیدا ہو گا۔ "ہندوستان کی آزادی" اور "مسلمانوں کی زندگی" مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ جس تشتت وافتراق۔ جس "جماعتی زندگی کی معصیت" کے دور سے مسلمان آج گذر رہے ہیں۔ اس کا تو لازمی نتیجہ بقول حضرت مولانا۔ پوری کی پوری قوم کی تباہی ہے۔ جب قوم ہی نہ ہو گی تو آزاد کون ہو گا! مسلمانوں کی آزادی کا مفہوم تو یہ ہے جو خود حضرت مولانا نے اپنے مسلک قومیت پرستی سے پیشتر ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔

> "اسلام میں حق امر و حکم کسی کو نہیں۔ وہ دنیوی انتظام و حکومت میں جب کسی ایک فرد کے استبداد کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ "ان الحکم الا للہ" تو اس کے احکام دینیہ کیونکر تابع آرا ءاشخاص و جماعت مخصوصہ ہو سکتے ہیں! اس نے یہ حق صرف قرآن کو دیا ہے۔ یا پھر دنیوی امور میں اس اجماع کو جو تمام مسلمانوں کی اکثریت رائے سے عبارت ہے۔" (الہلال۔ ۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

اور اسی کا نام ہے "اسلامی نظام اجتماعی"۔

---

(۳)

یہاں پہنچکر آپ کے دل میں فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو گا کہ جب حضرت مولانا کے نزدیک چند سال اُدھر۔ اسلام نام ہی اس چیز کا تھا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت ہو۔ ان کی اپنی متحدہ ذمیت ہو۔ ان کا اپنا مرکز ہو۔ ان کے تمام معاملات اس نظام کی رو سے طے پائیں جو خاص قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی اپنی اکثریت کی رو سے وجود میں آئے۔ ان کے لئے کوئی ایسی

تحریک جوان کی احیائے ملی کے لئے عمل میں نہ آئی ہو۔ کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی خواہ اس کے مقاصد کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں۔ کوئی ایسی تحریک جوان کو انفرادی اور ملی حیات کے ہر شعبہ میں "مسلمان" بننے کی دعوت نہ دیتی ہو کبھی حق و صداقت کی تحریک نہیں ہوسکتی۔ جب حضرت مولانا کا ایقان اور ایمان یہ تھا۔ تو پھر آج یہ کیا ہوا کہ اُن کے نزدیک یہ تمام اصول مردود قرار پاگئے۔ اور انکی جگہ ایک ایسے مسلک نے لے لی جس کی روسے ان اصولوں کا نام تک لینا بھی جرم قرار پاگیا۔ اس کا جواب شاید آپ کو نہ مل سکے۔ لیکن آیئے ہم آپ کو تھوڑا سا سراغ دیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہیں۔ سو قرآن کریم کی وہ آیات جنکی روسے وہ پہلے اصول اسلامی ثابت کیا کرتے تھے بعد میں منسوخ ہو گئے۔ لیکن یہاں پھر یہ مشکل آپڑے گی کہ منسوخ آیات کا تو آپ کو پتہ مل جائیگا۔ لیکن یہ پتہ نہیں مل سکیگا کہ ناسخ آیات کون سی ہیں۔ اس لئے کہ جسے حضرت مولانا نے یہ نیا مسلک اختیار فرمایا ہے۔ اس مسلک کی تائید میں آج تک کوئی آیت وحدیث پیش نہیں کی۔ لہٰذا یہ ناسخ آیات آپ کو قرآن کریم میں نہیں ملیں گی۔ بلکہ ان ناسخ احکام کا ماخذ کچھ اور ہے ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

اصولی چیز تو یہی ہے تا کہ مسلمانوں کی الگ جماعت اور اپنی متحدہ قومیت ہونی چاہئے۔ اسکے متعلق ارشاد ہے۔

> ہندوستان میں **مسلم قومیت** پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے! بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے۔ جو یکجا نہیں منتشر ہے۔ مبہم ہے اور غیر متیقن ہے۔ اب سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار رہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے"
>
> ......**مسلم قومیت** کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس **مذہبی اخوت** کا رشتہ ہی ایک چیز ہے اس لئے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پاسکے"

(میری کہانی۔ از پنڈت جواہرلعل نہرو۔ جلد دوم ص۳۳۳)

آیا آپ کے خیال میں کہ یہ "مسلم قومیت" کا نظریہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کے نزدیک "لغو" کیوں قرار پاگیا اور آگے بڑھئے۔ ارشاد ہے۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے

(خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء۔ از پنڈت جواہر لعل نہرو)

کس قدر حسرت اور کتنا استعجاب ٹپکتا ہے اس فقرہ سے کہ "ابھی تک ایسے لوگ زندہ ہیں" گویا ان کے نزدیک زندہ رہنے کا حق صرف انہی کو ہونا چاہئے جو اس دقیانوسی خیال سے توبہ کرکے ان کی ہمنوائی میں فتوے صادر کردیں کہ مسلمان کوئی الگ قوم و ملت نہیں ہے۔ آج قومیت کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ اوطان پر رکھی جاتی ہے۔

"مسلم قومیت" کا تصور۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) ہے۔ اور یہی خصوصیت ہے جو اسلام کو دیگر ادیان سے متمیز کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے قوم پرست حضرات مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اسی قسم کے مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے یہ نظریہ کہاں سے لیا ہے۔

پنڈت جی ارشاد فرماتے ہیں۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین۔ اور ترقی دشمن کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور

لوگوں سے بے جا فائدہ اُٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق آئینوالوں کی
بقا کا حامی ہے۔" (میری کہانی صفحہ ۱۶۱)

غور فرمایا' آپنے کہ یہ "منظم مذہب" کو مٹانے کی آرزو کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور چونکہ "منظم مذہب" دنیا میں صرف اسلام ہی ہے اس لئے بالفاظ دیگر "اسلام کو مٹانے" کی وہ آرزو کہاں سے پیدا ہو رہی ہے جس کی تائید ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کر رہے ہیں۔ اور آگے بڑھئے۔ ارشاد ہے۔

"منظم مذہب بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔" (صفحہ ۱۶۷)

ملاحظہ فرمایا آپنے۔ وہی مقصد اسلامی جسے حضرت مولانا "احیائے ملی" سے تعبیر فرماتے تھے اب ایک ایسے گھناؤنے جذبے کا نام ہو گیا جسے مستقل اغراض سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور اس نظریہ کو "ترقی" کا دشمن کہا جاتا ہے۔ گویا ترقی یہ ہے کہ "منظم مذہب" اسلامی جماعتی نظام کا وجود دنیا میں نہ رہے۔

وہی "مسلم قومیت" جس کے متعلق حضرت مولانا پورے ایقان و بصیرت سے فرماتے تھے کہ عین اسلام ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔ اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (ایضاً صفحہ ۳۳۲)

اُمید ہے کہ حضرت مولانا نے سابق صدر کانگریس سے ضرور معافی مانگ لی ہو گی۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس "مسلم قومیت" کے تخیل کی اشاعت کے زیادہ تر یہی ذمہ دار تھے۔

مضمون بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس لئے ہم سردست اتنے ہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ انہی سے آپنے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارے مسلم قوم پرست حضرات نے جو اپنا رُخ "کعبہ" سے پھیر کر "ترکستان" کی طرف کر لیا ہے وہ کس "قبلہ نما" کی سوئی کے رُخ کو دیکھ کر کیا ہے۔ تاسف صرف اس چیز کو دیکھکر ہوتا ہے کہ امیال و عواطف انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ وہی مولانا آزاد جو لاہور کی انجمن کے ایک ریزولیشن کو دیکھکر سراپا آگ ہو جاتے تھے اب کچھ ایسے بیٹھے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اپنی آنکھوں سے پڑھ رہے ہیں۔ اسلامی محکمات کا یوں تمسخر اڑتا دیکھ رہے ہیں۔ اور ایک لفظ احتجاج کا نہ اُن کی زبان سے نکل سکتا ہے نہ قلم سے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں۔ بلکہ وہ تمام مسلمانانِ ہند کو علاً بتا رہے ہیں کہ وہ راستہ جو اس کانگریس کا تجویز فرمودہ ہے جس کے قائد اعظم کے خیالات آپنے ملاحظہ فرمائے ہیں وہی راستہ دین کی "صراط مستقیم" ہے۔ اور اس کے علاوہ جو بھی راستہ ہے۔ باطل کا راستہ ہے۔ اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ ہمارے دُکھے ہوئے دل کی آہیں۔ سرمد مرحوم کی ایک رباعی کی شکل میں حضرت مولانا اور ان کے دیگر ہم مسلک علمائے کرام کی خدمت میں شرف پذیرائی حاصل کر لیں۔ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

سرمد رہ دین را عجب شکستے کردی　　　ایماں بہ فدائے چشم مستے کردی
با عجز و نیاز جملہ نقد خود را　　　رفتی و نثار بت پرستے کردی

یہ چیز تو آپنے دیکھ ہی لی کہ اسلام کی رو سے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت۔ اپنا مرکز اور اپنا نظام ملی ہونا اسلام ہے۔ یہ نہیں ہے۔ تو اسلام بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت کا ملک کی دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل کیسے ہوگا! ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے یہ کس شکل میں ان سے تعاون کر سکیں گے۔ ایسی مخلوط آبادی میں یہ اپنے نظام ملی کو کس صورت میں قائم رکھ سکیں گے! انشاءاللہ ان تمام سوالات کے جواب ہم کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرینگے۔ اور نہایت واضح طریق سے پیش کرینگے۔ لیکن اس وقت آپ پورے اطمینان و یقین کے ساتھ اس اساسی اور بنیادی چیز کو سمجھ لیجئے کہ اسلام نام ہے مسلمانوں کی اپنی الگ جماعت کا۔ اپنے مرکز کا اور اپنے نظام ملی کا۔ یہ اصول ہے۔ باقی تمام مسائل فروعات ہیں۔ فروعات کا حل ہمیشہ اصول کی روشنی میں تلاش کیا جاتا ہے۔ اصول گم کرکے فروعات کے حل تلاش کرتے پھرنا ایسا ہی ہے جیسا اس جسم کے پھوڑے پھنسیوں کا علاج کرنا جس جسم سے سر کٹ کر الگ ہو چکا ہو۔ وفیہا آیات لقوم یعقلون۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست؟

(از جناب سید بشیر الدین احمد صاحب صفائی ای ارکونم)

انسان کو ثبات کی طلب ہے اور وہ اس دنیا میں ہمیشہ سے کسی نہ کسی دستور حیات کا طالب رہا ہے، دنیا کے مختلف مذہبوں اور مفکروں نے حیات کے مختلف نظریے پیش کیے ہیں، جنسے وہ بلا واسطہ اور بالواسطہ متاثر ہوا ہے۔ اُسکے آگے دو راستے کھلے ہیں:۔ (۱) دانش نورانی — وحی والہام کا راستہ اور (۲) دانش برہانی[1] — فلسفہ کا راستہ۔ مولانا جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مسجد فاتح سلطان محمد، ترکی کی تاریخی تقریر میں نظام عالم کو ایک زندہ جسم مختلف اعضا کو پیشوں، دماغ کو بادشاہ اور دل کو فلسفہ یا وحی سے مناسبت دی تھی، اور اُسکے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ پیغمبری خدا کی دین ہے، اور فلسفہ اکتسابی چیز ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ علماء نے اپنی مخصوص کج نگاہی سے کام لیکر اس تقریر کی کیا کیا غلط تاویلیں کھینچ نکالی تھیں، ہمیں یہ حقیقت سامنے رکھنی چاہیے کہ فلسفہ عقل کی معیت میں چلتا ہے اور یہ راستہ اسقدر پیچ در پیچ ہے کہ کبھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ علاوہ بریں وحی اور

---

[1] "دانش نورانی" بھی دلائل و براہین کی بنا پر ہی دعوت دیتی ہے البتہ اُسکے دلائل و براہین یقین پر مبنی ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی طرح ظن و قیاس پر نہیں۔ وہ فلسفہ جس کا ماخذ قرآن ہو خود "دانش نورانی" کے ذیل میں آجاتا ہے۔ سید صاحب کا بھی غالباً یہی مفہوم ہے۔ طلوع اسلام

وحی میں فرق ہے اور اسی طرح فلسفہ اور فلسفے میں فرق ہے ایک وحی وہ ہے جو آزادی و آفاق گیری کے لیئے نوع انسانی کو تیار کرتی ہے، اور ایک وہ ہے جو علانیہ محکومی و غلامی کی تبلیغ کرتی ہے ایک فلسفہ وہ ہے جو حقایق زندگی پر نظر رکھتا ہے، اور ایک وہ ہے جو موت کو اپنا مقصودِ نگاہ قرار دیتا ہے، ہماری زبان کے زندۂ جاوید شاعر، حضرت اکبر مرحوم کا شعر ہے ؎

ایک فلسفہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

تارِ عنکبوت قابلِ التفات نہیں زمانہ ہمیشہ سے اس امر کا طالب رہا ہے کہ اقوام تیغ یا سکوت مین سے کسی ایک کا اپنے لیئے انتخاب کرلیں۔ اور اب مسلمانوں کے آگے یہی مسلہ درپیش ہے کہ وہ اغیار سے تیغ تازی کا لوہا منوایں اور وہ اپنی زندگی برقرار رکھین یا عجمی سکوت اختیار کرلیں اور افیم چیون کی بہشت کے عوض اپنی زندگی اغیار کے ہاتھوں فروخت کردیں، فلسفۂ سکوت کو لیجیے مشرقی اور خصوصاً عجمی ادب و شعر پر اس فلسفے نے کافی سے زیادہ اثر کیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی شاعر یا ادیب جب آنکھ کھولتا ہے تو اُسے ہر چہار جانب موت ہی نظر آتی ہے، اور تباہی و بربادی جو ہمیشہ اُسکے سر پر منڈلاتی رہتی ہے اُس کی ہر خواہش کو پیدا ہوتے ہی ہڑپ کرجاتی ہے چنانچہ یہ بے چارہ حکیمانہ انداز میں دُنیا سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی نصیحت کرتا ہے اور مرگ آرزو کی نوحہ خوانی میں اپنی عمر صرف کردیتا ہے ۔ مثلاً شاپور طہرانی نالہ کنان ہے

جز غصۂ فلک حوالۂ ما نکند — جز لخت جگر نوالۂ ما نکند
یک جرعہ بما نمی دہد ساقیٔ دہر — تا خون بدل پیالۂ ما نکند

خواجہ حافظ تلقین کرتے ہیں ۔

رموز مملکت خویش خسروان دانند — گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اور پھر دُنیا سے کنارہ کشی کی یوں تاویل کرتے ہیں۔

دلا در جہان دل منہ زینہار	کہ کس بر سر پل نہ گیرد قرار
ہماں مرحلہ است این بیابان دو	کہ گم شد در و لشکر سلم و تور
کجا رائے پیران لشکر کشش	کجا شیدۂ ترک خنجر کشش
نہ تنہا شد ایوان و کاخش بباد	کہ خاکش ندارد کسے ہم بباد

ہماری زبان کے مشہور صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ فرماتے ہیں

باید کہ ز فکر زندگانی گذری	وز حرص ہوائے کامرانی گذری
اے دردؔ ز اندیشۂ عالم بگذر	زاں پیش کہ زین جہان فانی گذری

شاہ رکن الدین محمود سنجانی نے تو غضب ہی کر دیا ہے:۔

مردان خدا میل بہ ہستی نمی کنند	خود بینی و خویشتن پرستی نہ کنند
آنجا کہ مجردان حق می نوشند	خمخانہ تہی کنند و مستی نہ کنند
در راہ چنان روکہ سلامت نہ کنند	با خلق چنان زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چنان کہ ترا	در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

شہنشاہ جہانگیر کو شاید شاعروں کی صف میں نہیں لایا جا سکتا، لیکن ذیل کی رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی روحانیت زندگی کو کس نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اے آنکہ غم زمانہ پاکت خوردہ	اندوہ دل و سوسہ ناکت خوردہ
مانندہ قطرہ ہائے باراں بزمیں	جا گرم نہ کردہ کہ خاکت خوردہ

اسی طرح داراشکوہ کا یہ شعر کہ:۔

با دوست رسیدیم چو از خویش گذشتیم	از خویش گذشتن چہ مبارک سفرے بود

اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اُسکے دل و دماغ پر گوسفندانہ افلاطونیت کا کس قدر اثر تھا۔

بعض عربی شعراء کے متعلق ڈاکٹر ڈوزر رقمطراز ہے۔

"بد صورت ابوالعتاہیہ اپنی شیریں بیان شاعری میں قریب قریب ہمیشہ ناکام محبّت اور آرزوے مرگ کا ذکر کرتا ہے وہ اپنی حکمت کا اظہار اس شعر میں کرتا ہے۔

عقل کو شک کی پیروی کرنے دو

گناہ سے بچنے کی سب سے بہتر تدبیر ترک تعلقات ہے۔ جس شخص کو مسائل زندگی اور فطری شاعری سے ذرا بھی مناسبت ہے، اسے اس شاعری میں جو دُنیا کے زوال پر آنسو بہاتی ہے اتنی ہی بے لطفی ہوگی جتنی متنبی کے کلام سے متنبی کے اشعار صُوری حیثیت سے دل کش ہیں مگر معنوی حیثیت سے بالکل پھیکے۔ اسی طرح ابوالعلا معری کو فلسفی شاعر کی حیثیت سے اُسکے استحقاق سے بڑھکر جگہ دی جاتی ہے۔ نہ تو اُسکے خیالات جن میں سے بعض معقول، اور قابلقدر بھی ہیں، کو فلسفہ کہہ سکتے ہیں اور نہ اُنکے عامیانہ طرز ادا کو شاعری۔ (وہ اندھا اور مفلس تھا تو) ماہر لسانیات یا مؤرخ کی حیثیت سے ادنیٰ درجے کی تنقید میں وہ کچھ کرسکتا تھا لیکن اُسے سُوجھی کیا کہ بجائے ولولۂ حیات اور جوش عمل کی رُوح پھونکنے کے وہ ترکِ دُنیا کا وعظ کہنے لگا"[1]

ادب و شاعری کے اس فرسودہ حصّے کا اگر زندہ و محرک حصّے سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پستی و بلندی اور تاریکی و روشنی میں کیا فرق ہے۔ معاملہ شناس سعدیؒ یہ دانشمندی کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"بجائے اسکے کہ دوسرے تجھے دق کریں،
تو دوسروں کو دق کر . . . .
اگر باز تیرے ہاتھ سے نکل جائے
تو کنجشک ہی کو غنیمت جان

---

[1] فلسفہ اسلام مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین [2] فلسفۂ اسلام مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین

اگر دینار نہ ملے۔

تو درہم ہی پر قناعت کر،

خیام و حافظ کی قبیل کے شعراء کی شب پرستی و سرپذیری کے مولانائے روم اپنی حق پرستی۔ و سربلندی کا مقابلہ بدیں الفاظ کرتے ہیں:۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم　چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور جہاں دوسرے شعراء مرگ آرزو کی مرثیہ خوانی اور ترکِ علائق کی تلقین و تبلیغ میں مصروف ہیں، وہاں مولانا کس بلند آہنگی سے فرماتے ہیں،

زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت　شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

حضرت نظامی گنجوی علیہ الرحمہ نے ذیل کے شعر میں گویا مجاہدانہ روح کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے:۔

چوں شیران بہ سرپنجہ بکشائے چنگ　بچو رو بہ میالائے خود را بہ رنگ

اور انکے اس شعر کی داد ——

من آنکہ عنان بازپیچم ز راہ　کہ یا سر دہم یا ستانم کلاہ،

کچھ ٹیپو سلطان شہید، صلاح الدین اور نپولین جیسے دل و دماغ ہی دے سکتے ہیں۔

ایک شاعر شہید طہرانی اعتراف کرتا ہے کہ اُسنے سر پیٹنے کی بے ہودگی سے اپنے ہاتھوں کو اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ کوئی مفید کام کر سکیں۔

بے ہودہ دست بر سر خود عمرہا زدم　کارے ز دست نامدو دستم ز کار ماند

بعینہ یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو قنوطی نقطہ نگاہ سے زندگی مطالعہ کرتے ہیں اور اسکے برعکس ان لوگوں کی حالت ہے جو درد سے درمان کا کام لیتے ہیں اور چمن میں زندگی بسر کرنے کے لیئے خارِ آشنائی کے گر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں +

درد سے درمان کا کام کس طرح لیا جاتا ہے، اس کی ایک مثال ہمیں شوپنہار اور
نٹشے کے فلسفے کے موازنہ سے مل سکتی ہے۔ دونوں کا فلسفہ "ارادیت" (Voluntarism)
سے تعلق رکھتا ہے، اور دونوں حقیقت یا منتہٰی (Ultimate Reality) کو عزم
یا ارادے (Will) سے تعبیر کرتے ہیں، آگے چلکر شوپنہار ارادے کو ایک غیرعقلی ارادۂ
عامہ (Individual Will) قرار دیتا ہے، چنانچہ اُسکے نزدیک ارادۂ شخصی
(Individual Will) کوئی چیز نہیں کیونکہ فردیت محض التباس ہے، زندگی ناتمام
آرزوؤں کی ایک دکھبھری کہانی ہے، اور بہتر یہی ہے کہ انسان کوئی آرزو ہی نہ کرے
التباس فردیت اور آرزوؤں کے دردناک انجام کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور زندگی کو فن کا
ایک کارنامہ تصور کرے۔ شوپنہار کے برعکس نٹشے ارادے کو خواہش اقتدار یا عزم للقوۃ
(Will To Power) قرار دیتا ہے، آگے چلکر وہ شوپنہار سے اتفاق کرتا ہے کہ واقعی
دنیا آلام و مصائب کے بندھنوں میں اُلجھ گئی ہے لیکن اُسکے نزدیک یہ مرض لاعلاج
نہیں۔ وہ تجرد اور قنوطی زندگی کے خلاف جدّ و جہد اور پُرخطر اور بہادرانہ زندگی کی تعلیم
دیتا ہے، کیونکہ جہد للبقا فوق البشر انسانوں کو سطح کا ریپر لاتی ہے، جو ساری مشکلات
کا حل ہیں لیکن نٹشے چونکہ منکر خدا ہے اس کی نظر محدود رہ گئی ہے اسکا زور جنون فوق البشر
کے ظہور کے لیئے اعلیٰ و ادنیٰ انسانوں کی تفریق روا رکھتا ہے اور وہ فوق البشر کو ابدی
تکرار (Eternal Recurrence) کے چکر میں اُلجھا دیتا ہے، بہرحال نٹشے کی تعلیمات
نے یورپ کی سرد مہری دُنیا میں ایک آتشین ذہنی انقلاب برپا کیا جو (یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ)
بڑی حد تک نفسیات آمریت کا ذمہ دار ہے۔

"زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اس کی
اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی
جب تک کہ اُسکا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو

قرآن مجید نے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ (دیباچۂ پیامِ مشرق)
سوال یہ ہے کہ ایک نئی خارجی دُنیا کی تشکیل کن اُصولات پر کیجائے" یہ کام کون کرے، اور پھر اسکا وجود عوام کے ذہن میں کس طرح متشکل کیا جائے؟ وحی اصولات کا تعین کرتی ہے اور فلسفہ فروعات کی تعمیر و ترتیب میں مدد دیتا ہے" اور اس لحاظ سے صحیح وحی کے ساتھ نوعِ انسانی کو صحیح فلسفہ کی بھی ضرورت ہے۔ غرض ایک دیدہ ور فلسفی ہی، جسکا فلسفہ ادب خوردۂ دل، ہو اس کی تشکیل میں عہدہ برآ ہوسکتا ہے اور ایک نکتہ رس شاعر جسکے دلی جذبات اور دماغی افکار میں توازن ہو اسکا وجود ضمیرِ انسانی میں مؤثر طور پر متشکل کرسکتا ہے۔ کسی قوم کی یہ بڑی خوش قسمتی ہوگی، اگر کسی شخصیت میں شاعر اور فلسفی کی یہ دونوں صفتیں بہ یک وقت موجود ہوں، ہمارے درمیان اس کی روشن ترین مثال قبلہ علامہ اقبال ہیں۔

اقبال کے نزدیک خودی کی فاعلیت کا نام حیات ہے، جسکا راز پیہم نئی آرزوئیں پیدا کرنے اور اُنکی تکمیل کے لیئے ادراک و حواس کی بدولت مادے کی مزاحمات و مشکلات پر عبور حاصل کرنے میں مضمر ہے۔ دوسرے الفاظ میں، یہ فاعلیت ایک مسلسل جد و جہد ہے، جس کی بدولت خودی کو توانائی و تنومندی حاصل ہوتی ہے

دادم رواں ہے یم زندگی ۔ ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی بدن کی نمود ۔ کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود!
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل ۔ خوش آئی اُسے محنتِ آب و گل

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ۔ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

صلہ یہ مضمون ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے محشر انگیز حادثہ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ طلوعِ اسلام

بہت اُسنے دیکھے ہیں پست و بلند　　سفر اسکو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیئے برگ و ساز　　سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
اُلجھ کر سُلجھنے میں لذّت اُسے　　تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُسے

درسرائے ہست دبود آئی ؟ میا　　از عدم سوئے وجود آئی ؟ میا
در بیابے چوں شرر آوارہ شو　　در تلاش خرمنے آوارہ شو،

چونکہ مادے پر عبور حاصل کرنے کے لیئے ہمّت و پامردی اور پُرخطر زندگی کی ضرورت ہے، شاعر مختلف انداز سے اسکی ترغیب دلاتا ہے۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست؟　　گفتا مے کہ تلخ ترا و نکوتر است

چمن خوش است و لیکن چو غنچہ نتواں زیست　　قبائے زندگیش از دم صبا چاک است
بہ خود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی　　چوں خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا　　زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش!

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟　　یکدم شیری بہ از صد سالہ میش

خودی کی حالت جد و جہد برقرار رکھنے (یعنی حیات ہی) میں، خودی کی تربیت اور بقائے شخصی کا راز پنہاں ہے ایک تربیت یافتہ خودی ہی بقائے شخصی کی مستحق ہوسکتی ہے کیونکہ غیر تربیت اور کمزور خودی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرسکتی۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی　　وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خودگر و خودگیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں، جسکا ذرّہ ذرہ فانی ہے، موت کا زبردست ہاتھ زندگی کے نقوش مٹاتا نہیں جا رہا ہے اور لہٰذا کیا موت قاطع حیات نہیں؟ اقبال کی حیرت انگیز ذہانت نے اس معمہ کو بہترین طریقے سے سلجھایا ہے۔

ہوا جب اسے سامنا موت کا کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اُتر کر جہانِ مکافات میں رہی زندگی موت کی گھات میں!
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج!
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات!
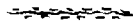
مزید براں ہمیں یہ فرض کر لینے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں کہ ہمارے جسم یعنے حیاتیاتی ڈھانچے کے مُردہ یعنی بے کار ہو جانے سے حیات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ہیلم ہولٹز (HelmRotz) نے ثابت کیا تھا کہ ہمارا شعور اعصابی برانگیختگی (Nervous excitation) کا فوراً احساس نہیں کر سکتا، لیکن اُسکے لیے وقت درکار ہے۔ لہٰذا یہ لازم آتا ہے کہ ہمارا موجودہ عضویاتی ڈھانچہ خودی کے موجودہ تصورِ زمان کا تابع ہے۔ لیکن خودی، موجودہ زاویۂ نگاہ کے علاوہ دوسرے زاویوں سے بھی زمان کا تصور کرنے پر قادر ہے۔ خواب میں ارتسامات (Impressions) کا بے اندازہ ارتکاز، اور موت کے حافظے کا حیرت انگیز ارتفاع جو بعض حالتوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے، اسکی دو مثالیں ہیں۔ لہٰذا موت کو ہم ایک ایسے عالم سے تعبیر کر سکتے ہیں جس میں خودی کو تصورِ زمان کا ایک خاص زاویۂ نگاہ حاصل ہوتا ہے، اور اس عالم کو قرآنی الفاظ میں "عالم برزخ" کہا جاتا ہے۔ خودی کو اس عالم میں حقیقت کے تازہ

اور نئے پہلوؤں کا احساس ہوتا ہے اور وہ اُنکے معانقے کے لیئے اپنے آپ کو تیّار کرتی رہتی ہے، یہ عمل اسوقت تک جاری رہتا ہے کہ اُس کو داخلی حیثیت سے حشر پیش آتا ہے اور وہ لا متناہی خودی کے مقابل پیش ہو جاتی ہے؛ اب اسکے گذشتہ اعمال و افعال اور آیندہ زندگی کی ممکنات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسکے بعد جہنم ایک حالت ہے، اور معیار انسانیت سے گرجانے کی ناکامی کا دردناک احساس؛ اور جنت مخالف و پریشان کُن طاقتوں پر فتح و کامرانی کے حصول کی بے پایاں مُسرّت؛ اب ہر لمحہ ایک تازہ جلوہ کا ظہور اور حقیقت کے ایک نئے احساس کا شعور ہوتا ہے، اسطرح انسان آگے بڑھتا جاتا ہے، اور زندگی کا کبھی نہ ختم ہونیوالا تسلسل قایم رہتا ہے:-

زندگانی انقلاب ہر دمے ست زانکہ او اندر سُراغ عالمے ست

مجموعی لحاظ سے، حیات، تربیت خودی اور بقائے شخصی کا محمود ترین لائحہ عمل ہمیں ذیل کے تین اشعار میں ملجاتا ہے، جس میں حضرت علّامہ نے ضرب کلیم کے ناظرین سے بدین الفاظ خطاب کیا ہے:-

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دستِ و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جلترنگ

اگر یہ سچ ہے کہ یہ اشعار کسی شاعر کی زبان سے نکلے ہیں تو انسان کی نگاہ اس بلندی کے تصور سے عاجز ہے، جہاں شاعر پہنچ گیا ہے!

حقایق

معتقدات ۔ خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ کچھ اس طرح انسان کے قلب و دماغ سے چپک جاتے ہیں کہ اُنکا چھڑانا گویا ایک افیمی سے نشہ چھڑانا ہوتا ہے مسلمانوں کی روایات پرستی ایک مشہور و معروف چیز ہے جس کی وجہ سے آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ جونہی کسی خدا کے بندے نے قرآن کریم سے کوئی ایسی حقیقت پیش کی جو اسلاف میں سے کسی مفسر کے قول یا کسی روایت کے خلاف جاتی ہو تو اس طبقہ کیطرف سے فوراً اسپر "منکرِ حدیث" اور "اہل قرآن" کا لیبل لگا دیا جاتا ہے تاکہ کوئی اسکے کہنے پر توجہ ہی نہ دے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری روایات کا مجموعہ ایسا ہے جسے کوئی بڑے سے بڑا روایت پرست بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتا۔ ہندوستان کے اہل حدیث طبقہ میں مولانا ابوالکلام آزاد ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں لیکن اسلاف کی تفسیروں میں جو روایات اور احادیث آتی ہیں اُنکے متعلق اُن کی تحقیق اور رائے قابل غور ہے۔ انھوں نے آیت من اظلم ممن منع مساجد اللہ . . . الخ کی تفسیر میں امام ابن جریر کی روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ۔

"ہم نے یہ روایتیں اس لیے نقل کیں تاکہ ہمارے علمائے کرام اندازہ کر سکیں کہ ہماری تفاسیر کی عام روایات و آثار کا کیا حال ہے اور کس طرح رطب و یابس اور غث و ثمین کا انہیں مجموعہ بنا دیا گیا ہے۔ امام ابن جریر اس جلالت و عظمت کے شخص ہیں کہ نہ صرف اپنے دور زماں میں بلکہ تاریخ اسلام میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں وہ صرف مفسر ہی نہیں بلکہ محدث بھی ہیں اور مورخ بھی۔ باایں ہمہ بلا ادنیٰ نقد و بحث کے ان روایات کو نقل کر کے ترجیح دے رہے ہیں جن کو ایک معمولی بچہ بھی۔ جسنے اسی کی تاریخ کے سوانح و سنین یاد کر لیے ہوں۔ بے اختیار موضوع کہدیگا۔ جب تفسیر طبری کا یہ حال ہے تو پھر اُن متداول تفاسیر و آثار کا کیا پوچھنا جنکے اقتباسات بغیر نقد و بحث کے علمائے حال کی زبان

پر ہوتے ہیں اور جو اسی سے ماخوذ ہیں

اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک کام جمع روایات تھا اور ایک نقد و انتخاب۔ پہلا کام پہلوں کا تھا اور دوسرا پچھلوں کا پہلوں نے اپنا فرض ادا کیا مگر پچھلوں نے غفلت کی۔

(الہلال۔ بابت ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

یہ تو تھا عام تفسیری روایات کے متعلق۔ اب اہل حدیث کے انہی امام صاحب کے خیالات مجموعۂ احادیث کے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے اور مجموعہ احادیث میں بھی کسی معمولی کتاب کے متعلق نہیں، بلکہ بخاری شریف کے متعلق: جو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ تسلیم کیجاتی ہے۔ اور جس پر تنقید کرنے کا خیال تک بھی دل میں پیدا ہونا اتنا بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے کہ جس کی شاید معافی ہی نہ مل سکے۔ بخاری شریف میں جو حدیث ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ (نعوذ باللہ) جھوٹ بولا۔ اس پر تنقید فرماتے ہوئے۔ حضرت مولانا قمطراز ہیں

"اگرچہ اُس کی توجیہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھولی ہیں مگر صاف بات یہی تو ہے جو امام ابو حنیفہؒ کیطرف منسوب ہے اور جسے امام رازی نے دُہرایا ہے یعنے ہمارے لیۓ تسلیم کرلینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہوگئی بمقابلہ اسکے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کرلیں۔ اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت ناقص ٹھہرجائے تو بہر حال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہوگی لیکن اگر ایک معصوم پیغمبر کو بھی غلط بیان تسلیم کیا گیا تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہوگئی" (ترجمان القرآن جلد دوم ص۴۹۹)

یہی الفاظ اگر کسی ایسے شخص کیطرف منسوب ہوتے جو بدقسمتی سے "اہلحدیث" نہ کہلاتا ہو تو پھر آپ دیکھتے کہ روایت پرست طبقہ کیطرف سے کس قدر محشر انگیز طوفان برپا ہوجاتا۔ حضرات اسلاف علیہ الرحمۃ کے علمی دینی خدمات ہر احسان شناس کے نزدیک موجب ہزار شکریہ ہیں لیکن یقین مانئے کہ غلطیوں کا امکان

اُن کے دور دزماں میں بھی ایسا ہی تہا جیسا آپکے زمانہ میں کیونکہ وہ خدا کے رسول نہ تھے ۔اس لیئے
کسی چیز کو اس بنا پر تنقید کی حد سے بالا تر قرار دیدیتا کہ وہ آپ کے زمانہ سے پہلے کہی جا چکی ہے
دین میں بڑا غلو ہے' اسلاف پرستی کی آڑ ہمیشہ وہ لوگ لیتے ہیں جو اتنے بلند حوصلہ نہیں ہوتے
کہ اپنی شکست کا اعتراف کرلیں، جب اُنہیں اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی دلیل نہیں ملتی تو
وہ تلاش کرتے ہیں کہ متقدمین سے کسی کا قول اُن کی تائید میں ملجائے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ
حقیقت' حقیقت ہے خواہ اُس کی تائید میں کسی ایک انسان کا بھی قول آپ کو نہ ملے' اور
باطل، باطل ہی ہے ۔خواہ سینکڑوں کتابیں اُسکے حق میں کیوں نہ ہوں ۔اگر آپ اِس چیز
کو سامنے رکھیں گے تو دین کے معاملہ میں بہت سی فتنہ پردازیوں سے محفوظ رہیں گے ۔

وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُول شَھِید
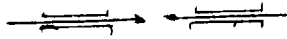
ترسیل زر کا پتہ

قارئین طلوع اسلام ترسیل زر میں احتیاط سے کام لیں اور جملہ رقوم
اس پتہ پر ارسال فرمائیں ۔

جناب حکیم ذکی احمد خانصاحب
جید پریس بلیماراں دہلی

بصائر

دیدہ ور

ملک صالح نجم الدین ایوبی سلطان مصر متوفی ۶۴۷ھ نے چرکسی غلام کثرت سے خریدے تھے تاکہ انکا ایک لشکر تیار کرکے صلیبیوں کے مقابلہ میں کام لے، جزیرۂ روضہ کے قریب انکو رہنے کے لیے زمین عطا کی تھی انھوں نے عظیم الشان محلات اور قلعے تعمیر کیے تھے۔ یہ لوگ چونکہ سخت جانباز اور بہادر تھے اور اُنسے بڑے بڑے کارنامے ظہور میں آئے اس لیے سلطان مصر نے اپنے وزراء امراء اور درباری اُنہیں میں سے منتخب کیے اسی زمانہ میں علامہ عز الدین بن عبدالسلام ملک شام سے مصر میں آئے، ملک صالح نے اُن کی تکریم کی اور انکو قضا کا عہدہ دیا۔ ملک صالح کے بعد ایک مقدمہ کے دوران میں قاضی موصوف کے نزدیک یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ یہ ممالک سلطان کے زرخرید ہیں اور آزاد نہیں کیے گئے ہیں اسلیے اعلان کرایا کہ اُنکے جملہ تصرفات خود مختارانہ از قسم بیع و شرا و نکاح و طلاق وغیرہ بوجہ عدم حریت ناجائز ہیں اور حکم بھیجا کہ وہ سب کے سب حاضر آئیں۔ میں انکو فروخت کرونگا۔ کیونکہ وہ اسلامی بیت المال کی ملکیت ہیں۔

ممالیک نے جب یہ سُنا تو قیامت برپا ہوگئی اسلیے کہ امارت۔ وزارت۔ سپہ سالاری وغیرہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے مناصب پہ وہی لوگ تھے، قاضی صاحب کو انکے احباب سمجھانے اور اسکے انجام سے ڈرانے لگے مگر انھوں نے مطلق توجہ نہ کی اور شرعی حکم کی تنفیذ پہ اڑے رہے +

نائب السلطنت نے غضب ناک ہو کر کہا کہ ہم روئے زمین کے ملوک ہیں۔ قاضی کی کیا مجال ہے کہ وہ ہمارے سامنے دم مارسکے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے ہاتھ سے اُس کی گردن ماردونگا۔ یہ کہہ کر اپنے اعوان وانصار کی ایک جماعت کو ساتھ لیئے ہوئے چلا، سب کے سب غصّے میں بھرے ہوئے اور ننگی تلواریں ہاتھوں میں لیئے ہوئے تھے۔ جب اُنکے گھر کے پاس پہنچے تو شور سُنکر اُنکا لڑکا باہر نکل آیا۔ کیفیت دیکھ کر سہما ہوا اندر بھاگا اور باپ کو مطلع کیا۔ نہایت بے پروائی سے بولے کہ تیرے باپ کا یہ رُتبہ کہاں کہ راہ حق میں اُسکا خون بہایا جائے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے +

نائب السلطنت کی نگاہ جب اُنپر پڑی تو جلال حق سے کانپنے لگا۔ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور رو کر بولا کہ یا مولانا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں فرمایا کہ تم لوگوں کو فروخت کرونگا۔ بولا کہ قیمت کون لے گا۔ جواب دیا کہ میں۔ اور اسکو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کرونگا۔ چنانچہ یہی کیا۔ اور سر بازار اُن سب کو فروخت کرا دیا۔

قاضی عزالدین اربابِ حال میں سے تھے اور اُنکا لقب سُلطان العلماء تھا +
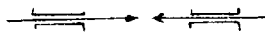
قاضی عزالدین پہلے دمشق میں قضا کے عہدہ پر تھے وہاں کے امیر اسمٰعیل نے جب صلیبیوں کو صیدا و قلعۂ شقیق دینے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملایا۔ اسوقت اُنھوں نے اعلان کیا کہ خطبوں میں سے اسمٰعیل کا نام نکالدیا جائے۔ وہ یہ سُنکر غضب ناک ہوا۔ اسلیئے یہ دمشق چھوڑ کر مصر کیطرف چلے، چونکہ نہایت محترم تھے اسوجہ سے اُمرا اور اعیان شہر نے روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہم اسمٰعیل کو راضی کر لینگے آپ ہمارے ساتھ چلکر صرف اس کی دست بوسی کر لیجئے۔ فرمایا کہ میں تو اس پر بھی راضی نہیں ہوں کہ تمہارا امیر میری دست بوسی کرے چہ جائیکہ میں خود اسکا ہاتھ چوموں۔ اللہ کا شکر ہے جسنے اس آفت سے مجھ کو پناہ میں رکھا ہے جس میں تم لوگ مبتلا ہو۔ جاؤ۔ تم دوسرے عالم میں ہو اور میں دوسرے عالم میں۔

جب یہ مصر میں آکر قاضی ہوئے اس زمانہ میں سلطانی حاجب امیر فخر الدین جسکے ہاتھ میں سلطنت کی باگ تھی ایک مسجد کے دروازہ پر بالاخانہ بنایا تھا جسپر نوبت بجائی جاتی تھی قاضی موصوف نے جب اسکو دیکھا تو فوراً توڑنے کا حکم دیا اور امیر فخر الدین کے ناقابل شہادت ہونے کا اعلان کردیا۔ اور یہ خیال کرکے کہ اسکی مخالفت میں میں اپنے منصبی فرائض ادا نہ کرسکونگا۔ استعفا لکھ کر بھیجدیا اور عدالت سے چلے آئے۔ ملک صالح کو جب علم ہوا تو اس نے خود جاکر اس بالاخانہ کو گروادیا اور انکو راضی کرکے دوبارہ مسند عدالت پر لایا۔

فخر الدین اور اُسکے رفقاء سمجھتے تھے کہ قاضی کے اعلان کا ہمارے اوپر کیا اثر ہوسکتا ہے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اسی دوران میں ملک صالح سلطان مصر نے خلیفۂ بغداد مستعصم کے پاس کسی امر خاص کے متعلق سفارت بھیجی۔ سفیر نے وہاں پہونچکر جب خلیفہ کو پیغام سنایا تو خلیفہ نے دریافت کیا کہ اسکو تم سے سلطان نے خود کہا تھا یا کسی اور نے۔ سفیر نے جواب دیا کہ امیر فخر الدین نے۔ خلیفہ نے کہا کہ عزالدین نے اسکو ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے اسلیئے اس کی روایت کو ہم قبول نہیں کرسکتے مجبوراً سفیر نے واپس آکر سلطان کی زبان سے پیغام لیا۔ اور بغداد جاکر خلیفہ سے جواب لایا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ قاضی شرف الدین بن عین الدولہ کا ہے جو مصر میں قاضی تھے ان کی عدالت میں ملک کامل سلطان مصر کسی مقدمہ میں شہادت میں طلب ہوا۔ وہ چونکہ روزانہ ایک مغنیہ کا گانا سُنا کرتا تھا۔ اسوجہ سے قاضی موصوف نے اُس کی شہادت لینے سے انکار کردیا۔ اسپر اُسنے قاضی کی شان میں سخت کلمہ استعمال کیا۔ قاضی نے کہا کہ یہ عدالت کی توہین ہے۔ اور اسی وقت اپنی برطرفی کا اعلان کرکے مسند سے اُٹھ کر چلے آئے سلطان نے مجبوراً جاکر معافی چاہی اور انکو راضی کیا۔ کیونکہ اسکو اپنی بدنامی اور نامقبولیت کا خطرہ ہوا۔

(تاریخ الامت حصہ ششم)

تکلّف برطرف

رازی

غالب مرحوم نے پتہ نہیں کس عالم میں یہ کہا تھا کہ — وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اُس کی حقیقت اور نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں مسئلہ شہید گنج سے متعلق جب ملک برکت علی صاحب نے ایک بل کا مسودہ پنجاب اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تو اس بل کو مسترد کر دیا گیا۔ یہ ظاہر تھا کہ گورنر پنجاب کے اس فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کے غیظ و غضب کا کیا عالم ہوگا۔ لیکن وفاشعاران ازلی آگے بڑھے اور انھوں نے سینہ سپر ہو کر اعلان کر دیا کہ اس میں گورنر صاحب کا کوئی قصور نہیں، انہیں تو ہمیں نے مشورہ دیا تھا کہ ایسا کریں۔

یہ تو وفاداری بشرط استواری، کا ایک واقعہ تھا۔ اب ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

مہاتما گاندھی نے جب مسٹر جناح سے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں باہمی مفاہمت کی گفت و شنید شروع کی تو بعض مسلم طلقوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ مسلمانوں میں ذرا اجتماعی زندگی کا احساس پیدا ہوا ہے اس لیے وہ کانگرس جو ملک میں حکومت اور اپنے سوا کسی جماعت کا وجود تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اب لگی ہے لیگ کے صدر سے مفاہمت ضروری سمجھنے اس خیال کی اشاعت سے چونکہ ہندوؤں کی خودداری کو ذرا ٹھیس لگتی تھی۔ اس لیے ایک اور "وفاشعار ازلی" آگے بڑھے اور انھوں نے سینہ سپر ہو کر اعلان فرما دیا کہ کون کہتا ہے کہ ہندو جھک کر مفاہمت کیطرف بڑھے ہیں یہ تو میں نے اُن کی منت سماجت کی تھی۔

سچ ہے "تُوڈیت" اور "رئیس الاحراریت" میں فرق صرف آقاؤں کے نام بدل دینے کا ہے ورنہ :۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی ۔ نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللّٰہی ۔ وہی مرحبی وہی عنتری

انھوں نے اپنا مقدس فریضہ ادا کردیا ۔ اب مسٹر جناح پڑے اعلان کرتے پھریں کہ یہ بالکل غلط کہتے ہیں بلکہ مسٹر جناح کی اس تردید سے تو اُن کی اِس خدمتِ جلیلہ کا وزن اور بھی بڑھ گیا ہوگا ۔ کہ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند
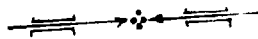
یادش بخیر مسٹر ساورکر ۔ پردہان ہندو مہا سبھا نے مہاراشٹر کی ادبی کانفرنس کے خطبہ صدارت کے دوران میں فرمایا کہ صدر کانگرس کی یہ تجویز کہ ہندوستان میں لاطینی رسم الخط رائج کردیا جائے بالکل مہمل ہے ۔ اس لیے کہ اس سے ہندوستان اور مغرب کے روابط کا سلسلہ اور بھی مستحکم ہو جائیگا ایک طرف تو ہندوستان اور یورپ کے رشتہ معنی کے استوار ہونے سے اسقدر نفرت لیکن دوسری طرف اپنے اس دعوے کی دلیل میں سند بھی یورپ ہی لاتے ہیں فرماتے ہیں

دیکھئے ڈی ویرا نے آئرستان کی آبادی کے بعد سب سے پہلا قدم آئرش کی زبان کی احیاء کیطرف اُٹھایا ۔ اسی طرح ہٹلر نے بھی جرمنی زبان اور کلچر کے تحفظ و تجدید کے لیے جہادِ عظیم کیا لہٰذا ہندو آزادی حاصل ہونے کے بعد اپنی زبان اور کلچر کی ترویج و اشاعت کیوں نہ کریں ۔

یعنی جو کچھ ہٹلر نے قوت حاصل ہونے کے بعد کیا وہی کچھ ہندو کرنا چاہتے ہیں جرمن آریوں نے سامی نسل کے یہودیوں کو نکال باہر کیا ۔ بھارت ورش کے آریہ سپوت ملیکش مسلمانوں کو ملک بدر کرنا چاہتے ہیں ۔

آخر میں فرمایا کہ زبان کا مسئلہ کچھ مشکل نہیں۔ ہندوستان کی قومی زبان وہی زبان ہو گی جو یہاں اکثریت کی زبان ہے۔ یعنے ہندی جس کی اساس سنسکرت ہو۔

ٹھیک! متحدہ قومیت کی زبان وہ جو اکثریت کی زبان ہو۔ اور اس سے آگے اسکا مذہب وہ جو اکثریت کا مذہب ہو۔

لیجئے۔ ہندو مسلم سوال حل ہو گیا۔ لوگ ان کاموں کے لیے تحقیقاتی کمیشن بٹھایا کرتے ہیں۔ ملک میں اگر ایسے دو چار ادرچھا چھکن" پیدا ہو جائیں تو بھارت ماتا کی آج مکتی ہو جائے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(مسٹر ساورکر نے غالباً یہ تو نہ سنا ہو گا کہ اسی ہٹلر نے زیکو سلاویکیا کے متعلق یہ بھی اعلان فرمایا ہے کہ وہاں کی جرمنی آبادی کو، جو نہایت اقلیت میں ہیں۔ اپنی زبان اور کلچر کی حفاظت کی کامل ضمانت ملنی چاہیئے!)

ہندوستان کے متعلق چونکہ یہ مشہور رہے کہ ایک مذہب پرست ملک واقعہ ہوا ہے۔ اس لیے یہاں ہر شئے کے خمیر میں مذہب کا چھینٹا ضرور دیدیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام بھی اسی چھینٹے سے خالی نہیں رکھا گیا۔ وہاں جمعہ کے دن صبح کے وقت قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد قوالی شروع ہو جاتی ہے۔ دن بھر مختلف اوقات میں محبوب قوال اور کلن قوال "مذہب پرست" حلقہ کی اس گلہ طرازی کی تردید کرتے رہتے ہیں کہ گورنمنٹ مسلمانوں کے امور کا کچھ خیال نہیں کرتی۔ حتےٰ کہ سہ پہر کو جو قوالی ہوتی ہے تو اس کا نام ہی "قوالی جمعہ" (FRIDAY CONCERT) رکھا گیا ہے +

مسلمانوں میں جمعرات "اہل طریقت" کا دن سمجھا جاتا تھا کہ جس دن عام مزاروں پر قوالیاں ہوتی ہیں اور جمعہ اہل شریعت کا کہ جس میں نماز وظائف کے سے خشک اعمال پر زور

دیا جاتا ہے۔ لیکن اب حکومت کی کرم فرمائی سے یہ امتیازات بھی مٹ گئے اور "طریقت و شریعت" کا دن ایک ہی ہوگیا۔ یہ ہیں برکاتِ عہدِ انگلشیہ۔ قوالوں کی ڈھولک کی آواز تو خیر مزار کے اردگرد ہی رہتی تھی لیکن محطّۂ نشر الصوت میں جو قوالی ہوتی ہے۔ اس کی ڈھولک کی آواز تو تمام دُنیا میں پھیلتی ہے اور اس طرح ہر جگہ تبلیغ کرتی ہے کہ یہ ہیں مسلمانوں کے مقدس دن کی خصوصیات۔ سچ فرمایا ہے فرمانے والے نے کہ۔

آ تجھ کو بتاؤں میں۔ تقدیرِ اُمم کیا ہے ! شمشیر و سناں اوّل۔ طاؤس و رباب آخر

(اقبالؒ)

لاہور کے ایک ادبی رسالہ میں جھوٹ کے عنوان سے حسبِ ذیل نظم شائع ہوئی ہے۔

موت کے بعد آئے گی،
اور بھی اک زندگی
جاودانی زندگی!
غیر فانی زندگی!
اک بہارِ بے خزاں
اک نشاطِ بیکراں
لذتیں کیفیتیں !
راحتیں ہی راحتیں !
کتنا دلکش ہے یہ جھوٹ !

یہ ظاہر ہے کہ نظم میں شعریت کے اعتبار سے کوئی رنگینی نہیں۔ ندرت بیانی نہیں۔ رفعت تخیل نہیں۔ صرف قافیہ بندی ہے۔ لہٰذا یہ شعر نہیں "حقایق" ہیں۔ اور اسی لئے شاید یہ شائع بھی کئے گئے ہیں لیکن کچھ علم بھی ہے آپ کو اِس تحقیق کا شرف کس ذات گرامی کو حاصل ہے!! انکا اسم مُبارک ہے سعید احمد اعجاز۔ سبحان اللہ! احمدؐ (فداہ ابی وامی) کے نامِ نامی کے ساتھ یہ نسبت اور

دینِ احمدؐ کے ساتھ یہ استہزار +

پھر نظم کا انداز ملاحظہ ہو۔ گویا ایک رائل کمیشن مقرر ہوا تھا کہ وہ اس امر کی تحقیق کے بعد رپورٹ پیش کرے کہ واقعی مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہوتا ہے یا یہ محض ایک ڈھکوسلہ ہی ہے۔ اور یہ صاحب تھے اس کمیشن کے صدر۔ اب انھوں نے تحقیقات مکمل کرکے رپورٹ پیش کی ہے کہ نہیں صاحب! سب جھوٹ!!

یہ نمونہ ہے' ان برخورداروں کا جو کل کی "ملتِ اسلامیہ" بننے والے ہیں!

اور اگر ان سے (یا رسالہ والوں سے) پوچھیے تو کہہ دینگے کہ صاحب یہ شاعری کے فلسفیانہ نکات ہیں' ان باتوں کے متعلق زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا تو ہوتا ہی چلا آیا ہے حالانکہ شاعری میں بھی جو ہوتا چلا آیا ہے اس میں اور آج کے رجحاناتِ قلبی و ذہنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ایک اور صاحب ہیں حضرت مجاز۔ بی۔اے (علیگ) انکی ایک نظم دہلی کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوئی ہے۔

نوجوان خاتون سے!

دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا ❊ خود اپنے حسن کو پردہ بنالیتی تو اچھا تھا

اثر باقی نہیں معلوج پیروں کی دعاؤں میں ❊ جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا

پتہ نہیں اس "بزرگانہ مشورہ" کے جواب میں ادھر سے پردہ اٹھایا ہی گیا یا کچھ اور لیکن جو کچھ بھی جواب میں آیا ہو۔ حضرت مجاز کو اس سے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے۔ نیک بد سمجھائے جانا چاہیئے کوئی مانے یا نہ مانے۔ مشکل یہ ہے کہ خطاب انھوں نے کیا ہے۔ نوجوان خاتون سے اور نوجوان نصیحت کم ہی مانا کرتے ہیں بہرحال ایک کثیر طبقہ انکی مساعی جمیلہ کے نتائج کا منتظر ہے اور انکی دعائیں انکے ساتھ ہیں اگر یہ اس صبر آزما مرحلہ میں کامیاب ہو جائیں تو قوم کو چاہیئے کہ اس بطلِ جلیل کی خدمات کے اعتراف میں

رفتار زمانہ

چین اور چینی مسلمان!

چین کے مسلمانوں کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں نے بہت کچھ سنا ہے مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ چینی مسلمانوں کو حکومت میں کتنا دخل ہے اور انکی فوجی قوت اور جنگی اولوالعزمیوں کا کیا حال ہے۔ اتفاق سے اسوقت چین اور جاپان کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اس لیے چینی فوج کے ساتھ وہاں کی مسلم فوج کے حالات اور انکے شاندار جنگی کارنامے بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔

اس سلسلہ میں اخبارات کے ذریعے متعدد مضامین شائع ہوچکے ہیں مگر ہم یہاں مستند ذرائع سے اور خود چینی مسلمانوں کی زبانی چینی فوج کے مسلمان قائدین کے حالات پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگی قوت واہمیت کے ساتھ انکی وطن دوستی اور اسلام پروری کا اچھی طرح علم ہوجائے +

کچھ دن ہوئے قاہرہ میں چینی مسلمانوں کا ایک وفد پہونچا تھا جو آٹھ ارکان پر مشتمل تھا یہ سب لوگ حکومت چین کے سرکاری عہدیدار ہیں اور انکے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی حمیت میں غرق ہیں اور پکے اور سچے مسلمان ہیں رئیس وفد کا نام جلال الدین وا چنگ چیانگ ہے۔ آپ چین کی مجلس مقننہ کے رکن بھی ہیں انکے پرائیویٹ سکرٹری کا نام ابراہیم فو ہے۔ ارکان میں یوسف چیانگ اور داؤد چیانگ ممتاز شخصیت کے مالک ہیں +

مصر کے مشہور اسلامی اخبار "البلاغ" کے نمائیدہ نے اس وفد سے ملاقات کرکے جو اہم بیان حاصل کیا ہے ہم ذیل میں اسکی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

یہ وفد جنوری ۱۹۳۸ء کو شنگھائی سے عازم بیت اللہ ہوا اور حجاز پہونچکر اُسنے حج ادا کیا اراکین وفد کا بیان ہے کہ اسلام کی روحانی عظمت کا جو منظر ہم کو حجاز مقدس میں نظر آیا وہ کسی اور جگہ نہیں آیا"۔

وفد کا بیان ہے کہ چینی فوج میں مسلمانوں کی کثرت ہے جنکے قائد اعلیٰ جنرل چیانگ کائی شیک ہیں یہ جنرل گو مسلمان نہیں ہیں مگر مسلمانوں سے خاص اُنس اور محبت رکھتے ہیں۔ اور اُنکی شجاعت و فداکاری کے معترف ہیں۔ چین کا سب سے بڑا فوجی افسر ایک مسلمان ہے جسکا نام عمر یانون چی ہے' وفد کا بیان ہے کہ اس جنرل کی قیادت میں تین لاکھ مسلمان ہیں جو تمام چین میں اپنی شجاعت کے لیے مشہور ہیں

وفد نے نمائندہ "البلاغ" سے بیان کیا کہ جاپان نے چین پر حملہ کرکے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچایا ہے اور اُنکے بہت سے مذہبی ادارے اور اوقاف تباہ کر دیے ہیں۔ ان میں مرحوم شاہ فواد اول مصر کا کتب خانہ بھی ہے جو اُنکے نام مسلمانان چین نے قایم کیا تھا جسکے لیے مرحوم نے دس بارہ ہزار کتابیں وقف کی تھیں۔

غربی شمالی چین کی آبادی خالص مسلمانوں پر مشتمل ہے یہاں تک کہ حکام، افسر اور فوج کے قائد بھی مسلمان ہیں۔ یہاں کی اسلامی افواج کے کمانڈر انچیف کا نام عمر پائے چیانگ سی ہے دوسرا مسلمان فوجی افسر جنرل خالد ما ہونگ کوئی ہے جسکے پاس ایک لاکھ مسلمان فوج ہے۔ جنرل عمر نہ صرف ایک لاکھ مسلمانوں کے افسر اعلیٰ ہیں۔ بلکہ جنرل چیانگ کائی شیک کے دست راست اور معاون بھی ہیں آپنے مختلف میدانوں میں جاپانی فوج کو شکست دی ہے۔

چینی مسلمانوں کا یہ فقرہ کتنا حق بجانب ہے کہ۔

واخواننا المسلمون من ابناء الوطن البررة المخلصين المشهورين بالوفاء والتضحية يعرفون حق المعرفة ان العدو لا يفرق بين المسلمين وغير المسلمين في تقتيلهم وتذبيحهم ولا يميزون المساجد من المعابد في تخريبهم وتدميرهم فاذا دافعوا عن الوطن المشترك فقد دافعوا عن انفسهم ودينهم (البلاغ)

مسلمان اہل وطن جو ایثار و قربانیوں میں مشہور رہیں خوب جانتے ہیں کہ دشمن (جاپان) قتل و غارتگری میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں کریگا اور منادر کے ساتھ مساجد کو بھی مسمار کرے گا اسلیئے اگر چین کے مسلمان مشترک وطن کی مدافعت کے لیئے کھڑے ہوگئے ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنی جان اور اپنے مذہب کی حفاظت کے لیئے کھڑے ہوئے ہیں +

مغرب اقصےٰ مجاہدین ریف اور جنرل فرانکو

اسپین کی جنگ ابھی تک علےٰ قدم وساق بحالہ قایم ہے۔ باغیونکا سردار جنرل فرانکو مغرب اقصےٰ کے مسلمانوں کے لیئے عذاب الیم بنا ہوا ہے اور اُسنے مسلمانونکو جن میں عورتیں، بچے بوڑھے سب ہی شامل ہیں، جنگ کی آگ میں دھکیلنے کا وہ خوفناک طریقہ اختیار کیا ہے جس کو سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اس سلسلہ میں مغرب اقصےٰ کی جمعیات اسلامیہ کے صدر نے ایک بیان اخبار البلاغ (مصر) اور جریدہ صوت الشعب میں شایع کرایا ہے، جو بہت ہی مبسوط اور بہت ہی زہرگداز ہے، ہم اُسکی تلخیص ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

(۱) جنرل فرانکو نے مختلف طریقوں سے ریف کے مسلمانونکو زبردستی میدان قتال میں دھکیل دیا ہے اور اب تک ایک لاکھ مسلمان اس جنگ میں کام آچکے ہیں+

(۲) اخیر میں جنرل فرانکو نے ریف کے مسلمانونکا صفایا ہی کردیا یعنی ستر سال کے بوڑھوں اور چودہ سال کے بچوں تک کو پکڑ کر میدان قتال میں بھیجدیا تاکہ وہ فوجیوں کا کھانا پکائیں اور اُنکے کپڑے صاف کریں اور ضرورت ہو تو اُن کو ہلاکت و بربادی کے لیئے دشمن کے مقابلہ پر روانہ کردیا جائے

(۳) جنرل فرانکو نے حال ہی میں ریف کی معصوم اور عفت مآب عورتونکو اسپین بھیجدیا ہے، ان میں جو بڑی عورتیں ہیں اُنکے ذمے فوجیونکا کھانا پکانا اور کپڑے دھونا وغیرہ کام لگا دیے ہیں اور جو چھوٹی اور کم سن ہیں انکو معمولی مشق کرانے کے بعد عورتوں کی فوج میں داخل کرلیا ہے ان میں بھی جو

حسین اور خوبصورت ہیں ان کو جنرل فرانکو نے زبردستی مغربی فوج کے ہمراہ کر دیا ہے کس مقصد کے لئے؟ اس کا جواب آسان ہے اور اس کے تصور سے ہماری گردنیں شرم کے مارے جھک جاتی ہیں

(۴) پہلے پہل زعماء ریف جنرل فرانکو کی چال میں آ گئے کیونکہ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ منطقہ ریف کو بالکل آزاد کر دیا جائیگا اور وہاں عربوں کی مستقل اور آزاد حکومت قائم کر دی جائے گی۔ چنانچہ اس وعدہ پر مغرور ہو کر بہت سے زعماء نے جنرل فرانکو کا پروپیگنڈ کیا اور ہزاروں مسلمانوں کو اسپین کی جہنمی جنگ میں دھکیل دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ جب ریف میں سوائے بیواؤں اور یتیموں کے مردوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے تو وہاں حکومت کس کی قائم ہوگی؟

لیکن وہ وقت بھی آ گیا جس میں جنرل فرانکو کے وعدوں کا پردہ صاف الفاظ میں چاک کر دیا گیا۔ چنانچہ تطوان کے کمشنر کرنل بیکبیڈ یو نے جو جنرل فرانکو کا دست راست سمجھا جاتا ہے تمام اخبارات میں یہ اعلان شائع کرا دیا ہے کہ اہل ریف کو آزاد کرنے اور مغرب اقصیٰ میں عربوں کی حکومت قائم کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ اور جو عرب جنگ اسپین میں جنرل فرانکو کا ساتھ دے رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کافی روپیہ بطور حق المحنت دیا گیا ہے!

(۵) جب مغرب اقصیٰ کے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کو معلوم ہوا کہ جنرل فرانکو کے وعدوں کا حشر ہونے والا ہے تو انہوں نے تطوان میں سخت احتجاج کیا مگر ان کو اس کا صلہ یہ ملا کہ کثرت کے ساتھ بازاروں اور گھروں میں قتل کر دئے گئے۔ بہت سے قید خانوں میں ڈال دئے گئے اور بقیۃ البافیہ کو گرفتار کر کے اشبیلیا میں نظر بند کر دیا گیا۔

(۶) باغیوں نے یعنی جنرل فرانکو کے اعوان و انصار نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ غرناطہ کے قصر الحمراء اور جامع قرطبہ میں (جو عربی حکومت کے آثار باقیہ ہیں) حربی ذخائر جمع کر دئے ہیں اور ان کو میگزین بنا دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت ان کو تباہ کرنے کے لئے گولہ باری کریگی اور یہ رہی سہی آثار و اطلال جو اسلامی عظمت و شوکت کا آخری سہارا ہیں بمباری سے مسمار ہو جائیں گے اور اسلام کے نقوش تک کا اسپین سے صفایا ہو جائیگا۔

(۷) ریف کے اطراف میں مساجد اللہ میں نماز جمعہ اور نماز پنجگانہ بھی ختم ہوگئی ہے کیونکہ جب مرد ہی باقی نہ رہے تو مساجد کو معمور کون کریگا بلکہ اس کے ساتھ جو لوگ باقی ہیں ان کو عیسائی بنانے کے لئے پادریوں کو ششیں شروع کردی ہیں چنانچہ پادری روزانہ مسلمانوں پر مقدس پانی چھڑکتے ہیں اور انکو عیسائی بننے کی ترغیب دیتے ہیں شفاخانوں میں اگر کوئی مسلمان مریض اپنی گردن میں صلیب لٹکانے سے منع کرتا ہے تو اس کو کھانا تک نہیں دیا جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر مرجاتا ہے۔

(۸) فسطائی حکومت نے ان مغربی مسلمانوں پر جو حج کر کے واپس ہوئے ہیں یہ لازم کردیا ہے کہ وہ روم جاکر پوپ سے برکتیں حاصل کریں اور مکہ مکرمہ کے بعد روم کا بھی حج اور طواف کریں۔

(۹) جو مسلمان خندقوں اور میدانوں میں بیٹھکر جنگ کر رہے ہیں انکو چوبیس گھنٹوں میں کیک کا ایک ٹکڑا یا خنزیر کا بہت تھوڑا گوشت دیا جاتا ہے اور وہ بیچارے جبراً و قہراً ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں اور اپنی قسمتوں کو روتے ہیں!!

فلسطین

اٹلی اور انگلستان میں گفت و شنید کے بعد جو معاہدہ ہوا ہے وہ فلسطین کے حق میں نہایت ہی خطرناک ہے! فلسطین کے بارہ میں اٹلی کے مطالبات حسب ذیل تھے۔

(۱) فلسطین میں انتداب باقی رکھا جائے (۲) فلسطین کو تقسیم نہ کیا جائے اور نہ اسکو یہودی مملکت قرار دیا جائے (۳) مستقبل میں جو حالات رونما ہوں انکے بارہ میں اٹلی سے ضرور مشورہ کیا جائے چنانچہ حکومت اٹلی نے اپنے ریڈیو اسٹیشن سے عربی میں تقریروں کا سلسلہ اسی لئے جاری کیا تھا کہ عربوں کو سرگرم عمل رکھا جائے اور برطانیہ کو مرعوب کیا جائے۔ اس مقصد میں اٹلی کو کسیقدر کامیابی بھی حاصل ہوئی اور برطانی اخبارات اور پارلیمنٹ کے ارکان برابر اسکے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے یہ سوال کہ آخر اٹلی کیوں عربوں کی حمایت کرتا رہا اور یہودیوں کی مخالفت میں اس نے کیوں اتنا وسیع پروپیگنڈہ کیا؟ اسکا جواب حسب ذیل دفعات میں مل سکے گا۔

(۱) فلسطین میں انتداب قایم رہنے کی صورت میں برطانیہ کو انتدابی قواعد وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے یعنی وہ فلسطین میں نہ تو جنگی کارخانے قایم کرسکتی ہے نہ قلعے تعمیر کرسکتی ہے اور نہ تعداد سے زیادہ فوج رکھ سکتی ہے، لیکن اگر انتداب اُٹھ جائے تو برطانیہ یہ سارے منصوبے پورے کرسکتی ہے اور اس سے اٹلی کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) اٹلی کو خوب معلوم ہے کہ تقسیم فلسطین کے بعد ارض قدس میں یہودی مملکت قایم ہوجائیگی اور جب یہ ہوگا تو برطانیہ، حیفا عکا اور دیگر بحری مقامات کو بحری مستقر آسانی سے بنا سکے گی اور اٹلی کی بحری قوت کو خطرات لاحق ہو جائینگے۔

(۳) اٹلی اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اگر فلسطین میں یہودی مملکت قایم ہوگئی، تو اس کا میلان اشتراکیت کیطرف ہوگا جو فسطائی تحریک کی مخالف سمت میں واقع ہے۔

مگر برطانی، اٹلی گفت وشنید اور معاہدہ کے بعد اٹلی بھی ہلکا پڑگیا ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ آئندہ فلسطین کے معاملات میں کوئی ایسی مداخلت نہیں کریگا جو بالواسطہ عربوں کے حق میں مفید ہو۔ چنانچہ تازہ ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ فلسطین میں فوجی ہوائی مستقر قایم کررہی ہے اور اُس کا ارادہ ہے کہ فلسطین کو چاروں طرف سے فوجی محاصرہ میں لے لیا جائے۔

رہے فلسطین کے موجودہ حالات سو وہ نہایت خطرناک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارض قدس کے باشندوں پر اپنا رحم فرمائے۔

ایران میں علمی ترقی

ایران نے اگرچہ بہت ہی قلیل مدت میں ترقی کی ہے اور ترقی کے میدان میں آئے ہوئے اُسے ابھی چند سال ہوئے ہیں مگر علمی اور صنعتی ترقیوں میں اس نے ایک خاص درجہ حاصل کرلیا ہے، سنہ ۱۹۲۶ء میں تعلیمی میزانیہ ۷۷۳۱۳۰۰ ریال تھا اور سنہ رواں میں یہ رقم ۱۴۵۰۲۵۰ تک پہونچ گئی ہے سنہ ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبار کی تعداد کل ۱۵ تھی سنہ ۳۶ء میں طلبار کی تعداد ۳۰۸ تک پہنچ گئی مگر اس سال طلبار کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگئی ہے۔

سنہ ۱۵ء میں ثانوی مدارس کے طلباء کی تعداد کل ۷ تھی جن میں لڑکی ایک بھی نہ تھی لیکن سنہ ۱۹۳۶ء میں لڑکوں کی تعداد ۷۳۵ اور لڑکوں کی تعداد ۲۱۱ تھی۔ ابتدائی مدارس کے طلباء کی تعداد سنہ ۱۹۱۳ء میں ۱۲۴ اور طالبات کی ۳ تھی مگر سنہ ۳۶ء میں لڑکوں کی تعداد ۱۶۶۳ اور لڑکیوں کی ۲۵۳ تک پہنچ گئی

سنہ ۱۹۲۳ء میں معلمین اور معلمات کی تعداد ۲۴ ، ۳۰ تھی جو سنہ ۱۹۳۶ء میں ۱۰۹۱ تک پہونچ گئی۔ سنہ ۲۴ء میں مدارس کی تعداد ۲۱۶ تھی مگر سنہ ۱۹۳۶ء میں ۵۳۲۹ تک پہنچ گئی۔

اب سے کچھ مدت پہلے ایران میں عمرانی وسائل مفقود تھے نہ سڑکیں تھیں نہ ریل گاڑیاں مگر اب جلالۃ الملک رضا شاہ پہلوی کی کوششوں سے ریلوے نے جملہ اطراف کو مربوط کر دیا ہے اور بے شمار سڑکیں جابجا نکال دی گئی ہیں۔

”کانگرس مسلم لیگ اور مسلمان“

(از جناب عبداللہ جان صاحب شملہ)

مئی سنہ ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں ضمناً مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ مجھے مولانا کے سیاسی مسلک سے کوئی بحث نہیں لیکن صاحب مضمون نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ”قوم پرست“ ہو جانے کے سبب مولانا کا آج کا اسلام اُنکے سنہ ۱۹۱۳ء کے اسلام سے پانچ سات درجے نیچے ہے۔ جو ذریعہ استعمال کیا ہے۔ وہ غلط ہے۔

صاحب مضمون کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۳ء میں مولانا نے آیت ”وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ“ کا ترجمہ یہ کیا تھا کہ آج سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ دوسری تعلیم تلاش کریگا تو یقین کرو کہ اُس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی“ اور اسی آیت کا ترجمہ سنہ ۳۲ء میں مولانا نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ”جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو اُس کی راہ کبھی قبول نہ کیجائے گی“۔

میرے پاس الہلال کی جلدیں نہیں ہیں لیکن غالباً پہلا ترجمہ مولانا نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ جیسا کہ منقول ہے۔

دوسرا ترجمہ بھی ترجمان القرآن سے صحیح طور پر منقول ہے لیکن اس سے آگے چل کر صاحب مضمون نے بقول مولانا "عالمگیر سچائی" کی تفسیر درج کی ہے۔ وہ غلط ہے۔ جو الفاظ اس موقع پر منقول ہیں۔ وہ ترجمان القرآن میں موجود تو ہیں لیکن مندرجہ بالا آیت کے تحت میں نہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل آیت کے ترجمہ کے حاشیہ پر "لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ"۔۔

اس آیت کا ترجمہ مولانا نے یوں کیا ہے "نیکی اور بھلائی کی راہ یہ نہیں ہے کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ پورب کی طرف پھیر لیا یا پچھم کی طرف کر لیا (یا اسی طرح کوئی دوسری بات ظواہر و رسوم کی کرلی) نیکی کی راہ تو اُن لوگوں کی راہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ ملائکہ پر۔۔۔ ایمان لاتے ہیں"۔

حاشیہ میں مولانا یوں رقمطراز ہیں :-

"دینِ حق کی اس اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کوئی دوسری بات اختیار کرلی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اصلی شئے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو +

نزولِ قرآن کے وقت دنیا کی عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے۔ دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں اور انہی کے کرنے نہ کرنے پر ان کی نجات و سعادت موقوف ہے لیکن قرآن کہتا ہے اصل دین خدا پرستی اور نیک عملی ہے اور شریعت کے ظاہری رسوم و اعمال بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو پس جہاں تک دین کا تعلق ہے ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیئے۔ نہ کہ وسائل کی"۔

آیت وَمَن يَبْتَغِ .... کا جو ترجمہ صاحب مضمون نے نقل کیا ہے۔ وہ ترجمان القرآن کے صفحہ ۱۵۸ پر ہے جہاں اس آیت کا ذکر سورۂ فاتحہ کے ضمن میں آگیا ہے۔ اپنی اصلی جگہ یہ آیت صفحہ ۲۹۷-۲۹۸ پر ہے اور اس کا ترجمہ صفحہ ۲۹۸ پر ہے یعنی "جو کوئی اسلام کے سوا (جو تمام رہ نمایانِ حق کی تصدیق و پیروی کی راہ ہے) کسی دوسرے دین کا خواہش مند ہو تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا"۔ اس ترجمہ اور صفحہ ۱۵۸ والے ترجمہ میں جو فرق ہے اُس کی وجہ آیت مذکورہ کے سیاق و سباق اور اُن کا ترجمہ غور سے دیکھنے والے پر بخوبی کھل جائے گا +

صاحب مضمون نے مولانا کے متعلق جو رائے قایم کی ہے اس کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ مولانا نے اسلام جیسی "عالمگیر سچائی" کی تشریح یہ فرمائی کہ یہ کوئی خاص شکل کی عبادت یا کھانے پینے کی کسی خاص پابندی کا نام نہیں ہے مندرجہ بالا حوالوں سے یہ ظاہر ہو جائے گا۔ کہ صاحب مضمون سے سہو ہو گیا ہے۔ اور مولانا نے خاص شکل کی عبادت یا کھانے پینے کی خاص پابندی" کے خلاف جہاں اظہار رائے کیا ہے، وہاں قرآن کا منشا بھی یہی ہے -

جوئے رواں

معارف القرآن

(چودھری غلام احمد پرویز بی اے ۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ ۔شملہ)

فاتحۃ الکتاب

اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنزَلَ عَلٰی عَبدِہِ الکِتٰبَ وَ لَم یَجعَل لَّہٗ عِوَجًا ؕ قَیِّمًا لِّیُنذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّن لَّدُنہُ وَ یُبَشِّرَ المُؤمِنِینَ الَّذِینَ یَعمَلُونَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُم اَجرًا حَسَنًا ۙ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُولِہِ الاَمِینِ وَعَلٰی اَتبَاعِہٖ اِلٰی یَومِ الدِّینِ ۔ اَمَّا بَعدُ:-

اسلام دین فطرت ہے ۔

یہ قرآن کریم کا دعویٰ اور ہمارا ایمان ہے تفصیل اس اجمال کی خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو مفہوم اس سے یہی ہے کہ اسلام کی تعلیم اسقدر سادہ اور سیدھی دل میں اُتر جانے والی ہے اور اُسکے مہمات اُصول، قوانین فطرت کی طرح۔ ایسی محکم اور غیر متبدل بنیادوں پر قایم ہیں کہ اس کو قبول کرنے میں ذہن انسانی کو اور اُسپر عمل پیرا ہونے میں قلوب وجوارح کو کبھی انسانی فطرت کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی ۔ بلکہ یہ عین فطرت ہے اور اقتضائے فطرت کیطرح تمام نوع انسانی اُسے قبول کرنے پر مجبور ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تعلیم کو آج عام طور پر اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے وہ ایسے لاینحل مباحث اور پیچیدہ مسائل کا مجموعہ بنکے رہ گئی ہے کہ بلا کاوش و تردد اُسے قبول کرنا تو ایک طرف ۔ انسانی کوششیں ہزار سُلجھانے کی ہمت کریں اسکی اُلجھنیں پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں دین فطرت کی حقیقی روح تو ہمیں قرن اولیٰ میں نظر آتی ہے ۔ جب کہ اس حقیقت کش تعلیم نے چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم کو ایک طرف قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا ۔ اور دوسری طرف مکارم اخلاق کے اس بلند ترین مقام پر پہنچا دیا کہ

انکے اعمال حیات آج بھی زندگی کے بحرِ ظلمات میں روشنی کے بلند میناروں کی طرح جگمگا رہے ہیں کہ ہر راہ گم کردہ مسافر کو ان سے صراطِ مستقیم کا نشان مل سکے لیکن وہ دورِ عمل وہ مجاہدانہ خدا پرستی کا زمانہ جلد گزر گیا۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور رفتہ رفتہ ملوکیت کی تمام ہلاکت آفرین خرابیوں کے ساتھ عجمی تکلفات اسلامی تمدن پر چھا گئے۔ یوں تو یہ ملوکیت بنی امیہ سے ہی شروع ہوگئی تھی لیکن عہد عباسیہ میں اسلامی روح پر عجمیت اس درجہ غالب آگئی کہ ان نظر فریب۔ زرنگار نقابوں کے اندر عروس حقیقت کا سراغ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ یہی دور اتفاق سے ہمارے علمی کارناموں کا درخشندہ عہد ہے۔ یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اسرائیلیات کے افسانے قصص قرآنی میں "ربط و نظم" قائم کرنے کے لئے زیب داستان بنائے گئے۔ فرصت کا زمانہ۔ فراغت کے دن "شمشیر و سنان کی ولولہ انگیزیاں" طاؤس رباب "کی نرم خیزیوں میں تبدیل ہوگئیں نتیجہ اسکا ظاہر ہے کہ ایک طرف قوائے عملیہ زنگ آلود ہو کے رہ گئے اور دوسری طرف اسلام کی فطری تعلیم عجمی تصورات کے جلو میں فلسفیانہ موشگافیوں اور قصص و روایات کی توہم پرستیوں کی نذر ہوگئی۔

زوال بغداد کے بعد صورتِ حالات بد سے بدتر ہوگئی۔ مرکزیت کے فنا ہو جانے سے امت ریت کے منتشر ذروں کی طرح بکھر گئی مختلف زاویے اور متعدد گوشے الگ الگ مرکز بن گئے۔ اب نہ وہ دلوں میں سپاہیانہ ولولہ اور جوش تھا، نہ دماغوں میں عالمانہ جلوہ و بصیرت۔ ایران کے آتشکدوں نے اپنی گرمئی نفس اور حرارت سخن سے ایک نئے تصوف کو فردوس نگاہ بنا دیا جسکی رو سے دین نام رہ گیا۔ انفرادی تزکیہ نفس اور ذاتی ارتقاء روحانیت کا وہ نظام اجتماعیت۔ وہ جماعتی اور مرکزی زندگی جو اسلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت تھی جو دین فطرت کی اصل تھی نگاہوں سے روپوش ہوگئی۔ اور عملی رہبانیت کے عناصر ایک ایک کر کے جزو دین بن گئے۔ ان حسین و جمیل اور مرصع و منقش عجمی پردوں میں ملبوس ہوکر اسلام جب درۂ خیبر سے آگے بڑھا تو ہندوستان کی دیدائیت نے

آگے بڑھکر اس کے ماتھے پر سندور کا قشقہ لگایا اور اس کے چرنوں میں اپنی شردھا کے
پھول چڑھائے۔ اب ناقوس اور اذآن میں ہم آہنگی کی کوششیں شروع ہوئیں
تسبیح کے دانے رشتہ زنار میں پروئے جانے لگے۔ زمزم و گنگا کے امتزاج سے
ایک نئے چشمۂ زندگی کی تحقیق شروع ہوئی۔ خاکِ حجاز اور جمنا جل کے خمیر سے
خدا کے ایک نئے گھر کی تعمیر سطحِ خیال سے اُبھرنے لگی۔ ہندی رسومات شعائرِ دین بن گئیں
برہمنیت کا فلسفۂ حیات مسلمانوں کے رگ پے میں سرایت کر گیا اور دین حجازی کا "بیباک
بیڑا" یوں گنگا کے دہانے میں آکر ڈوب گیا۔ ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر یورپ سے
الحاد و مادہ پرستی کا بحر مواج اپنی تمام شورانگیزیوں اور طوفان خیزیوں کے ساتھ بپھرتا
اُمنڈتا بڑھتا چلا آرہا تھا جس میں کہیں علانیہ نفرت انکار کی کف بردھاں گرداب آلود
طغیانیاں تھیں اور کہیں عقل پرستی اور تجدد پسندی کی بظاہر ساکت و خاموش لیکن
درحقیقت بڑی بھیانک اور خوفناک روانیاں۔ خدا۔ رسولؐ۔ وحی۔ آخرت۔
غرضیکہ ایمان و ایقان کی ہر متاع عزیز کو خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ
بہائے لیئے جا رہی تھیں۔ دینِ فطرت میں تو یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ اس طوفان
بلا سے کہیں زیادہ مہیب و مہیج طغیانیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ لیکن جن بے بنیاد
ریت کی دیواروں نے دین کے حصن حصین ہونے کا دھوکا دے رکھا تھا
ان میں یہ تاب کہاں کہ وہ اس بلا انگیزی کی روک تھام کر سکیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر
کہ نوجوان طبقہ ایک ایک کر کے دین سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا چلا گیا۔
اور مذہب پرست طبقے نے ان کی تکفیر و تفسیق کے فتاویٰ کو ان بڑھتے ہوئے
فتنوں کا سر کچلنے کے لیئے کافی سمجھ کر اپنی خود فریبی اور عملاً اعتراف شکست
کا ثبوت بہم پہنچایا۔ الا ماشاء اللہ۔ مذہب پرست طبقہ میں جو چیز خطرناک طور پر
حائل ہوتی تھی اور ہو رہی ہے وہ انکی ماضی پرستی ہے۔ یہ وہ زنجیر ہے جو

انھیں اپنے تصورات کے تنگ دائرہ سے باہر قدم ہی نہیں رکھنے دیتی۔ یہ وہ تاگہ ہے
جو اس طائرِ لاہوتی کے پنجوں میں کچھ اس انداز سے اُلجھا ہے کہ وہ اسے دینِ فطرت کی فضائے
بسیط میں بال کشا ہونے ہی نہیں دیتا۔ اللہ تعالےٰ نے جب دنیا میں اس قوم کو بھیجا جس کے
متعلق خود ارشاد فرمایا کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (تم نوعِ انسانی میں سے بہترین
قوم ہو) تو ان کو ہلاکت وتباہی کے عمیق غاروں سے بچانے کے لیئے ایک مشعلِ ہدایت
ایک سراجِ منیر ایک نورِ مبین عطا فرمایا کہ اس کو وہ اپنے جادہ حیات میں پیش
پیش رکھیں۔ اپنے شاہ راہِ عمل میں خضرِ طریقت بنائیں اور زندگی کے ہر شعبے میں جو
قدم بھی اُٹھائیں اسی کی روشنی میں اُٹھائیں تاکہ وہ راستہ کے پُرخطر اور مہیب نشیب فراز
سے مامون ومصئون منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ لیکن اس روشنی کو اگر وہ قوم
بجائے اپنے آگے رکھنے کے کہ جس سے ان کے سامنے کا راستہ روشن
ہوجائے۔ اپنے پیچھے اُٹھا رکھیں تو ظاہر ہے کہ قطع شدہ منزل تو نور و درخشندہ و
تابناک نظر آئے گی۔ لیکن سامنے کا راستہ پہلے سے بھی تاریک ہوجائیگا
کہ عام عقل کی دُھندلی سی روشنی میں بھی جس قدر راستہ نظر آتا تھا وہ اب انکے
اپنے سائے سے اور ظلمت ناک ہوجائے گا نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط
راستے پر چلتے ہیں لیکن اسی میں صراطِ مستقیم سمجھ رہے ہوتے ہیں غلط مسلمات
غلط معتقدات۔ غلط نظریئے ذہن میں جما رکھتے ہیں اور انھیں دین کا نچوڑ
قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی نمازوں کا رُخ قبلہ نما کو دیکھ کر ضرور سیدھا کرتے ہیں
لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے قبلہ نما کی سوئی ہی "ترکستان" کی طرف جھک رہی ہے
وہ بزعمِ خویش اپنے آپ کو خدا اور رسولؐ کا متبع جانتے ہیں حالانکہ انکی اتباع محض انسانوں
کی اتباع ہوتی ہے۔ ان اپنے جیسے انسانوں کی اتباع جنکی بر سرِ حق ویقین ہونیکی صرف اتنی ہی
سند کافی سمجھی جاتی ہے کہ وہ ان سے سو برس پیشتر کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ انکی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوبل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا - ولو کان آباءھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون - ۲/۱۷۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اُس کی اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریق پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اباؤ اجداد کو دیکھا ہے - اگرچہ ان کے اباؤ اجداد نہ کچھ عقل رکھتے تھے نہ ہدایت -

ان کو اگر آپ ان کے مروجہ وسائیر و آئین سے - جو اُن کے آباؤ اجداد سے نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آرہے ہیں - ایک اینچ بھی ادھر اُدھر ہٹنے کی دعوت دینگے تو وہ تڑپ اٹھیں گے کہ اُن کے معتقدات ان سے چھین رہے ہیں - اور معتقدات - خواہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں - انسان کی بڑی متاع عزیز ہوتے ہیں - اس کے ساتھ ہی وہ اس خیال سے بھی لرز اٹھیں گے کہ اگر انھوں نے اپنے مروجہ اعمال وعقائد میں تبدیلی پیدا کر لی تو اس سے یہ سمجھنا پڑیگا - کہ ان کے بزرگ غلطی پر تھے - اور یہ خیال ان بزرگوں کی تعظیم و تقدس کے سخت خلاف پڑیگا - ماضی پرستی اور غلط عقیدت کے یہ وہ بت ہیں جنہیں یہ لوگ اپنے کعبۂ دل میں لئے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے خلاف ایک حرف سننے کیلئے بھی تیار نہیں ہوتے - ایک چیز صریح قرآن کریم کے خلاف ہو لیکن اس کے جواز میں - بدبختی سے - کسی پیش رو انسان کی سند مل جائے - تو وہ اپنے اندر کبھی اتنی ہمت نہیں پائیں گے کہ ہدایت ظاہر ہو جانے پر وہ اس غلط نظریہ کو چھوڑ دیں - بلکہ ان کی ساری کوشش اس میں صرف ہو جائیگی کہ کسی طرح قرآن کریم کو توڑ مروڑ کر اس کو غلط قالب میں ڈھال لیا جائے - اور اگر وہ اپنی اس سعئ لاحاصل میں بھی ناکام رہیں تو پھر یہ کہہ کر دل کو بہلا لیا جاتا ہے کہ اُن پہلے لوگوں کے سامنے بھی تو قرآن تھا ہی - ہم ان کے علم و بصیرت کی بلندیوں تک کہاں پہنچ سکتے ہیں - یہ جو قرآن کریم اور ان کے مسلک میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے - ہماری ہی کوتاہ فہمی کی وجہ سے ہے -

پھر ماضی پرستی کی بنا پر ایک اور خطرناک عقیدہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم جیسی ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب کو ایک خاص ماحول کا پابند کر دیا جاتا ہے - حالانکہ فطرت کی کوئی شے کسی

خاص زمانہ اور زمانہ کے خاص احوال وظروف میں مقید ہو کر نہیں رہ سکتی۔ قرآن کریم خدا کا آخری پیغام ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ قیامت تک کے لئے حیات انسانی سے متعلق جس قدر مسائل پیدا ہوتے جائیں گے اُن سب کا حل اس کے اندر ملیگا۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں جا کر کبھی یہ کہدے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی کبھی یہ نہیں کہیگا کہ بس اب میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا۔ اب میں خالی برتن ہوں اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے۔ لیکن پانی کے اندر جس قدر خصوصیتیں چھپی ہوئی تھیں زمانہ کی عقل وعلم اور تجربہ اور مشاہدہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے بیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج اسی پانی سے کس قدر کام لئے جاتے ہیں۔ اور کیا اس پر بھی دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی کے اندر جتنی خصوصیتیں پوشیدہ ہیں سب معلوم کر لی گئی ہیں؟ دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑتی چلی جائے۔ اشیائے فطرت اس کا برابر ساتھ دیتی جائیگی۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ اس لئے اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہو سکتا اور کوئی زمانہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن کریم جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سب ان کے عہد میں سمجھا جا چکا۔ قرآن کریم بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے نکمل کیا گیا ہے۔ زمانہ علم وعقل کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑ کر چلا جائے قرآن کریم وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی آگے نظر آئیگا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کل کی آنے والی نسلیں اگر تجربات ومشاہدات میں ان سے آگے ہونگی۔ خود بخود سمجھ جائیں گی۔ اور اس طرح قرآن کریم کی ایک ایک بات حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آجائیگی۔ برعکس اس کے قرآن کریم کو کسی خاص ماحول میں مقید کر دیجئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ جیسا کچھ یہ سمجھا جا چکا ہے۔ اس سے زیادہ۔ یا اس کے خلاف۔ بعد کے زمانہ میں یہ سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ تو پھر آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ اسے قیامت تک ساتھ دینے والی کتاب کس طرح تسلیم کیا جائیگا۔ اور آپ کا یہ دعوےٰ۔ جو ایمان کی حقیقت اختیار کئے ہوئے

ہے۔ کس بنا پر ثابت ہوگا۔ لیکن تعجب ہے کہ کتاب الٰہی کو صحیفہ فطرت ماننے والے اس کے متعلق یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ ازمنہ گذشتہ میں جو کچھ اس سے حاصل کیا جا چکا ہے وہ آخری باب ہے۔ اور اس کے بعد یہ کتاب (نعوذ باللہ) ایک بے کار شے بن چکی ہے۔ اگر عصر حاضرہ کے انسان اس سے درس عبرت و موعظت لینا چاہیں۔ اپنی بڑھتی ہوئی مشکلات کا حل دریافت کرنا چاہیں۔ تو جب تک وہ اپنے آپ کو ہزار یا پانچ سو سال پیچھے نہ لے جائیں وہ اس سے مستفیض نہیں ہو سکتے۔ اس نظریئے کے ماتحت قرآن کریم میں تفکر و تدبر کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اور ذہن انسانی رفتہ رفتہ جمود و تعطل کی برودت سے مفلوج اور شل ہو کر رہ جاتا ہے۔

لیکن قرآن کریم میں تدبر کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اسے انسان اپنے ہی ذہن کے تابع رکھ سکے۔ یعنی اپنے ذہن میں پہلے سے ہی کچھ خیالات راسخ کرے۔ اور پھر قرآن کریم کو ان کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دے۔ یہ تو اتنا بڑا کھلا ہوا شرک ہے جس کی کبھی معافی نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم کے حقائق محکم اور اٹل ہیں۔ وہ کسی انسان کے امیال و عواطف۔ کسی کے رجحانات و جذبات کے ماتحت نہیں ہو سکتے۔ مومن وہ ہے جو اپنے تمام رجحانات قلبی و ذہنی کو خدا کی اس مقدس کتاب کے تابع رکھے۔

تو اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم کسی گذشتہ زمانہ کے ساتھ بھی مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اور کوئی شخص اسے اپنے خیالات کے تابع رکھ کر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ تو پھر قرآن کریم کو سمجھا کیسے جائے؟ یہ تھا وہ سوال جو میرے سامنے بار بار اس طبقہ کی طرف سے آتا رہا جس طبقہ میں میں قرآن کریم کے متعلق کچھ جذبۂ اشتیاق پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ اپنی تفسیر ہے وہ اس تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں۔ اس کی ہر بات خود اسی سے سمجھ میں آ سکتی ہے حضرات بزرگان کرام علیہ الرحمۃ کے علمی کارنامے ہمارے لئے باعث صد افتخار ہیں۔ ان سے

ہم بہت سا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور کیوں نہ اٹھائیں جب کہ ہم اُس کے جائز وارث ہیں۔
لیکن قرآن کریم کے سمجھنے کا تو ایک ہی طریقہ ہے جو خود قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اور وہ وہی ہے
جس کا ذکر ابھی ابھی کیا گیا ہے۔

لیکن سوال کرنے والا اس کا جواب ان چند الفاظ میں نہیں مانگتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ
مجھے بتاؤ کہ میں قرآن کریم کو کس طرح سمجھوں! اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کو پڑھو۔
پڑھنے سے ہی یہ سمجھ میں آ جائیگا۔ لیکن جب مجھ سے یہ کہا جاتا کہ میں تو قرآن کریم کو اکثر پڑھتا ہوں۔
لیکن نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کے اندر مجھے کوئی لذت اور جاذبیت محسوس نہیں
ہوتی۔ تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک حقارت آمیز "لاحول" کو ہی کافی نہ سمجھتا۔
اس لئے کہ ایسا جواب دینے والوں میں اکثر وہ حضرات تھے جن کی پاکیزگی ایمان۔ جن کی سعادت
روح اور جن کے جذبۂ دینی میں مجھے کبھی شبہ نہ ہوتا تھا۔ میں نے اس سوال کو بار بار اپنے دل
میں دھرایا۔ اور سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کونسی دقت ہے جو قرآن فہمی کی بابت ان کے راستے
میں حائل ہوتی ہے۔ میں نے مدتوں اس پر غور کیا۔ اللہ سے دعائیں مانگیں۔ اہل نظر حضرات
سے مشورے کئے۔ مستفسرین کی مشکلات کا تجزیہ کیا۔ اور اللہ کا احسان ہے کہ اس نے بالآخر میرے
سامنے اس پیچیدہ مسئلہ کو واضح کر دیا جس نے ایک مدت تک میرے دل کو بیقرار رکھا تھا۔
وھذا من فضل ربی۔

قرآن کریم کے مضامین جس انداز و طریق سے رکھے گئے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ اس جیسی
یا اس سے بہتر ترتیب انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہے لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے
کہ وہ ایک مضمون کو مسلسل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ ایک جگہ ایک حکم ہے
دوسری جگہ اسپر کچھ اضافہ ہے کہیں استثنا ہے کہیں اجمال ہے کہیں اس اجمال کی تفصیل ہے
اس لئے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جب اسکا ایک مسئلہ سامنے آئے تو

بیک وقت وہ تمام مقامات بھی نگاہوں کے سامنے آجائیں جن میں مسئلہ زیر نظر سے متعلق
مزید باتیں مذکور ہوں۔ جب قرآن کریم سے لوگوں کو شغف تھا تو انکو اس پر ایسا عبور حاصل تھا
لیکن آج تو یہ حالت ہے کہ نہ صرف مریض کو مرض کا ہی احساس نہیں بلکہ وہ دوا کے
نام سے بھی کوسوں بھاگتا ہے لہذا اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآن کریم کو سمجھنے کے
لئے اتنا عبور حاصل کرلیگا ایک امید موہوم ہے۔ بنا بریں ضرورت اس امر کی ہے کہ
قرآن کریم کو اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد و کاوش نہ ہو اور
اسکا طریقہ یہی ہے کہ ایک عنوان کو لیکر قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم کو یکجا جمع کیا جائے
اور اس میں ایسی ترتیب دیدی جائے کہ وہ مربوط و مسلسل مضمون کی صورت اختیار
کرلے۔ یہ چیز ہماری مروجہ تفاسیر سے تو مل ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ تو الحمد سے والناس
تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطالب بیان کرتی جاتی ہیں ان سے مختلف آیات کا مطلب
تو واضح ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم کی تعلیم سمجھ میں نہیں آتی۔ تبویب القرآن پر بھی کچھ کتابیں
ہمارے ہاں موجود ہیں لیکن جو کچھ میں چاہتا تھا وہ مطلب ان سے بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا
ان میں بالعموم الفاظ قرآن کی رو سے آیات کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے
اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں ایک ہی لفظ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کی رعایت سے
تبویب آیات ڈھونڈھنے میں تو ممد ہو سکتی ہے لیکن مطالب کے سمجھنے میں مفید نہیں ہو سکتی
قرآن کریم کی تعلیم کو اس نہج سے مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا ایسے لیے کام درحقیقت
جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کے موجودہ تشتت و افتراق کے دور میں
جبکہ جماعتی نظام کا مقصد ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ یہ خیال کہ کوئی جماعت اس کام کے لئے
آمادۂ عمل ہو جائیگی۔ خوش فہمی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جو نقشہ میرے ذہن میں تھا اسکے مطابق
میں نے دو تین عنوانوں کو بطور تجربہ لیا ابتداً میں دقت تو ضرور ہوئی لیکن جب اس کے نتائج
میرے سامنے آئے تو میری نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اب سمجھ میں آیا کہ قرآن کریم کا یہ

دعوی کسقدر صحیح ہے کہ یہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اِس تفسیر میں اور اُس تفسیر میں جو ذہن انسانی کی رہین منت ہوتی ہے۔ کتنا فرق ہے۔ ایک طرف اہل طلب کا تقاضا کہ ہمیں بتاؤ کہ قرآن کریم کو کسطرح سمجھیں دوسری طرف اِس نہج قرآن کریم کو سمجھنے کے یہ مختلف منابع میرے خیال کو یقین راسخ کی حد تک لے گئے کہ یہ کام کرنیکا ہے۔ کام کی عظمت اور اپنی کمزوریاں ڈراتی تھیں لیکن وقت کی ضرورت اور نتائج کی اہمیت مجبور کرتی تھیں کچھ وقت اسی کشمکش میں رہا بالآخر تائید غیبی نے مجھے اِس حوصلہ آزما عظیم المرتبت مُہم کے لئے آمادہ کر دیا اور اِس کے بعد میں نے اس فریضۂ مقدس کو مقصد حیات قرار دیکر اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس "جنون" کی نذر کر دیا۔ پہلا مرحلہ قرآن کریم کے بہت سے مفردات کے حتی الامکان قرآن کریم سے معانی متعین کرنا تھا اِسکے بعد اصل کام شروع ہوا پہلے تو سیکڑوں ابواب تجویز کیئے گئے اور ہر باب کے تحت سیکڑوں عنوانات قائم ہوئے پھر ہر عنوان کے ماتحت معنوی اعتبار سے قرآن کریم کی آیات کو یکجا جمع کیا گیا اس کے بعد تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہوا اور ہر عنوان کے ماتحت جمع شدہ آیات میں ایک ربط و نظم قائم کر کے تمام تعلیم کو ایک مسلسل اور مربوط مضمون کی شکل میں ترتیب دینا شروع کیا۔ یہ تیسرا دور اسوقت تک بہت سا ختم ہو چکا ہے اور ابھی بہت سا باقی ہے لیکن یوں سمجھئے کہ اِس سے قرآن کریم کا ایک ایسا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) مرتب ہو گیا کہ ذہن انسانی میں کوئی خیال آئے۔ اِسکے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ ہے سب بیک وقت ایک مسلسل اور دلکش مضمون کی صورت میں آپکے سامنے ہوگا جسمیں کسی انسانی خیال کو کچھ دخل نہ ہوگا کیونکہ ربطِ عبارت کے سوا کچھ اپنی طرف سے نہیں بڑھایا گیا۔ جہاں جہاں کسی توضیحی یا تمہیدی عبارت کی ضرورت پڑی ہے وہ بھی دراصل اِن آیات کا ہی ترجمہ ہے جو اس مقام پر سیاق و سباق میں درج ہیں۔ کامل دس برس کی شبانہ روز محنت سے میں اتنا کچھ کر سکا ہوں، اندازہ یہ ہے کہ یہ مکمل انسائیکلوپیڈیا پانچ چھ مجلدات میں آجائے گا۔ جتنی منزل قطع ہو چکی ہے آج میں جب نگہ باز گشت سے اسے دیکھتا ہوں تو حیران رہجاتا ہوں

کہ یا اللہ! یہ منزل میں نے کسطرح طے کرلی! حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی توفیق اور اسکا فضل شامل حال نہ ہوتا تو میں شاید کئی "عمروں" میں بھی اتنا کچھ نہ کرسکتا۔

اسی دوران میں یہ چیز بھی سمجھ میں آئی کہ قرآن کریم کی تفسیر کسی ایک فرد واحد کا کام نہیں اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم ایک دستور حیات ہے۔ نظام زندگی کا مکمل ضابطہ ہے تاریخ اور جغرافیہ، فلسفہ اور ہیئت۔ طبیعات اور حیاتیات۔ فلکیات اور طبقات الارض وغیرہ علوم وفنون کی کتاب نہیں لیکن چونکہ یہ اسکی کتاب ہے جسکا علم دنیا کے تمام علوم کو احاطہ کئے ہوئے ہے اس لئے قرآن کریم میں ضمناً اور نسبتاً جہاں کہیں دنیاوی علوم کے متعلق کوئی اشارہ آگیا ہے اس اجمالی اشارہ میں ان علوم کی اصولی تفصیلات سمٹ کر مرکوز ہوگئی ہیں اس اعتبار سے یہ پیغام خداوندی جو اولاً اور اصولاً حیات انسانی کی ہدایت کا ہی ایک ضابطہ ہے مختلف علوم وفنون کی جامع کتاب بھی بن گیا ہے مثلاً وجود باری تعالیٰ یا حیات بعد الممات کے دلائل میں تخلیق ارض وسمٰوٰت کا ذکر آگیا ہے تو ہرچند یہ ذکر ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہو نہیں سکتا کہ سائنس کے اکتشافات تخلیق ارضی وسما کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں وہ اس سے مختلف ہوں جو قرآن کریم میں نسبتاً مذکور ہے اگر اختلاف ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہنوز سائنس کی تحقیق یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچی۔ قیاس وظن کی حدود کے اندر ہے اس سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ قرآن کریم کے اُن گوشوں کی تفسیر کسی ایک شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔ تفسیر بالقرآن کی رو سے ان مقامات کے معانی تو متعین ہوجاتے ہیں لیکن ان معانی کی تفصیلات اور جزئیات کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس خاص فن کا ماہر (SPECIALIST) ہو۔ اور جو بتا سکے کہ ذہن انسانی نے اس وقت تک اس خاص فن کے متعلق کیا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور قرآن کریم ہمیں کہاں تک لے جاتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں۔ جہاں ہر مقام کے لئے ایک ایک ماہر فن کی ضرورت ہے۔ جو قرآن کریم

کی روشنی میں ان علوم کی ریسرچ کریں اور اپنے نتائج سے قرآن کریم کی تفسیر بیان کریں بعض اہل ذوق حضرات نے اس قسم کی کوششیں کی بھی ہیں اور اُن کے نتائج بڑے بصیرت افروز ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ کام بھی افراد کا نہیں۔ انفرادی کوششوں کا نہیں۔ یہ تو حکومت وسلطنت کا کام ہے۔ نظام جماعتی کا کام ہے۔ ماہرین فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لیکر اس پر عمریں صرف کر دیں۔ اور مرتے وقت اپنی مساعی جمیلہ کا ماحصل آنے والوں کے سپرد کر جائیں۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے۔ حتی کہ قرآن کریم کی ایک ایک متشابہ آیت محکمات کی ذیل میں چلی آئے اور انسان علی وجہ البصیرت پکار اُٹھے کہ انہٗ الحق۔ حقیقت صرف قرآن کے اندر ہے۔ باقی سب ظن و قیاس ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایک انسان ان مخصوص ظنی امور (TECHNICAL SUBJECTS) کا عالم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ ان مختلف شعبہ ہائے علوم (BRANCHES OF SCIENCE) سے متعلقہ آیات قرآنی کی تفسیر کیسے بیان کر سکے گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکا ہوں کہ ان خاص علوم کے مبادیات کو کہیں کہیں بیان کر دیا ہے۔ تاکہ ایک اجمالی سا تصور ذہن میں مرتسم ہو سکے کہ قرآن کریم اس مقام پر کسی خاص شعبۂ علم کے اصول بیان کر رہا ہے۔ جزئی تفسیر نہ میرے بس کی بات ہے۔ نہ مجھے اس کا دعویٰ ہے۔ البتہ قرآن کریم کا باقی وہ تمام حصہ جو نفس انسانی کی ہدایت سے متعلق ہے جو ضابطۂ حیات ہے۔ جو نظام اجتماعی کا دستور اساسی ہے۔ اس کی کھلی کھلی اور واضح تفسیر خود قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اور وہی تفسیر آپ کو اس کتاب۔ معارف القرآن کے اندر مل جائیگی۔ اس باب میں انشاء اللہ آپ کو قرآن کریم کی صحیح صحیح تعلیم کے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوگی۔ میں نے اس ضمن میں اس چیز کی بھی رعایت رکھی ہے کہ آج کل ہمارے نوجوان ''مذہب گزیدہ'' طبقہ کے دلوں میں جس قسم کے شکوک و شبہات عام طور پر پیدا ہوتے ہیں ان کا ازالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا جائے اس غرض کے لئے مجھے وہ توضیحی اور تمہیدی عبارات بڑھانی پڑی ہیں جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب عام طور پر حروف تہجی کی رو سے کی جاتی ہے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ اس کتاب کی ترتیب میں بھی یہی اصول پیش نظر رکھا جائے۔ لیکن بہت سے صائب الرائے حضرات نے بوجوہ چند اس کی مخالفت کی اور بالآخر یہی قرار پایا کہ اسے اس انداز سے ترتیب دیا جائے کہ جہاں ہر عنوان فی ذاتہٖ مکمل اور مربوط ہو۔ وہاں وہ ایک سلسلۂ دراز کی کڑی بھی ہو۔ یعنی ان عنوانوں کے باہمدگر ملنے سے جو ایک کتاب مرتب ہو۔ وہ بجائے خویش مربوط و مسلسل ہو۔ لہٰذا اس کی ترتیب کی یہ بنیاد رکھی گئی ہے کہ اللہ۔ ملائکہ۔ رسالت۔ کتاب۔ کائنات۔ آخرت سے متعلق ابواب کو اسی ترتیب سے مسلسل رکھا جائے۔ یہ پانچ چھ عنوانات یوں تو پانچ چھ الفاظ ہیں لیکن یوں سمجھئے کہ ہر عنوان ایک ضخیم جلد کا نام ہے۔ ایمانیات۔ اخلاقیات۔ معاشرت۔ معیشت۔ تمدن۔ عمرانیت۔ اقتصادیات۔ نفسیات۔ نظام اجتماعی۔ مرکزیت۔ مبداء و معاد۔ مختلف علوم و فنون۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ اثری تحقیقات۔ علم الارض۔ فلکیات۔ شعائر و مناسک۔ عبادات و رسومات۔ اسلامی قوانین۔ بین الاقوامی دساتیر۔ غرضیکہ علم و عمل کے متعلق کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اس کتاب کے اندر نہ آگئی ہو اس تقسیم کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت بیسیوں عنوانات کے ماتحت آگئی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ہر عنوان سے پہلے ایک فہرست مشمولات دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آیات قرآنی کی بھی ایک الگ فہرست دی گئی ہے۔ ایک جلد کے خاتمہ پر اس جلد سے متعلق تمام مباحث کی ایک مکمل فہرست۔ حروف تہجی کے ماتحت بطور (INDEX) شامل کر دی جائیگی۔ اور ساری کتاب کے مکمل ہونے پر ایک مفصل و مبسوط فہرست۔ حروف تہجی کے لحاظ سے اس انداز سے دی جائیگی کہ ایک ایک مسئلہ کئی ایک حروف کے ماتحت مل سکے۔ اور ڈھونڈھنے میں دقت نہ رہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی تمام آیات کی فہرست بھی دی جائیگی تاکہ معلوم ہو سکے کہ فلاں آیت کس کس جگہ آئی ہے۔ اس طرح گویا تمام قرآن کریم کی تفسیر۔ الحمد سے والناس تک آیات کی ترتیب سے ہی سامنے آجائیگی۔ یہ واضح رہے

کہ ایک عنوان کے ماتحت جہاں مختلف امور کا ذکر ہوگا۔ ان امور سے متعلق مفصل بحث اس خاص عنوان کے ماتحت ہی ملیگی۔ مثلاً تخلیق ارض و سما کے عنوان میں اگر ارتقائی منازل کا ذکر آگیا ہے۔ تو اس کی تفصیلی بحث نظریہ ارتقاء کے عنوان میں ملیگی۔ وقس علی ھذا۔ قرآن کریم کی آیات کا متن بھی دیا گیا ہے۔ اور ترجمہ بھی۔ ترجمہ اگرچہ رواں رکھا گیا ہے لیکن اصل سے اختلاف نہیں پیدا ہونے دیا۔ شاہ عبدالقادر۔ شاہ رفیع الدین علیہ الرحمۃ۔ اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ترجم سے بالعموم استفادہ کیا گیا ہے۔ ہر آیت کا شمار، اس طرح دیا گیا ہے کہ اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً ۲/۷ سے یہ مطلب ہے کہ سورۃ بقر کی ساتویں آیت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ انسانی دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو کسی صورت میں بھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کے متعلق ایک لفظ لکھتے وقت بھی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ ہاتھ تھرتھرا جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری بڑی عظیم الشان اور یہ مرحلہ نہایت نازک ہے۔ باین ہمہ احتیاط و احساس نہ مجھے اس امر کا دعویٰ ہوسکتا ہے۔ اور نہ کسی انسان کو۔ کہ جو کچھ سمجھا گیا وہ بالکل صحیح ہے۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اصلاح کی گنجایش نہیں۔ اپنی طرف سے کوشش کی گئی ہے۔ اور بڑی احتیاط سے کوشش کی گئی ہے۔ کہ قرآن کریم کو خود قرآن ہی سے سمجھا جائے۔ اور اس طرح جس نتیجہ پر قرآن کریم پہنچائے اسے بلا کم و کاست۔ بلا خوف و خطر درج کر دیا جائے۔ اس میں نہ اپنے خیالات کو کچھ دخل ہو نہ ان غلط معتقدات کو جو مرور زمانہ سے "مسلمات" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں مجھے خود کئی ایک اپنے خیالات کو بدلنا پڑا جنہیں میں اس سے پیشتر اسلامی نظریات سمجھے بیٹھا تھا۔ لیکن قرآن کریم کے سمجھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ غیر قرآنی تھے اور ان کے اسلامی ہونے کی سند یہی تھی کہ وہ ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں میں رواج پذیر ہو چکے تھے۔ یہ اختلافی گوشے بڑی کٹھن منزلیں

تھیں۔ ماحول کا اثر۔ وراثتی رجحانات۔ ابتدائی تعلیم کے نقوش۔ بچپن سے کان میں پڑی ہوئی آوازوں کے تاثرات۔ قدیمی روایات۔ یہ تمام قوتیں ایک طرف اور قرآن کریم کے فیصلے دوسری طرف۔ ظاہر ہے کہ یہ کشاکش بڑی سخت تھی۔ یہ کشمکش بڑی نازک تھی۔ یہاں پہنچکر قدم میں لغزش آجانا کچھ بعید نہ تھا۔ لیکن میری جبین نیاز اس بارگاہ صمدیت کے سنگ آستان پر ہزار بار اظہار تشکر میں سجدہ ریز ہے کہ اُس مقلب القلوب نے اس کمزور و ناتوان کو یہ توفیق عطا فرما دی کہ ان تمام محسوس و غیر محسوس ذہنی و قلبی رجحانات۔ احوال و ظروف کے اُن تمام امیال و عواطف کو دامن خیال سے جھٹک کر ستانہ وار اس حقیقت کبریٰ کی طرف بڑھ جاؤں جسے قرآن کریم بے نقاب پیش کر رہا ہو۔

پھر اس کتاب سے یہ بھی مقصود نہیں کہ قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم استیعاباً اس کے اندر آگئی ہے۔ اس سعی بلیغ کے باوجود سیکڑوں ابواب اور ہزاروں عنوان ایسے ہو سکتے ہیں جو اس پر اضافہ کئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم تو وہ بحر بے کنار ہے کہ کوئی انسانی عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تو محض ایک خاکہ ہے اس حقیقت کے سمجھانے کا کہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم یوں سمجھ میں آسکتی ہے۔ اور اس کی صحت پر یقین اس لئے ہے کہ یہ میرے یا کسی اور انسانی۔ دماغ کی اختراع نہیں بلکہ خود قرآن کریم نے ہی یہ طریقہ سمجھایا ہے۔ دنیا آگے بڑھیگی۔ اور اس خاکے میں رنگ بھریگی۔ زمانہ ترقی کریگا اور ان بنیادوں پر حسین و جمیل فلک بوس عمارات تعمیر کریگا۔ میرا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ وہ سعید روحیں جو قرآن کریم سے تلاش حقائق کی تڑپ رکھتی ہیں۔ ان کے لئے وہ ابتدائی مشکلات حل کر دوں جو قرآن کریم کے براہ راست سمجھنے میں ان کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ اگر میری یہ حقیر سی کوششیں ملت اسلامیہ میں قرآن کریم کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے میں کچھ بھی کامیاب ہو گئیں تو میں سمجھونگا میری کاوشوں کا مجھے کافی صلہ مل گیا۔ کہ اصلی صلہ تو اُس شاہنشاہ حقیقی کے دربار سے ہی مل سکتا ہے جو نیتوں کا جاننے والا اور ارادوں کا واقف کار ہے۔ جو مساعی اس کے

ہاں مشکور ہوجائیں وہی نتیجہ خیز ہیں - اور جو وہاں نامقبول ہوں - وہ خواہ بظاہر کتنی ہی درخشندہ وتابناک ہوں - دنیا و آخرت دونوں میں موجب خسران ہیں -

پھر بعید از سپاس گذاری ہوگا اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ جو استفادہ میں نے حضرات سلف علیہ الرحمہ کی متاع علمی سے کیا ہے - میری گردن تسلیم اس کے بار منت سے خم ہے - لیکن ان سے بھی زیادہ میرے شکریہ کے مستحق وہ بزرگ ہیں جنکے قیمتی مشورے - جو ان کے تبحر علمی - بلند نگہی - کشادہ ظرفی اور محبت قرآن کے آئینہ دار ہیں - بڑے بڑے مشکل مقامات پر میرے لئے خضر راہ بنے - پھر سپاس گذار ہوں اُن دوستوں کا جن کی قرآن کریم سے دلچسپی اس طول وطویل سفر میں میری دلجوئی اور حوصلہ افزائی کا موجب بنتی رہی - اور جن کے تقاضائے شوق سے یہ کتاب سردست اس شکل میں شائع ہونی شروع ہوئی ہے - حقیقت یہ ہے کہ جو تعلقات قرآن کے رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں ان میں خلوص ومحبت کی وہ جنتیں آباد ہوتی ہیں - جو دنیا میں کسی اور تعلق سے حاصل نہیں ہوسکتیں اور کوئی کیف وبہار جن کا مقابلہ نہیں کرسکتی ان کیفیات کا اندازہ کچھ وہی رند مشرب کرسکتے ہیں جو اس خمکدۂ حجاز میں مشغول نوشانوش ہیں -

آخر میں دعا ہے کہ یہ حقیر وبے مایہ سی "متاع عزیز" جو اس شاہنشاہ گدا نواز کے آستانۂ عالیہ پر جھکی ہوئی نگاہ - عرق آلود پیشانی لڑکھڑاتے ہوئے قدم اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لے کر حاضر ہو رہا ہوں - اس کے حضور میں شرف باریابی کی تقریب بن جائے - نگاہ اُس کی چشم کرم پر ہے نہ صلہ ومعاوضہ پر - کہ سنتا ہوں کہ اس کے بازار رحمت میں داد وستد کے کچھ ایسے ہی انداز ہیں -

ربّنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا ربّنا ولا تحملنا ما لا طاقتلنا به واعف عنّا واغفر لنا وارحمنا انت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکافرین ۞ ۲/۲۸۶

عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم
طلوعِ اسلام
بیادِ گار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

طلوعِ اسلام کا

مسلک ۔جیسا کہ پہلے پرچہ میں بالوضاحت بتایا جا چکا ہے۔طلوع اسلام کا مقصد حضرت علامہ اقبالؒ کے پیام حیات بخش کی اشاعت ہوگا۔جسکا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا جائے۔مفکرین عالم کے سامنے اس حقیقت کبریٰ کو بے نقاب کیا جائے کہ عالمگیر امن و فلاح کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دُنیا کا نظام زندگی وہ ہو جو خدا کے اس آخری ضابطۂ حیات میں مرتب کر کے دیا گیا ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں یہ یقین راسخ کیا جائے کہ دُنیا علم و بصیرت کی جن بلندیوں تک چاہے پہنچ جائے۔قرآن کریم اس سے بھی کہیں آگے نظر آئے گا۔

نظام۔طلوع اسلام کے نظام کے متعلق بھی اعلان کیا جا چکا ہے کہ یہ پرچہ کسی فرد کی ملکیت نہیں بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا نظم و نسق ایک ایسی جماعت سے متعلق ہے جس کے اراکین نے محض اللہ کے لیے اس فریضہ کو اپنے ذمہ لیا ہے انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس پرچہ کے خسارہ کو پورا کرتے جائینگے لیکن اس کے منافع میں سے کوئی شخص ایک پائی بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھے گا گزشتہ سال بعض مخلص احباب نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ طلوع اسلام کو پائدار بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ایسے ایثار پیشہ معاونین پیدا کیے جائیں جو ۲۵ یکمشت ادا کر کے اس کی سرپرستی فرماتے رہیں اور رسالہ کو مستقبل کے خطرات سے نجات دلا دیں۔دائرہ طلوع اسلام نے اس مقدس تحریک کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ تجویز کیا ہے کہ اس طرح جب تین ہزار روپیہ جمع ہو جائے تو اس کو محفوظ سرمایہ قرار دے کر اطمینان کے ساتھ رسالہ کی ترقی کے وسائل اختیار کیے جائیں تاکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں اب تک تیرہ سو روپے کے وعدے ہو چکے ہیں جن میں سے چھ سو روپیہ وصول بھی ہو چکا ہے۔انشاءاللہ دائرہ طلوع اسلام کی کوششیں برابر جاری رہیں گی یہاں تک کہ تین ہزار محفوظ سرمایہ جمع ہو جائے۔ لہٰذا:۔ **جو حضرات**

اس جماعت کی رکنیت پسند فرمائیں وہ پچیس روپیہ یکمشت یا بالاقساط ادا فرما کر ان خدمتگزاروں کے حلقہ

غمِ اقبالؒ

(اسد ملتانی)

جناب اسد کا مرثیۂ اقبالؒ آپ اشاعتِ ماسبق میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اب "تسکینِ غم" آپ کے پیشِ نظر ہے مرثیہ تھا تو، اور اب تلقینِ صبر ہے تو۔ دونوں جگہ آپ اس حقیقت کو نمایاں دیکھیں گے کہ:-

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبرِ دل بے اختیار کے ساتھ

سیلابِ غم ہو یا ہجومِ مسرت مومن کی شان یہ ہے کہ اُسکی نگاہ کا ہر زاویہ ادراک اور قلب کی ہر حرکت مرضاتِ الٰہی کے تابع ہو۔
(طلوعِ اسلام)

دیدۂ اشکبار کو اور نہ اشکبار کر
ملتِ غم رسیدہ اب صبر بھی اختیار کر

پھول کی آنکھ بھی ہے تر، چشمِ ستارہ بھی ہے نم
شاہدِ کائنات کو اور نہ سوگوار کر

کوندکے موجِ اشک میں ڈوب نہ جائے برقِ غم
شعلۂ مستقل بنا دل میں اُسے اُتار کر

ماتمِ عارضی کا رُخ جانبِ عشق پھیر دے
سوزِ غمِ فراق سے درد کو پائدار کر

جو کہ رموزِ سروری تجھکو بتا کے چل دیا
ویسے فقیر کے لیئے صدیوں اب انتظار کر

پردۂ مرگ نے اُسے تجھ سے چھپا لیا تو کیا
اپنی حیاتِ عشق میں تو اُسے آشکار کر

ہے یہی ماحصل اسد اُسکے پیامِ خاص کا
عشق سے زندہ کر خودی، فقر سے استوار کر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام دہلی

(دورِ جدید)

مدیر مسئول حکیم ذکی احمد خاں
معاون محمد عثمان

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ ۸/

جلد (۱) شمارہ (۳) بابت ماہ جولائی ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

لمعات

مسلمان پہلے ہی قحط الرجال کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اس پر پتہ نہیں مشیت خداوندی کو کیا منظور ہے کہ کام کے آدمی آہستہ آہستہ ہم سے چھنتے چلے جا رہے ہیں اور ایسی کرسیاں خالی ہو رہی ہیں جنکا پُر ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ ہنوز حکیم اسلام حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں آنسو نہ تھمے تھے کہ ہندوستان کے مشہور مؤرخ اسلام حضرت مولانا اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی کی رحلت کی خبر ملی۔ مرحوم اسلامی تاریخ کے بہت بڑے ماہر تھے مگر اس سے زیادہ اُن کی وہ اسلامی محبت تھی جو وقائع نگاری پر ہمیشہ غالب رہی۔ اُن کی تاریخ نویسی درحقیقت اسلامی عظمت و شوکت کے اظہار کا ایک ذریعہ تہا وہ اپنی مورخانہ مساعی کا ماحصل صرف یہ سمجھتے تھے کہ اُنکے قلم سے اسلام کی کتنی خدمت ہوئی اُن کی تحریروں سے کتنے گمراہوں نے ہدایت پائی اور اُنکے افکار و خیالات کتاب و سنت سے کہانتک تطابق رکھتے ہیں +

مرحوم نے اپنی عمر ایک رہنما ایک مؤرخ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مزدور اور نسبتاً گمنام مجاہد کی حیثیت سے بسر کی اور اسلامی محبت کے ساتھ آخر عمر تک اسلام کی خدمت میں سرگرم رہے خدائے تعالیٰ اس مرد مومن کی روح کو اپنی رحمت کے آبشاروں سے نوازے اور ہم کو اُنکا نعم البدل عطا فرما کر صبر و سکون کی توفیق بخشے۔ آمین

کانگریس کے روشن خیال ہندو لیڈر اپنی تقریروں میں جس شدت سے سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں اور وہ بھی کسی خاص اجلاس میں نہیں بلکہ مشترک پلیٹ فارموں پر وہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے۔ کانگریس کے فارم۔ کانگریس کی خط وکتابت۔ کانگریس کی

رسیدات۔ اور دستاویزیں اور کانگریس کے بورڈ وغیرہ سب ہندی رسم الخط اور ہندی زبان میں لکھے جاتے ہیں جن سے ان "فراخ حوصلہ" ہندؤں کی نیتوں کا حال آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہا یہ جاتا ہے کہ "ہندوستانی زبان" کو ہندوستان کی مشترک۔ قومی اور بین الصوبجاتی زبان قرار دیا جائے یعنی وہ زبان استعمال کیجائے جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس کے دوش پر سنسکرت، عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ کا بار نہیں ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "ہندوستانی" سے ہر جگہ ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور ہندوستانی سے وہ ہندی مُراد لیجا رہی ہے جس کو خود ہندو بھی مشکل ہی سے سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کانگریسی وزرا سرکاری اعلانوں میں بلا اختیار ہندوستانی کے بجائے ہندی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اس "غلط فہمی" کو دُور کریں اور اعلان کرتے رہیں کہ ذمہ دار حکام کو ہندی کے بجائے ہندوستانی لفظ استعمال کرنا چاہیئے تاکہ اُردو کے حامی مسلمان کہیں بھڑک نہ اُٹھیں بلکہ اس آتش خاموش کو یوں اندر ہی اندر سُلگا یا جائے کہ ان کو اصل حقیقت کا پتہ اُسوقت چلے جب اُنکے کلچر کی متاعِ گراں بھی راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جائے اور اُس کی جگہ پراچین تہذیب پوری قوت کے ساتھ متمکن ہو چکی ہو۔

کانگریس کے گزشتہ اجلاس میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی صدارت میں ایک تعلیمی بورڈ بنایا گیا تھا جسنے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد واردھا اسکیم کے تحت زبان کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ سادہ اُردو کو جو شمالی ہندوستان کی زبان ہے۔ قومی زبان قرار دیا جائے اور اُسکے لیئے دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط اختیار کیئے جائیں۔ یہ ان لوگوں کی متفقہ تجویزوں کا خلاصہ ہے جو تعلیم کے بارے میں بہت گہرا اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ ہماری کیا بساط ہے کہ اُسکے خلاف اپنی زبان کو حرکت دیں اور ارباب تعلیم کو اپنے مشوروں کا محتاج سمجھیں مگر ہماری ناقص رائے میں ہندوستانی کے پردہ میں ہندی کو آگے

بڑھے اور اردو کی جگہ حاصل کرنے کا بہت اچھا موقعہ فراہم کیا گیا ہے اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں نہ صرف ہندی رسم الخط جاری ہو جائیگا۔ بلکہ ہندی زبان کی جڑیں بھی مضبوط ہو جائینگی اور خود مسلمانوں کے سہارے ہندی کو اردو کے مساوی قرار دیکر اردو کی اہمیت تک کو ختم کر دیا جائے گا۔ یہ دیکھکر کس قدر صدمہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے کرایا جا رہا ہے۔ واردھا اسکیم جناب ڈاکٹر صاحب کی جگر کاوی کا نتیجہ ہے اور اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو ابتدائی ریڈریں تیار کی گئی ہیں ان پر تصدیق حضرت مولانا آزاد نے ثبت فرمائی ہے اور اردو کا جنازہ یوں مسلمانوں کے ہی کندھوں پر مرگھٹ میں پہنچایا جا رہا ہے۔ صوبہ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے مشورہ دیا ہے کہ مسلمان ہندی سیکھیں اور ہندو اردو کی تعلیم حاصل کریں تاکہ "اس طرح مختلف فرقوں میں اتحاد کا رشتہ مضبوط ہو جائے (ہندوستان ٹائمز ۸ مئی ۴۸ء) مقصد یہ ہے کہ "ہندوستانی زبان" کی حمایت کے سہارے ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کا معیار اردو کے برابر ہو جائے اور جب ایسا وقت آئے گا تو اردو کو شکست دیدینا ہندی کے لئے کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مسلمان کانگریسیوں کی نیت کیا ہے۔ ہم تو صرف نتیجہ پر نظر رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آئندہ چل کر نتیجہ یہی اور صرف یہی نکل سکتا ہے۔ زہر زہر ہی ہے خواہ وہ کسی نظر فریب دوست کے ہاتھوں ملے یا کھلے دشمن کے۔ باقی رہا نیت کا معاملہ۔ سو حسن نیت کا الاؤنس بھی اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب وہ لاعلمی پر مبنی ہو ایسے کھلے کھلے نتائج کی موجودگی میں بہبودی ملت" کا ادعا اگر عدو نوازی نہیں تو کم از کم دانستہ خود فریبی ضرور ہے۔

زبان اور رسم الخط کے بعد مسلمانوں کیلئے سب سے اہم چیز مذہبی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ قومی حکومتوں سے ہماری یہ توقع بجا تھی کہ وہ تعلیم کے سلسلہ میں ان نقصانات کی ضرور تلافی کریں گی جنکو انگریزی تعلیم انگریزی نصاب اور انگریزی نظام کے تحت مسلمان ہمیشہ برداشت کرتے رہے ہیں مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کے وزراء جو ابتدائی تعلیم کا خاکہ تیار کر رہے ہیں اس سے مذہبی عنصر کو بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔ گویا انگریز نے بھی مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ رکھنا چاہا اور اب قومی حکومتوں نے بھی اس

عنصر کو غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز کر دیا ہے۔

واردھا اسکیم کے تحت تعلیم و تربیت کے جو اعلیٰ اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ مسلمان بچوں کیلئے اسلامی تعلیم سے قطعاً معرا ہیں۔ بلاشبہ غیر مسلم حضرات اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہندو اگر کچھ نہ جانے تب بھی وہ ہندو رہ سکتا ہے اس کا جاننا بس یہی کافی ہے کہ وہ ہندو ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہندو مذہب کے اصول و مبادی کی معرفت بھی حاصل کرے (اور یہ اسلئے کہ ہندو مذہب درحقیقت کوئی مذہب ہی نہیں ہے) مگر ان کو شاید اس کا علم نہیں کہ اگر مسلمان اپنے مذہب سے لاعلم رہے تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا، مسلمان وہی ہے جو اپنے مذہب کا بھی تھوڑا بہت علم رکھتا ہے۔ اور جو مسلمان اس اقل قلیل عنصر سے بھی محروم ہے وہ مسلمان کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہے

مگر تعلیمی بورڈ کے صدر ہمارے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تو اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتے تھے پھر جو انہوں نے اپنے تعلیمی پروگرام میں اس حقیقت کو کیوں نظرانداز کر دیا اور یہ جانتے ہوئے کہ جبری تعلیم کے بعد مسلمان بچوں کو کسی دوسری جگہ مذہبی تعلیم حاصل کرنیکا موقعہ بھی نہیں رہے گا اپنے پروگرام میں مذہبی تعلیم کی اہمیت سے کیوں چشم پوشی فرمائی؟ — از باغباں تند است کہ صیاد آں نہ کرد۔

انگریزوں سے اپنے دور حکومت میں یقیناً یہ چوک ہوئی تھی کہ انہوں نے جبریہ تعلیم کا نفاذ نہیں کیا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر مسلمان بچے مکتبوں اور مسجدوں میں تھوڑی بہت اسلامی تعلیم حاصل کر لیا کرتے تھے مگر موجودہ وزارتوں نے نہایت ہوشیاری سے جبریہ تعلیم کا نفاذ کر کے مسلمانوں پر نجی تعلیم کا دروازہ بھی بند کر دیا ہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکومتوں کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور جو بعض مسلمان وہاں نظر آتے ہیں وہ بھی اکثریت کی ہی صدائے بازگشت ہیں کہ وہاں رہ ہی وہی سکتا ہے جو "مہاشٹر وانس" ہو اس لئے جس اسکیم یا فیصلہ کو متحدہ قومیت کا فیصلہ کہا جاتا ہے۔ وہ در اصل ہندوؤں کا ہی فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پر انگوٹھا کسی سید صاحب یا کسی مولانا صاحب سے لگوا لیا جائے اب ظاہر ہے کہ مسلمان بچوں کو ایسی تعلیم جبریہ دینا جسمیں مذہب کا عنصر یکسر نہ ہو اور انہیں نجی طریق سے تعلیم حاصل کرنے سے عمداً روک دینا۔ دس برس کے بعد کیا نتائج پیدا کریگا۔ یہ قدم اس وقت اٹھائے جا رہے ہیں جبکہ ہنوز ایک فیصدی آزادی بھی نہیں ملی۔ جب پورا سوراج مل جائیگا اسوقت کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے اسپر اگر مسلمان اکثریت کی چالوں سے بدگمان ہو جاتا ہے تو چاروں طرف سے شور اٹھتا ہے کہ غدار ہے۔ حوالۂ دار و رسن کر دو — میری نگاہ شوق پہ اسدرجہ سختیاں + اپنی نگاہ [illegible]

روپے کو خدا کی بڑی طاقت دی ہے اور چونکہ یہودی قوم دنیا میں سب سے زیادہ سرمایہ دار قوم ہے اس لیے اس کو بھی زبردست قوت حاصل ہو کر بڑی بڑی حکومتوں کو اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے اور سرمایہ کے زور سے مسلمانوں کے قبلہ اول پر قبضہ کرنے کی دیرینہ آرزو پوری کر رہے ہیں۔

ہم نے تین سال ہوئے، عربی اخبارات میں پڑھا تھا کہ صیہونی تحریک کے علمبردار ڈاکٹر وزمین، ہندوستان میں یہودیت کا پروپیگنڈا کرنے کے لیئے ہندوستان کے غیر مسلموں کو سرمایہ کا لالچ دیں گے اور اس کے لیئے تقریباً ایک کروڑ روپیہ مخصوص کر لیا گیا ہے اگر ڈاکٹر وزمین کو معلوم ہوتا کہ سنہری اور روپہلی جاذبیتوں کے ماتحت ہندوستان کے بعض مسلمان قلب ماہیت کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ کبھی "غیر مسلم" کی شرط نہ لگاتے وہ غالباً ابھی تک مسلمانوں سے بہت بڑی حد تک حسن ظن رکھتے ہیں۔

جس بات کے لیئے ہم نے یہ تمہید اٹھائی ہے اس کو صرف ایک اخبار کا حوالہ دے کر ہمیں ختم کرتے ہیں اور نتیجہ قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں۔

"فلسطین یہودیوں کا قومی وطن ہے جو اُنکے اعمال اور سیاسی انقلابات کی وجہ سے اُنکے ہاتھ سے چھن گیا۔ اگر وہ اپنے مُلک میں اور اپنے وطن میں آباد ہونا چاہتے ہیں تو عربوں کو کوئی حق اُن کی مخالفت کا نہیں ہے . . . . کوئی مُسلمان میری بات مانے یا نہ مانے خوش ہو یا ناراض ہو۔ مگر میں پُوری آزادی اور جراٗت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ یہودیوں کے خلاف جرمنی اور فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے میں اُس کو ظلم سمجھتا ہوں اور میں ظالموں کا ہم خیال نہیں ہوں اور مجھے یہودیوں سے پُوری ہمدردی ہے +"

(اخبار رہنما دہلی ۱۰ر جون ۱۹۳۷ء)

خدا اس قوم پر رحم فرمائے جسکے مشہور "رہنما" کی یہ حالت ہو +

۱۶ر جون کو انگلستان کی پارلیمنٹ میں سرحدی قبائل پر بمباری کے سلسلہ میں جو بیان وزیر اعظم برطانیہ نے دیا ہے وہ اخبار بیں طبقہ کے سامنے آچکا ہے۔ جواب کی سیاسی نوعیت سے ہمیں کوئی تعلق نہیں بلکہ ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ جو حکومت اسپین اور چین و جاپان کی بمباری پر بار بار احتجاج کر چکی ہے جو اسپین کے باشندوں کو فضائی آتش سے ہلاک ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی جس کا قلب اتنا نرم ہے کہ

غریب چینیوں کی ہلاکت پر مغموم ہوئے جاتاہے وہ کس جگر کے ساتھ فلسطین کے مظلوم عربوں اور وزیرستان کی غیر مصاف آبادی پر بمباری کر رہی ہے اور اس کا تماشہ کن آنکھوں سے دیکھ رہی ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ فلسطین کے عرب اور سرحد کے قبائل مسلمان ہیں؟ اور مسلمان ہونا ہی ایسا جرم ہے جس کی پاداش میں ہر قسم کی بربریت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمان بھی کسی کے نزدیک عدل و انصاف کے مستحق ہوسکتے ہیں۔
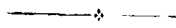
مسٹر جناح اور صدر کانگریس (سوبھاش چندر بوس) کے درمیان بمبئی میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہے مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جانبین کسی آخری تصفیہ کے لیے جو شکوک و شبہات سے مبرا ہو بے چین ہیں اور دونوں طرف سے خواہش یہی ہے کہ آئے دن کے اختلافات ختم کردیئے جائیں۔ رہا نفس تصفیہ کا معاملہ سو جب اسکا ظہور ہوگا اور ہم سب اسے دیکھیں گے تو اُسکے حسن و قبح کا اندازہ لگائیں گے اور معلوم کرینگے کہ جس مقصد کے لیے گفت و شنید کا سلسلہ جاری کیا گیا تھا اور مصالحت کی طرح ڈالی گئی تھی وہ کہاں تک حاصل ہوا ہے۔

اس موقع پر صلح ہوسکے یا نہ ہوسکے اور فریقین کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچ جائیں یا نہ ہمیں بہرحال مفاہمت و مصالحت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی مگر ایسی مصالحت جو اسلام کی مرکزیت کو صدمہ پہنچائے اور امتِ مسلمہ اپنی مستقل ہستی کو گم کرکے اکثریت کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالے مسلمان کانگریس میں شریک ہوں یا اس سے بھی بڑی کسی جماعت میں بہرحال ان کا مستقل وجود باقی اور قایم رہنا چاہیئے اور ان کی امتیازی خصوصیات کو اس حیثیت سے محفوظ رہنا چاہیئے کہ کفر و اسلام میں آسانی سے خطِ امتیاز کھینچا جاسکے مسلمان جہاں جائے اپنی اسلامیت کے ساتھ جائے اور جہاں سے آئے اپنی اسلامیت کے ساتھ آئے اگر ایسا نہیں ہے تو مسلم لیگ اور کانگریس کی صلح بھی مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں ہوسکتی اور اس حالت میں ہر مخلص مسلمان کا فرض ہوگا کہ وہ غیروں کے علاوہ اپنوں سے بھی جنگ کرنے پر آمادہ ہوجائے تاکہ اسلام اور اسلامی خصوصیات

خارجی اور داخلی ریشہ دوانیوں سے پاک ہو جائیں اور منافقت اپنی موت آپ مرجائے بمسلم خلیج کی طرف سے جس بنیادی شرط کا تذکرہ عام طور پر اخبارات میں ہو رہا ہے اگر وہ صحیح ہے اور خدا کرے کہ وہ صحیح ہو، تو اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کے استبقار اور اُسکے امتیازاتِ خصوصی کے تحفظ کی اہمیت اُن کی نگاہوں کے سامنے ہے اور یہ امر ہر مخلص مسلمان کے لیئے باعثِ ہزار مسرت و طمانیت ہے ۔

اسلامی معاشرت

صحیح انسانی معاشرت کیا ہے؟ اُسکے متعلق اسلام کے احکام کیا ہیں؟ وہ کون سے عناصر ہیں جو انسان کی صحیح معاشرت کے منافی ہیں اور اس باب میں قرآن حکیم مسلمانوں کو کیا تعلیم دیتا ہے؟ اخلاق اور بداخلاقی کے حدود کیا ہیں، اور انسانی سیرت کن چیزوں کو اختیار کرنے سے پختہ ہوتی ہے؟ غرض معاشرت کے متعلق ایک مکمل دستور العمل قرآن کریم کی روشنی میں دیکھنا ہو تو "اسلامی معاشرت" کا مطالعہ کیجیے۔ سا ٹھ صفحے کا رسالہ ہے اور جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی اے نے اس میں قرآن کریم کا خلاصہ اور عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے ۔

ایک کاپی کے لیئے ۴ر کے ٹکٹ ارسال کیجیے، اور گھر بیٹھے معاشرت کے اہم مسائل سے واقفیت حاصل کیجیے۔

دفتر طلوعِ اسلام جدید پریس
(بلیماراں دہلی)

جماعتی زندگی

(از جناب چودھری غلام احمد پرویز بی اے شملہ)

انسان اور حیوان کی زندگی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان کے سامنے کوئی نصب العین حیات، کوئی مقصدِ زندگی نہیں ہوتا۔ اُس کی تمام تگ و دو طبعی ضروریات کی تحصیل تک ہی محدود رہتی ہیں۔ ایک گھوڑے کو آپ عمر بھر تھان پر باندھے رکھیں اور گھاس پانی دیئے جائیں تو وہ نہایت مطمئن زندگی بسر کرے گا اگر آپ اس سے کچھ کام بھی لینا چاہیں تو وہ کام۔ وہ مقصد آپ کو خود متعین کرنا ہوگا۔ جہاں آپ اُسے چلائینگے وہ چلے گا۔ جہاں روکیں گے رُک جائے گا۔ نہ اُسکے سامنے اپنی متعین کردہ منزل ہوگی۔ نہ اس منزل کی طرف لے جانیوالا راستہ، پھر یہ بھی حیوانی زندگی کی خصوصیت ہے کہ اگر اُسکے ساتھ بندھا ہوا دوسرا گھوڑا درد سے بیتاب ہو رہا ہو تو اُسے کوئی احساس نہ ہوگا۔ یہ اپنے گھاس کھانے میں مصروف رہے گا۔ یہ ہے حیوانی زندگی۔ برعکس اس کے انسان کی زندگی ایک باالارادہ اور باالمقصد زندگی ہے۔ عبث و بے معنی نہیں۔ فرمایا:-

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۲۳/۱۱۵

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی عبث۔ بے مقصد پیدا کر دیا اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔

دوسری جگہ ہے:-

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۷۵/۳۶

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے یونہی بے مقصد زندگی بسر کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ نصب العین حیات کیا ہے! مقصدِ زندگی کونسا ہے!! ایک تو مقصدِ زندگی وہی حیوانی ہے۔ کھانا۔ پینا۔ سو رہنا۔ اور وقت آنے پر مر جانا۔ وہی پُرانا نظریہ ابیقوریت

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ﴿۴۷/۱۲﴾

اور جو لوگ کفر کرتے ہیں ان کی زندگی یہ ہے کہ وہ (سامان زینت) سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے (دن گذار دیتے ہیں) ﴿۴۷/۱۲﴾۔

اِسے یکسر "دُنیا دی" زندگی کہا جائے گا وہی زندگی جسکے متعلق اکبر مرحوم نے کہا ہے ؎

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے؟
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی۔ اور مر گئے

یہ خالص حیوانی زندگی ہے۔ اور جب زندگی کا نصب العین یہ قرار پا جائے تو حیوانات کیطرح انسان بھی ایک انفرادی زندگی بسر کرتا ہے اُسکے سامنے سب سے مقدم "میں" ہوتا ہے۔ بلکہ ہوتا ہی "میں" ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اپنے بیوی بچوں کی نگہداشت کرتا ہے لیکن یہ چیز بھی حیوانی زندگی میں مشترک ہے۔ مادہ جب انڈے سیتی ہے تو نر خوراک کا انتظام کرتا ہے اور پھر دونوں ملکر بچے کی پرورش کرتے ہیں تا آنکہ وہ اپنے بازوؤں پر اُڑنا نہ سیکھ لے۔ اگر انسان نے بھی اتنا کچھ کر دیا تو کیا کمال کیا۔ پھر مشکل ایک اور بھی ہو جاتی ہے جب انسان اس قسم کا انفرادی نظریۂ زندگی سامنے رکھتا ہے تو وہ ہر شئے کو کاروباری نقطۂ خیال (Business Point of View) سے دیکھتا ہے جس چیز میں وہ "اپنا" فائدہ دیکھتا ہے بلا تامل اختیار کر لیتا ہے جس میں نقصان دیکھتا ہے چھوڑ دیتا ہے ۔

یہ وہ نصب العین ہے جسے "دنیا داروں" کی زندگی کہا جاتا ہے اسکے برعکس دوسری طرف "دینداری" کی زندگی ہے۔ جس میں نصب العین حیات یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح "میری" نجات ہو جائے۔ "مجھے" مکتی حاصل ہو جائے اِس مقصدِ زندگی میں بھی انسان کی نگاہ اسی "میں" پر ہوتی ہے جس کا ذکر "دُنیا داری" کی زندگی میں کیا جا چکا ہے۔ یہ بھی انفرادی زندگی

کا تخیل ہے یہ نصب العین بھی فطرت کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے قرآن کریم نے فرمایا کہ یہ بھی ہمارا مقرر فرمودہ نصب العین نہیں۔

وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ... ۵۷/۲۷

اور رہبانیت تو انہوں نے خود اپنے دماغ سے گھڑلی ہے ہم نے انپر اِسے فرض نہیں کیا

ان دونوں سے الگ۔ اسلام نے وہ نظریۂ زندگی متعین کیا ہے جو عین فطرت کے ممنوا ہے اُس نے آسمانی ہدایت کی ضرورت ہی یہ بیان کی ہے کہ چونکہ انسان فطرۃً مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لیے باہمی اغراض و مقاصد کے اشتراک سے ان میں اختلافات کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ ان اختلافات کے فیصلے کے لیے انسانوں سے بلند و بالاتر۔ رب العالمین کی طرف سے غیر جانب دارا حکام کا آنا ضروری تھا۔ فرمایا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ۔ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۲/۲۱۳

نوع انسانی کو چونکہ ایک جماعتی زندگی (اکٹھے ملکر رہنے کی زندگی) بسر کرنا تھی۔ اسلیے اللہ نے انبیاء کو بھیجا۔ کہ وہ (اعمال صالحہ کے انعامات کی) خوشخبری دیں اور (اعمال سیہ کے عواقب سے) آگاہ کریں۔ اور اُنکے ساتھ اللہ نے کتابیں بھی نازل کیں حق کے ساتھ تاکہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر دیا کریں۔ ۲/۲۱۳

گویا قرآن کریم نے اُصولاً یہ بیان فرما دیا کہ انسان انفرادی زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اجتماعی زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اب اس ہیئت اجتماعیۂ انسانیہ میں جو انسان اپنا نصب العین وہ تجویز کریں جو آسمانی ہدایت نے متعین فرمایا ہے وہ تمام کے تمام ایک عظیم الشان "ملت واحدہ" کے افراد ہونگے جو ہمیشہ سے ایک چلی آئی ہے اور ایک ہی ہیگی قرآن کریم نے مختلف حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا:۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۲۱/۹۲

یقیناً یہ تمہاری تمام اُمت ۔ایک اُمت واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں
سو میری ہی محکومی اختیار کرو

اس آیت میں جماعتی نظام کے تین عنوان متعین کئے گئے ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ تمام انسان جو اپنا نصب العین زندگی پیغام خداوندی کے ماتحت متعین کرینگے وہ ایک اُمت واحدہ ہونگے ایک جماعت کے افراد ہونگے ۔اس جماعت کا مرکز۔ اس جھاڑو کے "تنکوں" کا بندھن ۔ان اجزائے پریشاں کا شیرازہ ۔ایک خدائے واحد کا ایمان ہوگا۔جو ان سب کا پروردگار رہے۔ اور یہ سب لوگ۔ یہ جماعت صرف اس ایک خدا کی محکوم ہوگی کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرے گی۔یعنی ایک آقا۔ایک پالن ہار۔اور تمام اہل ایمان اُسکے غلام۔ایک بزرگ خاندان اور سب اُس ایک خاندان کے افراد۔ یہ ہے قرآنی نظریۂ زندگی یعنی انفرادی زندگی کے بجائے جماعتی زندگی۔ حیاتِ اجتماعیہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شروع سے اخیر تک، کہیں ملتِ اسلامیہ کے افراد کو الگ الگ مخاطب نہیں فرمایا۔ ہر جگہ جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔تخاطب ہمیشہ یَا اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا سے کیا گیا ہے وہ ایمان والوں کی جماعت ہے جسکے متعلق فرمایا کہ " کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ "، تم ایک بہترین قوم ہو۔ یا کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا اس طرح ہمنے تم کو ایک بہترین قوم بنایا۔قرآن کریم میں غور سے دیکھئے۔ جہاں جہاں دعائیں سکھائی گئی ہیں۔ہمیشہ جمع کے صیغے میں ہیں رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (اے ہمارے رب ہم کو دُنیا و آخرت میں بہترین زندگی عطا فرما) رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَا...(اے ہمارے رب ہمپر گرفت نہ کر) رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ھَدَیۡتَنَا (اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو پس از ہدایت گمراہ نہ کردینا) وغیرہ ۔حتے کہ ایک شخص تنہا نماز میں کھڑا ہے اور دعائیں مانگتا ہے۔اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ہمکو سیدھی راہ دکھا۔ یہ "میں" کی جگہ "ہم" قرآن نے سکھایا ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کی زندگی میں جب دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو قاعدے کی رو سے انہیں السّلام علیک کہنا چاہیئے ۔تجھ ایک پر سلام و رحمت لیکن انہیں السّلام علیکم کہنے کا

حکم ہے وہ ساری جماعت کو مخاطب کرتے ہیں ایک ایک فرد کو نہیں
جب انسان کے سامنے اس جماعتی زندگی کا تخیل ایمان کی شکل میں آجاتا ہے تو اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ ملت کے اندر جذب ہو جاتا ہے اس کی انفرادی ہستی باقی نہیں رہتی۔ اسوقت وہ عملاً بتا دیتا ہے کہ عشرتِ قطرہ فی الواقع دریا میں فنا ہو جانا ہے۔ جب یہ قطرہ ملت کے بحرِ بےکنار میں مل جاتا ہے تو پھر کوئی طاقت اُسے اُس سے الگ نہیں کر سکتی پھر اُس کی اپنی ہستی کی الگ شناخت ہی باقی نہیں رہتی۔ جب اس سمندر میں مد کا عروج ہوتا ہے تو سارے سمندر کے ساتھ اس بے بضاعت قطرہ کا بھی عروج ہوتا ہے اور جب جزر ہوتا ہے تو یہ بھی باقی سمندر کا ساتھ دیتا ہے اسوقت اس کا تمام کاروبار۔ اس کی تمام تگ و دو، تمام کد و کاوش۔ اپنے لیے نہیں۔ بلکہ ملت کے لیئے ہو جاتی ہے حتےٰ کہ اس کی عبادات اس کی قربانیاں سب اس مقصدِ عظیم کے لیئے وقف ہو جاتی ہیں یہاں پہنچ کر دنیا داری کی خود غرضی کی زندگی۔ اور رہبانیت کی انفرادیت کی زندگی سمٹ سمٹا کر ایک جماعتی زندگی کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان مُسلم کہلاتا ہے۔

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ وبذالک امرت وانا اوّل المسلمین ۶-۱۶۲-۱۶۳

کہہ دیجئے کہ میری نمازیں میری قربانیاں میرا مرنا میرا جینا سب اللہ۔ رب العٰلمین کے لیئے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلا مسلم ہوں

قرآن کریم میں اگر آپ غور سے دیکھیں تو للہ (اللہ کے لیئے) لمرضات اللہ (خوشنودی خدا کے لیئے) فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں) وغیرہ الفاظ کا مفہوم عام طور پر یہی ہے کہ ایک عبدِ مومن کے تمام اعمالِ حیات۔ خلوص نیت کے ساتھ بغیر کسی اجر و معاوضہ کے خیال کے۔ اپنی ذات کے بجائے ملت کے لیئے وقف ہو جائیں کہ ملتِ اسلامیہ کا اپنی حقیقی ہیئت کذائی میں موجود رہنا فی الحقیقت دُنیا میں خدائے برحق کا نام باقی رہنے کا موجب ہے۔ اسلام کے اولیں دور میں ملتِ اسلامیہ۔ وہ مومنین کی متحدہ جماعت۔ وہ اُمتِ مسلمہ کہ جس کی نظیر نہ اس سے پیشتر

چشم فلک نے دیکھی نہ اس کے بعد دیکھنے میں آئی۔ جب بیکسی اور بے بسی میں گھری ہوئی تھی۔ مخالف قوتوں کا ہجوم چاروں طرف سے یورش کرکے سیلاب بلا کی طرح امنڈتا چلا آرہا تھا۔ ایسے وقت میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَانفقوا فی سَبِیْلِ اللہِ وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۲/۱۹۵

اور اللہ کی راہ میں مالی قربانی کرو۔ اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالو

یہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا کیا تھا۔ یہی کہ اگر اس وقت ان لوگوں کے دلوں میں جنکے پاس دولت تھی اجتماعی حیات کے بجائے انفرادی زندگی کا تصور جاگزیں ہو جاتا۔ وہ سمجھ بیٹھتے کہ ہم "دوسروں" کی خاطر اپنی متاع حیات کو کیوں لٹا دیں تو نتیجہ ظاہر تھا۔ اس انفاق کو فی سبیل اللہ کہا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کو اس روپے کی کیا ضرورت تھی وہ تو خود اپنے ہی لیئے تھا لیکن جو مال اپنی ذاتی ضروریات میں اپنی مرضی سے صرف کیا جائے وہ انسان اپنے راستے میں صرف کرتا ہے لیکن جو کچھ مفاد ملی کے لیئے صرف کرے وہ "اللہ کی راہ میں" صرف ہوتا ہے پہلا ہر چند "اپنے لیئے" ہوتا ہے لیکن یہ سمجھ کی بھول ہوتی ہے دوسرا بظاہر "دوسروں" کے لیئے ہوتا ہے لیکن یہی دراصل "اپنے لیئے" ہوتا ہے اسی لیئے فرمایا کہ

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنفُسِکُمْ ۲/۲۷۲

جو کچھ تم اسطرح صرف کروگے وہ تمہارے اپنے ہی لیئے ہے

یُوَفَّ اِلَیْکُمْ ۲/۲۷۲

وہ تمہیں پورا پورا واپس دیدیا جائیگا

نہیں بلکہ دگنا چوگنا ہوکر

مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ۲/۲۴۵

جو اللہ کو قرض حسنہ دیگا تو اللہ اسے بہت زیادہ بڑھا کر واپس دیگا

یہ اللہ کو قرض دینا کیا ہے ؟

یہی کہ ملّت کے مفاد میں صرف کیا جائے امیرِ قوم۔ مرکزِ ملّت۔ کے قدموں میں لاکر ڈھیر کردیا جائے۔ یہ ہیں وہ کام نہیں للہ (اللہ کے لیے) اور فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں) کہا گیا۔ اسی طرح جہاد کی آیات میں جہاں جہاں آپ فی سبیل اللہ دیکھیں گے یہی مفہوم ہوگا کہ ملّتِ اسلامیہ کے استحکام و استبقا کی خاطر کہ جو دنیا میں حق و انصاف کی علمبردار۔ اور پیغامِ خداوندی کی محافظ و امین ہے۔ ایک فرد اپنی عزیز ترین متاع یعنی زندگی تک قربان کردے اس کا کام میدانِ جنگ میں جان دیدینا ہو۔ یہ پوچھنا نہ ہو کہ اُس کے خون کا خونبہا کون وصول کرے گا۔ یہ زندگی اللہ نے دی تھی۔ اللہ ہی کے لیے کام آگئی۔ یہ ہے مفہوم فی سبیل اللہ کا۔ جب تک افراد کے اندر یہ جذبۂ ملّی قایم رہے گا اس کی قوم زندہ رہے گی۔ جب یہ فی سبیل اللہ (ملّت کیخاطر) قربانیوں کی حرارت سرد پڑ جائے گی، قوم تباہ ہو جائے گی اور اس کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۹/۳۹

اگر تم (ان قربانیوں کے لیے) باہر نہ نکلو گے تو اللہ کا سخت عذاب تم پر مسلّط ہو جائیگا

(یعنی تم سب کے سب مٹ جاؤ گے) اور تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی

یہاں دیکھیے افراد کی معصیت کوشیوں کی سزا ساری قوم کو بھگتنی پڑتی ہے اس لیے کہ یہ معصیت انفرادی نہ تھی۔ بلکہ اجتماعی تھی یعنی جب افراد کے دل سے اجتماعی زندگی کا تصوّر محو ہو جائے اور اس کی جگہ انفرادی زندگی کا غیر اسلامی تصور قایم ہو جائے۔ تو پھر وہ ساری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک دوسری قوم آجاتی ہے جو اس پہلی قوم جیسی نہیں ہوتی (ثم لا یکونوا امثالکم۔ ۴۷/۳۸) اس نئی قوم کے افراد میں اجتماعی زندگی کا ایمان ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیث و آثار میں اس شدت کے ساتھ جماعتی زندگی کے تخیل کو واضح کیا گیا ہے کہ انہیں دیکھنے کے بعد اس امر کے یقین کرلینے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا

کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے۔ انفرادی زندگی کا تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔
حضورؐ نے فرمایا۔ من فارق الجماعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ۔ جو جماعت سے الگ ہوا وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ یدُ اللّٰہ علی الجماعۃ من شذَّ۔ شذَّ فی النار۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اللہ خود اس کا محافظ ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔ حضرت عمرؓ نے خطبات میں اکثر اس حدیث مقدس کو بیان فرمایا کرتے تھے کہ عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعۃ۔ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مع الْوَاحد۔ وَھُوَ مِنَ الاثنینِ اَبعد

ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور جب وہ دو

ہو جائیں تو پھر وہ بہت دُور ہٹ جاتا ہے۔

اکیلے سے مراد انفرادی زندگی کے نظریہ کا حامل اور دوسے مفہوم جماعتی زندگی کے تصور کا علمبردار ہے۔ اسی لیئے حضرت عمرؓ کا یہ جملہ کہ لا اسلام الا بجماعۃ۔ کہ اسلام جماعت کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ گویا تمام اسلامی تعلیم کا نچوڑ ہے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرمایا کرتے تھے۔
ایاکم والتفرقۃ۔ فان الشاذ من النّاس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔
الا من دعا إلی ھذا الشعار فاقتلوہ ولو کان تحت عمامتی ھذہ۔

تفرقے سے ہمیشہ بچنا۔ کیونکہ جو انسانوں سے الگ رہتا ہے اسے شیطان یوں دبوچ لیتا ہے جیسے کہ بھیڑ کو بھیڑیا دبوچ لے۔ جو گلہ سے الگ ہو جائے۔ یاد رکھو! جو شخص تمہیں اس (انفرادیت) کی زندگی کی طرف بلائے۔ اسے قتل کر ڈالو۔ خواہ وہ اس میرے عمامے کے نیچے ہی کیوں نہ ہو (یعنی میں ہی کیوں نہ ہوں نعوذ باللہ) اور مسند امام احمد کی ایک عظیم المرتبت روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں تم لوگوں کو ان پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے حکم دیا گیا ہے یعنی الجماعۃ والسمع (سننا)، والطاعۃ (اطاعت کرنا)، والھجر (ملت کی خاطر سب کچھ ترک کر دینا)، والجہاد فی سبیل اللہ (ملت کے استحکام کے لیئے زندگی تک دیدینا) یاد رکھو جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا۔ اس کی گردن سے اسلام کا طوق اُتر گیا۔ عرض کیا کہ حضورؐ! خواہ وہ روزے

رکھتا ہو۔ اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا کہ ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتا ہو"۔ جماعتی زندگی کی تاکید میں تو یہاں تک فرمایا کہ اِذا کان ثلاثۃ فی سفر فلیؤمروا احدھم۔ کہ اگر تین آدمی بھی سفر میں ہوں تو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر منتخب کر لیں وہ امیر کہ جسکے متعلق فرمایا کہ اِسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی۔ خواہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام ہی امیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے۔ اُسکے احکام کو بگوش ہوش سُنو۔ اور اُس کی اطاعت کرو۔

یہ تھا وہ نظام جماعت اور وہ اطاعت امیر کا صحیح تصور جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف دُنیا کی تاریخ اور جغرافیے کو ہی بدل ڈالا۔ بلکہ خود انسانیت کے اندر ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا لیکن جب کوئی قوم گر جاتی ہے تو اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ صحیح تعلیم کی روح تو اڑ جاتی ہے اور لاش کو وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتی ہے۔ اور اُسے اتنی متاعِ گراں بہا سمجھتی ہے کہ جو شخص اس لاش کو مُردہ بتائے اور کہے کہ اس میں رُوح پھُونکنے کی بھی فکر کرو تو اسے قابلِ گردن زدنی قرار دیدیا جاتا ہے۔ جماعت اور امام کے الفاظ آج بھی آپ کو مساجد کے صحن میں سُنائی دینگے لیکن نہ بُولنے والے اور نہ سُننے والے کو احساس ہوگا کہ ان سے مفہوم کیا ہے "جماعت مل گئی" ! جماعت ہو گئی" ! کے استفسارات آج بھی مسجد کے دروازوں پر آنے جانے والوں کی زبان پر ہونگے لیکن ان میں سے شاید ہی کسی کو پتہ ہو کہ یہی ایک لفظ جماعت جب شرمندہ معنی ہوا تھا تو اُسنے کس طرح دُنیا کے تختے اُلٹ دیئے تھے۔ آج جماعت سے مفہوم رسمی طور پر صفیں سیدھی کر کے اکٹھے ملکر نماز پڑھ لینے کے ہیں۔ اور طاعتِ امام سے مقصود ایک آگے کھڑے ہونیوالے کی آواز پر اُٹھنے اور جھکنے کے، حالانکہ یہی نمازی جب ایسے ہی ایک امام کے حکم پر اُٹھتے اور جھکتے تھے تو ان کے اُٹھنے سے آسمان ابھر جاتا تھا۔ اور اُنکے جھکنے سے زمین دَب جاتی تھی۔ کائنات کے سمندر کا مد و جزر انہی کے اُٹھنے اور جھکنے کا رہین منت تھا اور شرف انسانیت کی خاموش فضاؤں میں تموّج اسی سے پیدا ہوتا تھا۔ آج کی نماز اور اسوقت کی نماز کے الفاظ و ارکان میں کچھ فرق

نہیں لیکن جب مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہوا تو وہی نماز جو "معراج المومنین" بن کر انہیں دین و دنیا کی سرفرازیوں کے سدرۃ المنتہیٰ تک لے جاتی تھی، آج اُن کے مُنہ پر لوٹا کر ماردی جاتی ہے کہ اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　　مُلا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جماعت کے معنی ہیں افراد کا ملت کے اندر گم ہو جانا اور طاعت امام کے معنی ایک مرکز کے فیصلوں کے سامنے جھک جانا۔ یہ ہے اسلامی جماعتی زندگی، یہ ہے وہ حقیقت کبریٰ جس کی محسوس و مشہود شکل دن میں پانچ مرتبہ مسلمانوں کے سامنے لائی جاتی تھی اور اس چیز کو واقفِ اسرارِ حقائق صلعم فداہ ابی و اُمّی نے کافر اور مومن میں وجہ امتیاز قرار دیا تھا کہ کافر کی زندگی جیسا کہ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں انفرادیت کی زندگی ہے حیوانیت کی زندگی ہے اور مومن کی زندگی اجتماعیت کی زندگی ہے انسانیت کی زندگی ہے۔

یہ مرکز کیا ہوگا!! اس جماعت کا عملی نظام کیسا ہوگا!! اس جماعت میں اور دُنیا کی دوسری منظم جماعتوں میں فرق کیا ہوگا!! ان کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ۔ وَمَا توفیقی اِلّا باللہ

اسلامی نظام اور کانگرس

(از ادارہ)

ہندوستان کے مسلمانوں میں اغراض پرستوں کی بدولت مذہبی انتشار کیا کم تھا کہ اب تحریک آزادی کے صدقہ میں ان کا سیاسی قبلہ بھی متزلزل ہو رہا ہے اور ان کے زاویہ نگاہ میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ امت اسلامیہ ہند یہ مستقل دو طبقوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور اسلامی وحدۃ یوں پارہ پارہ ہو رہی ہے۔ ایک فریق مشرق کی طرف قدم بڑھائے چلا جا رہا ہے دوسرا مغرب کی جانب گامزن ہے۔ ایک کے نزدیک وقت اور سیاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہے۔ کہ اپنے امتیازی وجود کو ختم کر کے اکثریت کی "کان نمک" میں اپنے آپ کو تحلیل کر دے۔ دوسرے کے نزدیک یہ اقدام خودکشی کے مرادف ہے۔ غرض جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ خدا اور رسول صلعم پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلام کو اپنی زندگی کا دستور قرار دیتے ہیں ان میں سے ایک گروہ روبقبلہ ہے اور دوسرا گروہ ترکستان کی طرف جا رہا ہے۔ اور جس اسلامی وحدت کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی فنا نہیں کر سکی وہ آج ہندی سیاست کی بدولت یوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔

موجودہ سیاسی افکار کے تقلب اور تحول سے دیگر قوموں میں احساس و بیداری کے عناصر پیدا ہو گئے ہیں مگر اس نے مسلمانوں پر الٹا اثر کیا ہے اور ان پر اختلاف و شقاق کی مصیبتیں نازل ہونے لگی ہیں۔ اس وقت قومیت پسند مسلمانوں کے نزدیک اہم ترین سوال یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان کو حقیقی مسلمان کس طرح بنایا جائے۔ خدا کا پیغام خدا کی مخلوق تک کس طرح پہنچایا جائے۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں ان کی مرکزیت کی تجدید و اصلاح کا کام از سر نو کس طرح شروع کیا جائے۔ وہ اکثریت کے ہجوم اور انقلاب کے دور میں اپنے مذہب۔ اپنی روایات۔ اپنے کلچر اور اپنی خصوصیات کو کس طرح برقرار رکھیں۔ بلکہ ان کے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ

اسلام کی عالمگیر وحدۃ کو جو انسانیت کے پاک وجود پر مبنی ہے کس طرح وطنیت اور قومیت میں تقسیم کیا جائے۔ اپنے امتیازی خصائص اور اپنی تہذیبی۔ لسانی۔ عمرانی اور معاشرتی علائم کو بالائے طاق رکھ کر کس طرح ایک مشترک تہذیب اور قومیت کو بروئے کار لایا جائے۔ یہ مذہب۔ مذہب کا شور جو عوام کے لئے افیم سے کم نہیں ہے اس کو کس طرح پست کیا جائے۔ روٹی کے پردہ میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا جانی دشمن کس طرح بنایا جائے۔ اور بالآخر مسلمانوں کی ایمانی صلابت کو اکبری مذہب کی "لطافت" میں کس طرح اور کس نوعیت سے تحلیل کیا جائے:

یہ وہ خیالات ہیں جو نہ صرف ہند واکثریت کے دماغ میں بلکہ خود قومیت پسند اور روشن خیال مسلمانوں کے دماغ میں کانگرس کی تحریک کے ساتھ ساتھ پرورش پا رہے ہیں اور ان کے سہارے مجلس قومی کے ارکان مسلمانوں سے "رابطہ" پیدا کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر یہ خیالات کسی غیر مسلم جماعت تک محدود ہوتے تو ہمیں ان پر قلم اُٹھانے اور ان کا تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے اسلام کے قلعہ میں ڈائنامیٹ بچھا رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کے سے نام رکھ کر مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی اسلامی بصیرت کے ساتھ کہتے ہیں۔ اور ان کے سامنے مسلمانوں کے مفاد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اگر مسلمان اپنا سیاسی مرکز علیحدہ قائم کرکے اپنے آپ کو مسلمان بھی رکھنا چاہتے ہیں تو ان حضرات کی طرف سے سوال ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کا مقصد کیا ہے؟ ان کا نصب العین اگر کامل آزادی کا حصول۔ غربت و افلاس کا علاج اور کسانوں اور مزدوروں کی فلاح و بہبود ہے تو بعینہٖ کانگرس کا مقصد حیات بھی یہی ہے اور جب مقصد متحد ہے تو علیحدہ علیحدہ اکھاڑے بنانے اور جُداجُدا مرکز قائم کرنے کی آخر ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ گویا اس سوال کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کانگرس کا موجودہ نظام عین اسلامی نظام ہے اور جو کام مسلمانوں کے کرنے کا تھا اس کو کانگرس انجام دے رہی ہے۔ پھر اگر اس مشترک ادارہ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ادارہ بھی انہی مقاصد کے ساتھ قائم کر دیا جائے تو یہ نہ صرف کانگرس سے

ملکہ اسلام سے بھی بغاوت ہوگی۔ اور دُنیا مسلمانوں کو مطعون کریگی کہ وہ آزادی کے دشمن اور ملکی ترقی کے مخالف ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اسی سوال پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں اور واقعات کی روشنی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مقصد اور نصب العین میں متحد ہونے کے باوجود مسلمان اپنا سیاسی مرکز علیحدہ قائم کرنے اور اکثریت کے طرز حکومت سے دامن بچانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ اور اس میں ان کو کہاں تک حق بجانب قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہم یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ جو مسلمان وطن کی آزادی کے لئے کوئی تڑپ نہیں رکھتا اور غلامی کی ذلتوں پر قانع رہنا چاہتا ہے وہ وطن ہی کا دشمن نہیں بلکہ اسلام کا بھی دشمن ہے۔ اسلام حریت و آزادی کا ہمیشہ علمبردار رہا ہے اور غلامی سے نجات دلانا اس کے ظہور کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے وہ غلامی اور محکومی کا کبھی حامی نہیں ہوسکتا۔ وہ ہمیشہ آزادی کا طلبگار رہے گا۔ غلامی کو خدا کی سب سے بڑی لعنت تصور کریگا۔ خود آزاد ہوکر زندگی بسر کرے گا۔ اور دوسروں کو آزاد کرانے میں اپنی زندگی تک کو قربان کر دیگا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان فرنگیوں کی غلامی سے آزاد ہوکر ہندوؤں کی غلامی اختیار کرلے اور بدیشی اقتدار کا جوا اتار کر دیشی غلامی کا لعنتی طوق اپنی گردن میں ڈال لے۔ کیونکہ اس کو نہ انگریزوں سے عداوت ہے نہ ہندوؤں اور یہودیوں سے۔ اس کو عداوت ہے غلامی اور محکومی سے خواہ وہ فرنگیوں کی غلامی ہو یا ہندوؤں اور عیسائیوں کی۔ اور خواہ وہ سمندر پار سے آئے یا خود ہمارے ملک میں اس کی داغ بیل ڈالی جائے مسلمان آزادی کی خاطر جس طرح انگریز سے لڑ سکتا ہے اسی طرح اپنائے وطن سے بھی نبرد آزما ہوسکتا ہے۔ اور آزادی کی خاطر اگر وہ انگریز سے صلح کرسکتا ہے تو اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں سے بھی ہاتھ ملا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی آزادی کا مقصد نسل انسان کی آزادی ہے۔ تمام دُنیا کی قوموں کی بہبود و فلاح ہے۔

اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنی علیحدہ تنظیم کے خواہاں ہیں اور اپنی علیحدہ مرکزیت کے

قیام کو ضروری خیال کر رہے ہیں۔ اس کا جواب ہم سطور ذیل میں دینے کی کوشش کریں گے۔

مادی رجحانات کے تحت دیگر اقوام کی زندگی کا مقصد اقتصادی اور سیاسی آزادی ہے۔ مگر مسلمان کا مقصد یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک استقلال حیات کا نصب العین ایک ذریعہ ہے دیگر اخلاقی و روحانی مقاصد کے حصول کا۔ گویا کانگرس جس آزادی کو اپنا مقصد قرار دے رہی ہے اور جہاں جا کر اپنی جد وجہد ختم کر دینا چاہتی ہے وہاں سے ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ کانگرس کا مقصد قومیت اور وطنیت کے محدود دائرہ میں پرورش پا کر اس مادی دنیا میں معدوم ہو جائیگا۔ مگر مسلمان کا مقصد اس دُنیا میں بھی اور آخرۃ کی زندگی میں بھی باقی اور دائم رہے گا۔ کیونکہ جو چیز انسانیت کی بنیادوں پر قائم ہوگی اس کو بقا کی دولت بھی حاصل ہوگی۔

اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض

جو چیز انسانوں کے لئے نفع بخش ہوگی وہ زمین پر باقی رہے گی۔

مسلمان اس لئے آزادی چاہتا ہے کہ خدا کی زمین میں امن قائم ہو۔ عدل و انصاف کی بساط نسل انسانی کے لئے بچھائی جائے۔ انسان انسانیت کا احترام کرنا سیکھے۔ قومی۔ وطنی۔ لسانی۔ لونی اور دیگر خصوصیات کو فنا کر کے مختلف طبقات و اجناس میں حقیقی مساوات قائم کرے۔ حکومت کے قانون کا سرچشمہ خطا کار اور خود غرض انسان کے بجائے الٰہی شریعت ہو۔ اور ایک صالح حکومت منظر عام پر آئے جس کے ذریعہ مکارم اخلاق کی اشاعت ہو۔ معروف و منکر، خیر و شر اور نیکی بدی میں حد فاصل قائم کی جائے۔ تزکیۂ نفوس اور خیرات و صالحات کی تلقین عام ہو تاکہ انسان روح و جسم کا صحیح امتزاج کر کے دین اور دنیا کی سُرخروئی حاصل کرے اور مقصد تخلیق کو انجام تک پہنچائے۔ کانگرس جس آزادی کی طلبگار ہے۔ اگر وہ حاصل ہوگئی تو قومیت اور وطنیت کی لعنت خدا کی زمین کو اسی طرح شر و فساد سے بھر دیگی جس طرح آج اس نے یورپ کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ "قومی حکومت" کو صرف مادی سیاست سے تعلق رہے گا۔ اس کی بلا سے اگر مکارم اخلاق کی عمارتیں منہدم ہو جائیں۔ دہریت و الحاد کا دور دورہ ہو۔ خدا اور یوم آخرۃ کا علی الاعلان انکار کیا جائے۔ اور اخلاقی قیود کی زنجیریں ٹوٹ کر اباحت مطلقہ

کی لعنت عام اور عالمگیر ہو جائے۔ ایک مسلمان ایسی حکومت پر جو حیات اخروی کے تصور سے خالی ہو اور صرف اسی دنیا میں عیش و عشرت کے لئے مخصوص ہو ہزار دفعہ لعنت بھیجے گا اور کبھی نہ چاہے گا کہ چند روزہ دُنیا پر لازوال اور ابدی زندگی کو قربان کرے۔ بیشک مسلمان دُنیاوی ذلت و افلاس کو خدا کا عذاب سمجھتا ہے لیکن اس ذلت و مسکنت کو دُور کرنے کے لئے وہ عاقبت نہیں بیچ سکتا۔ وہ اس ذلت کو اس انداز سے دُور کریگا کہ دُنیا اور آخرت دونوں کی سرفرازیاں سے حاصل ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ کانگرس کا نظام ترکیبی اور آئندہ قومی حکومت کا خاکہ غیر مسلموں کی اکثریت سے تیار ہوگا اور اس کا سرچشمہ ہوگا روس کی وہ اشتراکیت جو اسلام کی عین ضد ہے[1]۔ اسلام خدا کے تصور اور یوم آخرۃ کے عقیدہ کو انسانیت کے لئے اول اور آخر چیز قرار دیتا ہے اور اشتراکیت ان ہی دو چیزوں کی نفی کا نام ہے۔ وہ جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے اقتصادی نظام نہیں ہے بلکہ سرتاسر مادی نظام ہے جو روحانیت اور اخلاقیت کی مخالف سمت میں واقع ہوا ہے۔ اب آئندہ کانگرس کے زیر سایہ جو حکومت بھی قائم ہوگی۔ وہ لادینی اور خدا کے انکار پر مبنی ہوگی۔ اور حکومت کے زور سے مذہب و اخلاق اور روحانیت کی جڑیں کاٹی جائیں گی۔ اور اب تک روس میں جو کچھ ہوا ہے اس کا پوری قوت سے اعادہ کیا جائیگا۔

کانگرس کے سابق صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے "اپنی کہانی" میں مذہب کے خلاف جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن کا جس طرح خاکہ اُڑایا ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مستقبل کی حکومت کے لئے ابھی سے کس قسم کا مسالہ تیار کیا جا رہا ہے۔ اور اس مسالہ سے کس قسم کی عمارت تیار کی جائے گی۔

کانگرس کے موجودہ صدر سبھاش چندر بوس نے کانگرس کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں صاف صاف فرما دیا ہے کہ آئندہ قائم ہونے والی حکومت اشتراکی ہوگی۔ یہ حقیقت کہ کانگرس

---

[1] صحیح "اسلامی اشتراکیت" کیا ہے اس کے متعلق طلوع اسلام کی کسی آئندہ اشاعت میں لکھا جائیگا انشاء اللہ۔ (طلوع اسلام)

کا رجحان اشتراکیت کی جانب ہے اور وہ روز بروز اسی سانچہ میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ ہم کانگرس کے نیم سرکاری اخبار سے پیش کرتے ہیں۔ اخبار "ہندوستان" لکھنؤ اپنی تازہ اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"جواہر لال نہرو نے چھ سال گزرے جب ایک کتاب لکھی تھی "ہندوستان کدھر؟" اس میں انھوں نے بحث کی ہے کہ ہم کیوں لڑ رہے ہیں آزادی سے ہمارا کیا مقصد ہے؟ . . . . . . اس کتاب کا نکلنا تھا کہ ملک میں غُل مچا جواہر لال سوشلسٹ ہو گئے . . . . . . مگر اب تمام آزادی پسند جماعتیں، نوجوانوں کا سارا طبقہ اور کانگرس اسی راہ پر جا رہی ہے۔ اسی پروگرام پر چل رہی ہے۔ یہ ہے جواہر لال کے مطالعہ کا اثر۔"

(اخبار "ہندوستان" مورخہ ۱۳ر جون ۱۹۳۸ء صـ۱)

یہی اخبار آگے چل کر لکھتا ہے کہ:۔

"سوشلسٹوں کا کانگرس میں صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ کسی جماعت کے لئے روک کا کام دیں بلکہ وہ کانگرس کے اقتصادی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا راستہ نکالتے ہیں۔ کانگرس نے جو کچھ کسانوں اور مزدوروں کے لئے کیا اس میں سوشلسٹوں کا خاص دخل ہے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ کانگرس نے جواہر لال کا نظریہ قبول کر کے اس روش پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ جو ان کے رہنما، روسی اشتراکیوں کی روش ہے۔ اور آجکل کانگرس میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں "سوشلسٹوں کا خاص دخل ہے۔" اور چونکہ اشتراکیت اور لادینی مراوف حقیقتیں ہیں اور کانگرس اسی سانچہ میں ڈھل رہی ہے۔ اس لئے آئندہ قومی حکومت مادی رجحانات کے تحت مذہب کی دشمن ہو گی اور اس وقت ہندوستان کے مذاہب کا وہی حشر ہو گا۔ جو روس کی اشتراکی حکومت میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ایسی لادینی حکومت سے اسلام یا مسلمانوں کی کبھی مصالحت نہیں ہو سکتی۔

اس پر شاید یہ کہا جائے کہ جو اشتراکیت آئندہ حکومت کا خاکہ تیار کرے گی اور اشتراکیت کی بنیاد پر تعمیر کا نقشہ بنائے گی اس کو پہلے خود مذہب سے آزاد ہونا چاہئے تاکہ وہ مذہب کے خلاف نبرد آزما ہو سکے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثریت خود ایک مستقل مذہب کی علمبردار ہے۔ اور اس کو اپنا مذہب اتنا ہی عزیز ہے جتنا مسلمانوں کو اپنا مذہب اسلام۔ اور جب اکثریت خود مذہب کی حامی ہوگی تو اس کے ہاتھوں سے حکومت کا جو خاکہ تیار ہوگا وہ کس طرح دہریت اور لادینی کے مرادف ہوگا اور مذہب کو ماننے والی اکثریت کس طرح مذہب کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی۔ اگر بفرض محال ایسا ہوا بھی تو اشتراکیت اور دہریت کی زد سے وہ بھی نہ بچ سکے گی اور مسلمانوں کی طرح اس کو بھی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔

مگر یاد رکھئے کہ آئندہ قائم ہونے والی حکومت سے، خواہ وہ اشتراکی ہو یا فسطائی قسم کی، ہندوؤں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ خطرہ تو اس کو ہو جس کا کوئی مستقل مذہب مستقل تہذیب اور مستقل تمدن ہو اور جو اپنے اندرونی نظام کے اعتبار سے اس قدر مکمل ہو کہ ہر مخالف تحریک اس سے ٹکرا جائے اور کسی اجنبی تہذیب کا کوئی ادنیٰ عنصر بھی اس میں داخل نہ ہو سکے۔ مگر ہندو مذہب کا یہ حال ہے کہ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مذہب نہیں ہو سکتا۔ وہ مذہب نہیں ایک سوسائٹی ہے جو زمان و مکان کے اعتبار سے ہر سانچے میں ڈھلنے اور ہر قالب میں تبدیل ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے

بلاشبہ اشتراکیت خدا اور مذہب کی دشمن ہے۔ اخلاق اور رُوحانیت کے منافی ہے مگر ہندو "مذہب" کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کی وسعت کا یہ حال ہو کہ ایک خدا پرست اور ایک دہریہ بیک وقت اس کے دائرہ میں رہ سکتے ہیں اس کے لئے اشتراکی نظام کو قبول کر لینا اور خدا اور مذہب سے باغی ہو جانا کیا مشکل ہے۔ جواہر لال نہرو دہریہ ہیں اور دہریت کی کُھلم کُھلا تبلیغ کرتے ہیں تاہم وہ ہندو ہیں

اور ہند و سوسائٹی ان کو ہندو ہی سمجھتی ہے۔ گاندھی جی کٹر قسم کے سناتن دھرمی اور قدامت پسند ہیں اور ہندو دھرم میں شامل ہیں۔ مگر نفس ہندو ہونے کے اعتبار سے گاندھی اور جواہر لال میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کروڑوں سناتنی ویدوں کو خدا کا کلام مانتے ہیں مگر لاکھوں سے اوپر جینی ویدوں کو صلواتیں سناتے اور ان کو گپوڑوں سے تعبیر کرتے ہیں مگر ہیں وہ سب ہندو۔ لالہ لاجپت رائے آنجہانی کٹر آریہ سماجی تھے مگر علی الاعلان ویدوں سے منکر تھے۔ تاہم وہ آخر دم تک آریہ سماج اور عام ہندوؤں کے لیڈر بنے رہے۔

آئندہ قائم ہونے والی اشتراکی حکومت یہی کرے گی تاکہ خدا اور مذہب کے خلاف نبرد آزما ہو جائے گی سو ایسے لاکھوں باغی ہندوؤں میں موجود ہیں اور ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ وہ حکومت اتنا ہی کرے گی کہ اباحت مطلقہ کا اعلان کر دے اور عفت وعصمت کے بجائے عورت کو قوم کی مشترک جائیداد قرار دیدے۔ سو آج بھی ہندوؤں میں کوئی ایسا اخلاقی ضابطہ نہیں ہے جس کے تحت عصمت اور پاکدامنی کا کوئی مفہوم متعین کیا جا سکے۔ گویا اشتراکی حکومت کو قبول کرنے کی صلاحیت اگر کسی میں ہو سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو ہیں جن کے نزدیک ان کے ہر فرد کا ہندو ہونا تو ضروری ہے مگر خدا کو ماننا ضروری نہیں ہے۔

اب تصور کیجئے ایسی حکومت کا جو خدا کی منکر ہو۔ مذہب کی دشمن ہو۔ اخلاق کے لئے سم قاتل ہو۔ انسانوں کو قوم و وطن کے دائرہ میں محبوس کرنے والی ہو اور جس کا مذہب اور نصب العین صرف روٹی اور مادی دنیا کی چند روزہ خوشحالی ہو اور پھر ذرا تصور کیجئے اسلام جیسے پاک اور مقدس مذہب کا جس کی بنیاد خدائے تعالیٰ کا وجود ہو۔ جس کی اساس مکافات عمل یعنی آخرۃ کا عقیدہ ہو۔ جس کا ستون مکارم اخلاق اور تزکیہ نفوس ہو اور جو ہمہ وجوہ اس قدر مکمل اور جامع ہو کہ دین اور دنیا کی سعادتیں اس میں جمع ہو گئی ہوں اس پر اشتراکی حکومت کی بدولت کیا گزرے گی۔ اور سوشلزم کا ڈائنامیٹ اس کے مقابلہ میں کیا غضب ڈھائے گا!

لہذا یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ مستقبل کی اشتراکی حکومت میں تمام مذاہب کا حال یکساں ہوگا برباد ہوں گے تو سبھی ہونگے باقی رہیں گے تو سب ہی رہیں گے کیونکہ ہمکو تو آج ہی یہ نظر آرہا ہے کہ اشتراکیت سرعت کے ساتھ ہندوؤں میں سرایت کر رہی ہے مگر ہندو باقی ہیں اور جو مسلمان اس کی لپیٹ میں آرہے ہیں ان کا نہ مذہب باقی رہا نہ ان کا عقیدہ۔ ان کو اسلام کے نام سے شرم آنے لگی ہے اور اسلامی صورت اور سیرت کو وہ راہ حریت میں سنگ گراں تصور کرنے لگے ہیں!

کانگریس آیندہ جس حکومت کا خاکہ تیار کرے گی وہ تو جس نوعیت کا ہوگا ہم سب دیکھ لیں گے مگر ابھی سے کانگریس نے اسلامی تہذیب و تمدن۔ اسلامی اخلاق و خصوصیات کے خلاف جو قدم اٹھانا شروع کیا ہے اور جس طرح اسلامی آثار و علائم کو مٹانے کے لئے اس نے تدابیر اختیار کی ہیں اس کا حال ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو کانگریس کے لیڈروں کی تقریروں اور تحریروں کا بامعان نظر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ جواہرلال نہرو سابق صدر کانگریس نے کتاب "اپنی کہانی" میں اسلامی تہذیب اور نفس اسلام کا جس طرح مذاق اڑایا ہے وہ کتاب مذکور کے مطالعہ سے معلوم ہوسکتا ہے۔ جواہرلال کو چھوڑیے اور ان کانگریسی مسلمانوں کو لیجئے جن کے سر پر جواہر اور دیگر اشتراکی نوجوان پورے طور پر مسلط ہو چکے ہیں۔ یو۔پی۔ بہار اور دہلی میں "شعبہ اسلامیات" کے ایک خاص کارکن نے اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرت کا جس طرح مذاق اڑایا تھا اور اخبارات نے اس پر لے دے کی تھی وہ زیادہ عرصہ کا واقعہ نہیں ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں یو۔پی کے وزیر تعلیم سوامی سمپورانند صاحب نے یو۔پی اسمبلی میں تعلیم کے موضوع پر جو تقریر ارشاد فرمائی تھی اسکا ایک فقرہ یہاں بھی ملاحظہ ہو۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قایم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہئے ... جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی" (مدینہ ڈیڑھیون بحوالہ ترجمان القرآن)

غور فرمایئے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کا اعلان ایسے وقت میں کیا جا رہا ہے جبکہ آزادی کا پانچ فی صدی حصہ بھی کانگریس کو نہیں ملا ہے اور کانگریسی کارکن اپنی اشتراکیت کا اعلان کرتے ہوئے محتاط رہنا چاہتے ہیں لیکن تصور کیجئے اس وقت کا جبکہ ہندوستان کو آزادی حاصل ہوگی۔ اس کا دستور اساسی اکثریت کے ہاتوں مرتب ہوگا اور کھلم کھلا اشتراکیت کی نہ صرف تبلیغ کی جائے گی بلکہ قوت اور اقتدار کے زور سے اسکو ہندوستان کا سیاسی مذہب قرار دیا جائے گا، اُس وقت یہی حضرات جو غلام ہونے کے باوجود اسلامی تہذیب کو مٹانے کا خیال ظاہر فرما رہے ہیں، اسلام کے خلاف کیا کچھ نہ کرینگے اور "مشترک تہذیب" کو جو اباحت مطلقہ اور تمام بدتہذیبیوں کا سرچشمہ ہوگی کس طرح فروغ دیا جائے گا۔

یاد رہے کہ کانگریس کی اصطلاح میں "مشترک تہذیب" نام ہے صرف روٹی کا جس پر مسلمان کو مسلمان کے مقابلہ پر لاکر کھڑا کیا جائے گا اور آج اس گئے گزرے زمانہ میں مذہب کے نام پر کچھ مسلمان جو ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں ان کو آیندہ روٹی ہرگز جمع نہ ہونے دے گی اور کانگریس کا یہ زبردست کارنامہ ہوگا کہ مسلمان خدا و رسول کے نام پر نہیں۔ قرآن کی عظمت کے لئے نہیں۔ اسلام کے ناموس کے لئے نہیں صرف روٹی کے لئے لاٹھیاں اور چھریاں لے لیکر غیروں کے مقابلہ پر نہیں اپنے ہی بھائی مسلمانوں کے مقابلہ پر نکل کھڑے ہونگے اور جس اسلامی وحدت کو دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی بیخ و بن سے نہ اکھاڑ سکی اسکو کانگریس کی روٹی آن کی آن میں فنا کر دیگی۔

آپ خیال فرمائیں گے کہ شاید ہم کانگریس کی طرف سے حد سے زیادہ بدگمان ہیں اور محض قیاسی باتوں سے نتائج کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں مگر نہیں۔ یہ ہماری بدگمانی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جو ایک نہ ایک روز سامنے آکر رہے گی۔ کانگریس کا نیم سرکاری اخبار "ہندوستان" اپنی تازہ اشاعت میں نہایت فخر کے ساتھ کسانوں کی تنظیم کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

" اس وقت بعض جماعتیں بلا ہند و مسلم کا سوال اٹھائے اپنی روز مرہ کی مانگوں کے لئے لڑ رہی ہیں جیسے کسان سبھا، مزدور سبھا، قلی سبھا، سینم سبھا وغیرہ لیکن فرقہ پرست مسلمانوں

کے زہریلے پروپگینڈے کے اثر سے ابھی کچھ لوگ ان سبھاؤں میں جاتے گھبراتے ہیں۔
مسلمان لیڈروں کا یہ کام ہے کہ وہ دیہاتوں دیہاتوں جاتے ہیں وہاں کے مسلمان
کسانوں کو کسان سبھا کے فائدے سمجھا کر اس میں داخل کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کو
سیاسی لڑائی کا مطلب اور کانگریس کی خدمت بھی سمجھاتے ہیں اس طرح مسلمان کو آزادی
کی لڑائی میں کھینچ لاتے ہیں ایک طرف وہ اپنی روٹی کے لئے لڑتا ہے تو دوسری طرف ملک
کی روٹی کے لئے" (مورخہ ۱۲ جون ۳۸ء صفحہ ۲)۔

یہ ہے کانگریس کے نزدیک "آزادی کی لڑائی" کا مطلب کہ ایک مسلمان کو صرف روٹی کے لئے لڑایا
جائے گا اور روٹی کے پردہ میں مسلمان کو تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے بھائی کی گردن بلا تامل کاٹ ڈالے اور
روٹی کی خاطر خون مومن سے اپنے ہاتھ رنگے، اگویا مسلمان جو کبھی اعلاء کلمۃ الحق کے لئے لڑتا تھا۔ حق
وانصاف کی خاطر میدان میں نکلتا تھا۔ وہ اب روٹی کی خاطر جنگ کیا کرے گا اور اس مقدس جنگ میں
وہ مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کرے گا۔

یہ ہے کانگریس کے نزدیک "مشترک تہذیب" جو ہندو مسلمانوں کی تہذیب کو مٹا کر ایجاد کی جائے
گی اور یہ خود کانگریسی بھی سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کی کوئی مستقل تہذیب نہیں ہے، انکی تہذیب کا مسلمانوں
کی تہذیب کے ساتھ نام لینا محض قافیہ بندی ہے اور مقصد صرف مسلمانوں کی تہذیب کا مٹانا ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہ واسباب جو مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکتے ہیں اور ان کو اپنی علیحدہ تنظیم
اور اپنی علیحدہ مرکزیت کے قیام کی طرف توجہ دلاتے ہیں ورنہ حریت کامل اور استقلال حیات کا جذبہ
مسلمان کا مذہب اور ایمان ہے وہ ہندو سے زیادہ آزادی کی اہمیت کو سمجھتا ہے اسے معلوم ہے کہ
بغیر آزادی وفرمانروائی کے اللہ کی شریعت کو قوت وشوکت حاصل نہیں ہوسکتی اور بغیر حکومت کے
اسلامی قصر کی کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ درست اور ٹھیک نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ آزادی کی محبت اور غلامی
سے نفرت اول اول اسلام ہی نے دلائی اور اسی نے بتایا کہ انسانی عظمت کا سرچشمہ روح اور جسم کی

آزادی ہے اور وہ مسلمان خدا کی نظر میں مسلمان ہی نہیں جو دوسروں کا غلام اور محکوم بنکر جیئے اور اسی ذلت کی حالت میں مرے مگر سلطنت و حکومت کے باب میں اسکا نظریہ دنیا کے تمام نظریوں سے مختلف ہے، وہ آزادی اس کی نظر میں ایک لعنت ہے جو قومیت اور وطنیت میں محصور ہوکر رہ جائے اور جو انسان کو اخلاق و روحانیت سے بیگانہ کرکے اور مادیت کے جال میں پھنسا کر صرف روٹی کی خاطر زندہ رہنے دے۔ ایسی آزادی خواہ انگریز کے ہاتھ سے ملے یا ہندو کے ہاتھ سے، مسلمان کے لئے سخت ابتلا ہے اور اسکا فرض ہے کہ آخر دم تک ثابت قدم رہ کر اسکا مقابلہ کرے اور ایمان کو فروخت کرکے ایسی آزادی کے خریدنے کا تصور بھی دماغ میں نہ لائے۔

ایک آزادی وہ ہے جس کا خاکہ کارل مارکس اور اینجلز نے تیار کیا، لینن اور اسٹالن نے اس پر عمل کی پٹری جمائی اور روس میں اس کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ یعنے خدا سے آزادی، یوم آخرۃ سے آزادی۔ مذہب سے آزادی۔ خیر و نیکی سے آزادی یہاں تک کہ اخلاق اور پاکیزہ سیرت سے آزادی۔ اور یہی وہ آزادی ہے جس کو ہندوستان کی اشتراکی جماعت فروغ دینا چاہتی ہے اور سینکڑوں مارکس اور اینجلز پیدا کررہی ہے۔

ایک آزادی، اسلام کی آزادی ہے یعنے انسانوں کے بجائے حکومت الٰہیہ کا قیام۔ نیکی اور بھلائی کی اشاعت۔ عدل و انصاف کا فروغ۔ امن و سلامتی کا قیام، مکارم اخلاق کی آبیاری، بدی اور شیطنت کا استیصال اور اس بات کا اعلان کہ

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

صالح اور نیک بندوں کو زمین کا وارث ہونا چاہئے

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی آزادی اور اشتراکی حریت کے درمیان قیامت تک بھی مصالحت نہیں ہوسکتی۔

قومیت اور بین الاقوامیت

(جناب محمد اکرم خاں صاحب مدیر روزنامہ شمس ملتان)

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ دنیا میں وسیع ترین ہیئت اجتماعیہ کا احساس اور صحیح ترین بین الاقوامیت کا تصور صرف اسلام ہی نے پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے مذاہب یا اقوام میں جہاں کہیں بھی اس قسم کی کوئی عالمگیر تحریک پیدا ہوئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اثرات کا نتیجہ ہے تاریخ عالم کی ورق گردانی کیجائے تو اسلام کے نظامِ اتحاد کا ایک محدود اور دُھندلا سا نقشہ ہمیں صرف ان مسیحی ممالک میں نظر آتا ہے جو صلیبی جنگوں کے زمانے میں عارضی طور پر پیدا ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی مسلمانوں کی متحدہ قوت کی ایک ناکمل نقل تھی جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کے بعد دَور حاضر کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مکتی فوج۔ سکاوٹ روائی۔ ایم سی۔ اے کرسچین الیوسی ایشن جیسی تحریکوں سے لے کر مجلس اقوام کی تشکیل تک سب کی تہ میں وہی اسلامی بین الاقوامیت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس بات کا نفسیاتی ثبوت کہ یہ جذبہ فی الواقع اسلام ہی کے براہ راست تاثر کا نتیجہ ہے اس امر سے بھی ملتا ہے کہ مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی میں کسی مرکز اجتماع کا بہترین تصور پیش کرنے کے لیے لفظ "مکّہ" ہی مستعمل ہے۔ مثلاً کھلاڑیوں کا مکّہ سیاحوں کا مکّہ وغیرہ۔ لفظ مکّہ کا یہ استعمال اس خیال کی غمازی کرتا ہے کہ اہل مغرب کے نزدیک اس وقت تک کسی اجتماع کی مرکزیت کا بہترین نمونہ اسلام ہی کا بین الاقوامی مرکز ہے۔

مغرب جہاں ایک طرف اسلامی بین الاقوامیت کے نمونے پر اپنی مختلف تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لیے بیتاب نظر آتا ہے وہاں دوسری طرف وہ اس کوشش سے بھی کبھی غافل نہیں ہوا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی جمیعت کا شیرازہ پریشان کیا جائے۔ چنانچہ قومیت کی جو تحریک یورپ سے نکلی اُس کی سب سے بڑی غرض و غایت ہی یہ تھی کہ مسلمانوں کی عالمگیر ہیئت اجتماعیہ کے خود اُنہی کے ہاتھوں ٹکڑے

ٹکڑے کرا دیئے جائیں۔ مصر مصریوں کے لیئے۔ عرب عربوں کے لیئے اور ایران ایرانیوں کے لیئے کہہ کہہ کر اخوت اسلامی کے بجائے وطنیت اور قومیت کے تخیل کو زندہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں کا عالمگیر نظامِ اتحاد الگ الگ ملکوں اور قوموں تقسیم ہو جائے اور پھر ان میں سے ہر ملک پر فرداً فرداً قبضہ جمانا آسان ہو جائے۔ یورپ اپنی اس حکمت عملی میں کس قدر کامیاب ہوا؟ اس کا اندازہ خلافت عثمانیہ سے مصر، عرب، عراق، شام، اور فلسطین کی بغاوت اور علیحدگی سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے وہ بیت المقدس جس کو فتح کرنے کے لیئے یورپ کی تمام قوتیں متحد ہو کر کوشش کرنے کے باوجود بھی ناکام رہی تھیں آخر ایک ہزار سال کے بعد انگریزوں کے ہاتھ آگیا۔ سبب صرف یہی کہ عربوں نے قومیت کے جادو سے مسحور ہو کر ترکوں سے علیحدگی اختیار کی اور اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو توڑ کر صرف اپنی قومیت کی تشکیل کو ضروری سمجھا۔

مغرب کے جس سیاسی نظریئے نے عالمِ اسلام کی جمعیت کو توڑا وہ خود مغربی ممالک میں اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہا۔ وہاں بھی قوم، ملک اور نسل کے جذبات نے اس قدر زور پکڑا ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود وہاں بین الاقوامی تحریکات کا کامیاب ہونا تو درکنار رہا بین الاقوامی معاہدے اور صلحنامے تک محفوظ نہیں رہے۔ گویا اسوقت مغرب کی دنیا چاہ کن را چاہ درپیش کا زندہ نمونہ بن رہی ہے۔ دوسری طرف عالمِ اسلام میں جذبۂ قومیت کا ردِّ عمل ظاہر ہو رہا ہے اور اس سے اسلام کے عالمگیر اتحاد کو خود مسلمانوں کے ہاتھ سے جو نقصان پہنچا ہے اُس پر پشیمانی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ عربی ممالک وحدتِ عربیہ کی تحریک اور ترکی، ایران، عراق اور افغانستان کے باہمی اتحاد کی کوشش اسی تلافی مافات کے جذبہ کی آئینہ دار ہے۔ یہ صورت حال بہ حیثیت مجموعی اُمید افزا ہے البستہ اتنی کسر باقی ہے کہ ابھی تک یہ تنظیم صرف سیاسی اصولوں پر یکجا رہی ہے اور اسکی بنیاد خالصتاً اسلامی بنیادوں پر نہیں ہے لیکن رفتارِ واقعات بتا رہی ہے کہ وہ وقت دُور نہیں جب مسلمانوں کو سیاسی اتحاد کی خامی محسوس ہوگی اور وہ پھر اسلام کے دینی نظامِ اخوت کیطرف لوٹنے پر مجبور ہونگے۔

انہیں کوئی ایسا عالمگیر نظام عطا کرتا ہے نہ اُن کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی حیثیت حاصل ہے، اور نہ جغرافیائی لحاظ سے اُنکے لیے کسی ایسے نظام سے وابستہ ہونے کا امکان ہے اس کے باوجود بھی بین الاقوامیت کے لیے اُن کی حسرت آمیز بیتابی وقتاً فوقتاً ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی نیپال کے مہاراجہ کو اُٹھانے کی کوشش کبھی جاپان سے بُدھ مذہب کی بنا پر تعلق پیدا کرنے کی خواہش۔ کبھی چین سے ثقافتی تعلقات کی آرزو۔ کبھی جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں سے ہمدردی۔ اور کبھی زنجبار کے ہندوستانی تاجروں کی حمایت۔ کبھی فجی کے ہندوستانی آبادکاروں کے لیے پروپاگنڈا۔ کبھی حبش، اور ہسپانیہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کی قرارداد اور کبھی فلسطین کے عربوں کی مطالبات کی تائید۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ فقط اُس بین الاقوامی احساس کا ظہور جس کی حسرت تو دلوں میں موجود ہے۔ لیکن جسکے لیے کوئی پختہ بُنیاد نہیں پائی جاتی۔ جہاں ہم مذہبی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ وہاں مذہب میں نظامِ اُخوت موجود نہیں۔ جہاں سیاسی تعلقات کو اُستوار کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ وہاں ایک ہنگامی ہم خیالی سے زیادہ اور کوئی بُنیاد نہیں ہوتی لے دے کے صرف اپنی ہندوستانیوں کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ جو برطانوی نوآبادیوں میں جاکر آباد ہو چکے ہیں لیکن چونکہ خود ہندوستان کو ابھی سیاسی دُنیا میں کوئی قایم بالذات حیثیت حاصل نہیں ہے اس لیے نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کا مسئلہ بھی ہندوستان سے زیادہ برطانیہ کا ایک استعماری مسئلہ بنکر رہ جاتا ہے۔

اِن باتوں سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں اگر بین الاقوامیت کا جذبہ مفقود ہے اور عملی طور پر ان کی قومیت اور وطن پرستی کے دائرے سے باہر نہیں جاتی تو وہ اس لیے نہیں کہ وہ قومیت کو بین الاقوامیت سے بہتر سمجھتے ہیں۔ بلکہ محض اس لیے کہ وہ ہر لحاظ سے اسی تنگ دائرے کے اندر رہنے پر مجبور ہیں۔ افسوس تو اُن مسلمانوں پر آتا ہے جو حقیقت حال پر نظر نہ کرتے ہوئے محض برادران وطن کی قوم پرستی اور وطن دوستی کی دیکھا دیکھی اسلامی بین الاقوامیت سے بیزاری کو منتہائے سیاست دانی سمجھنے لگ جاتے ہیں حالانکہ ذرا وسعت نظر سے کام لیا جائے تو نہ اسلامی بین الاقوامیت مسلمانان ہند،

کی وطن دوستی کے منافی ہوسکتی ہے اور نہ قوم پروری بین الاقوامیت کے خلاف جا سکتی ہے بشرطیکہ وطن دوستی ہو وطن پرستی نہ ہو اور قوم پروری ہو قوم پرستی نہ ہو کیونکہ پرستش اسلام میں خداوند تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی +

جہاں تک ہندوستان کی آزادی کا تعلق ہے سو یہ ہندوؤں کے لیے تو محض ایک قومی مسئلہ ہے لیکن مسلمانوں کے لیے بین الاقوامی مسئلہ۔ اس لیے حصول آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں کو کسی طرح بھی ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ ضرورت صرف اس احتیاط کی ہے کہ برادرانِ وطن کی محدود اغراض کو دیکھتے ہوئے اپنے وسیع مقاصد کو بھی محدود نہ کردیا جائے۔ حصول آزادی کے لیے مسلمانانِ ہند کا ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و اشتراکِ عمل بھی ضروری ہے لیکن یہ خیال رہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی بین الاقوامیت کو کسی طرح صدمہ نہ پہنچنے پائے اور اندرون ملک میں ان کی اپنی اجتماعیت اور مرکزیت فنا نہ ہو جائے۔ اگر وسیع تر نظام سے کٹ کر ایک محدود دائرے میں کامل آزادی بھی حاصل ہو جائے اور وہ بھی انفرادی طور پر نہ کہ اجتماعی انداز میں بہ حیثیت ملت اسلامیہ۔ تو یہ آزادی مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی لیکن اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ مسلمان حصول آزادی کی جدوجہد میں سرگرم نہ رہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ جوشِ عمل دکھائیں کیونکہ اس آزادی سے ہندوؤں کی تو محض ایک محدود قومی اور وطنی غرض وابستہ ہے لیکن مسلمانوں کی ان سے بڑھ کر بین الاقوامی کشمکش میں اس آزادی کی اشد ضرورت ہے +

ترجمانِ حقیقت

(جناب سید الطاف حسین صاحب حالی بی اے ایم اے اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ)

ہماری زندگی ایک معمہ ہے۔ ہماری ابتدا و انتہا کی کیفیت۔ ہماری تخلیق کا مقصد، ہماری آرزوؤں کا منتہیٰ اور ہماری کوششوں کی غرض و غایت سب کی سب باتیں ایک راز سربستہ ہیں جس کی عقدہ کشائی میں عقل و خرد کے ناخن متعدد بار ناکام رہ چکے ہیں ہر ایک شخص نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس معمہ کا کوئی نہ کوئی حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک نے زندگی کے پیچ در پیچ مسائل پر مختلف زوایا سے روشنی ڈال کر اُسکے مختلف پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ معمہ حیات گویا ایک طویل و عریض ظلمت کدہ ہے جس کی تاریکیوں کو مختلف الخیال فلاسفہ کے ظنون و اوہام کی بازی گاہ تصور کرنا چاہیئے۔ عام آدمی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس قابل نہیں کہ اسرار حیات کا ادراک کر سکیں لہذا فطرت کبھی کبھی ایک آدھ دیدہ ور ایسا پیدا کر دیتی ہے جو اُسکے اشاروں کو سمجھ سکے اور اُسکے رموز سے آشنا ہوکر اور لوگوں کو بھی ھدایت دے۔ فطرت کے اِن برگزیدہ اصحاب نظر کی ایک مابہ الامتیاز صفت یہ ہے کہ وہ عالم محسوسات میں چند غیر مرئی حقیقتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو عام لوگوں کی نظر سے مخفی ہوتی ہیں یا جنسے اکثر قطعی طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔ اقبالؒ ان مخصوص دیدہ ور اصحاب کی جماعت میں نہایت ممتاز مقام پر متمکن ہے۔ اس کی نگاہیں ابتدا ہی سے اس حقیقتِ اشیاء کی متلاشی ہیں جسے وہ اپنی محبوبہ خیال کرتا ہے اس کی جستجو اُسے آوارہ و پریشان رکھتی ہے اور ابتدا میں اس خیال سے اُس کا دل نہایت پژمردہ رہتا ہے کہ وہ اس کے جمال کی نظارگی سے شاید کبھی بہرہ ور نہ ہوگا اور وہ اپنے دل کی حالت کو ان الفاظ میں بیان

کرتا ہے ؎

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اُسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اُسے

قدرت کو شاید اس کی پریشانی خاطر منظور نہیں۔ اس کی مایوسی بہت جلد ختم ہونے لگتی ہے اور گلشن فطرت کی رنگینیوں میں وہ اپنی محبوبہ کے حسن کی جھلک کو دیکھ کر پکار اُٹھتا ہے۔

آ میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا
نہروں کے آئینے میں شبنم کی آرسی میں

لیکن ابھی وہ حصول مقصد سے بہت دُور ہے اور اس کا دامن دل ہر مراد سے خالی وہ محسوس کرتا ہے کہ فطرت کا نگارخانہ محض آئینہ حقیقت ہے، حقیقت نہیں۔ وہ چیز جس کی اُسے تلاش ہے۔ اگر فطرت کے رنگین مناظر اُسکے آئینہ دار ہیں تاہم اُس کا اصلی وطن ان سے بلند وبالاتر ہے۔ شب تنہائی کا سکوت۔ آسمان کے پاکیزہ جھلملاتے تاروں کی نزہت آمیز تابندگی۔ سکوت کوہسار شفق کی رنگینی۔ بہتی نہریں حقیقت کے متلاشی دل کے لیے نیم تسلی کا باعث ضرور ہیں۔ مگر ان سے اس کی کامل تشفی نہیں ہوسکتی۔ اقبال اس حقیقت سے باخبر ہے اور وہ اپنے دل کو مناظر فطرت کے نظاروں کی بار بار دعوت دے کر محسوس کرتا ہے کہ اسکا دل ہلکے حجاب کی تاب بھی نہیں رکھتا اور جب تک "حسن ازل بذات خویش اس کے روبرو بے نقاب نہ ہو اسکی تسلی ناممکن ہے کائنات کے نظارے جب ایک ایک کرکے اُسکے اضطراب کو فرو کرنے میں ناکام رہ چکتے ہیں تو وہ اپنے دل کو قدرت کی ہم آہنگی کا فریب دیتے ہوئے حسرت آمیز الفاظ میں اس چیز کے متعلق سوال کرتا ہے جس کی تلاش اُسے اس قدر پریشان کیے رکھتی ہے :-

قدرت تری ہم نفس ہے اے دل — کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل

مگر بالآخر اُس کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں اور وہ گوہر جس کی تلاش میں اُسنے گلشن نما صحرائے فطرت کے ذرہ ذرہ کو چھان مارا اُسے اپنے ویرانۂ دل میں ملجاتا ہے وہ حقیقت جس کی

جھلک اُسے فطرت کے نقاب رنگ و بو میں سے پیشتر ازیں معمولی طور پر دکھائی دیا کرتی تھی اب اُسے اپنی رگ رگ میں ظاہر و باہر نظر آنے لگتی ہے اور وہ ارتقاء انسانی کی اس انتہائی منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں حقایق آشنا نگاہیں حسن ازل کے نظارہ سے ایک لمحہ تک کے لیے بھی جدا نہیں ہوتیں، کبھی اُس کا یہ حال تھا کہ "میں ابھی تک ہوں اسیر رنگ و بُو" اور اب اس کا

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اَللہ ھُو میری رگ پے میں ہے!

وہ حقیقت اشیاء جس تک پہنچنا فلاسفہ کے نزدیک حیات انسانی کی ارتقائی رو کا انتہائی مقصد ہے، وہ اقبال کے نزدیک عقل و خرد کی افزائش نہیں بلکہ محض تنویر دل سے حاصل ہو سکتی ہے وہ عقل و خرد کے پیچ پیچ راستوں کی فریب ہی سے بخوبی واقف ہے اور لوگوں کو بار بار اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ دل زندہ کی معجز نمائی کے روبرو عقل بالکل بے بس و بے اختیار ہے۔ عقل کی مذمت جو برگساں کے فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی اکثر مقامات محض اسکے لیئے وقف نظر آتے ہیں :-

عقل گو آستاں سے دُور نہیں۔ اسکی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب۔ آنکھ کا نُور دل کا نور نہیں

تنویر دل ایک وجدانی کیفیت ہے جسکے حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگاہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ اُنکے ہر شعر میں خودی کا سبق موجود ہے اور چونکہ اقبال کی نگاہ میں خودی اور ایمان ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں وہ صحیح مومن کی زندگی کو نظارۂ حقیقت اور مادیت کی بے پناہ طاقتوں کو تابع فرمان کرنے کا واحد اور قطعی ذریعہ سمجھتا ہے ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کا کلام مادہ پرست دُنیا کے لیے روحانیت کا پیغام ہے جس سے بار بار اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ عرصۂ حیات کی لامتناہی وسعتوں میں مادّی زندگی کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ناچیز قطرۂ آب کو بحرِ بے پایاں میں، انسان کو اسی لیے اتنا تنگ نظر نہ ہونا چاہیئے کہ کنویں کے مینڈک کی طرح اُس کی نگاہیں ہر وقت مادّے کی چاردیواری ہی میں محدود رہیں اگر وہ اپنی قوتِ مشاہدہ اور فکر و تدبر سے ذرّہ بھر بھی کام لے تو اُس پر واضح ہو جائے گا کہ زندگی کا ایک بہتا ہوا دریا ہے جس کی روانی کے مختلف ارتقائی سطوح ہیں اور جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر نئی سطح پر اپنے اندر نت نئے صدف اور نئے گوہر پیدا کرتا چلا جائے۔ جمادات سے لے کر انسان تک جو مرحلے دریائے حیات نے طے کر لیے ہیں۔ اُن سے اُس میں ایک گوہر بے بہا پیدا ہو چکا ہے اور وہ صفتِ آگہی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی قوتوں کی بدولت اپنے ماحول پر محض غالب ہی نہیں بلکہ اپنی قوتوں اور اپنے غلبے کے احساس سے بھی متصف ہے۔ اگر زندگی کی ارتقائی رو کو اِس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوگی۔ جہاں آج تک اِس سے انسان میں اپنی مادّی قوتوں کا احساس پیدا ہوا ہے وہاں یقیناً کچھ منازل ایسی بھی ہیں جہاں انسان میں صفتِ آگہی سے لطیف تر صفات نمودار ہونگی اور وہ اپنی اُن طاقتوں سے بھی آگاہ ہوگا جو بلحاظ لطافت مادّی قوتوں سے کئی گُنا افضل و اعلیٰ تر ہیں۔ دانا لوگوں نے انہیں "روحانیت" کے مُفسر د نام سے موسوم کیا ہے' خود انسانی زندگی میں اِس بات کا ثبوت ملتا ہے جوں جوں انسان کے دل و دماغ پرورش پاتے ہیں اُس کی نگاہیں مادّے کے انفرادی کرشموں سے ہٹ ہٹ کر ان لطیف حقایق کی طرف منتقل ہونے لگتی ہیں جو مادّی کرشموں کی توجیہ ہونے کے علاوہ اُنکے لیے جامع اشتنات کا کام بھی دیں۔ مثلاً اکثر لوگ تو محض گرتے ہوئے سیبوں اور ٹوٹتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان میں کوئی نسبت خیال نہیں کرتے مگر ان کی قوت متخیلہ جب عام سطح سے ذرا اونچی ہو جاتی ہے تو بحرِ حیات میں سے ایک آدھ نیوٹن سا گوہرِ بے بہا ایسا نکل آتا ہے جو اپنی دیدہ وری کے طفیل دُنیا بھر کی گرتی ہوئی چیزوں

کے پس پشت قوتِ کشش کو کارفرما دیکھ کر دُنیا پر اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ وہ تمام کرشمے
جو بظاہر بے تعلق معلوم ہوتے تھے دراصل ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں +

محض اتفاقی امر ہے کہ دیدہ وروں کی جماعت میں سے میں نے نیوٹن کی مثال
پیش کی ورنہ اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اصحابِ نظر محض دُنیائے سائنس کے لیے
ہی مخصوص ہیں اور نہ ہی میری اس سے یہ مراد ہے کہ علوم سائنس کو دیدہ وری سے کچھ
خاص تعلق ہے جو دیگر علوم کو نہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسے لوگ ہر شعبۂ علم میں کم و بیش
پائے جاتے ہیں اور علم و ادب کے طبقہ میں ان اصحاب کو عام طور پر شعرا کے نام سے موسوم کیا
جاتا ہے۔ حقیقی شاعر کی اختراقی نگاہیں محسوسات کے پردوں کو چاک کر کے حقایق حسن
و عشق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ دُنیا کو اس بات سے آگاہ کر دیتا ہے کہ فطرت کی دلفریبیوں
کی نمو محض ان حقایق کے وجود سے ہے اور اگرچہ عام نگاہیں ان حقایق سے ناآشنا ہیں
تاہم اگر تھوڑا بہت غور و فکر کرے تو اسے حقیقت کا نظارہ کامل نہ سہی ایک آدھ جھلک تو
ضرور ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ دُنیائے ادب میں شاعر کو وہی حیثیت حاصل ہے جو سائنسدان
کو عالم سائنس میں، جس طرح صاحبِ نظر سائنس دان کی نگاہیں گرتے ہوئے سیبوں اور ٹوٹتے
ہوئے ستاروں سے ہٹ کر قوتِ کشش کی طرف منتقل ہوتی ہیں جس کی وحدت میں
ان کرشموں کی کثرت کا راز ہے اسی طرح حقیقی شاعر کی نگاہیں بھی گلشن فطرت کے حسین نظاروں
سے کنارہ کش ہو کر حقیقی حُسن و عشق کی طرف ملتفت ہوتی ہیں جن کے رشتۂ واحد میں مختلف دلفریب
مناظر اس طرح منسلک ہیں جیسے ایک شاخ میں متعدد پھول + عام آدمی گرتے ہوئے سیب کو
دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے محض ایک چیز کو بلندی سے پستی کی طرف آتے دیکھا مگر سائنس دان
کی باریک بیں نگاہیں اس معمولی واقعہ میں قوتِ کشش کو مصروف کار دیکھتی ہیں اسی طرح
ایک معمولی آدمی شگفتہ پھول کو دیکھ کر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ محض چند رنگین پتیوں کے مجموعہ کا مشاہدہ
کر رہا ہے مگر بخلاف اس کے شاعر کی دُور بیں نگاہیں اس پھول کے کرشمۂ رنگ و بو کے پس پشت

جہانِ عشق　آباد دیکھتی ہیں یعنی گرتا ہوا سیب اگر سائنس دان کی نگاہوں میں کشش کی ہمہ گیر قوت کا ایک معمولی مظاہرہ ہے تو رنگین پھول شاعر کی نگاہوں میں قوتِ عشق کی معجزنمائی کا ادنےٰ کرشمہ ہے

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تُو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

ظاہر ہے کہ زندگی کی ارتقائی منزل میں انسان اپنی قوت متخیلہ کی پختگی کے سہارے مادّے کی چاردیواری کے طلسم کو توڑکر ان حقائق کی دید میں کامیاب ہو جاتا ہے جو مادّی کرشموں اور مادّی زندگی کی طرح کثیف اور آنی و فانی نہیں۔ بلکہ لطیف اور ابدالآباد تک رہنے والی ہیں۔ مگر ایسی ہستیاں جنہیں زندگی کے لشکر جرّار کی شاندار فتوحات تصوّر کرنا چاہیئے کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں۔ عام آدمی تو زندگی کی نشیبی سطح پر بسر اوقات کرتے ہیں مگر ان کا مسکن اس کی بلندترین منازل پر ہوتا ہے جن کی رفعتوں سے وہ کرشمہ ہائے عالم کی نیرنگیوں کو مسکراتی دیکھ کر بنی نوع انسان کو شاہراہ حقیقت کی ہدایت کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہے کہ انسانی قوتیں عروج یافتہ ہو کر محسوسات کی قیوّد سے نکل کر حقایقِ لطیفہ کے نظاّروں میں محو ہونے لگتی ہے یا بہ الفاظ دیگر زندگی کی ارتقائی رو کا میلان کثافت سے لطافت کیطرف ہے۔ ابتدا میں انسان محض مادے کے کرشموں سے آگاہ ہوتا ہے اور انکو ایک دوسرے سے الگ اور بے تعلق سمجھتا ہے۔ اس سے اگلی منزل میں جو دیدہ ورماہرین فلسفہ وشعر وسائنس کا مقام ہے انسان ان لطیف اصولوں یا حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے جن میں سے ہر ایک کے تحت مادی زندگی کے لاتعداد منتشر کرشمے اس طرح یکجا کیئے جاسکتے ہیں جیسے رنگارنگ کے موتی ایک ہی لڑی میں۔

انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ ان منازل کے وجود کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ لہٰذا ان کو دیکھتے ہوئے اور ان سے زندگی کی ارتقائی رو کے میدان کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ

نکالنا بے موقع اور بے محل نہ ہوگا کہ ان سے آگے ایسی منزلیں بھی زندگی کے لاتناہی سفر کا حصہ ہیں جہاں وہ لطیف سے لطیف تر حقایق چشمِ انسان پر جلوہ گر ہوتے ہیں جن کا محاصرہ پہلی منزل کے حقایق سے یقیناً بہت زیادہ وسیع اور بسیط ہے۔ اس صداقت کو اگر ذہن نشین کر لیا جائے تو یہ بعید از قیاس معلوم نہ ہوگا کہ زندگی کی جولانگاہ میں ایسی منازل بھی موجود ہیں جو دیدہ ور شعرا اور صاحبِ نظر سائنس دانوں کی منازل سے بالاتر ہیں جہاں انسان پر ایسی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں جو علمی وشعری حقایق سے بہت زیادہ لطیف ہیں جن کا محاصرہ علمی وشعری حقایق کی طرح معدود ومخصوص کرشموں پر نہیں بلکہ تمام کائنات عالم پر ہے۔ مذہب نے ان لطیف ترین حقایق کو حقیقتِ اشیاء کے نام سے تعبیر کر کے اُن منازل کو جہاں پہنچکر یہ حقیقت انسان سے بے نقاب ہوتی ہے۔ خداشناس حضرات کی مخصوص ملکیت قرار دیا ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنا گویا عروج انسانی کا کمال ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس گوہر مراد کو پا لیا۔ اس متاعِ بے بہا کا حصول ہدایتِ آسمانی کی روشنی اور اتباعِ نبوت کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں خدا رسیدہ حضرات کی زندگی سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ حقیقت "دیکھنے" کی چیز ہے، سمجھنے کی نہیں اور اس کا تعلق ذہنی ادراک سے نہیں بلکہ "مشاہدہ" سے ہے۔ قرآن کریم نے ایمان بالغیب کے فلسفہ میں انسانی عقل وادراک کی کمزوری ونارسائی کا اعلان کرتے ہوئے اس بات کی شہادت دی ہے کہ خداشناسی ذہنی وادراکی کیفیت کا نام نہیں، روحانی مشاہدے کی تفسیر ہے، مُریدِ ہندی پیرِ رومی سے اسی سلسلہ میں استفسار کرتے ہیں کہ انسانی ارتقا کا مقصد ومنتہیٰ کیا ہے، علمِ حقیقت یا دیدارِ حقیقت؟

خاک تیرے نور سے روشن بصر
غایتِ آدم خبر ہے یا نظر؟

جواب میں ارشاد ہوتا ہے ؎

آدمی دید است باقی پوست است

دید آں باشد کہ دید دوست است

اقبال کا دعویٰ ہے کہ یہ نظر انسان میں محض خودی کی نمود سے پیدا ہو سکتی ہے اور اس حقیقت کو اُس نے متعدد اشعار میں ظاہر کیا ہے، زندگی کی جولانگاہ اُس کی نگاہوں میں تقویم خودی کی مختلف منازل کا نام ہے اور ہماری زندگی ان منازل کا آغاز

خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر

جو انسان خودی سے آگاہ ہو وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ وہ ارتقائی منازل جن کا عبور اُسے درپیش ہے اُن کی امتدادی وسعتوں کے مقابلہ میں انسانی زندگی نمود شرر کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ اُس کی نگاہیں اپنی موجودہ منزل کے علاوہ آئندہ مراحل پر بھی لگی رہتی ہیں اور وہ وقتِ حاضر کی قیود کے باوجود ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ ایسے انسان کی نگاہوں میں موت ایک تغیرِ محض کے سوا اور کچھ نہیں جس کی بدولت زندگی جامۂ کثافت اُتار پھینکتی ہے اور وہ اس تغیر سے خائف ہونے کی بجائے گونا مسرّت حاصل کرتا ہے کہ اُس کی خودی جسمِ خاکی کی کثافت سے آزاد ہو کر اور اپنی قسم کے لطیف ماحول میں زندگی بسر کر کے اپنی نمود کے فرائض بہترین طور پر سر انجام دے سکے گی اور اس طرح وہ اس حقیقت اشیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا جسے زندگی کی ارتقائی رو کا انتہائی مقصد خیال کیا جائے گا۔ اور جسکے حصول کا راز بقول اقبال انسان کی اپنی ذات کی نمود میں مستتر ہے۔ ایسے انسان کے لیے موت گویا ایک راستہ ہے جو اُسے اُسکے محبوب و مقصود تک لے جاتا ہے اگر آدمی واقعی اپنی خودی سے آگاہ ہے یعنی اُسے اپنے مقصود سے محبت ہے اور وہ اُس تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہے تو موت یقیناً اُس کی ثابت قدمی میں تزلزل پیدا نہ کر سکے گی اور وہ اُس سے لرزاں و

وتر ساں ہونے کی بجائے اُسے خوش آمدید کہے گا۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات

یہی ایک حقیقت ہے جوان کو اپنے آپ سے اور خدا سے آگاہ کرتی ہے اور انسان کو لازمانی ولامکانی کی تعلیم دے کر اُس کے دل ودماغ کو توسیع بخشتی ہے جس کی بدولت وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حیات سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہو سکے اور اُس کے ساتھ ساتھ اِس طریق پر بھی گامزن رہے جس کا اتّباع عین ہدایت کا موجب اور جس سے انحراف ضلالت کی دلیل ہے۔

اقبال وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں اس راز کو فاش کیا اسکا کلام انسانی تاریخ میں ایک عالمگیر انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے جسکے اثرات ابھی بہت کچھ پردۂ وقت میں مستور ہیں۔ اُس کی آواز سے نوجوانوں کے دلوں میں ایک نئی دنیا رونما ہو رہی ہے جس کا پرتو ابھی اُنکے افکار و اعمال پر بہت ہلکا نظر آتا ہے مگر جسکے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ نمایاں اور نمایاں تر ہوتا چلا جائے گا۔ اقبال کا پیغام اسرار حیات کی تفسیر ہے جس سے ہر ایک دل اپنے اندر ایک نیا ولولۂ زندگی محسوس کرتا ہے، وہ بھید جس کو اس دانائے راز نے فاش کیا اُسکے انکشاف پر فطرت انسانی تا ابد ناز کرے گی اُسکے گنجینۂ سخن کے آبدار موتی فطرت کے رُخِ زیبا پر صبح کے پاکیزہ ستاروں کی مانند منور رہیں اور اُن سے اُس کو وہی زینت نصیب ہے جو حسین پھولوں کو قطراتِ شبنم سے۔ تاریخ عالم ایسے دیدۂ وروں کی مثالیں بہت کم پیش کرتی ہے۔ زندگی کی جوئے رواں کروڑوں کروٹیں لینے کے بعد ایسا گوہر شاہوار پیدا کرے تو کرے ورنہ زمانہ شاہد ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گفتگوئے مصالحت

قرآنی روشنی میں!

(رازی)
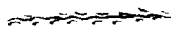
یوں تو ہندوستان میں ہندو اور مسلمان آٹھ نو سو سال سے اکٹھے رہتے چلے آ رہے ہیں لیکن باہمہ قرب و اختلاط برادران وطن جس قدر مسلمانوں کی تہذیب و تمدّن کی اساس سے بیگانہ ان کے ذہنی احساسات اور قلبی رُجحانات کے سرچشمہ سے ناآشنا اور اُنکے مذہب کے بنیادی اصولوں سے بے خبر ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ان سے اِس قدر غیریت اور اجنبیت برتی ہے۔ اس وقت ہمیں ان اسباب و علل سے بحث نہیں جو اس بیگانگی اور ناواقفیت کا موجب ہیں لیکن موجودہ دور سیاست میں اس کی وجہ سے جو مشکلات پیش آ رہی ہیں اُنھوں نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم کھُلے کھُلے الفاظ میں بیان کر دیں کہ آج بہت سی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں اسوجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ ہندو رُوحِ اسلام سے قطعًا ناآشنا ہے۔ عوام النّاس کو تو چھوڑیئے اس قوم کے ممتاز اکابر کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ہیگل اور نیٹشے کے فلسفہ کی باریکیاں جانتے ہیں۔ وہ مارکس اور لینن کے نظریات کے ماہر ہیں۔ وہ روما اور یونان کے عروج وزوال کے اسباب سے باخبر ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے متعلق صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کو اگر ذبح بقر کی اجازت دیدی جائے۔ مساجد کے سامنے باجہ بجانا روک دیا جائے۔ اور انکا "ٹونٹی دار لوٹا" ان سے نہ چھینا جائے تو اُنکے مذہب و تمدن۔ تہذیب اور کلچر کی پوری پوری نگہداشت ہو جاتی ہے۔ اور جب کوئی مسلمان اس سے ذرا آگے کسی اور چیز کے تحفظِ حقوق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ فورًا کہہ اُٹھتے ہیں کہ دیکھو میاں! یہ سیاسی معاملہ ہے اسے مذہب کا

بتیسمہ دے کر خواہ مخواہ "فرقہ وارانہ" مسئلہ کیوں بناتے ہو! یہ ایک بنیادی غلطی یا غلط فہمی ہے جس کی بنا پر آج تک ہندو مسلم اختلافی مسائل کا کوئی حل تجویز نہیں ہو سکا۔ اور ہم پورے ایقان و بصیرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ جب تک اس بنیادی غلطی کو دور نہ کیا جائے گا۔ اس مسئلہ کا کوئی محکم، دیرپا اور استوار تصفیہ نہیں ہو سکے گا۔ حقائق سے چشم پوشی کر لینے سے اختلافات نہیں مٹا کرتے۔ جو ایسا سمجھتے ہیں وہ خود بھی دہوکے میں رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دہوکے میں رکھتے ہیں۔ اور یہی دہوکا ہے جو انسان کو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے نہیں دیتا۔ اس لیے کہ جب کسی اختلافی مسئلہ کو فریقین دو مختلف اور متضاد زاویائے نگاہ سے دیکھیں تو وہ کس طرح کسی ایک فیصلہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہندو ایک معاملہ کو پیش کرتا ہے تو اسکے سامنے سیاسی منافع، ملکی مصالح، قومی رجحانات، وطنی جاذبیتیں ہوتی ہیں وہ اس معاملہ کو انہی میزانوں میں تولتا ہے اور بازار کی گرمی اور سردی کے پیشِ نظر اپنی قیمتوں میں تغیر و تبدل بھی کر لیتا ہے۔ مبادلہ و معاوضہ کی شرح میں بھی کمی بیشی روا رکھ سکتا ہے۔ لیکن فریقِ ثانی یعنی مسلمان۔ اس معاملہ کو خالصتہً مذہبی میزان سے تولتا ہے کہ جس پر نہ بازار کی سردی، گرمی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ نہ مبادلہ و معاوضہ (EXCHANGE) کی شرح میں کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ وہ دنیا کے کسی معاملہ میں وہ بازارِ سیاست کے کسی سودے میں "ہاں"، "نہیں" نہیں کر سکتا کہ اسکے سامنے یہ حکم جلی الفاظ میں لکھا ہوتا ہے کہ:-

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون ۵/۴۴

جو شخص اپنے معاملات کے فیصلے اللہ کی کتاب کے ماتحت نہیں کرتا اُسے اسلام سے کچھ تعلق نہیں وہ کفار کے زمرہ میں شامل ہے ۵/۴۴

لہذا مسلمان اس مقام پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فریقِ مقابل اس کی اس مجبوری کو نہیں سمجھتا اور کہہ دیتا ہے کہ دیکھو صاحب! ہم تو معاملہ کے تصفیہ پر آمادہ ہیں لیکن یہ حضرت عجب قسم کے واقع

ہوئے ہیں۔ اپنی سی کیے جاتے ہیں۔ ان سے معاملہ طے کیسے ہو۔ بات تو جب ہو کہ کچھ ہم بڑھیں کچھ یہ گھٹیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اتحاد و مفاہمت چاہتے ہی نہیں۔ یہ تو انگریزوں کے پٹھو ہیں، یہ تو جنگ آزادی کے راستے میں سنگ گراں بنے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں مسلمان یہ سب کچھ سنتا ہے اور متعجب ہو کر رہ جاتا ہے کہ یا اللہ! یہ وہ کون سی خطا کی جو اس قسم کی سب و شتم کا نشانہ بنایا جا رہا ہوں۔ وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ بھائی! یہ میرے مذہب کا معاملہ ہے میں اس میں مجبور و بے بس ہوں۔ تو اس پر پھر ایک شور بلند ہو جاتا ہے۔ کہ لو بھئی! اب کونسل کی نشستوں میں بھی مذہب آگھسا، بندے ماترم کا گیت بھی مذہبی مسئلہ بن گیا۔ اردو ہندی کا جھگڑا بھی دین کا معاملہ ہو گیا۔ مسلمان پھر یہ سب کچھ سنتا ہے اور کہنے والوں کا منہ تکتا رہ جاتا ہے اور سوائے اسکے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

یا رب یہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لہٰذا برادرانِ وطن جب تک مسلمان کی اس مجبوری کو نہیں سمجھیں گے ملکی معاملات نہیں سلجھ سکتے۔ جب تک انہیں اس بات کا یقین نہیں آجائے گا کہ ایک مسلمان کے لیے پولنگ اسٹیشن پر جا کر صحیح ووٹ دینا بھی ایسا ہی مذہبی فریضۂ مقدس ہے جیسا نماز پڑھنا سیاسی مسائل کا اختلاف کا کوئی حل تجویز نہیں ہو سکے گا۔ اسوقت ہم ایک نشست میں اتنا تو نہیں کر سکتے کہ اسلام کے جملہ عناصرِ ترکیبی کو سامنے لا کر یہ بتا دیں کہ بساطِ سیاست کے جن جن گوشوں کو ہندو خالص دنیاوی اور ملکی مسائل سمجھتا ہے۔ وہ مسلمان کے نزدیک عین دینی اور مذہبی معاملات ہیں۔ البتہ اسوقت ہم صرف ایک بنیادی مسئلہ کو قرآن کریم کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کرینگے جو گزشتہ ایام جناح۔ گاندھی۔ بوس" کی گفتگوئے مصالحت کے ضمن میں لوگوں کے سامنے آگیا ہے۔ گفتگوئے مفاہمت کی تفصیلات ہنوز پردۂ اخفا میں ہیں اس لیے ان پر تو کسی قسم کا تبصرہ قبل از وقت ہے۔ لیکن اخبارات میں ایک اصولی بات کا ذکر ہو رہا ہے اور وہی بات

ملک کے طول و عرض میں ہیجان انگیزی کا ذریعہ بنائی جا رہی ہے مسٹر جناح نے یہ کہا ہے کہ گفتگو چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کی غرض سے ہو رہی ہے اس لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور کانگریس کو غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت۔ اور اس طرح جو معاملات طے ہوں وہ من حیث الجماعت طے ہوں۔ کہ مسلمانوں کے معاملات طے کرنے کی مجاز صرف ان کی نمائندہ جماعت ہو سکتی ہے۔ کوئی فرد، یا کوئی فرقہ اس کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا جو مسٹر جناح نے پیش کیا۔ اس پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں ایک ہنگامہ برپا کیا جا رہا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ مسلک خالصۃً فرقہ وارانہ ہے اس کے تو یہ معنی ہیں کہ ملک میں مسلمانوں کی ایک الگ جماعت کا وجود تسلیم کر لیا جائے اور کانگریس تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے بجائے غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت بنکے رہ جائے۔ ہمارے نزدیک یہ تمام ہنگامہ آرائی اگر مصالحت سے پہلو تہی کرنے کی نیت سے نہیں تو کم از کم اس بنیادی غلط فہمی کی وجہ سے یقینی ہے۔ جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے وہ انکا اپنا ذاتی خیال ہے یا وہ بہ حیثیت مسلمان بہ مذہب کی رُو سے۔ ایسا کہنے اور کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر تو وہ ان کا اپنا خیال ہے تو اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ "خیال" نہیں بلکہ قرآن کریم کا حکم ہے تو پھر جب تک ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ وہ اس بنیادی اصول سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا۔ ساری دنیا اس کی مخالفت کرے۔ اُسے "فرقہ پرست" کہے۔ ضدی قرار دے۔ "غدار وطن" اس کا نام رکھے جو جی میں آئے کہتی جائے وہ اپنے فیصلے میں تبدیلی تو ایک طرف۔ تبدیلی کا خیال تک بھی نہیں لا سکتا کہ ایک مسلمان کے مصالح۔ اس کی ہر روش۔ اسکا مسلک۔ اس کے فیصلے، اسکے ارادے سب قرآن کریم کے فیصلوں کے تابع رہتے ہیں۔ بلیٰ من اسلم وجھہ للّٰہ وھو محسن۔ جب تک ایسا ہوتا ہے وہ مسلمان رہتا ہے اور جب قران کریم کے فیصلوں پر کوئی اور شے غالب آ جائے تو پھر وہ "ہندوستانی" تو رہ سکتا ہے مسلمان نہیں رہ سکتا۔

قرآن کریم دُنیا میں انسانوں کی تقسیم صرف ایک اصُول پر کرتا ہے جسے کفر و اسلام کا اصُولِ تقسیم کہتے ہیں اس کے نزدیک انسان صرف دو جماعتوں میں منقسم ہو سکتے ہیں مسلم و غیر مسلم انسانوں کی ایک تیسری قسم بھی وہاں ملتی ہے وہ بھی دراصل اسی دوسری جماعت ہی کی ایک شاخ ہے ان کو وہ منافقین کی جماعت کہتا ہے یعنی وہ لوگ جو بعض مصالح و منافع کی خاطر بظاہر ایک جماعت سے اپنا تعلق ظاہر کریں لیکن درحقیقت وہ دوسری جماعت کے ساتھ ہوں

وَمن النّاس من یقول آمنا باللہ و بالیوم الآخرۃ وَمَا ھُمْ بمُؤمِنِینْ یخٰدعون اللہ وَالّذِیْنَ اٰمنوا وَمَا یخدعونَ اِلاَّ انفسھم وَمَا یشعرون ۲/۸

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں. لیکن درحقیقت وہ (مومنین کی جماعت سے متعلق) نہیں ہوتے. وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں. لیکن دراصل یہ دھوکا انکی خودفریبی ہوتی ہے اور وہ سمجھتے نہیں ۲/۹

وہ لوگ جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ:-

وَاِذَا لقوا الّذِینَ اٰمنوا قَالُوْا آمنا. وَاِذَا خلوا اِلیٰ شیاطینھم قالوا انا مَعکم انما نحن مستھزؤن ۲/۱۴

جب یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایماندار ہیں لیکن جب اپنے لیڈروں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم یونہی تمسخر کر رہے ہیں

لیکن قرآنی تقسیم کے اعتبار سے یہ لوگ بھی غیر مسلمین ہی شامل ہوتے ہیں۔

وَاِذَا جَاءُوکم قَالوا آمنا. وَقد دّخلوا بالکفر وَقد خرجوا بہٖ. وَاللہُ اعلم بِمَا کَانُوْا یکتمون ۵/۶۱

اور یہ لوگ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو مومن بنجاتے ہیں. حالانکہ جب یہ آئے تھے تو اسوقت بھی کفر ہی لیکر آئے تھے. اور جب گئے تو اُسوقت بھی کفر ہی لے کر گئے. اور اللہ خوب جانتا ہے جو یہ چھپاتے ہیں

بلکہ یہ تو جہنم کے اسفل ترین درجہ میں جائیں گے کہ کھلے دشمن سے مارآستین ہمیشہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے:۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔ ۴/۱۴۵

یقیناً یہ منافق (یہ جعفر و صادق) جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہونگے

تو گویا قرآن کریم کے نزدیک جماعتیں صرف دو ہی ہیں مسلم اور غیر مسلم۔ اس تقسیم کے سوا وہ کسی تیسری تقسیم کو جانتا ہی نہیں۔ اسلام کے نزدیک کسی مخلوط جماعت کا تصور ہی غیر قرآنی ہے یعنی وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتا کہ مسلم، و غیر مسلم ملکر ایک جماعت بن سکتے ہیں۔ سارا قرآن آپ کے سامنے ہے نبی اکرمؐ کا اُسوہ حسنہ آپ کے سامنے ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کی تاریخ کے اوراق آپ کے سامنے ہیں کہیں کسی ایک جگہ بھی آپ کو اس قسم کا اشارہ تک بھی نہ ملے گا کہ مومن و کافر مسلم و غیر مسلم باہمی اختلاط سے کسی ایک جماعت کے افراد بن سکیں۔ اسلام خالص مسلمانوں کی الگ جماعت قائم کرتا ہے جس میں کسی غیر مسلم کا نام تک نہیں آسکتا اور اسی طرح کوئی مسلمان اپنی جماعت کو چھوڑ کر کسی دوسری جماعت میں شامل نہیں ہوسکتا جو غیر مسلموں پر مشتمل ہو۔ علیکم بالجماعۃ فانّہٗ من شذ۔ شذ فی النار (اپنی جماعت کے ساتھ رہو۔ جو اس میں سے الگ ہوا وہ سیدھا جہنم میں گیا) اس شذّ (الگ ہونے) کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ خالص مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر کسی مخلوط جماعت کا فرد بنجائے۔ من فارق من الجماعۃ شبراً فخلع ربقۃ الاسلام من عنقہ (جو جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوگیا۔ اس کی گردن سے اسلام کا طوق اُتر گیا) اگر ہم اس موضوع پر آیات قرآنی۔ احادیث مقدسہ اور آثار صحابہؓ جمع کریں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ لیکن ان تمام تحریری اسناد کے علاوہ نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ، اور صدر اول کے مسلمانوں (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) کی تاریخ اپنی شہادت آپ پیش کرتی ہے۔ غیر مسلم مورخین نے اس باب میں بڑی تجسس و تفحص کی ہے کہ کہیں کوئی ایک واقعہ ہی ایسا ملجائے کہ مسلمان اور غیر مسلم ملکر ایک قوم بنگئے ہوں لیکن وہ ناکام رہے ہیں۔ سر ولیم میور نے۔ اتنی سعی و کاوش کے بعد اپنی مشہور کتاب (THE CALIPHATE-ITS RISE AND FALL)

تاریخ عروج و زوالِ خلافت" میں لکھا ہے کہ صدر اوّل کے مسلمانوں کی تاریخ میں صرف ایک شخص، حارث، نامی ایسا ملتا ہے جو اپنی جماعت کو چھوڑ کر خاقان کے پاس چلا گیا تھا۔ لیکن وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد تائب ہو کر واپس آ گیا۔ اسی طرح غیر مسلم بھی مسلمانوں کی جماعت کے افراد نہیں بن سکتے تا وقتیکہ وہ اسلام قبول نہ کر لیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے معاملات، خواہ وہ اپنی اندرونی اصلاح و تنظیم سے متعلق ہوں۔ خواہ خارجی دنیا سے۔ وہ ان کی اپنی (غیر مخلوط) جماعت کے مشوروں سے طے پا سکتے ہیں وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پائیں گے)، "بینہم" (آپس میں) خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جماعت مسلم و غیر مسلم افراد پر مشتمل نہ ہوگی۔ بلکہ خالصۃً مسلمانوں کی جماعت ہوگی۔ پھر اطاعتِ خدا و رسول کے ساتھ جو صاحبِ اختیار، امیرِ ملّت، کی اطاعت کا حکم ہے تو اس کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ اولی الامر منکم۔ وہ صاحبِ اختیار، وہ امیرِ قوم تم میں سے ہوگا۔ کسی غیر مسلم کی قیادت میں چلنا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ اور مخلوط جماعت میں تو ظاہر ہے کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز باقی نہیں رہے گی۔ اس تمیز مٹانے کا نام ہی تو قومیت پرستی (NATIONALISM) ہے۔

(۱) تو ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام کسی ایسی جماعت کا تصوّر بھی نہیں لا سکتا جو مسلم و غیر مسلم افراد کی مخلوط جماعت ہو۔ اُسکے نزدیک مسلمانوں کی جماعت الگ ہوگی اور ان کے علاوہ تمام دنیا کے غیر مسلموں کی جماعت ان سے الگ۔

---

(۲) پھر جس طرح اسلام کسی مسلم و غیر مسلم کی غیر مخلوط جماعت کا تصوّر یکسر غیر قرآنی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح وہ افراد کی ہستی کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ فرد جب تک جماعت کا رکن ہے تو سب کچھ ہے جب وہ جماعت سے الگ ہو جاتا ہے تو اس کی اسلامی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک تخاطب جماعتِ مومنین (یاایھا الذین امنوا) سے ہے کہیں ایک جگہ بھی فرد کو مخاطب کرنے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

(۳) جس طرح اسلام افراد کی کوئی ہستی تسلیم نہیں کرتا اسی طرح اسکے نزدیک کسی "فرقہ" کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ فرقہ سازی۔ گروہ بندی، پارٹی بازی، کو تو وہ شرک قرار دیتا ہے۔

وَلَا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعًا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون

مسلمانو! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے جو تفرقہ اندازی کرتے ہیں۔ اور اپنی الگ پارٹی بنا لیتے ہیں۔ پھر ہر پارٹی، ہر فرقہ اپنے اپنے خیالات میں مگن رہتا ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ جو ایسا کرتے ہیں:۔

لست منھم فی شیٔ ۶/۱۶۰

تمہارا اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں

جو جماعت سے الگ ہوگیا۔ خواہ ایک فرد ہو یا ایک فرقہ۔ اس کا اسلام سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔!

مندرجہ صدر ہر مسلمات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے جسقدر معاملات دوسری جماعتوں سے الگ ہونگے وہ:

(ا) نہ کسی ایسی جماعت کیطرف سے ہوسکتے ہیں جو مسلم وغیر مسلم اراکین پر مشتمل ہو۔

(ب) نہ مسلمانوں کے افراد سے ہوسکتے ہیں۔

(ج) نہ کسی خاص پارٹی یا کسی فرقے سے ہوسکتے ہیں۔

بلکہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہونگے۔ لہذا از روئے قرآن و سنّت۔ ہر وہ معاملہ جو اوپر کی تین شقوں میں سے کسی ایک شق کے ماتحت طے پائے گا وہ اسلامی اصول کے ماتحت محکم و استوار نہیں ہوگا لیکن جو معاملہ مسلمانوں سے من حیث الجماعۃ طے پائے گا۔ وہی فیصلہ زندہ و پائندہ ہوگا کہ مسلمانوں کے نزدیک جماعت اور جماعت کے امیر کا فیصلہ خدا اور رسول ؐ کے فیصلہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور یہ وہ فیصلہ ہے جس سے سرتابی ابدی جہنم میں لے جانے کی موجب ہو جاتی ہے:۔

ومن یعص اللہ ورسولہٗ فان لہٗ نار جھنّم خالدین فیھا ابدًا ۲۳

اور جو خدا ورسول کے حکم سے سرتابی کرے گا تو اسکے لیۓ جہنم کی آگ ہے جس میں وہ

ہمیشہ رہے گا

یہاں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مسلمانوں کو ایک "فرقہ" قرار دینا ان کو انکے مذہب سے منحرف بنا دینا ہے کہ فرقہ بندی تو اُنکے نزدیک شرک ہے۔ مسلمان فی ذاتہٖ ایک مستقل قوم (NATION) ہے اور یہ کسی مخلوط قوم (NATION) کا جزو بن ہی نہیں سکتے۔ مذہبًا یہ ناممکن ہے، یہ جب تک مسلمان رہیگا ایک قوم۔ ایک جماعت کی حیثیت سے رہے گا۔ جب کسی مخلوط قوم میں جا کر ملجائیگا۔ اسلام کے دائرے سے باہر چلا جائے گا۔ یہ حقیقت بہ ظاہر بڑی تلخ معلوم ہوگی لیکن جس حقیقت کو خدا اور اس کا رسولؐ ایسے کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہو اُسے رواداری کے ایک غلط مفہوم کی بنا پر کھلے لفظوں میں نہ کہنا دوسروں کو فریب دینا ہے جو اسلام میں تو کسی صورت میں بھی جائز نہیں ۔

انّ الّذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی من بعد ما بیّنّٰہ للنّاس فی الکتاب اولٰئک یلعنھم اللہ و یلعنھم اللّٰعنون ۲/۱۵۹

یقیناً وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جو ہمنے دلائل وہدایت کی بنا پر نازل کیا ہے، بعد اسکے کہ ہمنے اسے کتاب میں تمام انسانوں کے لیۓ بالکل ظاہر کر دیا ہے۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے ۔

اب مسئلہ زیر نظر کی دوسری شق کو لیجیے یعنی مسلمانونکو من حیث الجماعت غیر مسلمونکی جماعتوں سے کس صورت میں معاملات طے کرنے ہونگے سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلام دُنیا میں شرف انسانیت سکھانے کے لیۓ آیا ہے، مسلمانوں کا جذبۂ عدل وانصاف، رحم ومروت ہمدردی واحسان کسی خاص قوم۔ خاص نسل۔ خاص رنگ۔ خاص ملک حتٰے کہ کسی خاص مذہب تک محدود نہیں ہوتا۔ ان کا خدا رب الناس یعنی تمام نوع انسانی کا پروردگار ہے۔ لہذا مسلمانوں کے جذبات مروت وپرورش بھی تمام نوع انسانی کے ساتھ یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن نظم ونسق عالم کی بہترین

تقویم کے لئے۔ دنیا میں اس جماعت کے استحکام کی خاطر جو حق و انصاف کی علمبردار ہے جو خدا کے ضابطہ آسمانی کی امین اور حامل ہے قرآن کریم نے وہ قوانین بھی مرتب فرما دیئے ہیں جن کی رو سے مسلمانوں کی جماعت غیر مسلموں کی جماعت کے ساتھ تعلقات قایم کرسکتی ہے۔ تعلقات کی ایک شکل تو وہ ہوتی ہے جسے اعتماد بھروسہ۔ قلبی یگانگت۔ دلی دوستی، وحدت ایمان و عمل کے تعلقات کہتے ہیں اسے قرآنی اصطلاح میں تولّی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے تعلقات قرآن کریم کی رو سے مسلمان صرف اپنی جماعت کے ساتھ وابستہ کرسکتے ہیں، غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قطعاً پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ اس چیز کو قرآن کریم نے مسلمانوں کی مرضی پر ہی نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ ان کو کھلے کھلے الفاظ میں تاکیدی احکام دیئے ہیں کہ وہ ایسا کرہی نہیں سکتے۔ یہ چیز کسی دوسرے وقت بیان کی جائے گی کہ دنیا میں اس قسم کی جماعت کا وجود کیوں ضروری ہے۔ اور اس جماعت کے افراد کو غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کے قلبی تعلقات پیدا کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ اسوقت ہم صرف قرآنی مسلمات سے بحث کر رہے ہیں ان کے دلائل و (حجج سے) فرمایا:۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں (اولیاء دلی دوست) وہ نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں۔ نماز کو قایم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔۔۔ ۹/۷۱

اس کے برعکس غیر مسلموں کے متعلق فرمایا:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ ۔ قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۳/۱۱۷

اے ایمان والو۔ اپنے سوا (یعنی اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا) کسی دوسرے کو دلی دوست۔ رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وہ ہمیشہ تمہارے نقصان پر خوشیاں مناتے ہیں ان کی نفرت اور کینہ کی کچھ باتیں

تو ان کے مُنہ سے (بعض اوقات) نکل جاتی ہیں لیکن جو کچھ اُنکے دلوں کے اندر
بھرا ہوا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے کھلی کھلی باتیں تم سے کہہ دی ہیں
اگر تم سمجھ رکھتے ہو (تو خود سمجھ لو کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔)

مِنْ دُونِکُم کا ٹکڑا قابل غور ہے یعنی اپنے سوا۔ اپنی جماعت کے افراد کے علاوہ اور کوئی بھی ہو اس سے اس قسم کے تعلقات قطعًا پیدا نہیں کیے جا سکتے جیسے اپنوں سے کیے جا سکتے ہیں۔ ہم نے پہلے دیکھ لیا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے دُنیا میں جماعتیں صرف دو ہی ہیں ایک مُسلمانوں کی اور دوسری غیر مُسلموں کی (مِنْ دُونِکُم کی) مُسلمانوں کے سوا اور ساری دُنیا کی جماعتیں اس غیر مسلم جماعت میں شامل ہیں۔ جو مُسلمانوں کی جماعت نہیں وہ غیر مسلموں کی جماعت ہے۔ خواہ وہ ہزار فرقوں سے ملکر جماعت بنی ہو۔ خواہ اسے کسی مُلک کی "واحد نمائندہ" ہونے کا دعویٰ بھی کیوں نہ ہو، مُسلمانوں کے نزدیک وہ جماعت من دون المؤمنین (غیر مسلم) جماعت ہے اور یہی وہ جماعت ہے جس سے تولّی۔ قلبی تعلقات۔ دِلی دوستی۔ اعتماد اور بھروسے کے تعلقات۔ قطعًا جائز نہیں وطن کا رشتہ تو ایک طرف رہا۔ خواہ خون کا رشتہ بھی کیوں نہ ہو۔ "خواہ اُنکے آباء و اجداد ہی کیوں نہوں اُنکے بیٹے کیوں نہوں بھائی کیوں نہوں رشتہ دار کیوں نہوں" (۵۸/۲۲) اُن سے تولّی جائز نہیں غیر مسلموں کے ساتھ جو تعلقات قایم ہونگے وہ ہمیشہ باہمی معاہدوں کی رُو سے قایم ہونگے جن میں باہمی حقوق و ضمانت کی شرائط و قیود واضح کی جائیں گی۔ یہ وہ جماعتیں ہوں گی جنکے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ "بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِیثَاق" تمہارے اور اُن کے درمیان میثاق ہے۔ معاہدہ ہے۔ نبی اکرمؐ نے جسقدر معاملات غیر مسلموں سے طے کیے سب اسی انداز سے کیے۔ من حیث القوم کیے۔ باہمی معاہدوں کی رو سے کیے۔ صدر اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ ان مواثیق و معاہدات سے بھری پڑی ہے۔ اسکے خلاف ہمارا دعویٰ ہے اور علےٰ وجہ البصیرت یہ دعویٰ ہے کہ قرآن و حدیث و آثار و تاریخ میں کہیں ایک سند بھی اس چیز کے اثبات میں نہیں ملے گی کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے انفرادی طور پر دوستی اور توے کے تعلقات قایم کیے ہوں۔ اگر کسی کو اس میں

میں شک ہو تو اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی ایک سند پیش کرے۔ فَاْتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ٥

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان ایسا کرے کہ وہ انفرادی طور پر غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ رابطہ مودت و موانات قائم کرکے ان کے ساتھ دوستی اور تولّی کا رشتہ پیدا کرے تو قرآن کریم کا اس باب میں کیا حکم ہے لیکن قبل اسکے کہ آپ یہ حکم سنیں ذرا کلیجہ کو تھام لیجئے حکم وہ ہے کہ جسے دیکھنے سے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں جس کے احساس سے دل کانپ اٹھتا ہے جس کے لکھتے وقت ہاتھ تھرتھرا جاتا ہے سنیئے حکم ہے کہ:-

من يتولهم منكم فانه منهم۔ ۵۱/۵

جو تم میں سے انکے ساتھ اس قسم کا رشتہ قائم کرے تو وہ انہی میں کا ایک ہو جاتا ہے۔

غور فرمایئے۔ فانہ منھم۔ وہ تم میں سے نہیں رہتا۔ وہ انہی میں سے ایک ہو جاتا ہے۔ جو اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسروں سے تعلقات قائم کرتا پھرے اُسے تم سے کیا واسطہ! وہ جن میں جا ملا۔ انہی میں سے ہو گیا! اللہ اکبر غور فرمایئے بات کہاں پہنچ رہی ہے!! یاد رکھیئے قرآن کریم کوئی شاعری کی کتاب نہیں ہے کہ یونہی برائے بیت کچھ الفاظ لکھ دیتا ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ محکم اور اٹل ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے اس کا مطلب بھی وہی ہوتا ہے جب اُسنے فانہ منھم کہا تو فی الواقعہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمانوں کے حلقہ میں رہتا ہی نہیں۔ وہ انہی میں سے ایک ہو جاتا ہے جن میں وہ جا ملتا ہے۔ اس فانہ منھم کی عملی تفسیر دیکھنی ہو تو روزمرہ کے واقعات پر غور فرمایئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت کی

ص۱ آیت میں اس مقام پر یہود و نصاریٰ کا ذکر بالتصریح ہے لیکن چونکہ مسلمانوں کو تمام کفار سے تولّی کی ممانعت کی گئی ہے (دیکھو) اور یہود و نصاریٰ کو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کافر کہا گیا ہے اس لیئے فانہ منھم کے معنی یہی ہیں کہ مسلمان اپنی جماعت مومنین کے سوا جن سے بھی تولّی رکھے گا وہ انہی میں سے ہو جائے گا۔

گفتگو کے متعلق ابتدائی مراحل طے ہوتے ہیں مسلمانوں کی طرف سے مسٹر جناح سامنے آتے ہیں اور رہا تما گاندھی سے کہتے ہیں کہ آپ ہندوؤں کی طرف سے آیئے۔ آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہاں سے کیا جواب آتا ہے؟ حیران ہوں کہ اس جواب پر آسمان کیوں نہ پھٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ شق ہوگئی، یہ خطہ کیوں نہ غرق ہوگیا۔ جواب آتا ہے کہ ہماری طرف سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد آئینگے اُن سے بات کیجئے اللہ جل جلالہٗ۔ یہ دن بھی ملّتِ اسلامیہ کو دیکھنے تھے۔ لیکن اُس مردِ غیور کی حمیت اسے گوارا ہی نہ کرسکی کہ چشمِ فلک اس نظارہ کو بھی دیکھے کہ مسلمان آمنے سامنے ہوں اور اُن میں سے ایک مسلمانوں کا نمائندہ ہو اور دوسرا ـــ غیر مسلموں کا نمائندہ۔ اُس نے کہہ دیا کہ نہیں ہندوؤں کی طرف سے آپ تنہا ہی آیئے۔ پھر اس "انہ منہم" کی تفسیر دیکھنی ہو تو وہ بیانات ملاحظہ فرمایئے جو اخبارات میں آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں مسلمانوں کی طرف سے جب کبھی ہندوؤں کے خلاف صدائے احتجاج اٹھتی ہے تو اُسکے جواب میں ہندوؤں کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے۔ اُن کی بریت اور صفائی پیش کرنے کے لیے اور اُلٹا مسلمانوں کے سر الزام دھرنے کے لیے کون سامنے لایا جاتا ہے؟ کوئی ڈاکٹر مونجے نہیں۔ کوئی بھائی پرمانند نہیں۔ بلکہ "امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد"۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر ز خاک !

سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں !

سچ کہا ہے قرآنِ کریم نے کہ "جب کوئی انسانوں کو خدا سمجھنے لگتا ہے تو اُس کی حالت یہ ہو جاتی ہے گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے یا اُسے ہوا کے تیز جھونکے پر کاہ کی طرح اِدھر اُدھر اُڑائے لیئے پھر رہے ہوں یا جیسے کسی چھوٹے سے پرندے کو کوئی عقابی پنجوں والا گدھ اُچک کرلے جائے"۔ وہی مومن جو تختہ دار پر بھی اپنی سی کہے جاتا ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت اسے اس سے روک نہیں سکتی۔ پھر اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ جو جس کے جی میں آئے اُس سے کہلوالے۔ یا للعجب۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بشر المنافقین بان لهم عذابا الیما۔ ن الذین یتخذون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ۔ ایبتغون عندهم العزة فان العزة لله جمیعا (۴-۱۳۸)

ان منافقین کو خوشخبری دیدیجئے کہ انکے لیے دردناک عذاب ہے وہ لوگ کہ جو مسلمانوں کو چھوڑکر (یا مسلمانوں کے سوا) غیرمسلموں کو اپنا دوست بناتے ہیں کیا یہ لوگ ان غیرمسلموں کے پاس عزت پانے کی خاطر جاتے ہیں! سو عزت تو تمام اللہ کے ہاں ہے (۴-۱۳۸)

کتاب و سنت کی ان تصریحات کو سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے کہ اگر مسٹر جناح یا کوئی اور مسلمان یہ کہہ دے کہ:-

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد عمل کی صرف یہی صورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان من حیث الجماعت معاہدہ ہو۔ اور

(۲) ایک فریق کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور دوسرے فریق کو غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت۔

تو کہیے اُسنے کون سا جُرم کردیا ہمیں اس سے واسطہ نہیں کہ کانگریس ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے یا نہیں۔ وہ ساری دُنیا کی نمائندہ جماعت بنجائے لیکن اسلام کے نزدیک چونکہ مسلم و غیرمسلم کی مخلوط جماعت کا تصور ہی باطل ہے اسلیے مسلمانوں کے نزدیک یہ جماعت غیرمسلموں کی جماعت ہی رہے گی ہر مسلمان ایسا سمجھنے۔ ایسا ماننے اور ایسا کہنے پر اپنے مذہب کی رُو سے مجبور ہے، اس میں نہ کسی سیاسی مصلحت کو دخل ہے نہ کسی کی ذاتی لڑائی کو۔ آجکل ایک ہنگامہ برپا کیا جارہا ہے کہ دیکھیے صاحب کانگرس کی وسعت ظرف کہ اُسنے مسلمانوں کے نمائندہ جناب جناح سے "۲ لفظوں" میں صاف کہہ دیا کہ ہم سب مطالبات تسلیم کرلینگے بشرطیکہ وہ کانگریس کے نظریۂ قومیت (NATIONALISM) کے خلاف نہ ہوں یعنی مسلمان بجائے اپنی الگ جماعت تسلیم

کرانے کے تسلیم کرلیں کہ "مسلم وغیر مسلم" دونوں مل کر ایک مخلوط قوم بن سکتے ہیں۔ صدر کانگریس نے پچھلے دنوں آسام میں ایک ایڈریس کے جواب میں کہا ہے کہ ہم سب کچھ مسلمانوں کے حوالے کردینے کو تیار رہیں بشرطیکہ مسلمان اپنے الگ جماعتی نظریہ کو چھوڑ کر "مشترکہ قومیت" کے نصب العین کو تسلیم کرلیں کس قدر چھوٹی سی شرط۔ اور کتنا معصوم سا مطالبہ!! اور مسلمانوں کی "ہٹ دھرمی" ملاحظہ ہو کہ اتنی سی بات نہیں مانتے!! لیکن مسلمان کیا کرے! وہ اپنے خدا کی مانے۔ خدا کے رسولؐ کی مانے۔ یا ان "تازہ خداؤں" کی مانے۔ یوں سمجھئے کہ صرف اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ بھئی میں تیری تمام شرطیں مان لونگا۔ بس ذرا سی میری بات مان لو کہ اپنی شاہ رگ کاٹ لینے دو۔ اور اس شرط کے نہ ماننے پر دُہائی مچا دی جاتی ہے کہ فرقہ پرست! انسانیت کا دشمن۔ وطن کا غدّار۔ انگریز کا پٹھو۔ اور پتہ نہیں کیا کیا!! ہم برادرانِ وطن سے صرف اتنی درخواست کرینگے کہ وہ اپنے دل میں اس قسم کے خیالات کو پرورش دینے کی بجائے ایک مرتبہ مسلمان کی پوزیشن کیوں نہیں سمجھ لیتے اور اس کی ان "مجبوریوں" پر نگاہ کیوں نہیں رکھتے جو اس پر قانونِ خداوندی کی شکل میں مسلّط ہیں اور جن "مجبوریوں" کے اندر درحقیقت اس کی "آزادی" کا راز پوشیدہ ہے۔

یہ ہے بنا مسلمانوں کے واحد نمائندہ جناب محمد علی جناح کے بنیادی مطالبات کی جنہیں دیکھ کر ایک سچا مسلماں صدائے تحسین بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس مردِ حق آگاہ کی دقیقہ رس اور دُور بیں نگاہیں حقایقِ قرآنی کو کس طرح حالاتِ حاضرہ کی مطابقت میں پیش کر رہی ہیں مسلمان عام طور پر سمجھتا ہے کہ قرآن جُبّہ و عمامہ میں لپٹا رہتا ہے لیکن اس ہیٹ اور پتلون کے ساتھ روحِ قرآنی کی اس انداز سے ترجمانی۔ بلا ساختہ سعدی کے یہ الفاظ سامنے آتی ہے کہ :۔ درویش صفت باش و کلاہِ تتری پوش۔ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ مسٹر جناح

اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

شاہراہِ مقصود

(از جناب مولانا ابوالکلام آزاد)

(تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہونی چاہیئے۔ اسکے متعلق مولانا آزاد صاحب نے ۱۹۱۲ء میں تحریر فرمایا تھا:)

"ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ تقسیم بنگال کی تنسیخ سے نہیں بلکہ مدت سے اپنے اندر آزادی اور حقوق طلبی نہ پالیسی کا ولولہ رکھتے ہیں۔ گو عام راہ ضلالت سے الگ رہنے کا انہیں لائق دینا چاہیئے لیکن افسوس ہے کہ انکے سامنے بھی ہندوؤں کی پولٹیکل جدوجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی ترقی کا سدرۃ المنتہیٰ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سیکھ جائیں۔ بے شک ہمارے عقیدے میں بھی آج کل مسلمانوں کے لیئے عبرت اور تنبیہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال میں ہے اور بڑی بدبختی یہی تھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی لیکن پیروانِ "امامِ مبین" کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہوسکتی کہ اعمالِ زندگی کے ایک ضروری شعبے میں ان کو اسلام تعلیم دینے سے مجبور و لاچار ہوگیا ہو اور اس کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں ایک دوسری قوم کے دسترخوان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر للچانا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہے تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آئتیں پڑھ دینے یا بستر نزع پر سورۂ یٰسین کو دہرا دینے کے لیئے کارآمد ہوسکتا ہے! ہمارے نزدیک اسلام کے دامنِ تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدنما داغ نہیں ہوسکتا کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں . . . .

پس اگر مسلمان زندگی حاصل کرسکتے ہیں تو مسلمان بن کر، ہندو یا مسیحی بنکر نہیں۔ اگر شمع کا فوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے پھر یہ بھی ہے کہ

فرض کر لیجئے، کل ہندؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی جتنی راہیں انسانی دماغ کی پیدا کردہ ہیں اُن میں تغیّر و تبدّل ہر وقت ممکن ہے۔ البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں۔ کہ لا تبدیل لکلمات اللہ پھر کیا اُس حالت میں مُسلمان بھی اپنے اماموں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے؟ ذرا غور سے کام لیجئے کہ گہری اور تفکر طلب باتیں ہیں۔ ہم مُسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ خواہ کسی اصول پر مبنی ہو لیکن وہ ایک ایسی راہ پیدا کریں جو اُن کی مستقل اور مخصوص راہ ہو جس میں کبھی تغیّر کی ضرورت نہ ہو۔ تمام خارجی اثرات تغیر سے محفوظ ہو نیز کہا جا سکے کہ وہ مُسلمانوں کی راہ ہے .... ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی رُوح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ سیٹھ اور کیا بھی۔ لیکن مُسلمانوں کی تو کوئی علیحدہ قومیت نہیں ہے کسی نسل و خاندان یا زمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ اُن کی ہر چیز مذہب۔ یا بالفاظ مناسب تر اُنکا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو قرار نہیں دینگے اسوقت تک ان میں قومیت کی رُوح پیدا ہو سکیگی اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کر سکینگے آج دُنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں اپنے لیئے جو تاثیر رکھتی ہے مُسلمانوں کے لیئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ کے پاس اسکے مقابلہ میں اگر کوئی لفظ ہے تو "خدا" یا "اسلام" ہے .... (الہلال)

(۱) مسلمانوں کے لیئے ہر شئے اُنکے مذہب میں ہے پس وہ اگر آجکل اپنی پولیٹکل زندگی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی جگہ اس شئے ہی کو کیوں نہ پیدا کریں جو نہ صرف پالیٹکس بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کردے

(۲) قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کیلئے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لیئے ایک کامل اور اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شئے باہر نہیں پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہو گا اُنکے لیئے موجبِ فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔

(۳) ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہیئے اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہیئے کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکام اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ اسلام ہی اُنکے لیئے

پالیٹکس کی راہ کھولے گا تعلیم کا حکم دے گا۔ اخلاق و فضائل میں تبدیلی پیدا کردے گا اور وہ تمام باتیں جن کو ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ للچا رہے ہیں۔ نقصانوں اور مضرتوں سے صاف ہو کر ان میں پیدا ہو جائیں گی۔

(۲) تعلیم معاشرت اور سیاست میں اُن کو بربنائے اتباعِ اقوام کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیئے بلکہ برنبائے مذہب۔　(الہلال ۹ راکتوبر ۲۳ راکتوبر و ۶ نومبر ۱۹۱۲ء)

کیا کوئی خدا کا بندہ ایسا ہے جو قوم کو اتنا پوچھ کر بتادے کہ قرآن کریم کی وہ تعلیم جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہ تھا۔ وہ آج کس کی نذر ہو گئی! یہ نیا مسلک جو برنبائے اتباعِ اقوام اختیار کیا جا رہا ہے اور جس کی طرف مسلمانوں کو پکار پکار کر بلایا جا رہا ہے کون سے نئے قرآن سے حاصل کیا گیا ہے! مسلمانوں کی اس مذہبی موت کا ذمہ دار کون ہے جس کی رُو سے اُنہیں ہندوؤں کے قدم بقدم چلنا سکھایا جا رہا ہے۔ وہ کون سا سامری ہے جس کی فسوں سازیاں ملّتِ بیضا کو خدائے طور سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کیطرف لیے جا رہی ہیں! وہ کون سا مقناطیس ہے جس نے مسلمانوں کے قبلہ نما کی سوئی کا رُخ "آنندبھون" کیطرف پھیر دیا ہے۔ وہ کون ہے جو آج دوسروں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کے پیچھے للچایا ہوا دوڑ رہا ہے۔ وہ کون سا فقیر ہے جس کی جھونپڑی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آج شمع کافوری سے بھی زیادہ درخشندہ و تابناک بنا کر دکھایا جا رہا ہے! وہ کون ہے جو مسلمانوں کے اندر اسلام یا خدا کے نام سے نہیں بلکہ قوم اور وطن کے نام سے زندگی کی حرارت پیدا کرنا چاہتا ہے! وہ کون سی مستقل اور علیحدہ راہ ہے جو ہندوؤں سے ہٹ کر مسلمانوں کے لیے تجویز کیجا رہی ہے! وہ کون سا گروہ ہے جو آج مذہب کو خطبۂ نکاح اور وضو و غسل کے مسائل تک محدود کر دینا چاہتا ہے! ہاں — ذرا غور سے کام لیجئے کہ یہ گہری اور تفکر طلب باتیں ہیں!

ہمیں معلوم ہے کہ آج قوم کے پاس کوئی ایسی قوت اور کشش موجود نہیں جو ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کیلئے کسی مُہرِ خاموشی کو توڑ سکے۔ لیکن ؎

قریبِ یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر　　جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

بحضورِ سرورِ کائنات

(خانصاحب حکیم احمد شجاع صاحب اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی)

اے رسولِ ہاشمی اے سرِ تکوینِ حیات　　اے کہ تیری ذات ہے وجہِ نمودِ کائنات

تو نہ تھا تو محفلِ کون و مکاں بے رنگ تھی　　تو نہ تھا تو بزمِ ہستی سازِ بے آہنگ تھی

حسنِ فطرت میں ابھی ذوقِ خود آرائی نہ تھا　　عشق اب تک محرمِ اسرارِ رسوائی نہ تھا

تلخیٔ حق سے ابھی نا آشنا گفتار تھی　　عقلِ انسانی ابھی پابستۂ انکار تھی

سربلندوں کی جبیں سجدے سے نورانی نہ تھی　　سینۂ انساں میں آہِ نیم شب لرزاں نہ تھی

آنکھیں آنسو نہ تھے سر میں نگوں ساری نہ تھی　　قلبِ مومن کی جہاں میں گرم بازاری نہ تھی

خواب میں آسودہ ابراہیمؑ کی تکبیر تھی　　ہیبتِ ضربِ کلیمؑ اک خواب بے تعبیر تھی

بربطِ داؤدؑ اک مدت سے رہینِ زنگ تھی　　مے تو تھی لیکن بہت بے کیف اور کم رنگ تھی

تو نے آتے ہی بدل دی طرحِ تقویمِ حیات　　ہوگئیں پابندِ امکانِ عمل ناممکنات

قالبِ ہستی میں دوڑا دی شعاعِ زندگی　　ہوگئی ارزاں تیرے دم سے متاعِ زندگی

پیکرِ گل کو کیا توحید کا سرِّ جلی!　　خاک کو دی قدرتِ نشوِ حسینؓ ابنِ علیؓ

آج تیرے عتبۂ اقبال پر آیا ہوں میں　　دل کے ٹکڑے نذر کرنے کیلئے لایا ہوں میں

وہ تہی دامن ہوں جسکے پاس کچھ ساماں نہیں　　جانتا ہوں سنگریزے نذر کے شایاں نہیں

اپنی رحمت پر نظر کر میری ناداری کو دیکھ　　دورِ غارتگر میں ناچار و نکی ناچاری کو دیکھ

قوم کو جب دیکھتا ہوں ٹھوکریں کھاتے ہوئے　　شرم آتی ہے تیرے دربار میں آتے ہوئے

بس نہیں چلتا بجز حیرانی و شرمندگی ۔ پھونک دے پھر اس تن بے جاں میں روح زندگی
سوز سے معمور میرے شعر کا پیمانہ کر ۔ ماسوا سے میرے ذکر و فکر کو رسوا نہ کر
عشق را چالاک تر کن از لب جام کہن ۔ حسن را بیباک تر کن بر سر بام کہن
قلب را تاب پر پروانۂ بے تاب بخش ۔ چشم را اشک روان و فطرت سیماب بخش

نعرۂ حق را ز شعر من بلند آوازہ کن
یاد بزم رفتگان را از فغانم تازہ کن

ترسیل زر
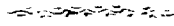
میں خریداران طلوع اسلام احتیاط سے کام لیں جملہ ترسیل زر

بنام حکیم ذکی احسان صاحب مالک جید برقی پریس

بلیماران دہلی ہونی چاہیئے

تکلف برطرف

راآزی

گذشتہ اپریل میں اندور کے مقام پر تمام مذاہب کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ایسے اجتماع ضرور مفید ہو سکتے ہیں بشرطیکہ مقررین حضرات اس مذہب کے حقائق سے واقف ہوں جس کی نسبت وہ کچھ بیان کر رہے ہوں اور سامعین میں قوت فیصلہ کے ساتھ اتنی جرأتِ قلب بھی ہو کہ وہ جہاں کوئی غلطی محسوس کریں اس کا اجتماع کے سامنے بیباکانہ اظہار کر دیں۔ اندور کی کانفرنس نے ہمارے دل میں اس کانفرنس کی یاد تازہ کر دی جو جولائی ۱۹۳۶ء میں لندن کے مقام پر بصدارت سر فرانسس ینگ ہسبنڈ منعقد ہوئی اور جس میں تمام مذاہب عالم کے ممتاز ترین نمایندگان نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی روئداد۔ معہ ان مقالات کے جو اس میں پڑھے گئے۔ شائع ہو چکی ہے اور دلچسپ معلومات کا مجموعہ ہے جیسا کہ اس روئداد (FAITHS AND FELLOW SHIP) سے ظاہر ہے۔ اور جس کی تائید ہم نے کانفرنس مذکور کے سکرٹری صاحب کی ایک پرائیویٹ چھٹی سے بھی کرائی ہے۔ عام انداز یہ تھا کہ جلسہ میں جو مقالہ پڑھا جانے والا ہوتا۔ اس کو پہلے سے چھپوا لیا جاتا اور نمایندگان جلسہ شروع ہونے سے پیشتر اس کا مطالعہ کر لیتے۔ پھر مقالہ کے ختم ہونے پر اس کے متعلق بحث و مذاکرہ ہوتا۔ ۱۴ر جولائی کی صبح کے اجلاس میں ایک ممتاز عیسائی محقق۔ ڈاکٹر سٹین (STEIN) نے عیسائیت کے متعلق ایک "فاضلانہ مقالہ" پڑھا۔ یہ صاحب رسالہ "عصر حاضرہ" (PRESENT AGE) کے ایڈیٹر اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اپنے مقالہ میں انھوں نے الوہیت مسیح کو متعدد دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال یہ ان کا موضوع تھا۔ اپنے مذہب کا معاملہ تھا۔ جو جی میں آئے کہتے۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ حضرات، الوہیت مسیحؑ تو ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا اعتراف خود اسلام کو بھی ہے۔

اب ہم نے ذرا غور سے مقالہ کو پڑھنا شروع کیا۔ ذرا تصور میں لایئے اس کیفیت کو یہ صاحب علمی دنیا میں اتنی شہرت کے مالک ہیں۔ چار پانسو ممتاز نمایندگان مذاہب کا اجتماع ہے۔ خود

مذہب اسلام کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ اس بھری محفل میں کس جرأت دیباکی سے فرماتے ہیں کہ

"قرآن کریم کی انیسویں سورہ میں (حضرت) محمدؐ نے کہا ہے کہ (حضرت) عیسےٰؑ کی ذات گرامی وہ ہے جو آفتاب کو اپنے داہیں ہاتھ پر اور مہتاب کو بائیں ہاتھ پر لئے ہوئے ہے"

کسی مسلمان نے قرآن کریم کی انیسویں سورہ کو نہیں دیکھا۔ اور اگر کسی نے نہیں دیکھا تو اب نکال کر دیکھ لے۔ اور تلاش کرے کہ یہ آیت کونسی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے اس بلند آہنگی کے ساتھ پیش کی ہے۔ ہم نے مقالہ کے بعد اس بحث کو دیکھا جو اس مقالہ کے اختتام پر اس سے متعلق وہاں چھڑی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بہت سی تھیں۔ لیکن غیر تو ایک طرف کسی اسلامی نمایندہ نے بھی وہاں یہ نہ کہا کہ حضور! ذرا ہمیں بھی تو اس قرآن کی زیارت کرا دیجئے جس میں یہ آیت درج ہو۔ بحث ہوئی۔ مقالہ کی تعریف ہوئی اور جلسہ برخاست ہوگیا۔ اور جرأت بالائے جرأت ملاحظہ ہو کہ مقالہ معہ اس "اقتباسِ قرآنی" کے روئداد میں شائع ہوا۔ اور اب ساری دُنیا میں گردش کر رہا ہے۔ جہاں ایسے ایسے "محققین" مقالہ نگار ہوں۔ اور ایسے ایسے واقف کار نمایندگانِ مذاہب وہاں اس قسم کے مذہبی اجتماعات کیوں نہ جہل و ظلمت کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔

اور آپ یہ نہ خیال فرمایئے کہ اسلام کی نمایندگی کسی "مسٹر" کے حصہ میں آئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے نمایندہ ہمارے ایک بہت بڑے علامہ مفسرِ قرآن تھے! یا للعجب۔

مشہور انقلاب پسند۔ کانگریس پرست پرچہ (کلیم دہلی) ہمیشہ مذہبی معتقدات کا تمسخر اڑاتا رہتا ہے۔ اور اگر کوئی اسے اس روش سے ٹوکتا ہے تو وہ اپنی اس لامذہبیت کے جواز میں ایک عجیب دلیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب پرست طبقہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ لامذہب طبقہ کی عقلیں کمزور ہیں۔ لیکن "اگر لامذہبوں کی عقلیں کمزور واقع ہوئی ہیں تو اس ضعفِ عقل کی ذمہ داری کس پر

عاید ہوتی ہے۔ کیا منکرانِ مذہب اپنی عقلوں کے خالق ہیں اور اگر وہ اپنی عقلوں کے خالق نہیں ہیں تو ان کی اس بیدینی کا جو ضعف عقل سے پیدا ہوتی ہے کون جواب دہ قرار دیا جائے گا۔"

(کلیم دسمبر ۱۹۳۷ء)

یعنی وُہی عقیدۂ جبر جس کی آڑ میں بنی اُمیہ کے متغلبین اپنے استبدادِ شخصی کو چھپایا کرتے تھے۔

لیکن یہی پرچہ اپنی ہر اشاعت میں "کانگریس کے منکرین" کو جی بھر کے گالیاں دیتا رہتا ہے۔" "پیدائشی وطن فروش"۔ "مادرزاد غدار"۔ "مسہریوں میں کروٹیں بدلنے والے گوشت کے سانس لیتے ہوئے سڑے لوتھڑے"۔ "برہنہ داری" وغیرہ ان کے نام رکھتا ہے۔ (کلیم بابتہ مارچ ۱۹۳۸ء)

یعنی یہ حضرت اگر خدا کا بھی انکار کر دیں تو در خورِ معافی

اور جنّاح بچارا اگر ہندو کا منکر ہو تو قابلِ دار!!

کیا یہ کہیں اس لئے تو نہیں کہ خدا کی گرفت مہلت دیتی ہے اور ہندو کی گرفت اتنی قریب نظر آتی ہے کہ اُس کے خلاف جانے سے وہ اگلی اشاعت کی بھی نوبت نہ آنے دے۔

"مصلحت بیں و کارِ آسان کن"

اِسے سیاسی اصطلاح میں "نیشنلزم" کہتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے اخبارات میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ خلیفۂ قادیان اپنی جماعت کو تلقین کر رہے ہیں کہ چونکہ خداوندانِ لندن نے اپنا گوشۂ چشمِ ربوبیت اِن وفاشعاران سے پھیر لیا ہے اس لئے انہیں بھی چاہئے کہ اپنے سجدوں کا رُخ پھیر لیں اور کانگریس سے جا ملیں۔ اس پر بعض حضرات اعتراض کر رہے ہیں کہ بڑے مرزا جی صاحب تو عمر بھر یہی الہام سُناتے رہے کہ دیکھنا انگریزی غلامی سے سرتابی نہ کرنا۔ اور اس الہام کی اس شد و مد سے تبلیغ کی کہ اس سے" چالیس الماریاں" بھر جائیں۔ اب یہ انکی اُمت کو کیا ہو گیا کہ ان الہاماتِ مقدسہ سے یوں باغی ہو رہی ہے۔ یہ تو بڑی "بے اصولی" بات ہے۔ لیکن ہمیں تو کافی غور کرنے کے بعد بھی پتہ نہ چلا کہ بالآخر اس میں "بے اصولی" کی کونسی بات ہے۔ یہ لوگ اصول کو خود نہیں سمجھے اور خواہ مخواہ خلیفہ صاحب اور انکی امت پر بے اصولی کا افتراء باندھ

رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ روش عین اصول کے مطابق ہے۔ بڑے مرزا صاحب کے الہامات نے جو اصول بیان فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ جو طاقت برسر اقتدار رہو اس کی غلامی اختیار کرو۔ یہی اصل ایمان ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ ان کے وقت میں انگریز برسر اقتدار تھا اس لئے انگریز کی غلامی جزو ایمان تھی۔ اب حالات بدل گئے۔ اقتدار انگریز سے چھن کر ہندو کے ہاتھ میں آرہا ہے۔ لہذا فطرت محکومانہ کے اس غیر متبدل اصول کے مطابق اب ہندو کی غلامی اختیار کر لینی چاہئے۔ اب فرمائیے اس میں بے اصولی کی کونسی بات ہوئی، ہمیں ان معترض حضرات کی یہ روش نظر پسند نہیں آتی کہ جوش مخالفت میں حقائق سے چشم پوشی اختیار کر لی جائے اور دوسروں پر غلط اتہام باندھ دیئے جائیں۔ بات ہمیشہ وہی کہو جو خدا لگتی ہو۔

"محکوم کے الہام سے آپ کو اس غلامانہ ذہنیت کے سوا اور ملیگا کیا! یہ چیز تو آپ کو کسی اور ہی الہام میں ملے گی کہ خدا کے سوا غلامی کسی کی جائز نہیں، خواہ وہ انگریز ہو خواہ ہندو۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

پریم اور شانتی کا مذہب

یہ ایک پُر مغز اور حقائق سے لبریز ۱۴ صفحہ کا رسالہ ہے جس میں ہندوستان کے مشہور اہل قلم جناب پرویز صاحب نے واقعات و دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو دُنیا کو

صلح و سلامتی اور امن

کا پیغام دیتا ہے اور آج مضطرب و بے چین دنیا کو جس تریاق کی تلاش ہے وہ صرف اسلام ہی کے دار الشفا سے تقسیم ہوتا ہے۔

تین پیسے کے محصول ڈاک ارسال کرنے پر رسالہ مفت ارسال کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام جید پریس بلی ماراں دہلی

تقریظات — ترجمان القرآن

مدیر اعلیٰ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سابق ایڈیٹر الجمعیۃ صفحات ۸۰ کتابت پسندیدہ وخوشنما کاغذ نفیس و اعلیٰ۔ قیمت سالانہ صہ رقی پرچہ ۸ر۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن دارالاسلام پٹھانکوٹ (پنجاب)

ترجمان القرآن ایک ماہانہ مجلہ ہے جو چھ سال سے مسلسل اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآن حکیم کی حکیمانہ دعوت کی نشر و تبلیغ کر رہا ہے۔ جن لوگوں کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے ان کے لئے بس یہ کہنا ہی کافی ہے کہ آپ ہی ترجمان القرآن کے مدیر اعلیٰ ہیں خدائے تعالیٰ نے مولانا موصوف کو اس زمانہ میں اسلام کی صحیح خدمت اور ملت کی تجدید کیلئے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے۔ اور وہ شرح صدر، وہ اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین دیا ہے جو مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کر کے قران کریم کی روشنی میں ہر مرض کا تریاق مہیا کرتا ہے۔ ترجمان القرآن کا موضوع قرآن حکیم ہے ایک طرف وہ کتاب الٰہی کی روشنی سے تاریک دلوں کو منور کر رہا ہے اور دوسری طرف فرنگی اور مغربی الحاد کے خلاف مسلسل جہاد کر کے مغربی فلسفہ کا رعب دلوں سے نکال رہا ہے۔

قرآن کریم کو منشاء الٰہی کے مطابق صحیح سمجھنا۔ صحیح اصولوں پر اسکی نشر و اشاعت کرنا اسلام کے خلاف باطل سرچشموں کا پتہ لگانا اور ان کو عقل سلیم کی حجت سے بند کرنا۔ اسلام کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی مخالفت سے مرعوب نہ ہونا۔ ذہنیتوں میں یکسر انقلاب پیدا کر دینا اور وقت کی مناسبت سے جملہ مشکلات کا حل قرآن کریم سے پیش کرنا۔ وغیرہ وہ خصوصیات ہیں جو بحمد اللہ رسالہ ترجمان القرآن کو حاصل ہیں ہندوستان میں آجکل سیاسیات کے نام پر مسلمانوں میں جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس سے غافل نہیں ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی بھی فرما رہے ہیں۔ اس رسالہ کا مطالعہ ہر خیال کے مسلمانوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔ خصوصاً ان تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کے لئے جو فلسفہ جدیدہ، سائنس اور مغربی حکماء کی دانش فروشیوں سے مرعوب ہو چکے ہیں اور جنہوں نے مذہب کو عقل و دانش اور ترقی کے خلاف سمجھ لیا ہے کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور اساتذہ کو اس رسالہ کا مطالعہ سب سے پہلے کرنا چاہیئے، بلحاظ

رفتار زمانہ

فلسطین

فلسطین کا معاملہ ہنوز روز اول ہے۔ اضطرابات، قتل و غارتگری، فوج اور عربوں کا تصادم بدستور جاری ہے عربوں کو پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کو گرفتار کر کے قید و بند میں ڈالا جاتا ہے ان کی املاک کو ضبط کیا جا رہا ہے ان سے تعزیری ٹیکس وصول کئے جا رہے ہیں ان کے مکانات کو ڈائنامیٹ سے اڑایا جا رہا ہے۔ ان کو مذہبی اوقاف کے مذہبی محکموں سے علیحدہ کر کے ان کی جگہ سرکاری آدمی مقرر کئے جاتے ہیں مسلمان عہدیداروں کو برطرف کیا جا رہا ہے اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو انسانیت اور تہذیب کے لئے ننگ و عار ہے۔

بیچارے عرب جن پر یہودیوں کو مسلط کر دیا گیا ہے سخت پریشان اور مجبور ہیں اور وہ "مرتا کیا نہ کرتا" کی مثل کے مطابق مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو گئے ہیں چنانچہ ان کا ہر روز برطانی فوج کے ساتھ تصادم ہوتا ہے طرفین سے گولیاں چلائی جا رہی ہیں۔ بم کے گولے برسائے جا رہے ہیں اور ہوائی جہازوں سے بمباری کر کے عربوں کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے اس مہینہ میں فلسطین کی حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فلسطین کے وسیع رقبہ پر فوج اور ہوائی جہازوں کی طاقت سے قبضہ کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ تمام ملک میں فوج پھیل گئی ہے اور یہ امید کیجا رہی ہے کہ ان تمام عربوں کو جو حکومت کی نظر میں باغی کہلاتے ہیں زور و طاقت سے زیر کر لیا جائے گا۔ عربوں کے سامان رسد کو روکنے کے لئے پولیس اور فوج کو سمریہ اور گلیلی کے علاقہ میں متعین کر دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اطالوی حکومت جو فلسطین کے معاملات سے خاص دلچسپی لے رہی تھی اور تقسیم کے خلاف آواز بلند کر رہی تھی وہ اب بالکل خاموش ہے؛

واقعہ یہ ہے کہ برطانی اطالوی معاہدہ میں جو حال ہی میں منعقد ہوا ہے۔ یہ طے ہو چکا ہے کہ اٹلی تقسیم فلسطین کی مخالفت نہیں کریگا اور حکومت برطانیہ اس سلسلہ میں جب کبھی کوئی تجویز مجلس اقوام میں پیش کریگی، اٹلی اس کی پرزور حمایت کریگا۔

یہی وجہ ہے کہ یہودی قوم اس معاہدہ سے بہت خوش ہے چنانچہ ایک یہودی اخبار لکھتا ہے کہ یہودیوں کی رائے عامہ نے لندن اور روم کے مابین اتحاد کا خوشی و گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے کیونکہ یہودیوں کو امید ہے کہ یہودی عزائم کو بروئے کار آنے سے جو چیز سب سے زیادہ روک تھی وہ اس معاہدہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اب آئندہ یہودی اپنے ارادوں کو آسانی کیساتھ پایۂ تکمیل تک پہونچا سکیں گے۔

عربوں کو یہ حالات معلوم ہیں اور ان کو اپنا مستقبل صاف نظر آرہا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ فلسطین کی تقسیم سے برطانیہ کا مقصد کیا ہے اور اس پردہ میں عربوں کو کس طرح فنا کیا جارہا ہے چنانچہ وہ بھی اپنی جگہ مختلف تجاویز پر غور کر رہے ہیں۔ مگر مظلوموں اور محکوموں کی تجاویز کیا اور ان پر عمل درآمد کیسا؟ تاہم فلسطین کے چند سرکردہ عربوں نے مسٹر چیمبرلین کو ایک یادداشت بھیجی ہے جس میں لکھا ہے کہ وہ یہودی لیڈر ڈاکٹر وزمین پر اس بات کا زور ڈالیں کہ وہ یہودیوں اور عربوں کی گفت و شنید میں ضرور شریک ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مصالحت کی بنا یہی ہو سکتی ہے کہ فلسطین میں عرب سلطنت قائم کی جائے اور اس میں یہودیوں کو اقلیتوں کے حقوق حاصل ہوں۔

چند روز کے اندر اندر حکومت برطانیہ کے نام دو بڑی شخصیتوں نے فلسطین کے بارے میں جو مکتوب ارسال کئے ہیں ان کو سیاسی حلقوں میں خاص اہمیت دیجارہی ہے۔ ایک مکتوب امام یمن کا ہے جو ملک معظم کی حکومت کے نام بھیجا گیا ہے۔ دوسرا مکتوب شیخ المصطفےٰ المراغی شیخ الازہر کا ہے جو وزیر اعظم مصر کے نام ارسال کیا گیا ہے۔ ہم یہاں دونوں مکتوبوں کا خلاصہ درج کرتے ہیں امام یمن اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:۔

فلسطین کا معاملہ عالم اسلامی کے لئے تمام امور سے زیادہ اہم ہے سب سے پہلے یہ واضح

کردینا ضروری ہے کہ حکومت ا مام یمن ان تمام نتائج اور ضروریات سے باخبر ہے جن کی بنا پر دولت برطانیہ فلسطین کو اپنے اقتدار میں رکھنا چاہتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ اپنی نوآبادیات سے علاقہ مواصلات قائم رکھنے کے لئے فلسطین کو محفوظ اراستہ بنانے کی زبردست خواہش رکھتی ہے لیکن ان تمام ضروریات کے مقابلہ میں بھی میرا اعتقاد ہے کہ حکومت کو عربوں کے جذبات وعواطف کا احترام کرنا پڑے گا۔ فلسطین بہرحال عربوں کا وطن ہے ایسا وطن جہاں صدیوں تک انہوں نے اسلامی شان وشوکت کے ساتھ جہانبانی کی ہے۔ ہم اس بات کو قرین انصاف سمجھتے ہیں کہ فلسطین کے مسلمان اور عیسائی۔ برطانیہ سے مصر اور عراق کی طرح ایک معاہدہ کرلیں۔ اب رہا فلسطین میں باہر سے آنے والے یہودیوں کا معاملہ تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اور عیسائی شریفانہ جذبات کی بنا پر ان یہودیوں کو برطانیہ کی حمایت میں تسلیم کریں گے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہودی ہاجرت کی ایک حد مقرر کردی جائے

حکومت یمن یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہے کہ عربوں کو فلسطین سے جلا وطن کرکے اور دنیا کے تمام مسلمانوں اور عیسائیوں کے جذبات کو ٹھکرا کر یہودیوں کو فلسطین میں بسانا اور ان کی حکومت قائم کرنا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ فسادات اور ایک نہ ختم ہونے والا ہنگامہ قتل وغارت کے سوا کچھ پیدا نہیں کرسکتا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اسلام کی یہ توہین کی گئی تو باقی دنیا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ ہماری خواہش ہے کہ حضارت وتمدن کی حامی حکومت برطانیہ تاریخ عالم کے اس صفحہ کو اپنے ہاتھ سے نہ لکھے۔

وزیر اعظم مصر کے نام شیخ ازہر کا مکتوب اور اس کا جواب حسب ذیل ہے۔

فلسطین کا معاملہ طویل سے طویل ہوتا جارہا ہے یہ مسئلہ فلسطین والوں کے لئے وطنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا دینی مسئلہ ہے اور مسجد اقصیٰ اور اس کی حرمت کی حفاظت تمام مسلمانوں کا دینی وملی فریضہ ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کے تمام مسلمانوں پر مسجد اقصیٰ کی اس بےحرمتی کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کا حل کرنا انسانیت اور انسانی تمدن کی سب سے بڑی

خدمت ہے۔ اور برطانی حکومت کا فریضہ ہے کہ فلسطین والوں کو ان کے وطنی حقوق کیطرف سے مطمئن کرے۔

اس کے جواب میں وزیراعظم مصر نے جو مکتوب ارسال کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ حکومت مصر اس قضیہ کو حل کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش عمل میں لائے گی۔ مصر ہمیشہ سے یہ کوشش کر رہا ہے کہ اس مسئلہ کا ایسا حل دریافت کیا جائے جو اہل فلسطین کے لئے قابل قبول ہو۔ میں یقیناً انشاء اللہ اس مسئلہ میں دخل دوں گا۔ کہ خون ریزی کا یہ دور ختم ہو جائے۔ مجھ پر انسانیت اور جوار دونوں کے علاوہ مذہبی فرض بھی عائد ہوتا ہے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ میری کوششوں کو کامیاب کرے۔

ترکی

حکومت ترکیہ کی سیاست میں جو اہم واقعہ رونما ہوا ہے وہ اسکندرونہ کے انتخابات ہیں جس میں ترکوں کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور عربوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

اسکندرونہ اور انطاکیہ حکومت شام کی زیر سیادت تھے اور چونکہ آبادی کے لحاظ سے عربوں کو عددی کثرت حاصل تھی اس لئے ان پر ان کی سیادت حق بجانب بھی تھی مگر ترکوں نے معاہدہ لوزان کی بعض دفعات کی تشریح کرتے ہوئے اسکندرونہ پر اپنا حق ظاہر کیا اور اس پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مگر چونکہ شام ابھی تک فرانس کے زیر اثر ہے اور اسکی آزادی صرف نام کی آزادی ہے اس لئے ترکوں کی مداخلت پر فرانس نے زبردست احتجاج کیا اور عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکا کر اپنا مطلب نکالنا چاہا مگر ترک نہ فرانس سے مرعوب ہوئے اور نہ عربوں کے احتجاج سے متاثر۔ انہوں نے اسکندرونہ پر اپنی افواج بھیجدیں اور معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا۔ ترکوں اور عربوں میں تصادم بھی ہوئے اور بہت سے عرب اور ترک ایک دوسرے کے ہاتھ سے مارے گئے ترکی اخبارات نے اس دوران میں فرانس اور جمعیتہ اقوام کے خلاف سخت اور شدید مضامین لکھے اور فرانس کو متنبہ کر دیا کہ اگر وہ اپنی شرارت سے باز نہ آئیگا

تو ترکوں کو مجبوراً میدان میں آنا پڑے گا۔ آخر خدا خدا کر کے جمیعتہ اقوام کی مداخلت سے اسکندرونہ پر ترکوں کا حق سیادت تسلیم کر لیا گیا

مگر اب انتخابات کے سلسلہ میں اسکندرونہ اور انطاکیہ میں پھر گڑبڑ ہوگئی ہے اور ترکوں نے مسلح کاروں اور ٹینکوں کے ذریعہ انطاکیہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس مظاہرہ میں ایک بم بھی پھٹا جس سے ایک عورت ہلاک اور ایک مکان منہدم ہو گیا اس سلسلہ میں عربی اخبارات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلح ترکوں کے ہاتھوں چار اشخاص اور ہلاک ہو گئے۔ ترکی حکام نے شہر میں مسلح فوج متعین کر دی ہے اور اسکندرونہ میں مارشل لا جاری کر دیا ہے۔

آجکل ترکی حکومت بحری اور ہوائی جہازوں کو ترقی دینے کے مسئلے پر بہت زیادہ غور کر رہی ہے۔ ترکی کارخانوں میں بحری جہاز اور آبدوز کشتیاں تعمیر ہو رہی ہیں اور ہوائی جہازوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گذشتہ کئی ماہ سے ترکی حکومت نے اپنے بحری پروگرام کے مطابق جنگی جہازوں کی سیاحت کا بھی انتظام کیا ہے چنانچہ ۸ر جون کو مشہور جہاز حمیدیہ آٹھ سو ترکی بحری افسروں کو لیکر دنیا کی سیاحت کے لئے روانہ ہوا اور ۱۶ر جون کو اسکندریہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ حکومت مصر نے سرکاری طور پر اس کا استقبال کیا۔ یہ جہاز اسکندریہ میں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد یورپ، امریکہ، افریقہ، جاپان اور ہندوستان کی مختلف بندرگاہوں کی سیاحت کے لئے روانہ ہو جائے گا۔

ترکی پارلیمنٹ نے اسلحہ اور ہوائی بیڑہ میں اضافہ کے لئے ۱۲ لاکھ پونڈ کی منظوری دیکر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ ترکی حکومت بھی یورپ کی تیاریوں سے غافل نہیں ہے چنانچہ ترکی وزیر جنگ نے اپنی ایک تقریر میں یہ بھی کہدیا ہے کہ اس وقت ترکی حکومت کی قوت مدافعت دنیا کی کسی حکومت سے کم نہیں ہے۔

ٹیونس

ٹیونس اور مراکش کے عربوں پر فرانس کے مظالم روز بڑھتے جا رہے ہیں۔ خرابی یہ ہے

کہ وہاں کے عربوں میں حکومت خود اختیاری اور آزادی کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے اور فرانس تمام چیزیں برداشت کرسکتا ہے۔ مگر مذہبی اور قومی شعور کی بیداری کو برداشت نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں فوج اور عربوں میں آئے دن تصادم ہوتا رہتا ہے۔ جس میں حکومت کا تو کچھ نہیں بگڑتا بیچارے عرب ہی جان و مال کا نقصان برداشت کررہے ہیں۔

طنجہ کا اخبار کوکب آخری تصادم کی تفصیلات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے کہ سبز پوش عربوں کی جماعت کو فرانس نے جب خلاف قانون قرار دیدیا تو تمام عربوں میں سخت اضطراب پھیل گیا اور ان کا ایک بڑا گروہ ریذیڈنٹ جنرل کی کوٹھی پر جمع ہوگیا اگرچہ اس طرح کا اجتماع قریب قریب ناممکن تھا مگر سبز پوشوں نے یہ ترکیب کی کہ دو دو چار چار کرکے قصر حکومت کی طرف گئے اور جب تقریباً تین ہزار عرب جمع ہوگئے تو محافظ فوج کو خبر ہوئی اور اس نے موقعہ پر آکر ان کو منتشر کرنا چاہا مگر وہ یلغار کرکے گورنمنٹ ہاؤس میں گھس گئے اور ریذیڈنٹ جنرل کو تلاش کرنے لگے۔ اتفاق سے ریذیڈنٹ ہاؤس میں موجود نہ تھے ورنہ ان کی جان کو سخت اندیشہ تھا۔ اس عرصہ میں فوج نے ان کو منتشر کرنا چاہا مگر وہ منتشر نہ ہوئے اور کمانڈنگ افسر کی ہدایت پر ان پر حملہ کیا گیا جس میں ۳۷ عرب شہید اور ۱۵۰ زخمی ہوئے۔

تیونس کے فرانسیسی حکام زعماء عرب کو گرفتار کرکے طویل سزائیں دیرہے ہیں تاکہ تحریک آزادی سرد پڑجائے۔ عربوں کے لئے ایک نیا جیل تعمیر کیا گیا ہے جس میں ۴۴۰ بے گناہ عربوں کو محبوس کردیا گیا ہے۔ طنجہ۔ دار بیضا اور دیگر مقامات کے ۱۰۱ عربوں کو شبہ کی علت میں گرفتار کرکے مختلف میعاد کی سزائیں دیدی گئی ہیں۔ جن کی مجموعی مدت ۶۹ سال ہوتی ہے اور ساتھ ہی مختلف مقدار میں جرمانے بھی کئے گئے ہیں جن کی مجموعی رقم بیس ہزار فرانک ہوتی ہے۔ غرض الجزائر کی حالت سخت ناگفتہ بہ ہے ایک طرف فرانس نے عربوں کو فنا کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ دوسری طرف عربوں نے آزادی حاصل کرنے

کی قسم کھائی ہے اب فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔

مصر

انتخابات کے بعد آجکل مصر میں مصری شاہزادی فوزیہ (جو شاہ فاروق والئی مصر کی ہمشیرہ ہیں) اور ایرانی شاہزادہ شاپور کی شادی دلچسپ موضوع بنی ہوئی ہے گو سرکاری طور پر اس نسبت کی تصدیق کردی گئی ہے۔ مگر مصر کے بعض علماء اہل سنت نے اس نسبت پر اعتراض کیا ہے کہ شاہزادہ شیعہ مذہب رکھتا ہے۔ لیکن اس کو زیادہ نمایاں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شاہزادہ اور ان کے والد شاہ پہلوی عملاً شیعہ نہیں ہیں رضا شاہ نے ایران میں مجالس ماتم اور تبرا بند کر دیا ہے اور فقہ حنفی کے مطابق تعلیم کا نظام مقرر کر دیا ہے۔ ولی عہد ایران نہایت حسین و شکیل نوجوان اور کئی زبانوں کے ماہر ہیں شاہزادی فوزیہ جو گیسو دراز شہزادی کہلاتی ہیں اعلیٰ سیرت اور پختہ کیرکٹر میں مشہور ہیں۔

ضروری اطلاع

کتاب "معارف القرآن" ماہ جون کے پرچہ سے مسلسل شائع ہو رہی ہے جون کے پرچہ میں اس کا مفصل و مبسوط مقدمہ درج ہوا تھا۔ وہ پرچہ دفتر میں ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ان خریدار حضرات کی خاطر جو معارف القرآن کا مکمل فائل رکھنا چاہیں۔ اس مقدمہ کی الگ کاپیاں چھپوالی گئی ہیں۔ جو طلب فرمانے پر ارسال کر دی جائیں گی۔ منیجر طلوع اسلام دہلی

معارف القرآن

اِلٰہ

آپ تاریخ انسانی کے کسی دَور میں سے گزریئے اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نگہ ڈالیئے ایک چیز آپ کو بلا لحاظِ زمان و مکان تمام نوع انسانی کے اندر مشترک نظر آئے گی یعنی کسی بلند و بالا تر ہستی کا تصور، کسی مافوق البشر ذات کے وجود کا احساس۔ آپ دُنیا کے کسی ایسے جزیرہ میں چلے جائیے جہاں اِس سے پیشتر بیرونی حصۂ زمین کے کسی انسان کا قدم نہ پڑا ہو۔ وہاں بھی اگر دو چار انسان بستے ہونگے تو آپ دیکھیں گے کہ اُن کی زندگی کا خواہ ہر ایک پہلو دوسرے عالم انسانیت سے مختلف ہو لیکن اس قدرِ مشترک میں وہ بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ ہونگے۔ انھوں نے بھی کچھ نہ کچھ تجویز کر رکھا ہوگا۔ جسکے سامنے وہ جھکتے ہونگے جسے وہ اپنے سے بُلند و بالا تر قوتوں والا سمجھتے ہونگے۔ اس اجمال کی تفصیل تو ہم "دین فطرت" کے عنوان میں بیان کریں گے۔ یہاں اتنا اشارہ ہی کافی ہے اس اعلیٰ و ارفع ہستی کو جس کا احساس وجدانی طور پر فطرت انسانی کے اندر موجود ہے اِلٰہ کہا گیا ہے یعنی وہ ذات جس کی عبادت کی جائے، جسکے سامنے جُھکا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ احساس فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے تو اس سے مفہوم بھی خالق فطرت کا تصور ہونا چاہیئے لیکن جس طرح گوناگوں اسباب و اثرات، فطرتِ انسانی پر قسم قسم کے پردے ڈال کر اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں، اسی طرح اِلٰہ کا یہ فطری تصور بھی رنگا رنگ کے پردوں اور قسم قسم کے لباسوں میں گم ہوکر کہیں کے کہیں پہنچتا رہا ہے۔ حتے کہ بعض اوقات فطرت

حیوانِ خارجی پردوں کے نیچے کچھ اس انداز سے دَب جاتی ہے کہ اس کی آواز بھی باہر نہیں آسکتی اور یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان کسی ایسی ذات کے وجود سے بھی انکار کر بیٹھتا ہے. فطرتِ صالحہ کو اِن خارجی پردوں سے بے نقاب کرنے کے لیئے. اسے بیرونی اثرات کے طوق و سلاسل سے آزاد کرنے کے لیئے. وقتاً فوقتاً خدا کیطرف سے آسمانی ہدایت آتی رہی. جو سچ کو جھوٹ سے. حقیقت کو فریب سے. حق کو باطل سے، اصل کو نقل سے الگ کرکے. نکھار کر. انسانوں کے سامنے رکھتی رہی تاکہ اُنہیں معلوم ہو جائے کہ وہ حقیقی الٰہ جس کا احساس فطرتی طور پر اُنکے اندر موجود ہے. کون ہے اور کیسا ہے لیکن محسوسات کا خوگر انسان تھوڑے ہی وقت میں اس حقیقت مجردہ کو بُھلا دیتا تھا. اور الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں مجازی رنگ آمیزی کر دیتا تھا. کبھی وہ جن چیزوں سے ڈرتا. انہیں اپنا معبود بنا لیتا. کبھی جنکے ساتھ کچھ توقعات وابستہ کرتا. انہیں اِلٰہ تصور کر لیتا. پھر ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدس کے لحاظ سے اُنکے مجسمے کھڑے کرتا. بُت تراشتا. یہ مختلف دیوی. دیوتا. یہ اندر. اگنی. سُورج. چاند. گنگا. جمنا. شیر. سانپ. گائے. بیل. بڑ. پیپل. سب اسی جذبۂ خوف و اُمید کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں، جس سے خوف پیدا ہوا اُسکے سامنے جُھک گئے. جس سے کچھ اُمیدیں وابستہ ہوئیں. اسکے حضور سرنگوں ہو گئے لیکن یہ سب کچھ اس فطرتِ صالحہ کے خلاف تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اِس لیئے کہ انسان کو تو پیدا ہی اِس لیئے کیا گیا تھا کہ وہ فطرت کی ان تمام چیزوں سے کام لے. اُن کو تابع فرمان بنائے. اُنکو مسخر کرے. اُن پر حکومت کرے. یہ سمندروں کی شورانگیزیاں. یہ پہاڑوں کی گراں سامانیاں، یہ تحت الثریٰ کی آتش فشانیاں، یہ اوجِ ثریا کی طلعت آفرینیاں. یہ خوفناک صحراؤں کی بربریت یہ ہولناک جنگلوں کی سبعیت. یہ دریاؤں کی وحشت خیز روانیاں، یہ ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں. یہ زمین یہ آسمان، یہ چاند. یہ سورج یہ ستارے، سب اُسکے

سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ سب اسکے خدمتگزار ہوں۔ اور یہ انکا مخدوم ہو جب حقیقت یہ ہو تو پھر ان چیزوں کے سامنے جھکنا کیسا۔ ان کو اِلٰہ بنانا کہاں کا۔ انہی غیر فطری تصورات کو مٹانے کے لیئے خدا کیطرف سے ہدایت آتی رہی اور انسان کو بتاتی رہی کہ اِلٰہ بننے کے لائق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو ان تمام سے بلند و بالاتر ہو۔ جو اس تمام نظام کائنات کی مالک و مختار ہو۔ اور وہ ذات خدا کی ذات ہے یہی تعلیم سب سے پہلی بار خدا کیطرف سے آئی اور یہی سب سے آخر، چنانچہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیئے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم جو اولیں پیغام نوع انسانی کو دینا چاہتا ہے وہ لا اِلٰہ اِلّا اللہ ہے۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی۔ یعنی اس امر کا یقین۔ اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جسکے سامنے جھکا جائے جس کی غلامی اختیار کیجائے۔ جسے آقا تسلیم کیا جائے۔ جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے یعنے جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہو اُسے مٹا دینا ہوگا۔ بھلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی۔ پھر ایجابی پہلو آئے گا۔ تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے جسکے سامنے جھکنا زیبا ہے۔ اور جسے اللہ کہتے ہیں۔ تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہ راست تعلق پیدا کر دینا۔ یہ ہے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم اور چونکہ قرآن کریم کی اصولی تعلیم کوئی نئی تعلیم نہیں بلکہ وہی پیغام ازلی ہے جو حضرات انبیاء کرام علیہم کی وساطت سے دنیا کو ملتا رہا ہے۔ اس لیئے اس سلسلہ رشد و ہدایت کی شروع سے یہی تعلیم رہی ہے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے یہی تعلیم پیش کی۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

اس لیے کہ انہیں بارگہ صمدیت سے جلوہ گاہ طور پر یہی ارشاد ہوا تھا

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ

یقیناً میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی اور الہٰ نہیں پس میری ہی عبادت کرو

اور مجھے یاد کرنے کے لیے نماز قایم کرو ۲۰/۱۴

(عبادت اور صلوٰۃ کی تشریح متعلقہ عنوانوں میں ملے گی)

اور یہی تعلیم حضرت عیسےٰؑ کی تھی جس کا اقرار وہ خدا کے حضور کرینگے۔ فرمایا:۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰـہَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ قَالَ سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ

جب اللہ کہے گا کہ اے عیسےٰ بن مریمؑ کیا تمنے ان لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ معبود قرار دے لو۔ تو وہ کہے گا کہ (معاذاللہ) میں تجھے (شرک سے) پاک سمجھتا ہوں یہ میرے لیئے کب زیبا تھا کہ میں ایسی بات کہتا جسکے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ اگر مینے کہا ہو گا تو تجھے اسکا (یقیناً) علم ہو گا۔ تو تو میرے دل کی بات بھی جانتا ہے اور جو کچھ تیرے علم میں ہے میں اُسے نہیں جانتا تو سب غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے ۵/۱۱۶

اور یہی تعلیم محفوظ اور مکمل شکل میں نبی کریم صلعم کی وساطت سے تمام نوع انسانی تک پہنچا دی گئی فرمایا

اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی قُلْ لَّآ اَشْھَدُ قُلْ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ

کیا تم (سچ مچ) اِس امر کی شہادت دیتے ہو (یقین رکھتے ہو) کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں۔ کہو کہ میں تو ایسی شہادت نہیں دیتا۔ کہو کہ وہ تو ایک الٰہ ہے اور میں یقیناً تمہارے شرک سے بری ہوں ۶/۱۹

سورۂ توبہ میں ہے کہ :۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ

اگر یہ لوگ اعراض کریں تو کہہ دیجئے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے اسکے سوا کوئی دوسرا الہٰ نہیں میں اُسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ ۹/۱۲۹

سورۂ رعد میں ہے :۔

قُلْ ھُوَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ مَتَابِ

کہو کہ وہ میرا رب ہے اُسکے سوا کوئی اور معبود نہیں اُسی پر بھروسہ ہے اور اسی کی طرف رجوع کرنا۔ ۱۳/۳۰

یہ تعلیم بذریعہ وحی نازل ہوئی تھی :۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

کہو کہ مجھ پر تو یہ وحی ہوئی ہے کہ یقیناً تمہارا معبود (وہ) الہ واحد ہے۔ تو کیا تم اُسکے سامنے جھکتے ہو یا نہیں! ۲۱/۱۰۸

اس وحی کا دوسری جگہ یوں ذکر ہے :۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ

کہو کہ میں تو یقیناً تمہارے جیسا ایک انسان ہوں مجھ پر یہ وحی ہوئی ہے کہ یقیناً تمہارا معبود وہی الہ واحد ہے ۱۸/۱۱۰

پھر فرمایا :۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ

کہیے کہ میں تو صرف ایک آگاہ کرنیوالا ہوں اور اللہ واحد قہار کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے ۳۸/۶۵

اسی تعلیم پر ان الفاظ میں زور دیا گیا ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ

پس یاد رکھو کہ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۔ ۴۷/۱۹

دوسری جگہ ہے ۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

اللہ وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور ایمان رکھنے والے اللہ پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں ۱۳/۶۴

یہ تو الگ الگ رسولوں کا ذکر تھا مجموعی طور پر فرمایا :۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا جس پر یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور الٰہ نہیں پس میری ہی عبودیت اختیار کرو ۲۵/۲۱

اس سے معلوم ہو گیا کہ جو تعلیم سلسلہ انبیاء کرامؑ کی وساطت سے خدا کی طرف سے ملتی رہی وہ اُسی ایک الٰہ کی پرستش کی تعلیم تھی ۔ جہاں جہاں اس تعلیم میں خرابیاں واقع ہوئی ہیں وہ سب انسانی دماغوں کا نتیجہ ہیں ۔ ورنہ صحیح خدا کی تعلیم تو وہی تھی جو فطرت انسانی کے مطابق تھی، وہ تعلیم کہ جس کے حقیقت ثابت ہونے پر خود خدا شاہد ہے اُسکے فرشتے شاہد ہیں ہر وہ صاحب علم شاہد ہے جس کی فطرت صالحہ اعتدال کے نقطہ پر ہے ۔

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ

اللہ اس پر شاہد ہے کہ اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ملائکہ اور صاحبانِ علم جو عدل پر قایم ہیں اسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ زبردست حکمت والا ہے ۳/۱۸

انہی کے متعلق دوسری جگہ ہے ۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا اِنَّ اِلٰـہَکُمْ لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ

قسم ہے ان فرشتوں کی (یا وہ فرشتے شاہد ہیں) جو صف بستہ ہوتے ہیں پھر

وہ جو بندش کرنیوالے ہیں پھر وہ جو ذکر کی تلاوت کرتے ہیں کہ تمہارا معبود برحق ایک ہے آسمانوں اور زمین کا
اور جو کچھ اُنکے درمیان ہے انکا پروردگار اور طلوع کے مواقع کا رب ۳۷/۱-۵ +

چونکہ جو تعلیم فطرتِ انسانی کے مطابق ہوگی اُسکا اعتدال پر ہونا لازمی ہے۔ اس لیئے توحید کی تعلیم کے شاہد بھی وہ حضرات ہونگے جو ایک طرف علم رکھتے ہونگے اور پھر افراط و تفریط سے بچ کر نقطۂ اعتدال پر قایم ہونگے۔ علم اور اعتدال ان دو لفظوں کے اندر رموزِ کائنات کی تمام حقیقتیں سمیٹ کر رکھ دی ہیں ان کی تشریح اپنے اپنے مقام پر ملے گی۔ یہاں صرف اتنا ہی دیکھنا ہے کہ علم اور عدل کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ کو الٰہ ملنے اور بس۔ یہی اسلام ہے یعنی خدا کا ازلی پیغام۔ آل عمران کی آیت مذکورہ صدر سے اگلی آیت ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۝

دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے ۳/۱۸

اور یہ اسلام آج دُنیا میں صرف قرآن کریم کے اندر موجود ہے اُسکے باہر اور کہیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں اس لیئے کہ جیسا آئندہ چل کر معلوم ہوگا۔ دُنیا کی ہر قوم نے اس پیغام ازلی میں ذہن انسانی کی اختراعات اور تحریفات کی آمیزش کر ڈالی اور شمع کی صاف روشنی فانوسوں کے رنگ میں گم ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصور کہ وہ الٰہ کیسا ہے۔ آپ کو اپنی منزہ شکل میں صرف قرآن کریم کے اندر مل سکے گا وہ الٰہ جسکے متعلق فرمایا:-

وَاِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝

اور تمہارا الٰہ وہ الٰہ واحد ہے۔ اسکے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اور وہ رحمٰن اور رحیم ہے[ل] ۲/۱۶۳

ل یہ شمار صفات الٰہی کے ہیں ۱۲

رحمتوں اور عنایتوں کا بادشاہ۔ لطف وکرم کرنیوالا خدا۔ وہ خدا جسکے متعلق ارشاد ہے:۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ

(ترجمہ)

اللہ وہ ہے کہ جسکے سوا کوئی الہٰ نہیں۔ غیب وشہادت (حاضر و غائب) کا جاننے والا (۲) وہ رحمٰن ورحیم۔ اللہ وہ ہے جسکے سوا کوئی الہٰ نہیں۔ وہ شہنشاہ حقیقی (۳) قدوس (ہر عیب سے پاکیزہ (۴) سلامتی والا (۵) امن دینے والا (۶) نگہبان (۷) غالب (۸) زبردست (۹) بڑی عظمت والا (۱۰) اللہ لوگوں کے شرک سے پاک ہے (۱۱) وہ اللہ جو پیدا کرنیوالا ہے (۱۲) ٹھیک ٹھیک بنانیوالا ہے (۱۳) صورت گر (بہترین ہیئت کذائی عطا کرنیوالا (۱۴) سب اچھے اچھے نام (تمام عمدہ صفات) اسی کے لیے ہیں (۱۵) زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں (۱۶) اور زبردست حکمت والا ہے $\frac{59}{24-22}$

وہ الہٰ جس کی صفات یہ ہیں:۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

(۱۷) اللہ وہ ہے جسکے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ زندہ۔ (۱۸) قایم (۱۹) سب کو قایم رکھنے والا
نہ اُسے اونگھ دبا سکتی ہے نہ نیند (۲۰) زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اسیکا
ہے (۲۱) ایسا کون ہے جو اُسکے حضور (کسی کی) سفارش کر سکے بغیر اس کی اجازت
کے (۲۲) وہ تمام حاضر و غائب حالات کو جانتا ہے (۲۳) اور (انسان یا تمام
موجوداتِ کائنات) اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ مگر جتنا کچھ
وہ چاہے (۲۴) اس کا علم و قدرت آسمانوں اور زمین کو محیط ہے (۲۵) اور
ان کی نگہبانی اس پر کچھ بھی گراں نہیں گزرتی (۲۶) اور وہ بلند و بالاتر
عظیم المرتبت ہے (۲۷) ۲/۲۵۵

ایک زندہ اور پائندہ خدا۔ جیتا جاگتا۔ ازلی و ابدی۔ قایم و دایم۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

اللہ وہ ہے جسکے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ حیّ و قیوم ہے ۳/۲

انسان معبود اس کو بناتا ہے جسکے متعلق سمجھتا ہے کہ اُسکے اختیار میں کچھ قوتیں ہیں لیکن یہ
غلط ہے۔ واہمہ ہے۔ سب کچھ اسی ایک الٰہ کے قبضۂ قدرت میں ہے فرمایا

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ

کہو کہ کبھی تم نے اسپر بھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہاری سماعت اور بصارت کو چھین لے
تمہارے دلوں پر مُہر لگا دے۔ تو اللہ کے سوا کون ایسا معبود ہے جو تمہیں یہ پھیر دیدے (۲۸)
دیکھو ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں پھر بھی یہ لوگ
اعراض کرتے ہیں ۶/۴۶

شرک کرنے والوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جو مادہ کو قدیم مانتا ہے اُنکے نزدیک بات
محال ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے یعنی پہلے بالکل نہ ہو اور پھر پیدا ہو جائے

اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یہ مادی کائنات بھی خدا کی طرح قدیم ہے صرف مادے میں تغیرات (مثلاً بیج سے درخت بنجانا) ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب غلط فہمیاں اس بنا پر پیدا ہوتی ہیں کہ انسان خدا کو بھی اپنے جیسا سمجھ لیتا ہے اس کی صفات کو انسانی صفات کے مطابق خیال کرتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھتا جب اُسنے دیکھا کہ انسان میں یہ قدرت نہیں کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں لے آئے۔ لہٰذا تو یہ عقیدہ قایم کر بیٹھا کہ روح۔ مادّہ اور خدا تینوں ازلی اور ابدی ہیں۔ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اُنکے نزدیک مادے کے بغیر خدا ایسا ہی بیکار رہے جیسا مٹی کے بغیر کمہار، رنگوں کے بغیر مصوّر۔ اس باطل عقیدہ کی تردید بھی بیّن الفاظ میں کر دی جیسے فرمایا کہ خدا وہ ہے جو:۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

آسمانوں اور زمین (اس تمام کائنات) کا موجد ہے (۲۹) بدیع ہے (ایسا ہے جو ان کو عدم سے وجود میں لایا ہے) اور اُسکے اولاد کیسے ہوسکتی ہے (۳۰) حالانکہ اُس کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے (۳۱) اور اُسنے ہر شئے کو پیدا کیا ہے، (۳۲) اور اس کو ہر شئے کا علم ہے (۳۳) یہ ہے تمہارا رَب اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں ہر شئی کا پیدا کرنے والا پس اُسی کی عبودیت اختیار کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے (۳۴) اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی (ادراک نہیں کرسکتی) لیکن وہ سب نگاہوں کو محیط ہے (۳۵) اور وہ بڑا باریک بین باخبر ہے ۶/ ۱۰۲-۱۰۴

بدیع ہے چیزوں کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے۔ چونکہ انسان نے اُسے اپنے جیسا سمجھ رکھا تھا اس لیے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمادی کہ اسکے اولاد ہوسکتی ہے یعنی عیسائیوں کا عقیدہ

الہیت (حضرت مسیحؑ کا خدا کا بیٹا ہونا) اور ہندوؤں کا عقیدہ کہ فلاں دیوتا فلاں خدا کا بیٹا ہے۔ سب اس سے باطل ہوگئے اس کو کوئی نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ احاطہ نہیں کر سکتی۔ ادراک نہیں کر سکتی۔ چہ جائیکہ وہ مجسم انسان کی شکل ہیں۔ یا شیر اور کچھوے کے روپ میں دنیا میں آجائے۔ اوتار کے عقیدہ کا اس سے ابطال ہوگیا۔ الوہیتِ مسیح کا انکار ہوگیا +

وہ الٰہ جس کے متعلق فرمایا۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ

خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ

ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۲۷
۶۴-۶۰

(ترجمہ)

آیا کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور تمہارے لیے بلندیوں سے

پانی برسایا اور پھر اس (پانی) کے ذریعے ہم نے رونق دار باغات اگائے تم سے تو ممکن نہ تھا کہ ان باغات کے درختوں کو اگا سکو (۳۷) تو کیا اللہ کے ساتھ (کوئی) اور بھی الہ ہے! مگر یہ لوگ پھر بھی راہ راست سے پھر جاتے ہیں +
وہ کون ہے جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اسکے درمیان نہریں بنائیں اور ان کے لیئے پہاڑ کھڑے کیئے۔ اور دو دریاؤں (یا سمندروں) کے درمیان حدِّ فاصل ٹھہرائی۔ تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے! لیکن اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔ (۳۸) وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعاؤں کو سنتا ہے۔ جب وہ اُسے پکارتا ہے اور اسکی مصیبت کو دور کر دیتا ہے (۳۹) اور تم کو زمین میں بادشاہ (جانشین) بناتا ہے، (۴۰) کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے! بہت تھوڑے ہیں جو (فطرت کی اس آواز کو) یاد رکھتے ہیں وہ کون ہے جو خشکی اور دریاؤں کے اندھیروں میں تمہاری راہ نمائی کرتا ہے، جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے۔ جو بارش سے پہلے (اس مژدہ جانفزا سے) دلوں کو خوش کر دیتی ہیں (۴۱) کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی الہ ہے! اللہ ان لوگوں کے شرک سے بلند ہے +

وہ کون ہے جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے (مبدا) اور پھر اس کو دوبارہ زندہ کرے گا (معاد) (۴۲) اور وہ کون ہے جو تمہیں پستیوں اور بلندیوں سے رزق بہم پہنچاتا ہے (۴۳) کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے! کہو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو $\frac{۲۷}{۶۴-۶۰}$

یہ چیز کسی دوسری جگہ آئے گی کہ قرآن کریم نے جس قدر خدا کی صفات کا ذکر کیا ہے ان میں ایک طرف تو خدا کے متعلق صحیح صحیح تصور ذہن انسان میں قایم کرنا مقصود ہے اور دوسری

طرف دوسرے لوگوں کے کسی نہ کسی غلط عقیدہ کی تردید بھی مطلوب ہے اگر آپ کے سامنے مذاہب عالم کی تاریخ یا انکے مختلف عقائد کی تفصیل ہو تو آپ ہر ایک آیت میں خود بخود دیکھتے جائینگے کہ قرآن کریم کس طرح ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے میں تمام ادیان عالم کے غلط تصورات کی اصلاح کرتا جاتا ہے یہ ہے فرق اس تعلیم میں جس میں ذہن انسانی کے تصرفات آچکے ہوں اور اس خدائی تعلیم میں جو اپنی اصلی شکل میں موجود ہو۔ کیا قرآن کریم کہیں شرک کا شائبہ بھی پاس بھٹکنے دیتا ہے؟ مختلف انداز سے۔ متنوع اسالیب بیان سے۔ متعدد دلائل سے۔ گوناگوں امثال ونظائر سے ایک خدائے واحد کا تصور ذہن میں مرتسم کرتا چلا جاتا ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ وَالنَّہَارَ مُبْصِرًا ط اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ○ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ○

اللہ وہ ہے جسنے تمہارے لیے رات کو بنایا کہ اس میں سکون حاصل کرو۔ اور دن دیکھنے کے لیے (۴۴) اللہ انسانوں پر فضل کرنیوالا ہے لیکن بہت سے لوگ شکر گذار نہیں ہیں۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب۔ (۴۵) ہر شئے کا خالق۔ اسکے سوا کوئی الہ نہیں۔ پھر تم کدہر الٹے جا رہے ہو! (بھٹکتے پھر رہے ہو) ۴۴-۴۵

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ط ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ ج فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ ھُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ط اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

وہ اللہ جسنے تمہارے لیے زمین کو قرارگاہ اور آسمان کو (مثل) چھت کے[1] بنایا ۴۶ .... اور تمہاری صورت نہایت حسین بنائی۔ (۴۷) اور تمہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں (۴۸) یہ ہے اللہ تمہارا رب

---

[1] اسکی تفصیل "ارض وسموات" میں دیکھیے۔

سو بڑا عالیشان ہے اللہ تمام جہانوں کا رب (۴۹) وہ زندہ و پائندہ ہے
اُس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں سو تم خالص اعتقاد کے ساتھ صرف اسی کو پکارو
تمام تعریفیں اسی اللہ رب العالمین کے لیے ہیں (۵۰) ۲۴ / ۶۵ ۴۰-۴۴

رب العالمین کسی خاص قبیلہ۔ خاص قوم۔ خاص ملک کا خدا نہیں، تمام کائنات کا خدا ہر ایک کا الٰہ۔ سب تعریفیں اُسی کے لیے ہیں۔ جب تمام صفات اُسی کی ذات میں ہیں تو تعریفیں بھی اسی کے لیے ہیں کوئی اِن باتوں میں اس کا شریک نہیں۔ بلند و بالاتر۔ ارفع و اعلیٰ الٰہ :- اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۱۶/۲۲

ایک واحد الٰہ۔

وہ تمام قوتوں کے سرچشمہ کا مالک سلسلۂ کائنات جس نظام کے ماتحت چل رہا ہے اس نظام کا قادر و مختار (CONTROLING AUTHORITY)

فَتَعٰلَى ... لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ

پس بلند و برتر ہے وہ مالک حقیقی۔ اُسکے سوا کوئی الٰہ نہیں عظمتوں والے عرش کا رب کریم و ۲۶/۲۴

جب تمام قوتوں کا خالق اور مالک وہی ہے تو پھر حکومت بھی اسی کی ہو سکتی ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

اور اللہ وہ ہے جسکے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اور سب تعریفیں اُسی کے لیے ہیں اولیٰ اور اُخریٰ (دُنیا و آخرت) میں۔ اور حکومت بھی اُسی کی ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے (۵۲) ۲۸/۷۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکز ملت ← لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ → مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

بات اللہ و رسول کی مانو جب وہ تمہیں ان بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنے

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لئے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار

(فرمان رسول)

لا اسلام الا بالجماعۃ

(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دور جدید)

مرتب
محمد عثمان!
جلد (۱)

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ ۸؍
شمارہ ۵ بابت ستمبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

گوہرِ نایاب

(ہمیں دائرہ طلوع اسلام کے ایک ممتاز رکن کی کرم گستری سے حضرت علامہ اقبالؔ علیہ الرحمۃ کی ذیل کی غیر مطبوعہ رباعی موصول ہوئی ہے جسے ہم بکمال فخر و مسرت شائع کرتے ہیں۔ طلوع اسلام کو اس بات پر بجا طور پر ناز ہے کہ اس کا "نالہ صحن مسجد" کے اندر بھی ہے اور یہ بھی اُمید کیجا سکتی ہے کہ بعونہ تعالےٰ اس سے "دلِ مُلّا" بھی پگھل جائیگا۔ مدیر)

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم

قمارِ زندگی مردانہ بازیم

چناں نالیم اندر صحنِ مسجد

کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

(اقبالؔ)

ہاتھ میں لیکر اپنی نگرانی میں ایک اور کانگریسی وزارت مرتب کر لی جو اسوقت برسر اقتدار ہے
اس وقت بھی وزارت میں کسی ایک مسلمان کو لینا کانگریس پھر بھول گئی گویا قدرت نے کانگریس کو
موقع دیا کہ وہ جب نہیں تو اب کسی مسلمان کو وزارت میں لے لے مگر کانگریس نے جو اعلیٰ
اصولوں کی پابند ہے اس بے اصولی کو گوارا نہ کیا اور یہ دکھا دیا کہ اسلام دشمنی میں استواری
اسے کہتے ہیں!

فرمائیے۔ اگر آج سی پی میں سیواجی مرہٹہ کی حکومت قائم ہوتی یا ڈاکٹر مونجے اور بھائی
پرمانند وہاں کے وزیر اعظم ہوتے تو اس سے زیادہ کیا کرتے جو کانگریس نے کیا؟ مگر کانگریسی
مسلمان اس پر بھی مطمئن ہیں یہانتک کہ کانگریس کے طرز عمل کی صحت پر ہر وقت مباحثہ کرنے کو
تیار ہیں۔ ہم یہانتک لکھ چکے تھے کہ اس سلسلہ میں مولانا آزاد کا ایک بیان نظر سے گزرا
جس میں آپ فرماتے ہیں کہ میں انقطاعی طور پر یہ ذہن نشین کرا دینا چاہتا ہوں کہ ایک مسلم
وزیر کے تقرر کے لئے جو نشست سی۔ پی وزارت میں خالی رکھی گئی ہے اسے جلد ہی پُر کیا
جائے گا۔ گویا سی۔ پی وزارت میں تین بار ردوبدل ہونے کے بعد کہیں مسلم وزیر کے تقرر کا خیال
دامنگیر ہوا ہے ع

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت ست

بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ کانگریس کسی شخص کے مذہب۔ کلچر۔ عادات و رسوم میں
مداخلت نہ کریگی اور ہر فرد اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے میں آزاد ہوگا۔ مگر سوامی سمپورنانند وزیر
تعلیم یو۔ پی برملا کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی ہندو مسلم تہذیبوں کو مٹا کر ہندی تہذیب
کی بنیاد نہ ڈالی جائے گی قومیت متحدہ کی تشکیل محال ہے! یہ ہے ہر مذہب کے کلچر کی حفاظت
کا ثبوت اور یہ ہے کراچی کے کانگریسی ریزولیوشن کی عملی تشریح!

بنی گنج ضلع مونگھیر میں زبردستی مسلمانوں سے دستخط لیئے گئے کہ وہ اپنے قصبہ میں

نہ تو گائے کا گوشت لائینگے اور نہ اسے استعمال کریگے۔ اسپر بہار اسمبلی میں مسٹر یونس کی طرف سے تحریک التوا بھی پیش کی گئی تھی (ہندوستان ٹائمز ۲۶ جولائی ۳۸ء) جسکا خبر نہیں کیا حشر ہوا۔ اور بہار کی کانگریسی گورنمنٹ نے اسپر کیا کارروائی کی۔

احمد آباد کی خبر ہے کہ وہاں کانگریسی گورنمنٹ نے اعلیٰ ذات کے ہندو ہوٹلوں میں اچھوتوں کو داخل ہونے کی اجازت دیدی ہے اور سناتن دھرمیوں کے مذہبی جذبات کو پامال کرکے ایک ایسا حکم نافذ کیا ہے جو صریحاً مذہب میں مداخلت کے مرادف ہے چنانچہ احمد آباد کے ڈیڑھ ہزار ہوٹلوں نے اس حکم کے خلاف بطور احتجاج ہڑتال کردی اور مالکوں نے ایک جلسہ میں حکومت پر واضح کیا کہ

"اونچی ذات کے ہندوؤں نے ہمارے ہوٹلوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے کیونکہ حکومت نے ہماری پوزیشن خراب کردی ہے اور اس فیصلہ سے ہماری تجارت تباہ ہو رہی ہے صدر جلسہ نے یہ بھی کہا کہ خود گاندھی جی بھی سہبوج (اچھوتوں کے ساتھ ملکر کھانا کھانا) کو پسند نہیں کرتے پھر ہمکو اسپر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔" (تیج ۳ اگست ۳۸ء)

چونکہ چھوت چھات ہندو مذہب کا لازمی جزو ہے اس لئے اونچی ذات کے ہندو اچھوتوں کے ہمراہ کھانا پسند نہیں کرتے۔ مگر کانگریسی گورنمنٹ کا طرز عمل دیکھو کہ اس کے ایک ہاتھ میں کراچی والا ریزولیوشن ہے اور دوسرے ہاتھ میں اس کو ذبح کرنے کے لئے تیز چھری ہے جب ہندو یہ کہتے ہیں کہ چھوت چھات ہمارا مذہبی مسئلہ ہے تو کانگریس کو اس میں مداخلت کرنے کی ضرورت ہی کیا پڑی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کانگریسی ہندوؤں کو مساوات اور رواداری کی حمایت مقصود نہیں بلکہ انھیں یہ اندیشہ کھائے جا رہا ہے کہ کہیں مظلوم اچھوت ہندو دھرم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑ دیں اور اس طرح ہندوؤں کی تعداد میں کمی واقع نہ ہو جائے لیکن معاملہ کی سطح پر ہی نگاہ نہ رکھئے بلکہ ذرا اور گہرائی میں اتر جائیے اور دیکھئے کہ واقعات آپ کو کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں جب کانگریس مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرتی ہے

تو اس غرض سے کہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا تحفظ کیا جائے اور اسلامی شعائر کو مٹایا جائے۔ اور جب وہ قدامت پرست ہندوؤں کے "مذہبی" معاملات میں دخل انداز ہوتی ہے تو اس مقصد کے لئے کہ ہند و قومیت کا تحفظ ہو یعنی ہندو اور مسلم تہذیبوں کو مٹانے کے بعد جو جدید "ہندی" تہذیب مرتب کیجائے گی اس کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہونگے۔

(پراچین تہذیب منفی اس کے تمام نقائص) جمع (اسلامی تہذیب منفی وہ تمام باتیں جو ہندو تہذیب کے خلاف ہوں۔) ہندی تہذیب

پنجاب گورنمنٹ نے فاقہ کش کسانوں اور تباہ حال مقروضوں پر ترس کھا کر جو بل منظور کئے ہیں انھوں نے سود خوار مہاجنوں پر ایک بجلی سی گرا دی ہے۔ پنجاب کا مہاجن یہ دیکھ کر کہ فاقہ کشوں کی مصیبتوں کا کسی حد تک خاتمہ ہونے والا ہے خود کشی پر آمادہ ہوگیا ہے اور ڈاکٹر نارنگ کی سرکردگی میں اس نے پنجاب گورنمنٹ کو چیلنج دیدیا ہے!

ہمیں مخالفوں کی مخالفت کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی عبرت حاصل ہو رہی ہے۔ ان میں اکثر لوگ وہ ہیں جو کانگریس کے پلیٹ فارموں پر کسانوں کی ہمدردی میں آنسو بہاتے رہے ہیں مگر آج وہ سرمایہ دار مہاجنوں کی صف میں کھڑے ہو کر یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ انکا سابقہ طرز عمل ریاکاری اور زمانہ سازی پر مبنی تھا اور وہ دراصل خود سرمایہ دار ہیں سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں اور غریبوں کو زندہ درگور کرکے صرف اپنی زندگی کی خیر منا رہے ہیں۔ لائلپور کی غیر زراعت پیشہ کانفرنس میں ڈاکٹر نارنگ نے جو بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا ہے وہ ہم نے حیرت کے ساتھ اول سے آخر تک پڑھا اور ہمیں معلوم ہوگیا کہ دنیا میں اہمسا کی دعویدار قوم سے زیادہ کوئی ظالم اور سنگدل قوم نہیں ہے! اَللّٰہُ اَکْبَرُ! غریب طبقہ دو روٹی مانگتا ہے مقروض اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں اور کسان منڈیوں کو بھرپور رکھنے کے لئے زمین کی

سہولتوں کے طلبگار ہیں مگر مہاجنی طبقہ جو سیکڑوں سال سے ان غریبوں کا خون چوستے چوستے قہر و ستم کا مظہر اتم بن گیا ہے۔ اس حالت کو دیکھ دیکھکر آگ پر لوٹ رہا ہے! ہمیں یقین ہے کہ اس جنگ میں حق و انصاف کی فتح ہوگی اور ظالم اگر خود راہ راست پر نہ آئیں گے تو زمانہ انھیں راہ راست پر آنے پر مجبور کریگا۔

مسٹر میکڈونلڈ یکایک فلسطین کی گلیوں میں گشت کرتے ہوئے دیکھے گئے! معلوم نہیں کہ ارض مقدس کی زیارت سے موصوف کا مقصد کیا ہے اور انھوں نے روپوش ہوکر گلیلی، بیت اللحم اور ناصرہ کا معائنہ کرنے کی زحمت کیوں گوارا فرمائی؟ دو روز کے قیام کے بعد آپنے فلسطین کے باشندوں کو ایک پیام دیا ہے فرماتے ہیں کہ "ہمارا مقصد یہ ہے کہ فلسطین میں امن و امان قائم ہو اور ان لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جائے جو اس سرزمین پر بستے ہیں"۔ میکڈونلڈ ایسے بھولے شخص کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ارض مقدس میں امن و امان کا قیام اعلان بالفور کی تنسیخ اور عربی حکومت کی تاسیس پر مبنی ہے! برطانیہ اہل فلسطین کے ساتھ انصاف کرے گی! بہت خوب مگر اس نے عربوں اور یہودیوں کے معاملہ میں جو روش اختیار کر رکھی ہے اس نے برطانیہ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ ظالم اور مظلوم کے ساتھ انصاف کر سکے اگر عربوں کے ساتھ انصاف ہوگا تو برطانیہ کا جگر کباب ہوگا کہ ہائے یہودیوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی! رہا یہودیوں کے ساتھ انصاف کا معاملہ سو وہ تو برطانی نقطۂ نگاہ سے برابر ہو رہا ہے۔ انکے متعلق یہ کہنا کہ انکے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ لفظ "انصاف" کی بدترین توہین ہے۔

کس قدر شاندار لفظ ہے "انصاف" جب بم کے گولوں کے ساتھ اس کا استعمال ہو مگر کس قدر بے معنے ہے "انصاف" جب مظلوم اس کی دُہائی دے۔

یہ تو تھا مسٹر میکڈونلڈ کا "انصاف" جو انگلستان سے بڑی احتیاط کے ساتھ فلسطین پہنچایا گیا ہے

اب ذرا ملاحظہ کیجئے ہائی کمشنر کی اس تقریر کو جو آپنے انصاف کی فضا میں براڈ کاسٹ کی ہے، آپ عربوں کو دھمکی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تقسیم فلسطین کمیشن کی سفارشات اور ملک معظم کے آخری فیصلوں پر تشدد اور خونریزی سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا!"

یعنی عرب جو چاہیں کرلیں۔ برطانیہ اپنے خطرناک فیصلوں کا ضرور نفاذ کرے گی! یہ ہے میکڈونلڈ کا انصاف جسکا اظہار انھوں نے ہائی کمشنر کی تقریر دلپذیر میں کرایا ہے۔ خدا رحم کرے، "انصاف" بر جوہوس ملک گیری کے صدقہ میں "برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مصداق بنکر رہ گیا ہے۔!

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کا مسلمان بے بس و مجبور ہے اور اس کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں جس کے سامنے انگریز کی اس سبعیت و بربریت کو جھکنا پڑے لیکن ان فراعنہ و نماردۂ برطانیہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ فلسطین کا مسئلہ محض ہندوستان کے غلام مسلمانوں کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ یہ تمام روئے زمین کے ۴۵ کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ ہے جن کے جذبات کا احترام نہ کرنا قہر آسمانی کو دعوت دینا ہے چہ عجب کہ وہ جہان جسے برطانیہ کے جاہ و حشمت کی کشتی ٹوٹنے والی فلسطین کے خشک سمندر میں ہی کہیں پیچ ہو!!

بقول پنڈت جواہر لال نہرو و بابو سبھاش چندر بوس۔ آئندہ قومی حکومت اشتراکیت کی بنیادوں پر قائم ہوگی جو لوگ اشتراکیت کی حقیقت سے واقف ہیں وہ اس کھلی سازش کا ادراک کرکے سہم جاتے ہیں کیونکہ اشتراکیت اور دہریت لازم ملزوم ہیں مگر ہمارے ناواقف علماء یہ کہکر دل کو تسلی دے لیا کرتے ہیں کہ اشتراکیت ایک معاشی نظام ہے اس کو دین اور مذہب سے کیا تعلق؟ کاش ہمارے علماء کو اشتراکیت کے سرچشمہ تک رسائی حاصل ہوتی اور وہ مارکس اینجلز اور لینن کے نظریات سے براہ راست واقفیت حاصل کرتے! ان بیچاروں کو پتہ ہی نہیں کہ اشتراکیت زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور اس کو یہ ہرگز پسند نہیں کہ انسان

مادی حکومت کے علاوہ مذہب، اخلاق کی بھی کوئی حکومت قائم ہو اور ایمان بالغیب انسانی ضمیر کی تشکیل میں کوئی حصہ لے مگر ہمارے قومیت پسند علماء کو یقین ہی نہیں آتا کہ اشتراکیت اپنے جابر و قاہر نظام کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ ہم ان ناواقفوں کی توجہ ذیل کی عبارت کیطرف دلائیں گے۔ اخبار "ہندوستان" جو کانگریس کا نیم سرکاری اخبار ہے۔ اس میں اشتراکیت کے بانی "کارل مارکس" پر ایک مضمون "سردار جعفری" کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ سطور ذیل اسی مضمون کا اقتباس ہے۔ مسٹر جعفری اشتراکیت کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "وہ خیالات جو مارکس نے اپنی کتاب میں پیش کیے ہیں مجموعی حیثیت سے مارکزم کہلاتے ہیں اس چھوٹے سے مضمون میں ان خیالات کا تجزیہ ممکن نہیں ہاں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکے ماتحت انسانی زندگی مداری کے تماشہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے زیر اثر نہیں ہوتی انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایک دوسرے سے علحدہ نہیں کیا جا سکتا مذہب۔ اخلاق۔ قانون۔ حکومت۔ سیاست سب ایک ہی سلسلہ کی بہت سی کڑیاں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں ... تاریخ انسانی، ذرائع پیداوار کی تبدیلیوں کی ایک مسلسل داستان ہے جس میں ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ اقتدار حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ماضی و حال کی پوری تاریخ طبقہ وار جنگ کا ایک سلسلہ ہے۔ وہی طبقہ حکمراں ہوتا ہے جو ذرائع آمدنی پر قابض ہوتا ہے۔ ریاست اس طبقہ کی پشت پناہ ہوتی ہے اور مذہب قانون اسے قوت بخشتے ہیں" (مورخہ ۱۳ جولائی جلد ۳ صفحہ ۶ کالم ۲)

اشتراکیت کا یہ متن تفسیر و تشریح کا محتاج ہے۔ مگر ہم علماء کی بصیرت پر بھروسہ رکھتے ہوئے توقع کرتے ہیں کہ وہ خود ہی اس کی تشریح فرما کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں گے۔

چونکہ ہندوستان کا آئندہ نظام حکومت اشتراکیت کی بنیادوں پر قائم ہوگا۔ اس لئے اس مسئلہ کی اہمیت طلوع اسلام کے پیش نظر ہے۔ انشاء اللہ مستقبل قریب میں ہم اس مسئلہ پر مفصل و مبسوط مضمون شائع کریں گے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ روس کی اشتراکیت کیا ہے اور اسلام کی

صحیح اشتراکیت کیا ہے اور ایک سچا مسلمان ایک سچا اشتراکی کسطرح بن سکتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

حیرت اور تعجب نہ کیجئے کہ رنگون میں فساد ہو گیا جس میں سو سے اوپر مسلمان مارے گئے اور کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا۔ اگر وہاں فساد نہ ہوتا تو یقیناً حیرت ہوتی کیونکہ وطن کی تقسیم کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ دلوں سے انسانیت کا احترام اُٹھ جائے اور وطن کی پوجا میں انسان کی حالت حیوان سے بدتر ہو جائے۔
برہما آج سے کچھ ہی پہلے ہندوستان کا ایک حصّہ تھا مگر انگریز کے پُراسرار ارادے نے اسکو ہندوستان سے جُدا کر دیا اور ان وطن پرستوں کو جو وطن کی تقسیم کو فطری اور نیچرل قرار دیتے ہیں برطانیہ کی ڈپلومیسی نے ایسا جواب دیا کہ وہ دیکھتے ہی رہ گئے اور انکا نظریہ وطن جڑ سے اُکھڑ الگ جا پڑا رنگون کے مُسلمانوں پر بظاہر بدھوں نے مگر بہ باطن کسی اور نے وہ قیامت توڑی ہے جس کی یاد شاید سیکڑوں سال گزرنے پر بھی تازہ رہیگی۔ نہ مسلمانوں کی جانیں محفوظ رہیں نہ انکی املاک باقی رہیں اور نہ مساجد اللہ کی حرمت و عزّت کا خیال کیا گیا۔ یک بیک ایک قیامت آئی اور بیسیوں بے گناہوں کو ہلاک اور ہزاروں کو زندہ درگور کر گئی! یہ پہلا ثمرہ ہے برہما کو ہندوستان سے جُدا کرنے کا یا یوں کہو کہ ہندوستان سے برما کو جُدا کرنیکا جو مقصد تھا وہ بغیر انتظار کے بہت جلد پورا ہو گیا ہم کاغذکی سطح پر برما کی مظلوم آبادی سے لفظی ہمدردی کے سوا اور کیا سلوک کر سکتے ہیں؟
کانگریس ابتک خاموش ہے اسکے کشکول میں شاید لفظی ہمدردی کا بھی کوئی ٹکڑا باقی نہیں رہا ہے رہے انگریز سو انکا گلہ اس لئے بیجا ہے کہ مرنیوالوں میں سوائے ہندوستانیوں کے اور کوئی نہ تھا انکی رگ غیرت تو اسوقت پھڑکتی جب لاشوں کے انبار میں چند سفید سفید لاشے بھی نظر آتے!
کاش اس خونی حادثہ کا آئندہ اعادہ نہ ہو اور ہمارا یہ خیال غلط ہو کہ یہ فساد آئندہ فسادات کی ایک "شاندار" تمہید ہے۔ ہندوستان اور برما کی علیحدگی پر ذرا قیاس فرمایئے فلسطین کی تقسیم کو کہ تقسیم سے پہلے ہی وہاں قیامت برپا ہے اور جب ارض مقدس تقسیم در تقسیم کی عملی شکل اختیار کریگی اُس وقت جو حشر وہاں برپا ہوگا اس کی صحیح تعبیر کے لئے کوئی لفظ خود ہی ایجاد کر لیجئے!

اسکندرونہ جو شامی ترکی سرحد پر واقع ہے اور بحر روم کی حفاظت کا ایک بہترین قلعہ ہے بڑی جدوجہد کے بعد ترکوں کے قبضہ میں آگیا اور فرانس کو بہزار ذلت ترکی جمہوریت کے سامنے جھکنا پڑا۔ یہ مقام مملکت شام کا ایک حصہ ہے اور آبادی کے لحاظ سے اسکا تعلق عربوں سے ہے عربوں کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد شام کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے اسکو غلامی کی ایک دوسری شکل سمجھنا چاہیئے۔ فرانس نے اپنے معاہدہ میں اس مقام کو اپنا فوجی مستقر ظاہر کیا تھا جو بلاشبہ آئندہ چلکر ترکوں کے لیئے بغل کا پھوڑا ثابت ہوتا۔ ترکوں نے جو اب یورپین طاقتوں کی ڈپلومیسیوں کو خوب سمجھ گئے ہیں اس خطرہ کا احساس کیا اور یہ سمجھ کر یہ علاقہ آزادی کے بعد بھی عربوں کے قبضہ میں نہیں رہ سکتا اسپر اپنی سیادت کا دعویٰ کر دیا اور قدیم معاہدوں اور دستاویزوں کی ایسی تشریح کی کہ فرانس کے ہوش اڑ گئے۔ آخر جمعیۃ اقوام کی مداخلت سے معاملہ کچھ سلجھا اور اسکندرونہ پر ترکوں کا کیقدر حق سیادت تسلیم کر لیا گیا۔ مگر ترک جو کامیابی کا راز اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ اس نام نہاد سیادت پر راضی نہوئے اور فرانس کو جنگ کا الٹی میٹم دیدیا اور جمعیۃ اقوام کو بھی دھمکی دیدی کہ اگر اس نے اس معاملہ میں ذرا بھی جانبداری کا ثبوت دیا تو ترکی جمہوریت اسکو طلاق دیدیگی مختصر یہ کہ فرانس نے اپنی مجبوریوں کا اندازہ لگا کر ترکوں کے مطالبات تسلیم کر لیئے اور انکو وہ حقوق دیدیئے جو شاید کسی کمزور حکومت کو دس سال کی جنگ کے بعد بھی حاصل نہ ہوتے۔

اس معاملہ میں ترکوں کو فتح ہوئی اور فرانس کو ہزیمت وشکست۔ فرانس نے ترکوں کے سامنے اس لیئے سر نہیں جھکایا کہ حق و انصاف کا اقتضا بھی یہی تھا۔ کیونکہ مغرب کی زبان میں انصاف کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور پر اخلاقی اور مذہبی دنیا میں سمجھے جاتے ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں طاقت فوجی قویٰ کا استحکام۔ قوم کی عزیمت و استقامت جس قوم میں یہ تمام اوصاف موجود ہوں گے وہ ڈنڈے کے زور سے سب کچھ منوالے گی اور یورپ بقائمی ہوش وحواس پسر دستخط کر دیگا کہ یہ حق ہے۔ انصاف ہے۔ غریب حبش اسی لیئے مارا گیا کہ وہ ان اوصاف سے معرا تھا اور اٹلی اسکی کمزوری کو سمجھتا تھا۔ ترک دردانیال اور اسکندرونہ کے بارے میں اسی وجہ سے کامیاب ہیں کہ انھوں نے

ڈھیلے کا جواب اینٹ اور پتھر سے دینا سیکھ لیا ہے۔ اب اگر اسلام یہ کہتا ہے کہ حق و انصاف کے لئے مسلمانوں کو ہر قوت کیساتھ مقابلے کیلئے مستعد اور تیار رہنا چاہئیے اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لئے خدا کی بخشی ہوئی طاقتوں کو استعمال کرنا چاہئیے تو اسپر تلملانے کی کیا بات ہے! افسوس آج ہمکو اسلام کی اس تعلیم سے خود شرم آنے لگی ہے اور بڑے بڑے مجاہد جنکا نعرہ تھا ذروۃ سنامہ الجہاد (اسلام کی بلندی جہاد سے ہے) وہ اب اہنسا کے فلسفہ پر فریفتہ ہونے لگے ہیں!

طلوعِ اسلام کی شروع سے ہی حالت یہ ہو رہی ہے کہ　　دامانِ نگاہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار۔ کئی ایک ضروری مباحث ہیں جو سامنے ہیں لیکن ایک ماہوار رسالہ کے محدود صفحات انکے کفیل ہی نہیں ہو سکتے کئی ایک عنوانات ایسے ہیں جنہیں ہم مستقلاً شروع کرنا اور التزاماً جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ بھی (سوائے معارف القرآن کے) عدمِ گنجائش کے گلہ سنج ہیں۔ بہرحال دو موضوع تو ایسے ہیں جنہیں ہم اب زیادہ عرصہ تک معرضِ التوا میں نہیں رکھنا چاہتے۔ یعنی

(۱) پیامِ اقبال اور قرآن کریم۔　　ازجناب پرویز

اور (۲) تشریح مثنوی اسرار و رموز۔　　ازجناب خان محمد یوسف خان سلیم چشتی۔

بتوفیق ایزدی ہم اکتوبر کے پرچہ سے اس سلسلہ کو باقساط شروع کریں گے۔

چند شکوک اور اُن کا ازالہ!

(از جناب رازی)

سوال کیا جاتا ہے کہ جب قرآن کریم میں حکم ہے کہ تعاونوا علی البر والتقویٰ (نیکی اور خدا ترسی۔ تقویٰ۔ کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو) تو مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ ضرور اشتراک عمل کرنا چاہیئے کیونکہ اسکے پروگرام میں تو بہت اچھے اچھے کام شامل ہیں۔

پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ فلاں معاملہ "بر و تقویٰ" کا ہے اور فلاں "اثم و عدوان" کا۔ ایک کانگرسی مولوی صاحب نے اس بات کے جواب میں فرمایا کہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ "بر و تقویٰ" کا کون سا معاملہ ہے لیکن اُن سے کوئی پوچھے کہ جس چیز کو آپ دین میں تشتت و افتراق۔ انتشار و اختلاف کہتے ہیں جس کا رونا آج ہر شخص رو رہا ہے۔ اور جسے قرآن کریم شرک قرار دیتا ہے کیا وہ اسی وجہ سے نہیں کہ ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ "بر و تقویٰ" کی بابت خود فیصلہ کرے جس راہ کو اچھا سمجھے اُسے اختیار کرلے اور جسے بُرا سمجھے اُسے چھوڑ دے۔ آپ شریعت کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے متعلق تو یہ حکم دیتے ہیں کہ کسی خاص مسلک کے ماتحت چلو لیکن اتنے عظیم الشان مسئلہ میں یہ روش اختیار کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اپنے ذہن کے مطابق اسکا فیصلہ کرے۔ یہ وجہ ہے اس بات کا کہ دین کی اصلِ عظیم یعنی جماعت اور مرکز کی زندگی کا تخیل نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ جب جماعت اور اسکا مرکز موجود ہو تو بر و تقویٰ اور اثم و عدوان کا فیصلہ وہاں سے ہوا کرے یہی لک عین اسلامی مسلک ہو سکتا ہے چھوٹے چھوٹے انفرادی معاملات میں تو اس کی ضمنی زت ہو سکتی ہے کہ ہر شخص بر و تقویٰ کا خود فیصلہ کرلے۔ مثلاً آپ چلے جا رہے ہیں۔ راستے میں دیکھتے کہ ایک بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔ کچھ لوگ اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں آپ بھی ان سے

تعاون کیجیے، لیکن جن معاملات کا اثر آپ کی قوم کی موت اور زندگی پر پڑتا ہو اُن کی نسبت اگر آپ ہر شخص کو اجازت دیدینگے کہ جو مسلک چاہے اختیار کرے تو تصور فرمایئے کہ نتیجہ کیا ہوگا! کیا کوئی شخص عہد رسالتمآب صلعم میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا بتا سکتا ہے کہ جماعتی معاملات میں کسی مسلمان پر اختیار دیا گیا ہو کہ وہ اپنا مسلک خود اپنے ذہن سے متعین کرے؟ کانگرس کے پروگرام میں بے شک ملک کی اقتصادی حالت کی اصلاح، مزدوروں اور کسانوں کی غربت اور افلاس دُور کرنے کی تجاویز شامل ہیں، اور ان سے اگر مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو تو ان امور میں اشتراکِ عمل ضرور کرنا چاہیئے، مسلمانوں سے بڑھ کر کمزور اور غریب کا ہمدرد اور کون ہوسکتا ہے لیکن اگر اس اشتراکِ عمل کے لیے اوّلین شرط کوئی ایسی ہو جو اصُولاً آپ کے مذہب کے خلاف ہو تو کیا اس وقت بھی آپ اس اشتراک عمل پر آمادہ ہو جائیں گے؟ کانگریس میں اشتراکِ عمل کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والا ہندوستان میں "متحدہ قومیت" پیدا کرنے کا حامی ہو اور جیسا کہ جون ۱۹۳۸ء کے پرچہ میں بصراحت بیان کیا جا چکا ہے مسلم و غیر مسلم کی "متحدہ قومیت" کا تصور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے اب فرمایئے کہ ایک مسلمان ایسی شرط کو تسلیم کر کے جس سے وہ اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھے، کمزوروں، غریبوں کی ہمدردی میں اشتراکِ عمل کیسے کرسکتا ہے؟

ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہودیوں سے اس قسم کا اشتراک کیا تھا۔

> "جب رسول کریمؐ نے مدینہ میں جمہوری اتحاد قایم کرنے کے لیے غیر مسلم قبائل سے اتحاد کیا تھا تو یہاں غیر مسلموں سے ملکر جمہوری نظام کے لیے اتحاد قایم کرنا اور اُن سے ملنا کیوں جائز نہیں"
>
> (تقریر مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ مطبوعہ زمزم۔ ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء)

اس میں دو ٹکڑے قابل غور ہیں۔ نبی اکرمؐ نے مدینہ کے غیر مسلم قبائل سے "جمہوری اتحاد" قایم کیا یعنی غیر مسلموں سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر مدینہ پر باہر سے کوئی غنیم حملہ آور ہو تو مسلم و غیر مسلم جماعتیں ملکر

مقابلہ کریں گی۔ یہ "اتحاد" بالکل تعاون علی البر والتقویٰ کے مطابق تھا لیکن حضرت مولانا اس سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ ہندوستان میں "جمہوری نظام" قایم کرنے کے لیے بھی اسی طرح اتحاد کیا جاسکتا ہے۔ یہ نتیجہ غلط ہے "جمہوری اتحاد" اور "جمہوری نظام" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جمہوری اتحاد کے معنی یہ ہیں کہ کسی نیک کام میں مُسلم و غیر مسلم جماعتیں باہمی اشتراکِ عمل سے تعاون کریں لیکن "جمہوری نظام" سے یہ مراد ہے کہ ایک ایسا نظامِ حکومت قایم کیا جائے جس میں مسلم (اقلیت) و غیر مسلم (اکثریت) ملکر حکومت کے معاملات کا فیصلہ کیا کریں اور اس مخلوط جماعت کے فیصلے ملک کا قانون بن جائیں جو مسلم و غیر مسلم دونوں پر نافذ العمل ہوں۔ چنانچہ حضرت مولانا اپنی اسی تقریر میں فرماتے ہیں

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلم۔ سکھ۔ عیسائی۔ پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے"۔ (ایضاً)

اس قسم کا "جمہوری نظام" نہ قرآن کریم کی رو سے جائز ہے اور اس لیے نہ ہی اُسوۂ حسنہ میں اس کی کوئی مثال مل سکتی ہے۔ قرآن کریم مُسلمانوں کے نظامِ حکومت کے متعلق ارشاد فرماتا ہے کہ وَ اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ۔ ان کے معاملات اُنکے اپنے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے کسی غیر مسلم کے مشورہ کا ان میں کوئی دخل نہ ہوسکے گا۔ چنانچہ مدینہ میں خود انہی دنوں جب کہ غیر مسلموں سے وہ "جمہوری اتحاد" قایم تھا جس کا ذکر حضرت مولانا نے فرمایا ہے مُسلمانوں کے اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے تھے۔ کسی غیر مسلم کا اس نظام میں کوئی دخل نہ تھا یعنی وہاں "جمہوری اتحاد" تو تھا لیکن "جمہوری نظام" نہ تھا۔ "جمہوری نظام" (یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مخلوط جمہوری نظام) کا تو تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ ایسے جمہوری نظام میں ان الحکم الا للہ (حکومت صرف خدا کے لیے ہے) کا اصول کس طرح کارفرما ہوسکے گا؟ خدا کی حکومت کا تو مطلب ہی قوانین الٰہی یعنی شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہے۔ یہ اُس "جمہوری نظام" میں جس میں ہندو مسلم۔ سکھ۔ عیسائی پارسی سب شامل ہوں۔ کیسے ممکن ہوگا؟

پھر یہ بھی دیکھیے کہ مدینہ میں جس "جمہوری اتحاد" کو مُسلمانوں نے قایم کیا تھا۔ وہ مسلمانوں نے من حیث الجماعت قایم کیا تھا۔ اُنکے "مرکز" نے غیر مسلموں کی جماعتوں سے معاہدہ کیا تھا۔ انفرادی

طور پر مسلمانوں کو اجازت نہیں دیدی تھی کہ جو مسلک انکے نزدیک نیکی اور تقویٰ کا ہے وہ اختیار کرلیں

یہ بھی یاد رہے کہ مسلمان انفرادی طور پر کسی ایسی فرم (کاروباری دکان) میں شامل ہوسکے گا جس میں اور حصہ دار غیر مسلم ہوں۔ اور اس فرم کا نام بھی خواہ مخلوط ہو لیکن وہ کسی ایسے نظام میں انفرادی طور پر شامل نہیں ہوسکے گا۔ جس نظام کا کام ایسے قوانین وضع کرنا ہو جس کے ماتحت اسے اور اس کی قوم کو زندگی بسر کرنی پڑے۔ ایسے نظام میں وہ من حیث الجماعت شامل ہوگا اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مسلمانوں کے اپنے معاملات انکے اپنے وضع کردہ قوانین کے ماتحت فیصل ہونگے۔ مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت کا وضع کردہ کوئی قانون آزاد مسلمان پر نافذ نہیں ہوسکتا اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو اپنے دعوےٰ کے اثبات میں سند لائے۔

اس سے ظاہر ہے کہ کانگریس جب تک "متحدہ قومیت" کی شرط عائد کئے ہوئے ہے مسلمان اس کے کسی معاملہ میں اشتراکِ عمل نہیں کرسکتا۔ یہی تو بات ہے جسکے لیئے مسلمان اپنی الگ جماعت کا وجود از روئے کتاب و سنت ضروری سمجھتا ہے۔ ورنہ کمزوروں اور ضعیفوں کی امداد کے لیئے کار خیر میں کون شریک نہیں ہونا چاہتا۔

---

(۲)

کہا یہ جاتا ہے کہ آج جب کہ جماعت نہیں۔ مرکز گم ہے، تو پھر مسلمانوں کو ان امور میں انفرادی طور پر ہی حصہ لینا ہوگا۔

اسپر دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا آپکے نزدیک بلا جماعت و مرکز کے مسلمان اسلامی زندگی بسر بھی کرسکتا ہے؟ اگر، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "الخلافت والجزیرۃ العرب" میں ثابت کیا تھا (ملاحظہ ہو سوراجی اسلام۔ مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۳۸ء) آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جماعتی زندگی کے بغیر اسلام ممکن ہی نہیں۔ تو سب سے مقدم یہ ہے کہ وہ زندگی پیدا کرو جو اسلامی کہلا سکے مگر یہ اسلامی زندگی آج موجود نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اُسکے پیدا کرنے کیطرف توجہ ہی نہ دی جائے

اور جس طرح سے ہندوستان کے مسلمان چلتے آرہے ہیں۔ اسی طرح اُن کو چلتے رہنے دیا جائے۔ اگر آپ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں انفرادی طور پر دوسروں سے تعاون کرتے رہے اور اپنی جماعتی تشکیل کی فکر ہی نہ کی تو یہ اتنا بڑا اجتماعی گناہ ہوگا جس کی سزا قوم کی موت ہوگی۔ جماعتی مصیبت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب مولانا آزاد سے سُنیئے فرماتے ہیں:-

"قرآن وسُنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہوجاتی ہے۔" (ایضاً)

فرمائیے! انفرادی طور پر کانگریس کے "بر و تقویٰ" کے کاموں میں شمولیت مقدم ہے یا اپنے جماعتی نظام کی تشکیل؟

---

(۳)

کہا جاتا ہے کہ ہاں! تم اپنی جماعتی تشکیل کی فکر میں رہو اور اس عرصہ میں ہندو جنگ آزادی میں اتنے آگے نکل جائیں گے کہ تم پھر بیٹھے ہاتھ ملتے رہو گے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ ہندو اپنے قومی مصالح و منافع کی خاطر آجکل سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ اور آگے بڑھتے جارہے ہیں اس لئے تم اس بات کیطرف دھیان ہی نہ دو کہ تم جس "جماعتی معصیت" کی زندگی کی لعنت میں گرفتار رہو۔ اسے کس طرح اسلامی زندگی میں تبدیل کرسکتے ہو! بلکہ جو کچھ حالت آج ہوچکی ہے اسے اور مستحکم کرتے جاؤ، انفرادی زندگی کے تخیل کو اور پختہ ہونے دو۔ اور فرداً فرداً ہندوؤں کے ساتھ شامل ہوتے جاؤ۔ یعنی اگر اختلاج کیوجہ سے تمہارے قلب کی حالت بگڑ چکی ہے۔ اس کی حرکت درست نہیں رہی تو اسکے علاج کی فکر مت کرو۔ بلکہ اپنے ساتھی کے ہمراہ دوڑتے چلے جاؤ کہ اگر تم رُک گئے تو وہ بہت آگے نکل جائے گا۔ پوچھئے تو کسی طبیب سے کہ وہ ایسے شخص کے متعلق کیا فتویٰ دیتا ہے؟

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جتنا وقت تم جماعتی تشکیل میں ضائع کروگے ہندو اتنے میں کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ گویا ان کے نزدیک جو وقت جماعتی تشکیل میں صرف کیا جاتا ہے وہ بیکار جاتا ہے اس کا ماحصل کچھ نہیں ہوتا۔ وقت وہی کارآمد شمار کیا جاتا ہے جو شور وغوغا۔ بھاگ دوڑ۔ یعنی محسوس حرکات میں صرف کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ ہمسایہ قوم کے شور وشغب۔ بھاگ دوڑ سے مسلمان بوکھلا سا گیا ہے۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی ہے جیسی ریلوے پلیٹ فارم پر گاڑی کی آمد کے وقت مسافروں کی ہوتی ہے کہ ہر مسافر دوسرے مسافروں کی حرکت کو دیکھ کر بلاارادہ سراسیمہ ہوجاتا ہے بعض کی یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ سامان پلیٹ فارم پر بکھرا پڑا ہے۔ بچے مسافروں کے ہجوم میں گم ہوگئے ہیں۔ بدحواسی کے عالم میں پگڑی اتر کر گلے میں پڑی ہے۔ ایک جوتا پاؤں میں ہے دوسرا ریل کی پٹڑی پر۔ سانس پھول رہا ہے۔ منہ میں جھاگ آرہے ہیں۔ اس پریشانی میں اتنا دریافت کرنا بھی بھول جاتا ہے کہ جس گاڑی میں وہ سوار ہورہا ہے وہ وہی ہے جس میں وہ جانا چاہتا ہے مسلمان کی بھی آج یہی حالت ہورہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زندگی کی دوڑ میں یہ ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گیا ہے اسے بہت دیر میں ہوش آیا ہے لیکن اس سے پیچھے رہ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اب راستہ میں اینٹ پتھر کنواں۔ کھائی کچھ دیکھا ہی نہ جائے اور یہ وحشت سر پر سوار ہوجائے کہ آنکھیں بند کرکے۔ سر پر پاؤں رکھ کر دوڑنا شروع کردیا جائے۔ مسلمان اس بات کو نظرانداز کررہا ہے کہ ہندو پچاس برس سے اپنی جماعتی تشکیل کررہا تھا۔ اس کا وہ دور حرکت کا نہیں بلکہ خاموش تنظیم کا تھا۔ انگریزی کی قوت بڑھتی چلی جارہی تھی لیکن یہ خاموشی سے اپنی انفرادی زندگی اجتماعی زندگی میں بدل رہا تھا۔ اسوقت اگر ان میں بھی مسلمانوں کی سی بوکھلاہٹ پیدا ہوجاتی تو نہایت آسانی سے انہیں مطعون کردیا جاتا کہ ہاں! تم اپنی جماعتی تشکیل کی فکر میں رہو اور انگریز اتنے میں اپنی قوت کے آہنی شکنجے تم پر کس دے گا اور اگر اس وقت ہندو اس دلیل کو محکم سمجھ کر انفرادی طور پر حرکت شروع کردیتا تو پھر آپ دیکھتے اس کا انجام کیا ہوتا۔

بدبختی سے جو دور ہندو کی اجتماعی تشکیل کا تھا۔ وہی دور مسلمان کے انتشار کا تھا۔ اب جس وقت

ہندو اپنی جماعتی تنظیم کو مکمل کر کے آمادہ بحرکت ہو رہا ہے۔ مسلمان مکمل طور پر انفرادیت کی لعنت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ اِس فرق کو تو وہ نظر انداز کر دیتا ہے اور طعنے دینے لگ جاتا ہے کہ ہاں، تم بیٹھے رہو اور ہندو راستے میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ یاد رکھیے! ہر وہ حرکت جس سے پہلے اجتماعی تنظیم نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ہلاکت کیطرف لے جاتی ہے۔ یہ ایک اٹل قانون ہے۔ جس سے نہ ہندو کو مفر تھا نہ آپ کو ہوگا۔ ہندو اس ابتدائی مرحلہ کو طے کر چکا ہے اور مسلمان کو اس کا احساس ہی اب شروع ہوا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ اس مرحلہ کو طے کیے بغیر آپ ہندو کے دوش بدوش بھاگنا شروع کر دیں تو فطرت کا اٹل قانون آپ کو اِس لیے نہیں معاف کر دیگا کہ آپ کی نیت بخیر تھی۔ کمزور و نحیف مریض کو بستر سے اُٹھنے اور دَوڑنے کے درمیانی مراحل بتدریج طے کرنے ہونگے۔ یہ جذبہ کہ ایک توانا و تندرست نوجوان بھاگتا جا رہا ہے۔ اور مجھے بغیر سہارے کے چلنے کی بھی اجازت نہیں دی جا رہی۔ علاج کے ناقص ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ ان مراحل کو تو آپ کو طے کرنا ہی ہوگا۔ البتہ یہ امر موجب ہزار اطمینان ہے کہ جس طبیب کے زیر علاج آپ ہیں اس کے پاس ایسے نسخے بھی موجود ہیں کہ جتنی قوت دوسرا مریض دس دن میں حاصل کرے۔ اتنی قوت وہ تم میں دس گھنٹے میں پیدا کر دے۔ قرآن کریم کے پاس اس چیز کا علاج بھی موجود ہے کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم سے پیچھے رہ جائے تو اسوقت کیا کرنا چاہیے۔ مسلمان کو معلوم ہی نہیں کہ وہ جماعتی زندگی جس کی تشکیل قرآنی خطوط پر ہوتی ہے اپنے اندر کتنی قوت رکھتی ہے۔ ذرا اس چیز کو اپنے اندر پیدا کرلو۔ پھر دیکھو کہ ہندو اور انگریز الگ الگ تو ایک طرف دونوں مل کر بھی تمہارا مقابلہ کرسکتے ہیں؟ یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں ہیں جس سے دُنیا کی ہر قوم واقف ہے، بدبختی یہ ہے کہ مذبذب مسلمان کو اپنے طبیب پر خود ہی اعتماد نہیں رہا کچھ تو ان میں سے ایسے ہیں جو برملا اپنے آپ کو دوسرے ڈاکٹروں کے زیر علاج لا چکے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو نسخہ تو اس سے لکھواتے ہیں لیکن علاج دوسروں سے کراتے ہیں۔ سو پہلے تو آپ کو فیصلہ کرنا پڑیگا کہ جس طبیب کو آپ اپنا طبیب مانتے ہیں۔ اس کی حذاقت و طبابت پر آپ کو یقین بھی ہے؟ جب یقین ہو تو پھر اس کا تقاضا یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اسکے سپرد کر دو۔ اور جو کچھ

کہتا ہے کرتے جاؤ۔ اور اگر (نعوذ باللہ) یقین نہیں تو پھر علانیہ اسطرف چلے جاؤ۔ جہاں آپ سمجھتے ہیں۔ کہ آپ کا علاج عمدہ طریق سے ہوسکے گا

---

(۴)

کہا جاتا ہے کہ اسلام آزادی کا حامی ہے۔ غلامی اُسکے نزدیک لعنت ہے۔ پھر مسلمان سب سے مقدم جنگ آزادی میں شریک کیوں نہ ہو جائے۔ باقی باتیں بعد میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

لفظ آزادی ذرا تشریح طلب ہے۔ ہندو کے نزدیک اول تو آزادی سے مفہوم محض اقتصادی آزادی ہے۔ یعنی یہ کہ اپنے مُلک کی پیداوار پر ہندوستانیوں کو پُورا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ یہی نظریۂ آزادی قومیت پرست مُسلمان حضرات کے بھی پیش نظر ہے، چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی تقریر کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے اسکے دوران میں وہ فرماتے ہیں +

"اسوقت مُلک افلاس کا گھر بنگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی اس کوشش میں ہیں کہ ہندوستان کے لیئے آزادی حاصل کی جائے۔ تاکہ ہندوستان کا روپیہ جو ہر سال مُلک کے باہر نکل جاتا ہے مُلک میں ہی رہے" (زمزم۔ ۲ جولائی ۱۹۳۸ء)

ہندو کے پیش نظر تو آزادی سے مفہوم ہی یہ ہے کہ اندرونِ مُلک کا انتظام اکثریت کے ہاتھ میں ہو اور چوکیداری کے لیئے انگریز کو ملازم رکھ لیا جائے۔ لیکن اگر آزادی سے مفہوم یہ بھی مان لیا جائے کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال دیا جائے گا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ باہر سے آئی ہوئی قوم کے ماتحت رہنا غلامی ہے کیونکہ یہ حکومت پردیسیوں کی ہے، اور سوراج سے مطلب یہ ہے کہ حکومت اپنے ملک والوں کی یعنی سودیشیوں کی ہو۔

لیکن کیا اسلام کے نزدیک بھی غلامی اور آزادی سے یہی مفہوم ہے ؟ کیا اسکے نزدیک ایک باہر سے آئی ہوئی قوم محض اس لیئے گردن زدنی ہے کہ وہ اپنے مُلک کی قوم کیوں نہیں ؟ اگر یہ نظریہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو فرمایئے کہ آپ کے خلفائے راشدینؓ۔ بالخصوص حضرت عمرؓ کے عہد میں

عرب کے مسلمانوں نے مصر و ایران، شام و عراق کے غیر ممالک کو فتح کیا اور وہاں اسلامی حکومت قایم کی۔ اگر اصول یہی ہو کہ ایک باہر سے آنے والی قوم اگر ملک کے اندر رہنے والی قوم پر حکومت کرے تو یہ سودیشی قوم اُس بدیشی قوم کی غلام ہو جائے گی اور یہ غلامی خدا کی لعنت ہے جسے دور کرنا جہادِ زندگی ہے تو آپ کو فوراً یہ بھی تسلیم کر لینا ہوگا کہ ان مسلمانوں نے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جنکے اعمالِ حیات آپ کے اسلام کا معیار ہیں، انہوں نے اِن دوسرے ممالک کے انسانوں کو غلام بنایا اور وہاں نعوذ باللہ۔ خدا کی لعنت پیدا کی! فرمایئے! کیا آپ کا حضرت عمرؓ کے متعلق یہی خیال ہے؟ نہیں یہ کہیئے کہ آپکا قرآن کریم کے متعلق یہی ایمان ہے جسنے مسلمانوں کو بشارت دی تھی کہ خدا کی یہ برگزیدہ جماعت نہ صرف عرب پر ہی حکمراں ہوگی۔ بلکہ ان ممالک پر بھی جہاں اِس سے پیشتر ان کے قدم نہ پہنچے تھے۔ ذرا سوچیئے تو سہی کہ ایسا ایمان رکھنے کے بعد اسلام کا باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہندو اس نظریہ کا حامل اِس لیئے ہے کہ اِس سے اسکا بگڑتا ہی کچھ نہیں اس پر ہمیشہ باہر والوں نے حکومت کی۔ اور اسے باہر جا کر کہیں کبھی ایک انچ زمین پر بھی حکومت کرنا نصیب نہ ہوا اس لیئے اُسکے نزدیک غلامی یہ ہے کہ کوئی باہر کی قوم اُسپر حکمراں ہو۔ اور آزادی یہ ہے کہ حکومت خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ آج مسلمان بھی اس نظریہ میں اُنکا ہمنوا ہے۔ اور نہیں سوچتا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

مسلمان کے نزدیک اصل شے یہ نہیں کہ حکومت کرنے والی قوم کہیں باہر سے آئی ہوئی ہے یا اس ملک کے اندر کی کوئی قوم ہے۔ اسکے نزدیک غلامی اور آزادی کا معیار یہ ہے کہ وہ جس نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کر رہا ہے وہ قرآنی نظام ہے یا انسانی نظام۔ اگر قرآنی نظام ہے تو وہ کہیں سے آئی ہوئی قوم کیطرف سے ہو عین آزادی ہے۔ اور اگر انسانی نظام ہے تو وہ خواہ اپنی قوم کیطرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ یکسر غلامی ہے۔ اگر مکہ میں رہنے والی قوم کسی وقت کعبہ میں بھی انسانی نظام کے مطابق حکومت شروع کردے تو اہل کعبہ کے لیئے ان کی ماتحتی غلامی ہوگی، اور اگر کوئی قوم افریقہ سے چلکر وہاں قرآنی نظام قایم کردے تو اُس قوم کی حکومت اہل مکہ کے لیئے عین آزادی ہوگی۔ لہذا مسلمان کے نزدیک ”بربیئی تقوی“ اتنا ہی نہیں کہ ہندوستان سے ”انگریز کو نکال دو“۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ حکومت جو قرآنی حکومت

نہیں ہے اور اس لیے اُس کی ماتحتی مُسلمان کے لیے غلامی ہے۔ اُس کی جگہ جو دوسری حکومت اس کے بعد قایم ہوگی۔ وہ کیسی ہوگی۔ اگر دونوں حکومتیں غیر قرآنی ہوں گی تو مُسلمان جیسے آج غلام ہے ویسے ہی اسوقت بھی غلام ہوگا البتہ ہندو ضرور آزاد ہو جائے گا کہ اس کا آزادی سے مقصود یہی ہے۔

لہٰذا جنگِ آزادی میں شرکت "برّ وتقویٰ" اُسوقت ہے جب یہ طے ہوجائے کہ اس نظامِ حکومت کے بعد آزاد ہندوستان میں نظامِ حکومت کم ازکم مُسلمانوں کے لیے قرآنی نظام ہوگا۔ کیا جنگِ آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ غیر مشروط طور پر شریک ہونے والوں نے کبھی اس کو بھی سوچا ہے یا محض "انگریز کو نکال باہر کرنا" ہی اُنکے نزدیک آزادی ہے؟ مسلمان کے نزدیک انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی یکساں لعنت ہے

کہہ دیا جاسکتا ہے کہ انگریز کو ہندوستان سے نکالدینے سے روٹی کا مسئلہ تو حل ہو جائیگا لیکن روٹی کا مسئلہ حل ہونے کے ساتھ جو اور لعنتیں مُسلمان پر مسلّط ہونگی انکا بھی آپنے کبھی خیال کیا ہے؟ دیکھئے کہ جو آزادی آپ کو آج جنت بنکر فریب دے رہی ہے اُس کی بنیادیں کن اصولوں پر رکھی جا رہی ہیں سب سے پہلے یہ کہ مُسلمان کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیونکہ "متحدہ قومیت" کے تخیل میں الگ قومیت کا نظریہ فرقہ پرستی ہے، جو سیاست ہند کے لغت میں بدترین لعنت کے مرادف ہے۔ اس متحدہ قومیت کے "نظامِ جمہوری" میں جس کا حصول حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے نزدیک عین آزادی ہے۔ اگر مُسلمانوں کی اقلیت اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) کو الگ رکھنے کی کوشش کرے گی تو اسکا حشر کیا ہوگا۔ یہ اس جنگِ آزادی کے قائدِ اعظم کی زبان سے سُنیئے فرماتے ہیں:۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈراکر، اور دھمکاکر اپنے قابو میں رکھتی ہے"۔ (میری کہانی۔ از پنڈت جواہرلال نہرو ص۵۵ جلد دوم)

اسی بنا پر بہار کی کانگریسی حکومت کے مُسلمان وزیرِ تعلیم نے تحریر فرمایا ہے کہ متحدہ قومیت کا مذہب وہ ہونا چاہیئے جو اکبر کے دینِ الٰہی کے رنگ کا ہو۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے نام ایسے نہیں رکھنے چاہئیں جن سے یہ بطور ہندو اور مسلمان کے پہچانے جائیں۔ اور یو۔پی کی کانگریسی حکومت کے وزیرِ تعلیم

سوامی سمپورا نند نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے کہ جب تک ہندو اور مسلم الگ الگ تہذیبیں مٹ نہیں جاتیں متحدہ قومیت کی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی فرمایئے کہ جس نظام حکومت میں مسلمان کے مخصوص تمدن اور قومیت کا یہ انجام ہونیوالا ہو۔اس کے حصول میں اشتراکِ عمل "بر و تقوی" ہے یا "اثم و عدوان"۔

انگریز کا ہندوستان سے نکال دینا۔ اور اسطرح یہاں کی اقتصادی مشکلات کا حل دریافت کرلینا یقیناً "بر و تقوی" ہے۔ اس میں شرکت مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے لیکن وہ فارغ البالی جو مسلمان کو اپنا مذہب۔ تمدن۔ اسلامی قومیت بیچکر حاصل ہو۔ایک سچے مسلمان کے نزدیک قطعاً اس قابل نہیں کہ وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔

مسلمان آزادی کے بغیر مسلمان ہی نہیں بشرطیکہ آزادی سے مفہوم یہ ہو کہ جس نظام کے تحت یہ زندگی بسر کریگا وہ قرآنی نظام ہوگا۔ اور اس امر کی ضمانت آپ کو کبھی نہیں مل سکتی۔ تاوقتیکہ آپ اپنی جماعتی زندگی کی تشکیل کے بعد اپنے اندر اتنی قوت پیدا کرلیں کہ نئے نظام حکومت میں آپ اپنے لیئے اپنا نظام زندگی متعین کرنے پر قادر و مختار ہوں ہندو مسلمانوں کے نزدیک برطانوی حکومت کے خاتمہ کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ اسکی جگہ کم از کم اپنے لئے قرآنی حکومت کو قائم کرسکیں۔

پھر یہ بھی کہا جاتاہے کہ انگریز ہندوستان (۵) سے نکل جائے تو اسلامی ممالک پر سے اس کی گرفت ڈھیلی ہو جائے گی۔ اس لیئے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دیگر اسلامی بھائیوں کی خاطر ہندوؤں سے جنگ آزادی میں غیر مشروط طور پر شریک ہونا چاہیئے۔

اوّل تو یہ ہی غلط ہے کہ ہندو انگریز کو ہندوستان سے نکالنا چاہتا ہے۔ حقایق سے آنکھیں بند کرکے کسی اپنی خوش فہمی میں مگن رہنا صحیح مسلک نہیں ہوا کرتا۔ مختلف سلطنتوں کی آج حالت یہ ہے کہ باوجود اس قدر فوج اور سامان حرب رکھنے کے ایک دوسرے سے خائف ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کل ہی کون سی بالادست قوت انہیں ہڑپ کرجائے۔ ان حالات کی موجودگی میں کیا اس بات کو تصور میں بھی لایا جاسکتا ہے کہ ہندو اس بات کو گوارا کرلے گا کہ وہ نہتہ۔ بے سازوسامان رہ جائے اور انگریز کی حفاظت کو ٹھکرادے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی ایک آئینی تبدیلی ہے۔ انقلاب نہیں ہے آج

اگر انگریز اس بات پر صلح کرنے پر آمادہ ہو جائے کہ اندرونِ ملک کا کلیۃً انتظام ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا جائیگا۔ تو ہندو فوراً اس سے صلح کرلے گا۔ اور آزادی کی جنگ کا خاتمہ ہو جائیگا۔

لیکن ہم تسلیم کیئے لیتے ہیں کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال دینا ہی مقصود ہے، تو اس کے بعد دو شکلیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور مسلمان یہاں "متحدہ قومیت" کا جزو بن کر رہے۔ اس کے الگ قومی اور ملی رجحانات باقی نہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور مسلمان یہاں ایک مستقل قوم کی شکل میں موجود ہو جو اکثریت کے لیے ایک ایسی سخت ہڈی ہو جسے نگلنا آسان نہ ہو۔ ملک کی داخلی اور خارجی پالیسی میں اُسکا پُورا پُورا حصہ ہو۔ اور غیر مسلم اقوام اس کی رضا جوئی کے بغیر ایک قدم بھی نہ چل سکیں کہ ۹ کروڑ کی اقلیت بشرطیکہ وہ ریت کے ذرّوں کی طرح منتشر نہ ہو بلکہ ایک چٹان کیطرح اجتماعی زندگی بسر کر رہی ہو۔ کچھ مذاق نہیں ہوتی۔ یہ تو اکثریت کا جینا حرام کر سکتی ہے۔ پہلی صورت میں تو ظاہر ہے کہ کسی اسلامی ملک کی ہمدردی کی خاطر ہندوستان کی "متحدہ قومیت" انگریز سے یا کسی اور بڑی طاقت سے قطعاً بگاڑ نہیں پیدا کرے گی۔ یہ پرائے شگون کیخاطر اپنی ناک کیوں کٹوانے لگی لیکن دوسری صورت میں یہاں کی اکثریت کے لیے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کسی بیرونی طاقت کی مخالفت یا موافقت کرنا۔ محال ہو جائے گا۔ فرمائیے کونسی صورت خود مسلمانانِ ہند اور اسلامی ممالک کے لیئے بہتر ہے؟ یقین مانیئے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ایک جماعت کی شکل میں منظم ہو جائیں تو اُن کی جمعیت بجائے خویش دیگر اسلامی ممالک کے لیئے ایک حیات بخش قوت بنجائے گی لیکن یہاں کی کوئی حکومت یہ دیکھ نہیں سکتی کہ مسلمان ایک جماعت بنجائیں۔ اُن کی جمعیت کو ٹکڑے کر دینے کے لیئے جو سیاسی چالیں انگریز چلا۔ انہی کے قدم بقدم اب ہندو چل رہا ہے۔ انگریز کے دورِ حکومت میں بھی سرکار کا ساتھ دینے والا طبقہ معزز و مکرم اور الگ رہنے والا معتوب و مقہور رہتا۔ ہندو کے آغازِ حکومت میں بھی ہندو کے ساتھ رہنے والا "قوم پرست" اور اُن سے الگ رہنے والا "ٹوڈی بچہ" بن رہا ہے۔

پھر یہ نہ سمجھئے کہ آپ کو اپنی جماعتی تشکیل کے لیئے برسوں کی مدت درکار ہے۔ اب تو وقت وہ آچکا ہے کہ

جماعت دنوں میں بن سکتی ہے۔ ملک میں عام طور پر اب دو ہی قسم کے خیالات کے مسلمان ہیں۔ ایک جنگِ آزادی میں کانگریس کے ساتھ انفرادی طور پر شامل ہونے کے حامی۔ دوسرے کانگریس کے ساتھ من حیث الجماعت اشتراکِ عمل کرنے کے مؤید۔ چونکہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ انفرادیت۔ اور ایسے اہم اور ملی معاملہ میں انفرادیت۔ قومی خودکشی ہے۔ اس لیے اوّل الذکر مسلمانوں کو صرف اتنا سمجھانا مقصود ہے کہ وہ تھوڑی دیر کانگریس سے الگ ہو کر اپنی جماعتی تشکیل کرلیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جماعت دنوں میں بن جائے گی، اسکے بعد جو اکّا دکّا مسلمان الگ رہ جائے گا۔ وہ جماعت کے مقابلہ میں کوئی وزن ہی نہیں رکھے گا۔ اس اجتماعیت کے بعد پھر "بر و تقویٰ" کے کام میں تعاون کیجئے۔ اور کانگریس سے ملکر انگریز کو ہندوستان چھوڑ۔ انگلستان سے بھی باہر نکال آیئے۔ یہ سب اسلامی مسلک ہوگا۔ اُسوقت آپکا یہ گلہ بھی مٹ جائیگا کہ لیگ "سروں" اور "نوابوں" کی جماعت ہے۔ اگر یہ "سر" حضرات ہندوؤں میں جذب ہو جانا ہی اپنا مسلک اختیار کرلیں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی الگ جماعت تو کوئی اور ہی ہوگی۔ کانگریس اپنی ابتدائی چالیس سالہ زندگی میں خود "سروں" اور "نوابوں" ہی کی جماعت تھی اور آج بھی وہاں "سر" ہونا کون سا جرم ہے ؟ یاد رکھیئے! اگر "سر" ہونا اس لحاظ سے بُرا ہے کہ اس سے انگریز کے تولّے (دوستداری) کی بُو آتی ہے۔ تو قرآن کریم کی میزان میں ہندو سے تولّی بھی اتنا ہی بڑا جرم ہے۔ اسلامی مسلک تو یہ ہے کہ نہ انگریز سے تولّی ہو نہ ہندو سے۔ بلکہ مسلمان باہمی تولّی سے ایک جماعت بن کر رہیں اور اپنے مرکز کی اطاعت میں دوسروں سے "نیکی اور بھلائی" کے کام میں تعاون کریں اور خود قرآنی نظام کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ ہمارے نزدیک انگریز اور ہندو سے تولّی کرنے والے دونوں برابر ہیں

اگر باین نرسیدی تمام بولہبی است

قرآن اور قرآنی دلائل

(از ادارہ)

قرآن کریم اس خدائے قادر وحکیم کا کلام ہے جس نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو پیدا کیا ہے اور ان کے لئے ایک اٹل قانون بنا دیا ہے جو فطرت الٰہی سے موسوم ہے اس کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ آسان ہے ۔ فطرت وعقل کے مطابق ہے ۔ ہر زمانہ اور ہر ماحول میں انسان کا رفیق ہے اور ایک ایسا ضابطۂ عمل اور دستور زندگی ہے جو ہر راہرو کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتا ہے ۔ یہ کلام آسان سمجھنے والوں کے لئے آسان اور مشکل سمجھنے والوں کے لئے مشکل ہے یہ اس شخص سے ہمیشہ اجنبی رہتا ہے جو اجنبی اور غیر فطری طریقوں سے اس تک رسائی حاصل کرنا چاہے اور اس شخص پر اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے جو اس کو اپنا دوست، اپنا رفیق اور اپنا محبوب سمجھ لے اور اس کے مزاج میں اتنا دخل حاصل کر لے کہ اشارہ پاتے ہی اس کا مطلب سمجھ جائے اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو دوسروں کی وساطت کے بغیر خود اسی سے سوال کر کے جواب پائے ۔ کس قدر آسان اور اقرب الی الفہم کتاب ہے اور کس قدر مشکل اشکالات خود ہماری پیدا کی ہوئی ہیں کیونکہ ہم مشکل اور تاریک راستوں سے گزرنے کو اپنا کمال تصور کرتے ہیں اور مختلف قسم کی گمراہیوں نے ہمارے دماغ کا سوراخ اتنا ٹیڑھا کر دیا ہے کہ اس پاک کتاب کی کوئی سیدھی بات اس میں داخل نہیں ہوتی اگر ہم سہل اور کشادہ راستوں کو اختیار کر لیں تو یہ پاک کتاب آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کریگی اور ہمیں وہ چیز عنایت کرے گی جس کی طلبگار ہماری فطرت اور ہمارا ضمیر ہے ۔ ہمارا ضمیر اول و آخر حق کا طلبگار ہے ۔ نور کا متلاشی ہے ۔ اور شفا کا طالب ہے اور قرآن دنیا کو اسی بنا پر دعوت دیتا ہے کہ وہ حق ہے انه لحق وہ نور مبین ہے ۔ وہ شفاء لما فی الصدور ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ حق سے زیادہ اور کوئی چیز آسان اور انسانی فہم کے قریب نہیں ہو سکتی ۔

۳ قرآن اور مسلمان

ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے کہ قرآن حکیم آسان ہے نعوذ باللہ جس چیز کا مدعی خود قرآن نہ ہو ہمیں کیا حق ہے کہ اُس کو قرآن کیطرف منسوب کر دیں بلکہ خود اس نے کہاہے کہ انما یسرناہ بلسانك اے پیغمبر! ہم نے آپ کی (عربی) زبان میں اس کو آسان کر دیاہے مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ قرآن کو خود مسلمانوں نے مشکل سمجھ لیاہے اور چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں نے اسکے قریب جانے کی کوشش نہیں کی !! اس پاک کتاب کی خدمت سلف سے ہوتی چلی آئی ہے اور ہر زمانہ میں اس کے مبلغ اس کے معلم اور اُسکے مفسر اُس کو سمجھنے اور سمجھانے کا مبارک فرض انجام دیتے رہے ہیں ہزاروں تفاسیر لکھی گئیں، بے شمار علوم کی مدد سے اسکے اسرار و خفایا معلوم کرنے کے جتن کیے گئے بہت سے شیخ الاسلام اور مفسرین عظام اُٹھے جنہوں نے اس بحرِ بےکراں میں شناوری کی متکلمین اور حکمارِ اسلام نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ دنیا کو عقلی طریقوں پر اس کتاب سے روشناس کرائیں گے مگر نتیجہ یہ کہ آج بھی مسلمان اسی جگہ ہیں، جہاں ایک ہزار سال پہلے تھے۔ اور قرآن ان سے اتنا ہی دُور ہے جتنا کہ ایک اجنبی کو اجنبی سے ہونا چاہیئے! کیا یہ حیرت کا مقام نہیں؟ کیا یہ ایسی چیز نہیں کہ اس پر تمنی و فرادیٰ تمام امتِ اسلامیہ غور کرے؟

متکلمین اور حکمارِ اسلام

جس طرح قرآن حکیم آسان ہے اسی طرح ان اسباب کا پتہ لگانا بھی آسان ہے جنہوں نے قرآن کریم کو مشکل نا قابل فہم اور چیستاں بنا رکھاہے، ہمیں اس کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں بلکہ تھوڑی سی جرأت کے ساتھ ہمیں ان لوگوں کی کاوشوں کا جائزہ لینا چاہیئے جو قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے کے اجارہ دار ہیں اور جنکے علم و فضل و حکمت و فلسفہ اور وضعی اور اصطلاحی علوم کے سکّے آج تک دل کی مملکت میں رواں ہیں۔ یہ ہمارے متکلمین اور حکمار، یہ ہمارے امام رازیؒ اور امام الحرمینؒ یہ ہمارے اشاعرہ اور ماتریدیہ اور یہ ہمارے معتزلہ اور انکے اکابر کیا ہیں؟ قرآن کریم کے لیے مجسم پردہ ہیں قرآن کریم کی آسانیوں کو مشکل بنانے والے ہیں اور اللہ کی کتاب کو اپنے وضعی اصولوں اور فلسفیانہ

اصطلاحوں کے ذریعہ سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں یہ وہ بزرگ ہیں (اللہ تعالیٰ اُن کی قبروں کو نور سے بھرے) جو ابتدا میں قرآن کو آگے آگے رکھتے ہیں مگر تھوڑی دور چل کر قرآن کو پیچھے چھوڑتے اور آپ آگے نکل جاتے ہیں +

قرآن کریم کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی مشکل نہیں ہوسکتی کہ اُس کو سمجھنے کے لیے ان علوم کا سہارا لیا جائے جو خطا کار انسانوں کے وضع کردہ ہیں جنکے مبادیات و مقدمات۔ جنکے دلائل براہین ارسطو کی غلط منطق اور یونانی فلاسفہ سے ماخوذ ہیں اور جنکے علم کلام کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ قرآن کریم کی سادہ اور عام فہم باتیں جنکے سامنے انسانی فطرت خمیدہ ہو جاتی ہے مغلق، ناقابلِ فہم اور غیر فطری بن جائیں، اور سیدھی سادھی بات اصطلاحات میں پھنس کر اپنا حُسن و جمال غارت کردے

قرآن کریم کی خصوصیات

قرآن کریم پر غور و تدبر کرنے سے اُس کی سب سے بڑی تین خصوصیات، ہمارے سامنے آتی ہیں

(۱) وہ عقائد کے بارے میں جس حقیقت کا دعویٰ کرتا ہے اس پر دلائل بھی خود ہی پیش کرتا ہے وہ ہرگز اس بات کا محتاج نہیں کہ مثلاً خدا کے وجود اور وحدانیت اور حشر و نشر کو ثابت کرنے کے لیے کوئی خارجی ذریعہ اُس کی امداد کرے اور ارسطو کی منطق اور خود ساختہ اصطلاحیں اُس کی آبرو قایم رکھنے کے لیے آگے بڑھیں اور اُسکے دعاوی پر بطور احسان اپنی طرف سے دلائل قایم کریں۔ قرآن جو دعویٰ کرتا ہے خود ہی اسپر دلیل و حجت قایم کرتا ہے اور خود ہی مخالفوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرکے ان میں ایقان و اذعان کا نُور پیدا کرتا ہے +

(۲) قرآن کریم کا استدلال سادہ اور فطری مقدمات پر مبنی ہوتا ہے وہ ہمیشہ ایسے دلائل پیش کرتا ہے۔ جو اقرب الی الفہم اور اوفق بالطبع ہوتے ہیں اور جن سے ایک معمولی استعداد کا انسان بھی تسلی حاصل کرلیتا ہے اسکے مقدمات و مبادیات غامض نہیں ہوتے۔ اس کی تقریر فلسفہ کا پہن کر سامنے نہیں آتی اور نہ وہ ناقابل فہم اصطلاحوں کا استعمال کرتا ہے +

(۳) قرآن کریم کی دعوت اس اذعان و یقین پر ہے جو کائنات پر غور و تدبر کرنے سے

انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور جس سے عوام اور علماء دونوں کو تسکین حاصل ہو جاتی ہے

متکلمین اسلام کی غلط فہمی

متکلمین اور حکماء اسلام کی پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ اپنے ذہن میں پہلے چند اصول مقرر کر لیتے تھے اور اسکے بعد اپنے مقصد کے مطابق قرآن میں تاویل کا فتنہ پیدا کرتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قرآن کی مشکل تو حل نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ سرے سے مشکل ہی نہیں ہے بلکہ سرتا پا آسان ہے۔ البتہ گرہ پر گرہیں پڑتی چلی جاتی تھیں

اُن کی دوسری غلطی یہ تھی کہ وہ حقایق قرآنی پر اپنی طرف سے دلائل قایم کرتے تھے اور اپنے اختراعی اصول کی بنا پر قرآن کریم سے انکا استنباط کرتے تھے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے منطقی اصطلاحوں اور اختراعی دلیلوں کے زور میں قرآن حکیم کیطرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ اپنی وکالت خود کس طرح کرتا ہے اور انسان کے ضمیر کو مخاطب کرنے کے لیے اسکے پاس کیا کیا طریقے ہیں اور کس ترکیب سے وہ انسان کی عقل سلیم میں اُترنے اور اسکو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حالانکہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے مزعومہ اصول و دلائل کے بجائے ہر مسئلہ میں قرآن حکیم ہی کو حکم قرار دیا جائے اور خالی الذہن ہو کر یہ دیکھا جائے کہ اللہ کی یہ کتاب کس طرح اور کس حد تک کسی عقیدہ کا اثبات اور اس پر کس طرح دلائل قایم کرتی ہے مگر افسوس ہمارے متکلمین نے اپنے اختراعی اصولوں کی بنا پر کتاب الٰہی میں تاویلوں کا دروازہ کھول دیا اور قرآن کریم کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل گئے اُسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ تو قرآن کریم کے طرز خطاب و طریق استدلال کو ہی سمجھ سکے اور نہ ہی ان سادہ اور فطری مقدمات کا ادراک کر سکے۔ جو قرآن کی جان اور انسانی ضمیر کی اساس ہیں۔

چنانچہ انھوں نے جب وجود باری پر دلائل قایم کرنے چاہے تو قرآن اور فطرت دونوں سے الگ ہو گئے نہ وہ خدا کا وجود ہی ثابت کر سکے اور نہ قرآن کی طرف دیکھ سکے اور بجائے شبہات دُور کرنے کے قرآن کے ارد گرد انھوں نے شکوک کا ایک انبار لگا دیا۔

امام ابن تیمیہ اور قرآن۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اشاعرہ متکلمین اور فلاسفہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرما گئے ہیں کہ :۔

ان الرازی قد جمع ماجمعه من طرق المتکلمین والفلاسفة ومع هذا فلیس فی کتبه اثبات الصانع ولیس فیه ایضاً اثبات النبوۃ ..... وسبب ذالك اعراضهم عن فطرة العقلیة والشرعة النبویة بما ابتدعه المتبدعون مما افسدوا به الفطرة والشرعة فصاروا یسفسطون فی العقلیات ویقرمطون فی السمعیات

امام رازی نے متکلمین اور فلاسفہ دونوں سے استفادہ کیا لیکن اسکے باوجود اُن کی کتابوں میں صحیح طور پر نہ خدا کے وجود کا اثبات ہے اور نہ ان میں نبوت پر کوئی دلیل ہے اور اسکا سبب صرف یہ ہے کہ متکلمین نے فطرت سلیمہ اور شریعت محمدیہ دونوں سے اعراض کیا اور طرح طرح کی بدعتیں ایجاد کرکے فطرت اور شریعت دونوں کی خلاف ورزی کی چنانچہ وہ عقلیات میں جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ سفسطہ ہوتا ہے اور سمعیات میں جو کچھ فرماتے ہیں اُن کی دھمیاسے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"[له]

ابن رشد اور قرآن

علامہ ابن رشد اندلسی جو متکلم بھی تھے اور فقیہہ بھی اور ارسطو کے فلسفہ کے شارح بھی (متوفی ۵۹۵ھ) انھوں نے متکلمین کی غلطیوں اور قرآن حکیم کی حکمتوں پر ایک دلنشیں اور دلپذیر تقریر کی ہے جس سے لوگوں کا سُراغ ملجاتا ہے جنہوں نے قرآن کی راہ میں بے شمار مشکلات پیدا کر دی ہیں ہم ذیل میں انکی تقریر کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

فان قیل فاذا لم تکن هذه الطرق التی سلکها الاشعریة ولاغیرهم من اهل النظر

اگر کوئی پُوچھے کہ جب اشاعرہ اور معتزلہ کا طریقہ جمہور کی تعلیم کے لیے کافی نہیں تو پھر

له کتاب النبوات مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۵ ۱۲

وہ کون سا طریقہ ہے جس کو صحیح سمجھنا چاہیئے؟ تو ہم اسکا جواب یہ دینگے کہ تم متکلمین کے طریقوں کو چھوڑ کر صرف قرآن حکیم کو پیش نظر رکھو تو تمام مشکلیں خودبخود حل ہو جائیں گی لوگوں کی تین قسمیں ہیں بعض لوگوں کے لیئے ہر بات پر منطقی دلیل قایم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض صرف خطیبانہ انداز سے متاثر ہو جاتے ہیں اور بعضوں کے لیئے صرف وعدہ وعید کافی ہوتے ہیں قرآن چونکہ ایک معجزانہ کتاب ہے اور تمام جہان کی ہدایت وسعادت کے لیئے نازل ہوئی ہے اسلیئے وہ تینوں طریقوں کی جامع ہے ایک عامی بھی اسی طرح مطلب سمجھ لیتا ہے جس طرح ایک فلسفی پس جو شخص اس بنا پر قرآن حکیم میں بےموقع تاویل کرتا ہے۔ وہ قرآنی حکمتوں کو نہیں سمجھتا صحابہ کرام سے بڑھ کر تقوی وطہارت میں کون ہو سکتا ہے؟ اسکے باوجود بے جا تاویلوں سے انھوں نے قرآن کو مسخ نہیں کیا۔ لیکن صحابہ کرام کے بعد ایمانوں میں جتنا ضعف پیدا ہوتا گیا اُسی نسبت سے تاویلوں کی اشاعت بھی ہونے لگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلافات بڑھ گئے محبت مفقود ہو گئی اور شریعت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ پس جو شخص شریعت کو ان بدعتوں اور فسادوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ اس کو لازم ہے کہ قرآن پاک کو اپنے آگے رکھ لے اور ایک ایک عقیدہ کے دلائل کو الگ جمع کرتا جائے اور جس حد تک قرآن حکیم نے کوئی تعلیم دی ہے اس کو اسی حد تک رکھے اور کسی آیت میں حتی الامکان تاویل نہ کرے بجز اس صورت کے کہ تاویل خود نص سے مفہوم ہوتی ہو۔ کیونکہ قرآن کریم میں یہ تین باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو کسی اور کلام میں نہیں پائی جاتیں اول یہ کہ جس طرح اسکے دلائل اقناعی اور خطابی ہیں۔ یعنی عام آدمیوں کو ان سے تسلی ہوتی ہے اسی طرح وہ قیاسی اور برہانی بھی ہیں یعنے منطق[1] کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

---

[1] منطق سے مُراد عقل سلیم کی حجت ہے نہ کہ ارسطو کی منطق جو غلط مسلمات اور فرضی دلائل پر مبنی ہے +

دوسرے یہ کہ وہ اس قدر صاف ہیں کہ تاویل کی ضرورت ہی واقع نہیں ہوتی
تیسرے یہ کہ اگر تاویل کی ضرورت ہوتی ہے تو خود قرآن مجید کی دیگر آیات سے
مسئلہ صاف ہو جاتا ہے اور ہمیں کسی آیت کو اسکے ظاہری معنی سے پھیرنے کی ضرورت
نہیں ہوتی"[۱]

ابن رشد نے ان سطور میں قرآن فہمی کا جو اصول بیان کردیا ہے اس سے نہ صرف تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ متکلمین اور فلاسفہ کی تمام بدعتوں کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے اور ہم خود قرآن سے سوال کرنے اور جواب پانے کی سعادت حاصل کرسکتے ہیں۔

مسلمان جب تک "عقلی" علوم سے دُور رہے اور کتاب وسُنّت کی سادہ اور فطری تعلیم کو آگے رکھتے رہے اسوقت تک وہ تمام فسادات سے محفوظ رہے مگر جب ان میں یُونانی فلسفہ کی بدولت معقولات کا مذاق پیدا ہوا اور ارسطو کے نظریات سے انہیں اسلام کی دُنیا دیں ہلتی نظر آئیں تو وہ بہت گھبرائے اور اُنکے لیے اسکے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ وہ بھی مخالفوں کے مقابلہ میں عقلی دلائل اختیار کریں اور یُونان کے فلسفہ کی دھجیاں اڑائیں مگر اس اضطراب اور پریشانی میں اُن کو خیال ہی نہ رہا کہ قرآن کریم نے بھی حقائق وعقائد پر دلائل قائم کیے ہیں اور وہ دلائل نقلی نہیں بلکہ سرتاسر عقلی ہیں جن سے عوام وخواص سب کو تسلی حاصل ہوتی ہے اس سلسلہ میں ابن رشد اندلسی کا یہ قول کتنا صحیح ہے کہ۔

ہماری اس تقریر سے تم پر واضح ہوگیا ہوگا کہ وجود باری تعالیٰ کے اثبات پر اشاعرہ
کے تمام مشہور طریقے یقینیات پر مبنی نہیں ہیں وہ نہ عقلی ہیں نہ شرعی اور نہ ان سے یقین
کی دولت حاصل ہوتی ہے جس شخص نے وجود صانع کے سلسلہ میں قرآنی دلائل
مطالعہ کیا ہے اور اسکے براہین پر غور و فکر کی نظر کی ہے اسپر ہماری یہ بات پوشیدہ نہیں
رہ سکتی۔ اگر تم غور کروگے تو شریعت میں تم کو دو چیزیں صاف نظر آئیں گی۔ اول یہ کہ
قرآن کا طرز استدلال یقینی ہوتا ہے یعنی اس سے قلب و دماغ میں یقین کی کیفیت

---

[۱] دیکھو ابن رشد کی کتاب "فصل المقال فیما بین الحکمۃ والشریعۃ من الاتصال" مطبوعہ مصر ۱۳۱۳ھ منہ

پیدا ہو جاتی ہے دوسرے یہ کہ اسکے مقدمات عام فہم، بسیط اور اقرب الی الفہم ہوتے ہیں اور اسکے نتائج نہایت روشن اور سہل۔[1]"

مگر متکلمین عقائد کے اثبات میں فرضی تکے لڑاتے اور قرآن حکیم کے فطری دلائل کو چھوڑ کر اپنے فرضی اور قیاسی دلائل سے اسلام کی حمایت کرتے رہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی کوششوں سے اسلام کو تو فائدہ نہ پہنچا اُلٹا قرآن کریم چیستان بن گیا اور مشکلات پر مشکلات نے اس کی صورت اس قدر مسخ کر دی کہ وہ سہل اور آسان ہونے کے باوجود کسی کے سمجھ کے قابل نہ رہا۔ اب ان تمام مشکلات کا حل یہی ہے کہ متکلمین حکمار اسلام اور اسلامی فلاسفہ کے دلائل سے قطع نظر کر کے ہر معاملہ میں قرآن ہی کو حَکَم بنایا جائے۔ اُسی سے دریافت کیا جائے کہ اُسکا دعوے کیا ہے اور اسی سے پوچھا جائے کہ اُسکے پاس دلیل کیا ہے۔ تمام علوم کو پیچھے چھوڑ دو اور صرف قرآن کو آگے رکھ لو پھر کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی۔ اور قرآن انسانی قلوب وضمیر کو اطمینان کی دولت سے مالا مال کرتا چلا جائے گا۔

اب ہم متکلمین اور حکمار کی اختراعی اور وضعی دلیلوں کیطرف متوجہ ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ان دلائل کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کو قرآن حکیم نے اچھوتے اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہے تاکہ ایک محقق کو معلوم ہو جائے کہ انسان ضمیر کی تسکین قرآنی دلائل سے ہوتی ہے یا متکلمین کے دلائل اور یونانی فلاسفہ کے براہین سے۔

متکلمین کے دلائل اس قدر فنی اور اصطلاحی مغلقات سے بھرے ہوئے ہیں کہ عوام تو ایک طرف خواص بھی انہیں مشکل سمجھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی مثال پیش کرنا ہمارے قارئین کے لئے کچھ مفید نہ ہو سکتی تھی لیکن ہم بایں ہمہ دو چار مثالیں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ جن لوگوں کو از خود ان حضرات کی تصانیف پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ بھی اندازہ کر سکیں کہ اس مجموعہ چیستان سے قرآن کتنا سمجھ میں آسکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] دیکھو فصل المقال صہ ۶۲ - ۱۲۔

اُردو ہندی کا مسئلہ

(جناب محمد اکرم خان صاحب مدیر روزنامہ شمس ملتان)

(اگست کے پرچہ میں جناب رازی کا مضمون "واردہا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" شائع ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ کا دوسرا مضمون زبان کا مسئلہ تھا جو ادارہ طلوع اسلام کیطرف سے اسوقت لکھا جا رہا ہے اس اثنا میں جناب محمد اکرم خان صاحب کا یہ مضمون موصول ہو گیا جو اتفاق سے اسی موضوع پر ہے، اسے ہم بکمال مسرت شائع کر رہے ہیں، طلوع اسلام کا موعودہ مضمون آیندہ پرچہ میں شائع کیا جائیگا انشاءاللہ۔ زبان کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس پر مسلسل لکھنے کی ضرورت ہے۔ "طلوع اسلام")

ہمارے بدقسمت ملک میں زبان کا جھگڑا اگرچہ تقریباً آدھی صدی سے جاری ہے لیکن چند برس سے اس سوال نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اب اس بحث نے اخبارات و رسائل کی حدود سے نکل کر اہل وطن کی عملی زندگی کو نہایت شدت سے متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھکر اس اصلی سبب کے پتہ لگانے کی کوشش کریں جو اس جھگڑے کی تہ میں کام کر رہا ہے اور بعد ازاں اس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے صحیح راستہ اختیار کرنے کی طرف متوجہ ہوں

تاریخی پس منظر ہندوستان کی لسانی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو نظر آتا ہے کہ زمانہ قدیم میں آرین قوم وسط ایشیا سے تورانی زبان کی ایک شاخ اس ملک میں لے آئی اس شاخ کا نام سنسکرت تھا۔ کچھ تو یہاں کی نامعلوم قدیم زبانوں کے میل جول سے، کچھ مابعد کے بابلی، یونانی اور ایرانی حملوں کے نتیجہ کے طور پر، کچھ مرور زمانہ اور کچھ اس ملک کی آب و ہوا کے اثر سے یہ زبان بدلتی چلی گئی حتیٰ کہ اصلی سنسکرت صرف ایک مذہبی اور علمی زبان ہو کر رہ گئی اور عام بول چال کے لئے اسکی وہ بگڑی ہوئی صورت رائج ہو گئی جس کو

"پراکرت" کے عام نام سے پکارا جاتا ہے اور جو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف تھی،
آج سے تقریباً ایکہزار برس پہلے جب مسلمانوں نے اس ملک میں قدم رکھا تو یہاں مقامی زبانوں کے اختلاف کی یہی کیفیت تھی اس ملک میں اسوقت کی کسی مشترکہ زبان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ دہلی اور آگرہ کے نواح میں ایک زبان برج بھاشا کے نام سے رائج تھی۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر مقامی زبانوں کو مقامی نسبت سے پکارنا شروع کیا مثلاً وہ سندھ کی زبان کو سندھی، ملتان کی زبان کو ملتانی اور باقی تمام ملک کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہنے لگے چونکہ باقی زبانوں میں برج بھاشا کسی حد تک مرکزی حیثیت رکھتی تھی اس لئے رفتہ رفتہ اسی کا نام ہندی پڑ گیا۔
مسلمانوں کے ساتھ جب عربی، فارسی اور ترکی زبانیں ہندوستان میں داخل ہوئیں تو ان کے بے شمار الفاظ مقامی بولیوں میں شامل ہونے شروع ہو گئے، ہندوؤں کی مذہبی اور علمی زبان وہی سنسکرت رہی اور مسلمانوں کی عربی اور فارسی۔ لیکن چونکہ سرکاری زبان فارسی ہو گئی اس سے مقامی زبانوں پر بہت اثر پڑا۔ یہاں تک کہ اس امتزاج سے ایک نئی زبان کی تشکیل شروع ہوئی جو شروع میں ہندی یا ہندوی کہلائی، بعد میں ریختہ اور آخرکار اُردوئے معلی یا محض اُردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس طرح مسلمانوں کے دور حکومت میں سیاسی طور پر پہلی دفعہ ہندوستان نے ایک احد ملک کی صورت اختیار کی اسی طرح ہندوستان کی یہ مشترکہ زبان بھی پہلی بار وجود میں آئی اور اسی زبان کو تمام ملک کی نسبت سے ہندوستانی کا نام بھی دیا گیا، گویا یہ ایک ہی زبان تھی جو ہندی یا اُردو یا ہندوستانی کہلائی اور تمام ملک کی سرکاری زبان کی طرح اس کا مشترک رسم الخط فارسی تھا، البتہ مقامی طور پر زیادہ تر ہندوؤں میں سنسکرت سے نکلے ہوئے مختلف رسم الخط بھی استعمال ہوتے تھے جن سے موجودہ وقت کے ناگری، گورمکھی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ رسم الخط ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔
جب انگریزوں کا دور حکومت آیا تو ابتداء میں ایک عرصہ تک سرکاری زبان فارسی ہی

برقرار رہی چنانچہ اسوقت تک اُردو یا ہندوستانی کی مشترکہ حیثیت بھی بدستور قایم رہی لیکن جب لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد میں سرکاری زبان کے بجائے انگریزی مقرر ہوگئی تو اس اہم تبدیلی کے گوناگوں اثرات ظاہر ہونے لگے، جب تک تمام ملک کی سرکاری زبان کا رسم الخط فارسی تھا اسوقت تک اُردو یا ہندوستانی کے کسی اور رسم الخط کا "کل ہند" حیثیت حاصل کرنا قریباً ناممکن تھا، لیکن جونہی انگریزی نے فارسی کو حکومت کی کرسی سے اُتارا تو ہندوستانی زبان کے فارسی رسم الخط کی ہندوستان گیری بھی مسلّم نہ رہی اور اس کے مقابلہ میں بعض مقامی رسم الخط سر اُٹھانے لگے جنمیں سے ایک ناگری رسم الخط بھی تھا جسے آج ہندی رسم الخط کا نام دیکر تمام ملک میں پھیلانے کی کوشش کیجا رہی ہے۔

انگریزی تعلیم نے ہندوؤں میں صدیوں کی غلامی کے بعد جو سیاسی بیداری پیدا کردی اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں رفتہ رفتہ اجتماعی احساس، متحدہ قومیت کا جذبہ اور اپنی پرانی تہذیب" کو زندہ کرنے کا شوق بڑھنے لگا، اس جذبہ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں کی طرح زبان پر بھی پڑا، چنانچہ ہندوؤں نے ملک کی مشترکہ زبان اُردو یا ہندوستانی کو عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت اور بالخصوص فارسی رسم الخط کی بنا پر مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا اور اس کے مقابلہ میں ایک محدود بولی کو ایک مقامی رسم الخط کے ساتھ اُردو کے قدیم نام "ہندی" سے موسوم کرکے لا کھڑا کیا، یہ ہے وہ مقام جہاں سے اُردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

ہندی کی اصلیت سوال ہوسکتا ہے کہ جس ہندی کو ہندوستان میں رائج کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے اُسے میں نے محدود مقامی بولی اور اس کے رسم الخط کو مقامی کیوں کہا ہے،؟ جہاں تک بولچال کی زبان کا تعلق ہے یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اُردو یا ہندوستانی ملک میں عمومی طور پر مشترک ہونیکے باوجود مختلف علاقوں اور مختلف طبقوں میں امتیازی رنگ رکھتی ہے مثلاً عربی داں مولوی کی اُردو، سنسکرت دان پنڈت کی اُردو سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اہل علم کی اُردو اور بازار کی اُردو میں نمایاں فرق ہوتا ہے، اہل حر

بول چال کی خصوصیات اور ہوتی ہیں، دوکان داروں اور تاجروں کے محاورات کچھ الگ ہوتے ہیں غرضیکہ دنیا کی ہر زبان میں اسی طرح مختلف پیشوں اور مختلف طبقوں کی بولی مخصوص رنگ رکھتی ہے چنانچہ اردو یا ہندوستانی میں بھی یہ مقامی اور جماعتی رنگ موجود ہے جس ہندی کو رواج دینے کی کوشش کی جارہی ہے وہ دراصل ہندوستانی زبان کی وہ مخصوص صورت ہے جو محض سنسکرت داں پنڈتوں کی بولی کہی جاسکتی ہے، اسی طرح اس کے لئے جو ناگری رسم الخط اختیار کیا جارہا ہے وہ بھی دراصل صرف یوپی کی زبان برج بھاشا کا رسم الخط ہے اور ہندوستان کے بہت سے رسوم الخط میں سے ایک ہے، اس لئے اس فارسی رسم الخط کے مقابلے میں جو سندھ سے آسام اور صوبہ سرحد سے مدراس تک ہر جگہ یکساں ہے ایک مقامی رسم الخط سے زیادہ حیثیت ہرگز نہیں رکھتا۔

یہ تو ہوا اس مسئلہ کا تاریخی پس منظر، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تحریک اسوقت کس منزل تک پہنچ چکی ہے، اس کا رخ کس طرف ہے اور اس کا انجام کیا نظر آتا ہے۔

ہندوؤں کے خیالات اسوقت ہندوؤں کے خیالات کا جائزہ لیا جائے تو وہ اس معاملہ میں حسب ذیل سات جماعتوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

(۱) وہ جو چاہتے ہیں کہ اُردو زبان اور رسم الخط کو بالکل مٹا دیا جائے اور اسکی جگہ ہندی کے نام سے سنسکرت رسم الخط میں ایسی خالص سنسکرتی زبان کو رواج دیا جائے جس میں غیر ملکی زبانوں بالخصوص عربی اور فارسی کے الفاظ بالکل نہوں، یہی ہندی زبان سرکاری طور پر ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے اور یہاں کی تمام قومیں (مسلمانوں سمیت) اسی زبان کو استعمال کریں۔

(۲) وہ جو یہ جانتے ہوئے کہ اُردو زبان کو بالکل مٹایا نہیں جاسکتا اور عربی اور فارسی کے الفاظ کلیتہً خارج نہیں کئے جاسکتے، یہ چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے بدیشی لفظوں کے بجائے سنسکرت کے لفظ رکھے جائیں اور ناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستانی کو ہندی بنا کر قومی اور سرکاری زبان بنا دیا جائے۔

(۳) وہ جو یہ محسوس کرتے ہوئے کہ زبان کی اس تبدیلی ہیئت کیلئے کافی عرصہ درکا
اس پر تل گئے ہیں کہ موجودہ اُردو یا ہندوستانی ہی کو ہندی کا نام دیکر اور ناگری رسم
دیکر اس پر قبضہ جما لیا جائے۔

(۴) وہ جو کہتے ہیں کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی قرار دیجائے او
اردو اور ہندی دونوں خطوں میں لکھا جائے۔

(۵) وہ جو دیانتداری کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی م‍ش
زبان' اُردو یا ہندوستانی ہے جو اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لیکن قومی نصب العین
پیش نظر اس امر کے متمنی ہیں کہ رفتہ رفتہ ہندی کو ناگری رسم الخط کے ساتھ رواج دیکر اس
کا قائم مقام بنا دیا جائے۔

(۶) وہ جو اُردو کی ہمہ گیری کے باعث اُردو زبان کو اُردو رسم الخط کے ساتھ استعم
پر مجبور ہیں لیکن اس کے باوجود اُردو میں سنسکرت کے لفظ بھرنے اور اسے ہندی بنا
کے پروگرام میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔

(۷) وہ جنہوں نے اردو زبان کی ترقی میں عملی حصہ لیا ہے اور جو اُردو کے مقابلے
کی طرف متوجہ ہونے کو رجعت پسندی سمجھتے ہیں۔

پہلی جماعت | ان سات جماعتوں میں سے پہلی جماعت کے ہندو بالکل انتہا پسند مہا
ہیں، یہ عملی مشکلات کی پروا نکرتے ہوئے اپنے انتہائی نصب العین کی طرف نہایت سرگر
گامزن ہیں۔ ہندوؤں کی عام قومی بیداری، علمی و اقتصادی ترقی اور سیاسی کامیابی نے
حوصلے بہت کچھ بڑھا دیے ہیں، انہوں نے نہ صرف عربی و فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت
شدومد کے ساتھ بھرنے شروع کر دیئے ہیں مثلاً استقبال کی جگہ سواگت، روشن
اُجاگر، خدمت کی جگہ سیوا۔ عصمت کی جگہ ستیہ وغیرہ بلکہ عام مروج ہندی الاصل
بھی قدیم صورت میں بدل لینا لازم کر لیا ہے، مثلاً برس کی جگہ ورش، آس کی جگہ

پر کی جگہ پرنتو وغیرہ، غرضیکہ اس جماعت کی تحریر و تقریر کچھ ایسی زبان میں ہوتی ہے کہ خود ہندو بھی بالعموم اسے سمجھ نہیں سکتے۔

دوسری جماعت | دوسری جماعت کے لوگ نصب العین کے لحاظ سے پہلی جماعت کے بالکل ہمخیال ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ان کو علمی مشکلات کا پورا پورا احساس ہے اور وہ اپنے طریق عمل کو حقایق کی روشنی میں متعین کرنا چاہتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عربی فارسی کے الفاظ ہندوستانی زبان میں پوری طرح گھل مل گئے ہیں اور اب ان کا جُدا کرنا گوشت سے ناخن کا جُدا کرنا ہے یہاں تک کہ نہ صرف ہندوؤں کے بہت سے عام نام عربی اور فارسی الفاظ سے مرکب ہیں مثلاً روشن لعل اقبال کرشن، حقیقت رائے، جواہر لال وغیرہ بلکہ خود ملک کا نام ہند اور ہندوستان، قوم کا نام ہندو اور زبان کا نام ہندی اور ہندوستانی خالص عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں۔

اندریں حالات وہ سنسکرت کے الفاظ کی بھرتی اور ناگری رسم الخط کے ذریعے زبان کی ایک خاص حد تک ہئیت بدلنا چاہتے ہیں، اس جماعت کی سرگرمیاں بھی پہلی جماعت سے کسی طرح کم نہیں

تیسری جماعت | تیسری جماعت ہندو مقصد کے لحاظ سے پہلی اور دوسری جماعت سے متفق ہیں لیکن ان کا شوق اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے حصول مقصد کے لئے زیادہ انتظار گوارا نہیں کرسکتے، علاوہ ازیں انہوں نے تمام علمی مشکلات کا نہایت ہی آسان حل تلاش کرلیا ہے وہ یہ کہ اپنے لئے ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی زحمت اُٹھانے کے بجائے کسی موجودہ عمارت کا کتبہ اُتار کر اس پر اپنا سائن بورڈ آویزاں کردیا جائے چنانچہ ان لوگوں کا عام طریقہ یہ ہے کہ خواہ کوئی مقرر خالص اُردو میں تقریر کیوں نکرے یہ اخبارات میں بے تکلف لکھدیتے ہیں کہ اُس نے ہندی میں تقریر کی، خالص اُردو فلموں کا جب اشتہار دیتے ہیں تو اسے بھی ہندی (HINDI VERSION) ہی بتاتے ہیں، عام ہندوستانی بول چال پر بھی نہایت دیدہ دلیری سے ہندی کا نام تھوپ دیتے ہیں، لاہور میں ہندی کے مشہور کارکن کاکا لیکر بشیر احمد صاحب سکرٹری انجمن اُردو پنجاب سے بالکل صاف ستھری اردو میں بات چیت کرتے رہے

لیکن جب اُردو ہندی کی بحث درمیان آئی تو بے دھڑک کہہ اُٹھے کہ جو زبان آپ بول رہے ہیں یہی تو ہندی ہے! چونکہ اس تیسری جماعت کا کام مقابلتہً آسان ہے اس لئے اس کا پروپاگنڈا بہت زور پکڑتا جارہا ہے اور خاص طور پر انگریزی اخبارات کے ذریعے اس تحریک کو بہت ترقی دی جارہی ہے۔

چوتھی جماعت | چوتھی جماعت کا فیصلہ وہی ہے جو کانگریس نے بڑے سوچ بچار کے بعد کیا ہے یہ اُن ہندوؤں کا نقطہ نظر ہے جو ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا تصور رکھتے ہیں، ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ مسلمانوں ہی کی خاطر سے اُردو رسم الخط کو بھی برقرار رکھنے کی اجازت دیتے ہیں اور بظاہر بڑے آزاد خیال معلوم ہوتے ہیں لیکن جب اس امر کو مدِّنظر رکھا جائے کہ ایک تو اُردو رسم الخط اسوقت مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں رائج ہے اور دوسرے اسوقت ہندوؤں میں ہندی تحریک زور شور سے جاری ہے تو ایسی حالت میں دونوں رسم الخطوں کی اجازت دیدینا گویا اُردو کو کمزور کرکے ہندی کو تقویت دینے کا ایک آسان طریقہ ہے، ساتھ ہی جب ہندوؤں کی اکثریت اور مسلمانوں کی اقلیت اس اجازت کے مطابق الگ الگ رسم الخط اختیار کریگی تو ہندی کے غالب آجانے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی، غرضیکہ اس جماعت کا بظاہر منصفانہ اور روادارانہ رویہ بھی درحقیقت اسی نصب العین کی طرف لیجانے والا ہے جو انتہا پسند جماعتوں نے مقرر کر رکھا ہے۔

پانچویں جماعت | پانچویں جماعت میں ہندوؤں کی کافی تعداد ہے جنمیں سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، راجہ نریندر ناتھ اور بابو راجندر پرشاد جیسے اکابر بھی شمار کئے جاسکتے ہیں، لیکن اُردو زبان کے متعلق ان کے اعتراف کے باوجود اور اُردو سے ان کی علمی دلچسپی کے ہوتے ہوئے بھی اُردو کو اُن سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ اس رَو کے مقابلہ میں ہرگز کھڑے ہونا نہیں چاہتے جو اُن کی تمام قوم کو ایک خاص سمت میں بہائے لئے جاتی ہے

ان کے اعترافات محض اظہار واقعہ کے طور پر ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اس صورتِ حال کو برقرار رکھنے کے بھی دل سے خواہشمند ہوں۔

چھٹی جماعت | چھٹی جماعت میں خاص طور پر وہ ہندو اخبارات ورسائل شمار کئے جاسکتے ہیں جو اُردو رسم الخط میں شائع ہوتے ہیں، پنجاب، دہلی اور یو، پی میں اسکی بکثرت مثالیں ملسکتی ہیں، ان جرائد کی اشاعت ہزاروں کی تعداد میں ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو زیادہ تر ہندو ہی پڑھتے ہیں، یہ اخبارات اُردو زبان کی وسعت و ہمہ گیری اور اس کے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہونے کا زندہ ثبوت ہیں، لیکن کس قدر افسوسناک ذہنیت کا مظاہرہ ہے کہ یہی اُردو اخبارات اُردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں سب سے پیش پیش رہتے ہیں اور اُردو میں سنسکرت کے الفاظ بھرتی کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے، طُرفہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض اخبارات نے ہندی ایڈیشن بھی ساتھ جاری کر رکھے ہیں۔ سردست اُردو ایڈیشنوں کی ہردلعزیزی اور ہندی ایڈیشنوں کی قلت اشاعت دونوں زبانوں کی باہمی حیثیت کا اندازہ لگانے کے نہایت معتبر پیمانے ہیں۔ لیکن ہندی کی موجودہ تحریک کے ہوتے ہوئے یہ ہندو اخبارات غالباً صرف اسی بات کے منتظر ہیں کہ ہندوؤں میں ہندی کا پلڑا کب جھکتا ہے، جونہی ان اخبارات کے ہندی ایڈیشنوں کی اشاعت میں اُردو ایڈیشنوں سے بڑھ جانے کے آثار نظر آنے لگے، یہ اُردو ایڈیشن یکقلم موقوف ہو جائیں گے، اس جماعت کی گویا وہی مثال ہے کہ لڑائی کے وقت ایک دستہ بظاہر دوست بن کر مخالف فوج کے ساتھ جاملے اور اس کے قلعہ کے اندر پہنچکر دیواروں کی بیخ کنی کی کوشش میں لگا رہے۔

ساتویں جماعت | ساتویں جماعت بلاشبہ حق پسند ہندوؤں پر مشتمل ہے، وہ اُردو کی صحیح حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں، ہندی کو ایک مقامی اور محدود زبان سمجھتے ہیں، اُردو کے مقابلہ میں اسے بالکل ناتراشیدہ زبان جانتے ہیں، ان کا ذوقِ سلیم دونوں زبانوں کے معیار و مراتب کے فرق کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے لیکن افسوس کہ اس جماعت کی تعداد قلیل ہے اور متذکرہ بالا

جماعتوں کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی، جہاں یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ یہ باقی ہندوؤں پر اپنا اثر ڈال سکیں وہاں یہ بعید نہیں معلوم ہوتا کہ "ہمہ یاران دوزخ ہمہ یاران بہشت" کے دیرینہ اصول کے مطابق کسی وقت یہ بھی ہندی تحریک کے بادل ناخواستہ حامی بن جائیں۔

مسلمانوں کے خیالات | یہاں تک تو ہوا برادران وطن کے خیالات کا جائزہ، اب ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے خیالات کا اندازہ لگایا جائے تو ان میں بھی ذیل کے پانچ مختلف طبقے نظر آتے ہیں:۔

(۱) وہ جو انگریزی ادبیات سے اسقدر شغف رکھتے ہیں کہ انکو اُردو سے کوئی خاص دلچسپی نہیں

(۲) وہ جو ملک کی مشترکہ زبان "ہندوستانی" قرار دیتے ہیں اور اُردو و ناگری دونوں رسم الخطوں کو جاری رکھنا عین مناسب سمجھتے ہیں۔

(۳) وہ جو سمجھتے ہیں کہ اُردو زبان ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور دونوں میں اُردو رسم الخط کیساتھ جاری ہے، ہندی کی تحریک اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

(۴) وہ جو ہندی تحریک کی قوت کو پہچانتے ہوئے جان گئے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے اُردو زبان اور رسم الخط کا تحفظ ضروری ہے۔ لیکن مصلحتاً ہندوؤں کو بھی اپنے ساتھ شامل رکھنا چاہتے ہیں

(۵) وہ جو اُردو زبان کو اُردو رسم الخط کے ساتھ خالص اسلامی زبان سمجھتے ہیں اور اس کے تحفظ کا ذمہ دار صرف مسلمانوں کو ٹھیراتے ہیں۔

پہلا طبقہ | ان میں سے پہلا طبقہ انگریزی ادبیات میں حد سے زیادہ شغف رکھتا ہے، یہ اصحاب مطالعہ کرتے ہیں تو انگریزی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کا۔ خط وکتابت کرتے ہیں تو انگریزی میں، ان کی انجمنوں کی تمام تر کارروائی انگریزی میں ہوتی ہے، ان کے دروازوں کے سائن بورڈ بھی انگریزی میں لکھا ہوا ہوتا ہے، یہ اپنی ڈائری بھی انگریزی میں لکھتے ہیں، دستخط انگریزی میں کرتے ہیں، غرض کہ انگریزی زبان ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اُردو سے یا تو قطعاً نابلد ہو جاتے ہیں یا کم از کم اسقدر بے تعلق کہ مجبوری کے وقت بولنے کے سوا

اس زبان سے انہیں کوئی واسطہ نہیں رہتا، چونکہ اس طبقہ میں اکثریت تعلیمیافتہ مسلمانوں کی ہوتی ہے اسلئے اُردو زبان ایک ایسے طبقے کی خدمات سے محروم ہو جاتی ہے جس سے زبان کی ادبیات کو بہت کچھ امداد کی توقع ہوسکتی تھی، طرفہ یہ کہ خدمت تو ایکطرف رہی بعض اوقات اس طبقے کی طرف سے ایسی تجاویز پیش ہوتی ہیں جو اُردو کے حق میں زہر قاتل کا اثر رکھتی ہیں یہی طبقہ ہے جو اُردو رسم الخط سے پوری طرح واقف نہونیکے باعث اس میں دقت محسوس کرتا ہے اور اس بناپر اسمیں اسے بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں، مثلاً بالکل، تقریباً۔ خوردنی الوقع، حتیّ الوسع وغیرہ الفاظ کی تحریر انہیں بے قاعدہ معلوم ہوتی ہے، ق اور ک، ت اور ط، ث اور س اور ص وغیرہ کا فرق اُن کے ذہن نشین نہیں ہوتا، حروف کی مفرد اور مرکب صورتوں کا اختلاف انہیں پریشان کر دیتا ہے، یہ تمام "مشکلات" اُنہیں اُردو رسم الخط سے متنفر کر دیتی ہیں اور یا تو وہ اس رسم الخط کی اصلاح کی گوناگوں عجیب و غریب صورتیں تجویز کرتے ہیں اور یا سرے سے اسکی جگہ لاطینی رسم الخط رائج کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اُردو زبان کے لیے اپنوں کی یہ جماعت اغیار کی انتہا پسند سے انتہا پسند جماعت کی بہ نسبت بھی زیادہ خطرناک ہے۔

دوسرا طبقہ دوسرے طبقہ میں بالعموم وہ مسلمان شامل ہیں جو کانگریس کے حامی ہیں، یہ لوگ ملک کی مشترکہ زبان ہندوستانی قرار دیکر اُردو اور دیوناگری دونوں خطوں کو جاری رکھنا مناسب سمجھتے ہیں، بظاہر ان کا یہ نظریہ عین تقاضائے انصاف معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس جماعت کے ہاتھوں اُردو زبان کو بہت کچھ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اسوقت اُردو زبان اُردو رسم الخط کے ساتھ ہندوستان میں سب سے زائد وسعت رکھتی ہے، ادہر ہندوؤں میں ہندی رسم الخط کی تحریک زور شور سے جاری ہے۔ ایسی حالت میں قوم پرست ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر ہندی خط کی اجازت دیدینا بھی اُردو پر ضرب کاری لگانے کے مترادف ہے، اس جماعت کے بعض مسلمان تو ان حدود تک پہنچ جاتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے ہندوؤں کو اُردو رسم الخط اور مسلمانوں کو

ہندی رسم الخط سیکھ لینا چاہیے، اسوقت جبکہ اُردو رسم الخط ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترکہ طور پر لیکن ہندی صرف ہندوؤں کے ایک جزوی طبقے میں رائج ہے، اس مشورہ پر عمل کرانا گویا کھلے طور پر اُردو کی جگہ ہندی کو دے دینا ہے۔

اسی طبقہ کے بعض مسلمان اس مصلحت پر عمل پیرا ہیں کہ اُردو کا نام بدل کر "ہندوستانی" رکھدیا جائے، جہاں تک امر واقعہ ہے یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستانی اور اُردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں بلکہ ایک لحاظ سے ہندی بھی اسی زبان کا قدیم نام ہے۔ لیکن اسوقت جو عصبیت کی رو چل رہی ہے اس کے سامنے نام کا سوال کچھ حقیقت نہیں رکھتا، اصل مقصد تو اُردو کے قرآن رسم الخط کو مٹانا ہے، اسی زبان کو جب دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے گا تو خواہ آپ اسے ہندوستانی کہتے رہیں خواہ اُردو، وہ لامحالہ ہندی ہی ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں محض نام کی مصلحت بھی دیر تک قائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ اُردو کو ہندوستانی کہنے کی تحریک کا مناسب توڑ بھی سوچ لیا گیا ہے، جب ہندو یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی کے مشترکہ نام سے اُردو زبان فائدہ اُٹھاتی ہے تو گاندھی جی جیسے اکابر جھٹ ہندوستانی کو "ہندی اتھوا ہندوستانی" کا اصطلاحی نام دیکر یہ گنجایش بھی باقی نہیں رہنے دیتے۔

تیسرا طبقہ | تیسرے طبقے کے مسلمان اس خیال میں مگن ہیں کہ اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں رائج ہے، سرکاری طور پر منظور شدہ ہے اور مرورِ زمانہ نے اسکی بنیادیں مضبوط کردی ہیں ہندو لاکھ کوشش کریں اسکو نقصان نہیں پہونچا سکتے اور اس کے مقابلہ میں کسی اور زبان کو کامیاب نہیں بنا سکتے۔ جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے اس خیال کی صحت میں کچھ شبہ نہیں لیکن مستقبل کے متعلق ان کا تیقن نہ صرف مناسب حد سے بڑھا ہوا ہے بلکہ کسی حد تک غفلت آموز بھی ہے اُردو زبان واقعی اسوقت نہایت وسعت کے ساتھ رائج ہے اور ہندی کے لئے اسکی صحیح جانشینی ناممکن ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اسوقت، اُردو ہی کو دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر ہندی کا نام دیا جا رہا ہے، باقی رہی حکومت کی سرپرستی تو تازہ انقلابات نے واضح کردیا ہے کہ کسی

حکومت اور بالخصوص غیر ملکی حکومت کی سرپرستی پر زیادہ عرصہ تک بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہندوستان میں جو جماعت بھی سیاسی قوت حاصل کرے گی حکومت اسی کے ہاتھ میں ہوگی جس طرح انگریزوں کے ابتدائی دور میں سرکاری زبان فارسی رہی لیکن قلم کی ایک جنبش سے فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا، اسی طرح ہندوستان میں اگر ہندو سیاسی قوت حاصل کرلیں تو ان کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اُردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنالیں

چوتھا طبقہ | اس طبقہ کے مسلمان حقیقت حال کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن ان کی اعتدال پسندی انہیں اس مصلحت پر آمادہ رکھتی ہے کہ ہندوؤں کو بھی اُردو کی حمایت میں حتی الوسع ساتھ رکھا جائے اس خیال کے مسلمان کبھی تو اُردو کے ہندو ادیبوں کے کارناموں کو نمایاں کرتے ہیں، کبھی ہندوؤں میں اُردو زبان کے موجودہ رواج کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، کبھی اُردو اور ناگری خطوط کا مقابلہ کرکے اُردو کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی اعتدال پسند ہندوؤں کو اُردو کی حمایت پر مائل کرنے کے ساتھ ساتھ انتہا پسند ہندوؤں کی بارگاہ میں نہایت عاجزی سے رحم کی درخواست کرتے ہیں اور انہیں متحدہ قومیت کا واسطہ دیکر کہتے ہیں کہ خدارا ہندی کی حمایت کے جوش میں اُردو کی تباہی کے درپے تو نہ ہو جائیے۔ ظاہر ہے کہ اس خیال کے مسلمانوں کی یہ مصلحت اندیشی اس قومی رو کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو ہر طبقہ کے ہندوؤں میں پیدا ہو چکی ہے، ہندی تحریک اس قومی جذبہ کے زیر اثر اسقدر زور پکڑتی جارہی ہے کہ اُردو زبان کے بہت سے بلند پایہ ہندو ادیب ہندی ادبیات میں حصہ لینے پر مجبور ہوگئے ہیں، چنانچہ منشی پریم چند آنجہانی جیسا ادیب اسی اثر کے ماتحت ہندی کی طرف جھک گیا۔

اسی سلسلہ میں اُردو اور دیوناگری خطوط کا مقابلہ اور ایک خط پر دوسرے کی ترجیح کی کوشش محض مضحکہ انگیز ہے کیونکہ جب کسی تحریک کی تہ میں کوئی خاص تعصب کارفرما ہو تو پھر ادبی، فنی اور منطقی موشگافیاں بالکل بیکار ثابت ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اُردو رسم الخط پر کوئی فوقیت رکھتا ہے بلکہ وہاں تو محض

"ہندو تہذیب" کے احیاء کا جذبہ کام کر رہا ہے۔

پانچواں طبقہ | یہ طبقہ انتہا پسند مسلمانوں کا ہے، جہاں تک موجودہ صورت حال کا تعلق ہے ان کا خیال بظاہر غلط نظر آتا ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان، اُردو رسم الخط کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام میں بھی نہایت وسیع پیمانے پر رائج ہے لیکن جب مستقبل کی طرف توجہ کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اقوام میں اس کا رواج محض ماضی کے اثرات کا نتیجہ ہے اور نئی نسل میں ہندی کو جس زور شور سے رائج کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر وہ دن دور نہیں کہ جب اس زبان کی حفاظت صرف مسلمانوں ہی کے سر رہ جائے، ہندوؤں میں لڑکیوں کی تعلیم تو تمامتر ہندی زبان اور رسم الخط میں ہو رہی ہے اور لڑکوں کو بھی اب اُردو سے ہٹا کر ہندی کی طرف مائل کیا جا رہا ہے، اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

تبصرہ | یہاں تک ہم نے سرسری نظر سے یہ دیکھ لیا کہ اُردو اور ہندی کے متعلق اسوقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قسم کے مختلف خیالات موجود ہیں اور مختلف تحریکات کا رُخ کس طرف ہے مختصر لفظوں میں یہ کہ ہندوؤں میں اپنی تہذیب کے احیاء کا ایک عمومی جذبہ پیدا ہو چکا ہے، اور ان کے بظاہر مختلف الخیال طبقے اس مقصد میں بالکل متفق ہیں کہ ہندوستان میں ہندی زبان کو ہندی رسم الخط کے ساتھ رائج کر دیا جائے۔ وہ لاکھ کہیں کہ اُردو سے اُن کو کوئی مخاصمت نہیں ہے لیکن ان کا جو پروگرام ہے اسکو کامیاب بنا سکنے کے لئے ضروری ہے کہ اُردو سے ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونے کی حیثیت چھین لیجائے اور اسکی کرسی پر ہندی کو بٹھا دیا جائے، اس کے برعکس مسلمانوں کے پیش نظر نہ کوئی خاص مقصد ہے نہ لائحہ عمل، اسوقت تک اُردو کو جو اثر اور وسعت حاصل ہے وہ کسی جماعت کی کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خود اُردو کی فطری صلاحیتوں کا نتیجہ ہے جہاں تک مسلمانوں کے طرز عمل کا تعلق ہے سو وہ یا تو غفلت پر مبنی ہے یا خود فریبی پر۔

مسئلہ کی اصلیت | مسلمانوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقی سوال محض زبان کی بقا اور تحفظ کا نہیں کیونکہ برادران وطن کی ہزار کوششوں کے باوجود ہماری موجودہ اُردو زبان ہندوستانی

یا ہندی کے نام سے برابر موجود رہے گی، سنسکرت کے الفاظ کی بھرتی سے اسکی صورت خواہ کتنی ہی مسخ کیوں نکردیجائے اسکی اصلیت میں چنداں فرق نہیں آسکتا، سب سے بڑا خطرہ جو درپیش ہے وہ رسم الخط کی تبدیلی کا ہے، اس میں ذرا بھی بحث کی گنجایش نہیں کہ اُردو ..... رسم الخط خالص اسلامی ہے، ہندوؤں کی سیاسی بیداری اب اس رسم الخط کے مٹانے کے درپے ہے اور اسکی جگہ ہندی خط رائج کرنا چاہتی ہے لہذا اصلی مسئلہ رسم الخط کا رہ جاتا ہے اور اس رسم الخط کی بقاء کا انحصار محض مسلمانوں پر ہے،

مسلمانوں کا وہ طبقہ جو زبان کے بارے میں مصالحت کی یہ صورت پیدا کرتا ہے کہ زبان کا نام ہندوستانی ہوا اور رسم الخط اُردو ہندی دونوں ساتھ ساتھ جاری رہیں نہ صرف اصل مسئلہ کے حل سے گریز کرتا ہے بلکہ وہ اس معاملہ میں ہندوؤں کی اکثریت سے مرعوب بھی معلوم ہوتا ہے، وہ یہ فرض کرلیتا ہے کہ ملک میں آخر وہی خط جاری ہوکر رہے گا جس کی حمایت اکثریت کریگی۔ لہذا وہ اکثریت کے آگے ہتھیار ڈال کر ہندی رسم الخط کا حق تسلیم کرلیتا ہے، بظاہر یہ ایک سیدھی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک کھلی غلط فہمی ہے سب سے پہلے تو خود اُردو زبان کی تاریخ ہی اس خیال کو جھٹلاتی ہے، مسلمان اس ملک میں بہت ہی قلیل تعداد میں آئے۔ اور سات سو سال کی حکومت کے باوجود ہمیشہ اقلیت ہی میں رہے، وہ اپنے ساتھ عربی اور فارسی کا اسلامی رسم الخط لائے اور اقلیت ہی کی حالت میں اس رسم الخط کو ہندوستان کی زبان پر اس طرح عاید کیا کہ اکثریت کو وہی رسم الخط قبول کرنا پڑا۔ اگر زبان اور رسم الخط کے رواج کیلئے اکثریت ہی کی حمایت سب سے ضروری شرط ہوتی، تو ہندوستان میں اُردو رسم الخط کبھی فروغ حاصل نکرسکتا۔ اسکو بھی جانے دیجیے اور موجودہ زمانہ میں انگریزی زبان کی ترقی پر نظر ڈالیے، جہاں تک تعداد کا تعلق ہے، انگریز اس ملک میں ایک معمولی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اسکے باوجود انگریزی زبان یہاں جسقدر زور پکڑ چکی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اُردو اور ہندی آپس میں خواہ کتنے ہی لڑتے رہیں انگریزی کے مقابلہ میں دونوں کا سر نیچا ہوجاتا ہے یہاں تک کہ ابھی تک صرف کانگریس اور مسلم لیگ جیسے قومی اداروں

انگریزی زبان کے استعمال کرنے پر مجبور ہیں بلکہ ملک کے سب سے کثیر الاشاعت اخبارات بھی انگریزی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ زبان اور اس کے رسم الخط کا رواج کسی قوم کی تعداد اور اکثریت پر منحصر نہیں ہے بلکہ صرف سیاسی تفوق، علمی افضلیت اور تمدنی برتری پر منحصر ہے، جب تک مسلمانوں کو یہ حیثیت حاصل رہی اُن کا رسم الخط رائج رہا، جب انگریزوں کی باری آئی ان کی زبان فروغ پا گئی اسی طرح آیندہ کیلئے اُردو یا ہندی رسم الخط کا رواج محض اس امر پر منحصر ہے کہ مستقبل میں زیادہ سیاسی قوت مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے یا ہندوؤں کو جنکی سیاسی قوت بڑھ جائیگی، انہیں کی زبان اور انہی کے رسم الخط کا سکّہ رواں ہو جائیگا۔

سیاسی اقتدار کا اثر یہاں ایک یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ سیاسی تفوق کا اثر محض زبان کے ظاہری رواج ہی پر نہیں پڑتا بلکہ خود زبان کے الفاظ کے اندر سرایت کر جاتا ہے، دو قوموں کے سیاسی اقتدار میں جو فرق ہوگا وہ ان کی زبانوں کے ہم معنی الفاظ میں پوری طرح منعکس ہوتا ہے مثلاً اُردو کا لفظ مستری اور انگریزی کا لفظ میکینک بالکل ہم معنی ہیں لیکن حکمران قوم کی زبان کا یہی لفظ محکوم قوم کی زبان کے لفظ پر فوقیت رکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک مستری یا میکینک اپنے آپ کو میکینک کہکر فخر کرے گا لیکن مستری کہلانے میں اُسے عار محسوس ہو گی، ایک اور مثال اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دے گی،

اُردو زبان میں بادشاہ، انگریزی میں کنگ اور ہندی یا سنسکرت میں راجہ بالکل ہم معنی الفاظ ہیں۔ اسی طرح شہنشاہ، امپرر، مہاراج ادھیراج تینوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں لیکن چونکہ ہندوؤں میں کوئی آزاد اور خود مختار راج موجود نہیں ہے، اور ان کے جس قدر حکمران ہیں وہ یا تو مسلمان بادشاہوں کے ماتحت رہے یا اب انگریزوں کے زیر اقتدار ہیں، اس لیے الفاظ راجہ، مہاراجہ حتیٰ کہ مہاراج، ادھیراج اپنے اصلی معانی کھو بیٹھے ہیں، اور اب ان الفاظ سے کسی آزاد حکومت کا تصور نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں چونکہ مسلمانوں کی لفضلہ تعالیٰ آزاد حکومتیں موجود ہیں اس لئے بادشاہ اور شہنشاہ کے الفاظ بدستور اپنا اصلی مفہوم ادا کر رہے

البتہ چونکہ مغربی اقوام کا سیاسی اقتدار بڑھا ہوا ہے، ان کے الفاظ کنگ اور امپیریل میں اسی قدر زیادہ شان و شوکت پائی جاتی ہے۔

غرضیکہ سیاسی اقتدار کا عکس زبان پر نہایت واضح طور پر پڑتا ہے اور فی الحقیقت کسی زبان کا رواج اور فروغ اُس زبان کو بولنے والی قوم کی سیاسی قوت ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ اسوقت ہندوستان میں اُردو ہندی کی جو بحث جاری ہے اس کے باقی تمام پہلو محض جزوی حیثیت رکھتے ہیں، سب سے بڑا معیار ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی قوت کا باہمی تفاوت ہے۔ اُردو زبان اور اس کا رسم الخط مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہے، اگر مسلمانانِ ہند نے پوری طرح منظم ہو کر ہندوستان میں اپنی سیاسی قوت کا لوہا منوالیا، تو کوئی طاقت اُن کی زبان اور رسم الخط کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن اگر خدانخواستہ انکی سیاست باہمی اختلافات کی نذر ہوگئی اور ہندوستان کے آنے والے دور آزادی میں اُن کو کوئی باعزت جگہ نہ مل سکی تو یاد رکھئے کہ اُردو زبان کی فطری صلاحتیں، اُردو رسم الخط کی فنی خوبیاں کسی طرح بھی اپنی حالت برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گی۔

اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اردو ہندی کی بحث میں اُلجھنا بھی درحقیقت اصل مقصد سے ذرا ہٹ جانے کے برابر ہے لہذا اسوقت مسلمانانِ ہند کا سب سے بڑا مسئلہ باہمی تنظیم، ہئیت اجتماعیہ کی تشکیل اور سیاسی اقتدار کی تدبیر ہے، اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو اُردو زبان اور اس کے اسلامی رسم الخط کے تحفظ کا سامان خودبخود ہوجائے گا۔

انشاءاللہ کسی آیندہ اشاعت میں اُردو زبان کے تحفظ کی عملی تجاویز پر بھی اظہار خیال کیا جائے گا۔

حقائق و عبر

(ادارہ)

(۱) شعاعِ اُمید

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۚ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ‎(۴۲:۲۸)

اللہ کی وہ ذات اقدس ہے کہ جب لوگ خشک سالی سے نااُمید و مایوس ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے دامانِ رحمت کو پھیلا دیتا ہے اور مینہ برساتا ہے۔ وہ کارساز (وکریم) سزاوارِ حمد و ستایش ہے

کس آنکھ نے اس نظارہ کو نہیں دیکھا کہ جب خشک سالی کے زمانہ میں آسمان سے پانی کی جگہ آگ برسنی شروع ہو جاتی ہے تو وہ سطحِ ارض سے ہر اس رطوبت کو چوس لیتی ہے جو نباتی اور حیوانی زندگی کا آخری سہارا ہوتی ہے۔ لہلہاتے کھیت سوکھ کر زرد پڑ جاتے ہیں بشگفتہ وشاداب پھول مرجھا کر پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ تمازتِ آفتاب کی شعلہ باریاں ہر شے کی تر و تازگی کو جھلس دیتی ہیں۔ اس انتہائی یاس و قنوط کے عالم میں نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور ہراساں پریشاں واپس لوٹ آتی ہیں کہ اتنے میں سمت کعبہ سے ایک چھوٹی سی بدلی۔ بہار صد گلستاں بداماں لیئے اٹھتی ہے۔ جو ہر مایوس نگاہ اور ہر مضطرب قلب کے لیئے شگفتگی و شادابی کے ہزار نزہت بخش پیغام اپنے ساتھ لاتی ہے اور اپنے ایک ایک قطرے سے خاک کے ذرّوں میں تجدیدِ زندگی کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ کذالک یحیی اللہ الارض بعد موتھا۔ اور یوں اللہ اس زمینِ مُردہ کو حیاتِ تازہ بخشدیتا ہے۔

جس طرح ایک چھوٹی سی بدلی زمینِ مردہ کے لیے حیاتِ تازہ کے آثار کا پتہ دیتی ہے

اسی طرح بعض چھوٹے چھوٹے واقعات اقوامِ مردہ میں ایک نئی زندگی کی نمود کی علامات ہوجاتے ہیں۔ جب سے اصلاحات جدیدہ کے ماتحت ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کا وجود عمل میں آیا ہے ہر حساس نگاہ مسلمان اراکین کی یہ کیفیت مشاہدہ کرتی تھی کہ ریت کے منتشر ذرّوں کی طرح چاراایک طرف کی ہوا کے جھونکے کے ساتھ اُڑ گئے۔ دو پانی کی کسی تیز رَو کے ساتھ بہ گئے۔ نہ اپنی کوئی جماعت نہ اس جماعت کا کوئی مرکز۔ یہ تشتت وانتشار۔ یہ تحزب وتشیع۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی یاس انگیز کیفیت۔ ہر دلِ درد آشنا کو سکون ناآشنا بنا رہی تھی، مایوس نگاہیں چاروں طرف اٹھتی تھیں کہ اُن کے لیے بھی سامانِ زیست کی حامل کوئی بدلی کہیں نظر آئے لیکن ہربار وہ نااُمیدیوں کے بگولوں میں اُلجھ کر رہ جاتی تھیں۔ بارے اسمبلی کے اجلاس رواں کے شروع میں سمائے شملہ پر ایک ایسی بدلی نمودار ہوئی جس میں حیاتِ تازہ کے کچھ آثار پوشیدہ نظر آئے۔ یہ منتشر ذرّے سمٹ کر ایک جگہ ہوگئے اور جناب مسٹر جناح کے زیرِ قیادت اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا وجود عمل میں آگیا جو کانگریس پارٹی کے بعد سب سے بڑی پارٹی کہلا سکتی ہے لذٰلک یحیی اللہ الارض بعد موتھا ہرچند یہ جماعت ایک مختصر سی جماعت ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس ہولناک دورِ انفرادیت میں اتنی سی اجتماعیت کون سی ایسی بشارت کبریٰ ہے جس کے لیے یوں مسرت وشادمانی کے سجدہ ہائے شکرانہ بجالائے جائیں لیکن ہمارے نزدیک ہر وہ قدم جو انفرادیت سے اجتماعیت کیطرف۔ انتشار سے ائتلاف کیطرف۔ پراگندگی سے یک جہتی کیطرف اُٹھے وہ قدم شرک سے توحید کیطرف اُٹھتا ہے۔ اور اس لیے ہر قلبِ مومن کے لیے باعثِ ہزار مسرت وبہجت ہوتا ہے۔ یہی وہ آثارِ حیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ہم ان اراکین حضرات کیخدمت میں جو اپنے آپ کو اس اسلامی جماعت کے ساتھ وابستہ کر چکے ہیں بہ صمیم قلب ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اُن کی یہ یک جہتی وہم آہنگی قلب

و دماغ کی یک جہتی و ہم آہنگی ہوا ور جو قدم اس راستہ میں اُٹھے ہیں وہ اب آگے ہی آگے بڑھتے جائیں ۔ پیچھے نہ ہٹیں ۔ ربنا افرغ علینا صبرا و ثبت اقدامنا

وہ مسلم اراکین جو ابھی تک اس جماعت سے الگ ہیں ۔ ہم اُن کی خدمت میں اپنی طرف سے کچھ گزارش کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس ذات اقدس و اعظم صلعم (فداہ ابی و امی) کا ایک ارشاد گرامی پیش کرتے ہیں جن کی اُمت ہونے کا اُنہیں دعوےٰ ہے کہ :-

علیکم بالجماعۃ ۔ فانہ من شذ ۔ شذ فی النار

"ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ سیدھا جہنم میں گیا"

اور ان متفرقین حضرات میں سے جو اراکین غیر مُسلم جماعتوں کے ساتھ شامل ہوکر "مخلوط جماعتیں" قایم کر رہے ہیں اُن کی خدمت میں تو ہم اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر قرآن کریم کا یہ فیصلہ پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ امرھم شوریٰ بینھم مُسلمانوں کے تمام اُمور اُن کے آپس کے باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں مُسلم و غیر مسلم کی مخلوط بزم مشاورت مسلمانوں کے معاملات کو طے کرنے کی مجاز نہیں ہے اور اسی طرح مُسلمان کسی غیر مسلم کی قیادت میں بھی نہیں چل سکتا قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ اطاعت اسی امیر کی ہونی چاہیے جو تم میں سے ہو ۔ جو اولی الامر منکم ہو ۔ کتاب و سُنت کے ان واضح فیصلوں کی موجودگی میں معلوم نہیں یہ حضرات اپنے مسلک کے جواز میں کیا دلیل اپنے پاس رکھتے ہیں ۔ فبای حدیث بعدہ یؤمنون ۔

خدا کرے کہ یہ چند سطور ان حضرات کی نگاہوں سے بھی گزر جائیں اور وہ خود فیصلہ کر لیں کہ ایک مسلمان کو مُسلمان ہونے کی حیثیت سے کون سی راہ عمل اختیار کرنی چاہیے ۔ اے کاش کوئی آشنا ان کے گوش گزار کر دے کہ ؎

دگر بشاخ گل آویز و آب و نم درکش
پریدہ رنگ زباد صبا چہ می جوئی !

---

(۲) احساسِ اجتماعیت

اسی احساسِ اجتماعیت کا مظاہرہ وہ پُرشکوہ جلوس تھا جس سے مسلمانانِ شملہ نے ۷ اگست کو مسٹر جناح کا استقبال کیا اور جو شملہ کی تاریخ میں فی الحقیقت ایک عدیم النظیر حیثیت رکھتا ہے۔ ہم رسمی تکلّفات اور تقلیدی مظاہرات کو چنداں وقعت نہیں دیتے۔ لیکن جن آنکھوں نے اِس مظاہرہ کو دیکھا وہ اسپر شاہد ہیں کہ یہ ایک رسمی و تقلیدی مظاہرہ ہی نہ تھا۔ بلکہ دلوں کی سچی تڑپ اور خون کی حقیقی حرارت کا آئینہ دار تھا۔ اجتماعیت کا وہ آئینِ زندگی جو اسلام نے آکر نوعِ انسانی کو سکھایا تھا۔ سوختہ سامان مسلمانوں کی نگاہوں سے ایک عرصہ سے اوجھل ہو چکا ہے لیکن ان مظاہرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لُٹے ہوئے قافلہ کے راہ گم کردہ مسافروں کو پھرسے احساس ہو رہا ہے اور وہ اپنی لُٹی ہوئی متاع کی بازیابی کے لئے پھر کسی صحیح راہ کی تلاش میں ہیں ٭

یہی احساس اس پُرکیف تقریب میں نمایاں تھا جو ۱۳ اگست کی شام صندل ہال (اسلامیہ ہائی اسکول شملہ) میں منعقد ہوئی جس میں انجمن اسلامیہ نے مسٹر جناح اور اُنکے رفقائے کار یعنی اسمبلی کی لیگ پارٹی کے اراکین کے اعزاز میں دعوتِ عصرانہ (شام کی چائے) کا اہتمام کیا تھا۔ شملہ کے آسمان نے اِس سے پیشتر ایسی تقاریب کم دیکھی ہوں گی۔ اس میں بھی صاف صاف نظر آرہا تھا کہ رسمی تکلّفات نہیں بلکہ قلوب کی والہانہ شگفتگی باعثِ گرمیٔ محفل ہے۔ اس قسم کے ہنگامے اور مظاہرے ایک حقیقی احساسِ زیست کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں ٭

چہ عجب کہ اس خود فراموش قوم کی عذاب کی مدّت اب ختم ہو رہی ہو اور یہ پھر سے خدا کی ان رحمتوں کے قابل سمجھی جائے جو رحمتیں کبھی اس کی وساطت سے دُنیا کو ملا کرتی تھیں۔ کہ :-

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

---

(۳) ساحرین بنگال۔

پھر اسی احساسِ مرکزیت کا مظاہرہ وہ جوش و خروش تھا جو بنگال اسمبلی کے ایوا
باہر کھلے میدان میں جمع شدہ لاکھوں مسلمانوں کی فطرتِ سیمابی میں کھولتے ہوئے گرداب کی شک
نظر آرہا تھا جو یہ سننے کے لیے ازخود بیتابانہ مستانہ وار وہاں اکٹھے ہو گئے کہ مولوی فضل الحق صاح
کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کا کیا فیصلہ ہوتا ہے، ہر چند اسلام کے ترازو میں ا
گنے نہیں جاتے تولے جاتے ہیں، اور اس لیے ہم اعداد و شمار کے بھی قائل نہیں۔ لیکن چونکہ آج
نے اعداد و شمار ہی کو فیصلہ کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ اس لیے یہ امر موجبِ ہزار طمانیت ہے کہ ا
کے مطابق بھی یہ ثابت ہو گیا کہ مولوی فضل الحق صاحب اپنی مومنانہ حق گوئی اور مجاہدانہ
کی بنا پر اپنے رفقائے کار کے دلوں میں کس قدر گھر کر چکے ہیں۔ ہم اس شیر بیشۂ جرأت و بس
کی خدمت میں اس کامیابی پر وہ پُرخلوص ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں جو خدائے قدوس
بشارت کے اندر درخشندہ و تابناک موتیوں کی طرح نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے کہ :۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۳/۱۳۸

مومنے بالائے ہر بالا ترے | غیرتِ او برنتابد ہمسرے

اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ؎

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اکثر | مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے ید بیضا

انشاء اللہ العزیز یہ عصائے موسوی ساحرین بنگال کی نظر فریب رسیوں کو ضرور نگل ج
حق کی تو فطرت ہی یہی ہے کہ وہ باطل پر غالب ہے اور پوری سطوت و قوت کے ساتھ غالب ر

بانشۂ درویشی درساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

---

(۴) منحرفین پنجاب

لیکن بنگال کے مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کو دیکھ کر روح میں جو بشاشت و شگفتگی پیدا ہوتی ہے وہ پنجاب کے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر افسردگی و پژمردگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ پنجاب وہ خطّہ ہے جہاں سے کبھی زندگی کے چشمے اُبلتے تھے اور آج جبکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں مرتکز ہو رہی ہیں۔ کہنے کو تو پنجاب میں بھی لیگ کے ارباب حل وعقد صاحبانِ سطوت وحکومت ہیں لیکن عملاً یوں نظر آتا ہے کہ یہ حضرات کھلے بندوں اس کا شاید اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے کہ انکا لیگ سے کچھ واسطہ ہے، یہ حضرات (الّا ماشاءاللہ) آسمان کی ان بلندیوں پر رہتے ہیں جہاں سطحِ ارض کے رہنے والے جمہور مسلمانوں کے تصور کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور خود یہ ان رفعتوں سے نیچے اُتر کر غریب جمہور سے روابط وضوابط پیدا کرنا غالباً اپنے علوِ مرتبت کے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ "طبقہ اعلےٰ" کا احساسِ عمل یا تو بالکل جمود و تعطل کی نذر ہو چکا ہے یا وہ اپنے اپنے ذاتی مفاد و مصالح کے حصول میں صرف کر دیا جاتا ہے اور جمہور مسلمان مختلف "شکاریوں" کے بس میں پڑے ہوئے ہیں جو ہر آن ایک نئے جال کی تار و پود کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ پنجاب لیگ کے اُن سر برآوردہ حضرات کی خدمت میں ہم بادب گزارش کریں گے کہ قوم کو کام کرنے والے "سپاہیوں" کی ضرورت ہے "آنریری جرنیلوں" کی ضرورت نہیں۔ ان حضرات کو ایک دفعہ کامل غور و خوض کے بعد اپنے مسلک کے متعلق پختہ فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ مسلمانوں کی جماعت کا کھلم کھلا ساتھ دینے میں یقیناً "دوسروں" کی طعنہ زنی بھی ہوگی۔ "فرقہ پرستی" کا لیبل بھی لگے گا۔ اکثر تنگ نظر دوستوں سے تعلقات بھی کشیدہ ہونگے۔ اور شاید اس سے زیادہ خطرات کا سامنا بھی ہو۔ اگر یہ اپنے دلوں میں حوصلہ پاتے ہیں کہ یہ سب کچھ برداشت کر لیں گے تو بسم اللہ۔ قوم کی آنکھیں فرشِ راہ ہیں لیکن اگر وہ دیکھتے ہوں کہ اُنکے ذاتی مفاد و مصالح اس مسلک سے مانع ہیں تو کھلم کھلا الگ ہو جائیں۔ نہ اُن کو قوم سے حجاب کی ضرورت محسوس ہوگی نہ قوم اُن کی بابت دھوکے میں رہے گی۔ یہ مذبذبین کا "بین ذالک" مسلک نہ قوم کے حق میں اچھا ہے نہ خود اُنکے حق میں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی!
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

اے کاش ان حضرات کو کسی طرح اس رازِ حقیقت کا پتہ چل جائے کہ:-

وَ لِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ ۶۳/۸

عزت تمام اللہ اور اُسکے رسول اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ہوتی ہے)
ہم منتظر ہیں کہ انکا طریقِ عمل کس فیصلہ کا پتہ دیتا ہے!

---

(۵) ایک اصُولی بحث۔

جب سے ملک میں لیگ اور کانگریس کا مسئلہ زیربحث آیا ہے مسلم قوم پرست حضرات لیگ کی مخالفت میں یہی دلیل لاتے ہیں جس کا ذکر ہم نے ابھی ابھی اوپر کیا ہے یعنی وہ کہتے ہیں کہ چونکہ لیگ ستردں اور نوابوں کی جماعت ہے اس میں ان لوگوں کی کمی ہے جنکے سینوں میں دل اور دلوں میں احساس ملی کی تڑپ ہو اور جن کی رگوں میں خون اور خون میں جوشِ حرارت ہو۔ اس لیے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ ہمیں اس طریق استدلال پر ہنسی بھی آتی ہے اور تاسف بھی۔ اس لیے کہ اس دلیل کو ذرا آگے بڑھایے اور دیکھیے کہ اسکا منطقی نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ سُنیئے! یہ چیز آج مسلمانوں کی زبان پر ہے۔ کہ مسلمان ہندوؤں سے ہر لحاظ میں پیچھے ہیں تعلیم میں، دولت میں۔ قربانی میں، فرائض شناسی میں۔ اطاعت میں، تنظیم میں، یک جہتی میں۔ عمل میں، قوت میں اور ان کے مقابلہ میں ہندوؤں میں یہ تمام جوہر بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ اگر قوم پرست حضرات کی یہ دلیل محکم تسلیم کرلی جائے کہ لیگ چونکہ "بے عملوں" کی جماعت ہے اسلیئے اسے چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ تو اس سے کیا یہ بھی لازم نہیں آجائے گا کہ مسلمان چونکہ "بے عملوں" کی قوم ہے اسلیے اسے چھوڑ کر ہندو قوم میں شامل ہو جانا چاہیئے؟ یعنی اُن حضرات کے نزدیک بحث کا مدار اسلام اور ہندو مت کے اصولوں کی اچھائی اور بُرائی پر نہیں۔ بلکہ موجودہ مسلمانوں اور موجود

ہندوؤں کی حالت پر موقوف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دلیل کس قدر کمزور ہے ہمیں تسلیم ہے کہ لیگ میں "بے عمل" انسان بھی موجود ہیں کمزور بھی ہیں۔ خود غرض بھی ہیں (اور ایسے لوگ کہاں نہیں ہیں کہیں تھوڑے کہیں زیادہ) لیکن سوال تو یہ ہے ہی نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا اسلامی اصولوں کے مطابق مسلم وغیر مسلم کی متحدہ قومیت کا وجود عمل میں بھی آسکتا ہے؟ اگر ایسا ہونا ازروئے اسلام جائز ہو تو بسم اللہ کانگریس میں یقیناً بلا مشروط شامل ہو جائیے لیکن اگر مسلمانوں کی الگ جماعت کا ہونا لابد ہوا ور "متحدہ قومیت" کا تصور باطل ہو۔ تو پھر اس دلیل کی روسے کانگریس کی شرکت کس طرح سے جائز ہو جائے گی کہ لیگ "بے عملوں" کی جماعت ہے۔ ہم ایک عرصہ سے مختلف اکابر قوم پرست مُسلم حضرات کی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ دیکھ رہے ہیں کہ کہیں کسی جگہ انھوں نے اپنے مسلک کی تائید میں۔ یا لیگ کے وجود کی مخالفت میں کتاب وسنت سے کوئی سند پیش کی ہو۔ لیکن ہماری آنکھیں چاروں طرف پھر پھرا کر مایوس واپس آجاتی ہیں۔ اگر کہیں استدلال ملتے ہیں تو اس انداز کے کہ ایک صاحب نے کہیں کہہ دیا کہ جواہرلال اور گاندھی مسلمانوں کے امام نہیں ہوسکتے!! اسکے جواب میں لاہور کے ایک نو وارد قوم پرست مسلم اخبار نے لکھا کہ بے شک یہ لوگ نماز میں تو امام نہیں ہوسکتے لیکن سیاست میں امام ہوسکتے ہیں!!

یا مثلاً اسی اخبار میں ایک بہت بڑے مقتدر عالمِ دین قوم پرست مولوی صاحب کی ایک تقریر شائع ہوئی جس میں لکھا تھا کہ ایک صاحب نے اپنا اعتراض کیا کہ کیوں صاحب! جواہرلال۔ جو یہ صرف ہندو ہی ہے۔ بلکہ خدا کا بھی منکر ہے وہ مسلمانوں کا قائد کیسے ہوسکتا ہے۔ اسکے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ ذرا جناح کا فوٹو تو دیکھو۔ اگر جواہرلال قائد نہیں ہوسکتا تو جناح کیسے قائد ہوسکتا ہے!!! یعنی جواہرلال نہرو کی دہریت وکفر کا جواب جناح کا داڑھی منڈانا تھا۔ اور اس دلیل کے بعد یہ مقتدر عالم دین مطمئن ہوگئے کہ جواہرلال کی قیادت کا شرعی جواز مل گیا۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں با دب گزارش کریں گے کہ خدا کے لئے وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور پریشان حال مسلمانوں کو کم ازکم اتنا تو بتا دیں کہ خدا ورسول کے احکام کے مطابق

وہ کون سا راستہ ہے جسے "ھٰذا صراطی مستقیماً" کہا گیا تھا طلوع اسلام کے گزشتہ چار پرچوں میں قومیت پرور حضرات کے مسلک کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں مختلف موضوعات کے ماتحت بحث کی جاچکی ہے لیکن اسوقت تک کسی ایک مسلم قوم پرور کی طرف سے کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیا گیا۔ کیا انکے نزدیک یہ مسئلہ ایسا ہی غیراہم ہے کہ اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں یا (نعوذ باللہ) قرآن کریم ایسے اہم معاملہ میں مسلمانوں کی رہنمائی سے قاصر ہے اور اس کا حل ان کی اپنی اپنی مرضی پر چھوڑ رہا ہے !

واردھا کی تعلیمی اسکیم

"واردھا اسکیم" سے متعلق جناب رازی کا جو مضمون اگست کے پرچہ میں شائع ہوا ہے اُسنے مختلف طبقات میں ایک نمایاں ذہنی ارتعاش، و فکری حرکت پیدا کردی ہے مضمون کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ رسالہ کے علاوہ اسے الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا جس کا پہلا ایڈیشن چند ہی روز میں ختم ہوگیا اور پھر دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ اِس اسکیم کی بنیاد جیسا کہ آپنے اُس مضمون سے دیکھ لیا ہوگا۔ اس دعوے پر ہے کہ اس کی رو سے مذہب کو تعلیم سے خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ مذہب کی تعلیم جھگڑوں کا باعث ہوتی ہے۔ مہاتما گاندہی جو اس اسکیم کے موجد ہیں۔ بار بار اس امر کا اعلان کر رہے ہیں۔ اور جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب جنہوں نے اس اسکیم کی تفصیلات مرتب فرمائی ہے انھوں نے بھی شملہ کانفرنس کے دوران میں یہی چیز بتائی کہ اس اسکیم کو مذہبی تعلیم سے الگ رکھا گیا ہے۔ مذہبی تعلیم اپنے اپنے گھروں میں نج کے طور پر دلائی جاسکتی ہے۔

اگر یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہوتا تو بھی مسلمانوں کے نزدیک اس قسم کی اسکیم جس سے مذہبی عنصر الگ کردیا گیا ہو۔ قابلِ قبول نہ ہوتی۔ لیکن بوالعجبی یہ ہے کہ یہ دعوے۔ باوجود اس قدر اہم ہونگی کے یکسر غلط ہے۔ دعوے یہ ہے کہ اسکیم سے مذہب کو خارج کردیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم

کی پُوری بُنیاد مذہب کے اوپر ہے۔ خود اس اسکیم کے اندر یہ بات موجود ہے۔ اور مہاتما گاندھی کے مختلف بیانات نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ :۔

(۱) بچوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے گی کہ اہنسا کا طریق زندگی ہنسا سے اچھا ہے اور تاریخ میں ان لوگوں کے کارنامے درخشندہ طور پر ان کے سامنے پیش کیے جائینگے جنہوں نے اہنسا کے ذریعے دُنیا میں کامیابی حاصل کی۔

(۲) بچوں کو یہ تعلیم دی جائے گی کہ :۔

(ا) تمام مذاہب اپنے اصُولوں کے لحاظ سے سچے ہیں۔ اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

(ب) ظواہر و رسوم (یعنی شرائع) کا اختلاف کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ اختلاف مذہبی جھگڑوں کا باعث ہے

(ج) مذہبی تعلیم کسی کتاب کے ذریعے سے نہیں دی جائیگی۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ تعلیم جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کسی "مذہب" کی تعلیم ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو وہ کون سا مذہب ہے ؟

(۱) اہنسا کی صداقت کا مذہب ہندو یوگ کے فلسفہ کا نچوڑ ہے پتنجلی کے شاستر میں لکھا ہے کہ "اہنسا پرمو دہرم" ہے یعنی سب سے اعلیٰ مذہب اہنسا ہے۔ پھر بدھ مت اور جین مت کی اصل بھی یہی مذہب ہے، آج مہاتما گاندہی کے نزدیک تو دہرم ہی یہی ہے! ایسا دہرم کہ جسے وہ زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رسالہ جامعہ بابت ماہ جولائی ۱۹۳۸ء کے صفحہ ۸۵ پر لکھا ہے۔

> گاندھی جی نے نیشنل ایجوکیشن بورڈ کی پچھلی نشست میں یہ تقریر کی "اس واردھا ٹریننگ اسکول کے قیام سے ہمارا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے اور قومی بیماریوں کا مداوا تلاش کرنا۔ آج ہمارے قومی امراض میں سب سے شدید و مہلک چیز مذہبی تعصب ہے۔ اس کے خلاف ہمیں عدم تشدد کا حربہ چلانا ہوگا۔ ہمیں اپنے مسائل کا حل اہنسا کے اصول سے کرنا ہوگا ہمارے اسکولوں میں ریاضی۔ سائنس اور تاریخ کی تدریس عدم تشدد کے نقطہ نگاہ

سے کی جائے گی"۔

(۲) شق دوم پہلی شق سے بھی زیادہ واضح ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں "برہمو سماج" ایک ایسا فرقہ موجود ہے جسکے اصول وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اُنکے مذہبی عقائد میں یہ باتیں شامل ہیں

(ا) ہر مذہب کے سچے اُصولوں کو اعتقادی اُصول مانا جائے۔

(ب) ظواہر و رسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے۔ بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ج) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(ملاحظہ ہو رسالہ تحفۃ الموحدین از راجہ رام موہن رائے۔ وانسائیکلوپیڈیا۔ برٹانیکا۔ وانسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھکس از ہیسٹنگز)

اب آپ خود اندازہ فرمالیجئے کہ اس اسکیم سے "نفسِ مذہب" خارج کیا گیا ہے۔ یا کوئی خاص مذہب خارج کیا گیا ہے۔ اہنسا کی تعلیم ہندو شاستروں کی تعلیم ہے۔ بُدھ مت اور جین مت (جو اب ہندو مت کے اجزا بن چکے ہیں) کی تعلیم ہے۔ بالفاظ دیگر تمام ہندوؤں کی تعلیم ہے۔ اور دوسرا حصہ برہمو سماج کی تعلیم ہے۔ جو خود ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے ان سب کی تعلیم تو اس اسکیم میں موجود ہے اور یہ اعلان کیے جارہے ہیں کہ مذہبی تعلیم کو اس اسکیم سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس میں البتہ شبہ نہیں کہ اسلام کی تعلیم کو واقعی اس سے خارج کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام میں نہ تو "اہنسا پرمو دہرم" ہے اور نہ ہی برہمو سماج کی عالمگیر سچائی ہی اصل مذہب ہے۔ کیا ہم مہاتما گاندھی اور جناب ڈاکٹر صاحب سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ان کے دعوے میں اور اس حقیقت میں مطابقت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟

پھر ایک اور بات بھی بڑی عجیب ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنے بیان مطبوعہ ہندوستان ٹائمز مورخہ ۷ جولائی میں فرمایا ہے کہ میں اس بات کو بڑا خطرناک اور مہلک سمجھتا ہوں کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا اپنا مذہب دوسرے مذاہب پر برتری رکھتا ہے۔ لیکن اہنسا کے متعلق ایک تو شاستروں میں یہ موجود ہے کہ یہ "پرمو دہرم" (یعنی سب سے اعلےٰ مذہب) ہے اور دوسرے

خود اس اسکیم میں یہ درج ہے کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ اہنسا کا طریقۂ زندگی ہمسا سے اچھا ہے اور ان دونوں کا مقابلہ کرکے بتایا جائے کہ اہمسا میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور ہمسا میں کیا کیا برائیاں کیا دوسرے لفظوں میں یہ وہی بات نہیں کہ بچوں کے ذہن نشیں کرایا جائے کہ ایک خاص مذہب (اہمسا کا مذہب) دوسرے مذہب (غیر اہمسا کے مذہب) سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اور اہمسا کا مذہب چونکہ ہندوؤں کا مذہب ہے اور اہمسا اور ہمسا کا مذہب مسلمانوں کا مذہب ہے اس لئے بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ ہندو مذہب۔ اسلام سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

اور اس پر یہ دعوےٰ ہے کہ واردھا اسکیم سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا گیا ہے۔

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

یہ مضمون اس قدر مقبول ہوا کہ علیحدہ پمفلٹ میں چھپوایا گیا جسکے تمام نسخے صرف ایک ہفتہ میں ختم ہوگئے اب یہی پمفلٹ دوبارہ طبع کرایا گیا ہے اور قیمت وہی ایک آنہ رکھی گئی ہے۔ اس پمفلٹ نے علم دوست اور ملت نواز اصحاب کی آنکھیں کھولدی ہیں اور اس کی عام اشاعت کو وقت کی ایک اہم خدمت تصور کیا جا رہا ہے۔ جلد منگایئے۔ ورنہ پھر نہ ملے گا۔ قیمت ایک آنہ محصول ڈاک کے علاوہ ہے ایک نسخہ کے لیے ۲ دو آنہ کے ٹکٹ ارسال فرمایئے۔

منیجر:۔ طلوع اسلام بلی ماران دھلی

اطلاع دیجئے کسی صاحب نے عرصہ دو ماہ کا ہوا دفتر طلوع اسلام میں کچھ روپے ارسال کئے تھے۔ کوپن پر پتہ درج نہ تھا اس لیے معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں خیال ہے کہ روپے علیگڈھ سے آئے تھے اگر یہ سطور ان صاحب کی نظر پڑ جائیں تو براہ کرم دفتر کو روپے کی تعداد سے اطلاع دیں اور یہ بھی لکھیں کہ روپے کس مد میں ارسال فرمائے ہیں۔ دفتر اُن کا بے حد شکرگزار رہیگا۔

(منیجر:۔ طلوع اسلام بلیماران دہلی)

دامانِ باغباں

(ڈیلاور)

امریکہ کے شعبۂ تعلیم میں ایک نیا تجربہ کیا جا رہا ہے جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ عام طریق تعلیم کے لحاظ سے درسگاہوں میں طلبار کی تقسیم جماعت بندی کے لحاظ سے ہوتی ہے اور ایک جماعت کے تمام طلبار کو ایک ہی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں کی مختلف ذہنی استعداد کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ امریکہ کے ماہرین تعلیم نے اس طریق تعلیم کے نقائص پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس سے وہ بچے جو دماغی صلاحیت کے اعتبار سے اوسط درجے کے طلبار سے کہیں فائق ہوتے ہیں خواہ مخواہ کم استعداد والے بچوں کے ساتھ جکڑے رہتے ہیں جس سے اُنکی طبع دراک یا تو رفتہ رفتہ کچلی جاتی ہے یا وہ اسے کسی دوسرے شعبہ کیطرف منتقل کرکے تباہ کر دیتے ہیں۔ اِس خیال کے پیشِ نظر انھوں نے بچوں کی ذہنی استعداد کے امتحان کے لیے مختلف طریقے وضع کیے ہیں اور مختلف درسگاہوں کے بچوں کا امتحان لیکر وہ ایسے بچوں کو الگ کر لیتے ہیں جن کی ذہانت و فطانت عام بچوں سے بلند ہوتی ہے۔ آٹھ سے گیارہ سال تک کی عمر کے بچوں پر اس کا عمل کیا جاتا ہے اور اوسطاً دس ہزار بچوں سے پچاس بچے اس معیار پر پُورے اترتے ہیں۔ ان بچوں کو وہ ایک الگ درس گاہ میں منتقل کر دیتے ہیں۔ جہاں ان کی مجموعی تعداد پانصد کے قریب رہتی ہے غربت اور امارت اس انتخاب میں کہیں اثر انداز نہیں ہوتی اور اس جدید درس گاہ میں تمام منتخب شدہ بچوں کے ذہنی رجحانات کے مطابق اعلیٰ ترین تعلیم دینے کے انتظامات موجود ہوتے ہیں۔ اب اندازہ فرمایئے کہ اس قسم کی تعلیم کے بعد یہ بچے کیا بنکر نکلینگے؟ یہ وہ بچے ہوں گے۔ جن کے ہاتھوں میں قوم کی تقدیریں ہوں گی۔

(بحوالہ لٹریری ڈائجسٹ۔ بابت ۱۹ رفروری ۱۹۳۸ء)

یہ ہیں زندہ قوموں کے کارنامے؛ اور دوسری طرف ہماری درس گاہیں بھی ہیں۔ مذہبی
درس گاہیں کہ جہاں نصاب تعلیم وہ ہے جو آج سے تین سو برس پیشتر مرتب ہوا تھا، اور
جس میں کسی تبدیلی کا خیال بھی "مداخلت فی الدین" سمجھا جاتا ہے اور دُنیاوی درسگاہیں
کہ جن کے متعلق حضرت اکبر مرحوم نے فرمایا کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

ظہر الفساد فی البر والبحر۔ خشکی اور تری میں فساد ہی فساد۔ اسے کہتے ہیں

گبریل ڈانُنزیو (GABRIEL DANUNZIO) اٹلی کا مشہور قومی شاعر تھا جس کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ شاعر بھی تھا۔ اور فوج میں جرنیل بھی۔ بہ حیثیت جرنیل اس کا سب سے مشہور کارنامہ یہ تھا کہ جب جنگ عظیم کے خاتمہ پر اتحادی آپس میں صلح کی شرائط طے کر رہے تھے تو اٹلی کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ فیوم (FIUME) کی بندرگاہ۔ جو آسٹریا ہنگری کے قبضہ میں تھی اور جسے اتحادی یوگو سلاویہ کے حوالہ کرنا چاہتے تھے۔ اٹلی کو دیدی جائے۔ اتحادی مُصر تھے کہ یہ بندرگاہ یوگوسلاویہ کو ملنی چاہیئے معاملہ زیر غور تھا لیکن ان "قومی شاعر صاحب" نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ سے فیوم پر دھاوا بول دیا اور بندرگاہ پر بزور قبضہ کر لیا۔ اگرچہ بعد میں انہیں شہر خالی کرنا پڑا۔

امریکہ کے رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" (بابت فروری ۱۹۳۸ء) میں ان کے متعلق ایک بڑا دلچسپ واقعہ شائع ہوا ہے جو اس عظیم الشان اور جلیل القدر جرنیل کی دماغی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ملازمت سے سُبکدوش ہونے پر یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہتے تھے۔ جس کے میدان میں انھوں نے ایک تباہ کُن کشتی کا اگلا حصہ نصب کرا رکھا تھا جس میں ایک بڑے دھانے کی توپ لگی ہوئی تھی اُن کا عزیز ترین مشغلہ یہ تھا کہ جب کبھی تہوار آتا تو خوب گولے چلاتے۔

ایک دفعہ ایک جرمن تاجر نے اُن کی کوٹھی کے مقابل اپنی کوٹھی تعمیر کی اور اسے گلابی رنگ کرایا فیوم کے ہیرو کو یہ رنگ پسند نہ آیا اور جرمن تاجر (یعنی کوٹھی کے مالک) کو کہلوا بھیجا کہ رنگ تبدیل کردو

اس نے کہا کہ کوٹھی میری ہے۔ جیسا جی چاہے میں اسپر رنگ کرادوں کسی کو اس میں کیا دخل ہے!
جرنیل صاحب نے یہ سُنا تو اسے الٹی میٹم دیدیا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر رنگ تبدیل کردو
ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ جرمن نے پھر پرواہ نہ کی لیکن دوسرے دن صبح اُٹھ کر اُسنے دیکھا کہ جرنیل
صاحب توپ کا رُخ اُس کی کوٹھی کیطرف کئے ہوئے ہیں اور مُلازم اُسکے پاس گولوں کا ڈھیر لگا رہا
ہے۔ وہ گھبرایا اور جرمنی سفارت خانہ میں ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے پولیس کو اطلاع دی گئی۔ پولیس
نے معاملہ وزارت داخلہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے حکم آیا کہ جرمن تاجر کو اپنی کوٹھی کا رنگ بدلنا پڑیگا
البتہ اسکے اخراجات اطالوی حکومت ادا کردے گی۔

(جس قوم کے شاعرِ اعظم اس طبیعت کے مالک ہوں وہ قوم اگر حبش کو یوں ہڑپ
کرجائے تو کونسی تعجب کی بات ہے قوم کا دل و دماغ شاعر ہی تو ہوتا ہے)

حال ہی میں مسٹر ردم لینڈو کی ایک کتاب بعنوان "تلاش فردا" (SEARCH FOR TOMORROW)
شائع ہوئی ہے جس میں اس نے ان سیاسی اور مذہبی رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ جو اُسنے عرب فلسطین
ٹرکی وغیرہ کی سیاحت کے دَوران میں محسوس کئے حجاز میں وہ سُلطان ابن سعود سے بھی ملا۔ اور ان سے
مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ سُلطان نے اُسے بتایا کہ وہ اپنے تمام سیاسی اُمور کی بُنیاد
مذہبی معتقدات پر رکھتے ہیں اور اُن کا ایمان ہے کہ کسی مُلک کی حکومت بہتر نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ
اس حکومت کی بنا، اسلامی اُصولوں پر نہ رکھی جائے۔ اُنھوں نے فرمایا:۔

اُسلام کے متعلق غیر مسلم اجنبی بالعموم غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں اسلام تو تمام مذاہب
عالم میں سب سے زیادہ عملی مذہب ہے۔ اسلام کے ہاں اِس کی کوئی مخالفت نہیں کہ تم
موٹریں اور ریڈیو ایجاد کرو اور اُنہیں استعمال میں لاؤ۔ جب تک کوئی ایجاد یا اصلاح
نبی اکرمؐ کی تعلیم کے اصُولوں سے متصادم نہیں ہوتی۔ اسلام اُس کی کبھی مخالفت
نہیں کریگا۔ بلکہ وہ تو ان ایجادات و اصلاحات کے حق میں ہے۔ کیونکہ اسلام مادی

اور روحانی ہر دو شعبۂ حیات کی ترقی کا مؤید ہے۔

ہم مغربی تہذیب کے صرف مادی فوائد سے متمتع ہو سکتے ہیں کیونکہ اہل مشرق مغربی تہذیب کے روحانی پہلو کے قائل ہی نہیں ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کی تہذیب یکسر روحانیت سے عاری ہے"۔

سُلطان کے نزدیک دولِ عربیہ کا باہم اتحاد ایک لاینفک ضرورت ہے۔ ایسا اتحاد جس میں اپنے اندرونی معاملات میں اپنی اپنی طرز حکومت ... آزاد ہوگی لیکن تمام ریاستیں ایک مرکزی جماعت کے واسطے سے باہمدگر پیوست ہونگی۔

مسٹر لینیڈ وے نے سوال کیا کہ اس بارے میں سعودی عرب حکومت کا خیال ہے کہ وہ مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت کے اتصال کا ذریعہ بن جائے۔ اسکے جواب میں سلطان نے کہا۔

"ہر اسلامی مُلک کا یہ مشن ہونا چاہیئے کہ وہ ایسا کرے کیونکہ اُس کی کامیابی کا انحصار مغربی مادیت کے تعاون پر ہے۔ ہم حقیقی کامیابی اسی صورتمیں حاصل کر سکتے ہیں جبکہ ہم اہل مغرب کے سامنے حقایق اسلامی کو پیش کر سکیں اور انہیں اپنے متعلق صحیح صحیح حالات سے آگاہ کر سکیں اور دوسری طرف اہل مغرب کے انداز معاشرت کے متعلق از خود معلومات حاصل کریں"۔ (بحوالہ جرنل آف لندن۔ مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء)

پتہ میں غلطی نہ کیجیے

بعض حضرات پتہ میں صرف "دفتر طلوع اسلام دہلی" لکھ دیتے ہیں جس سے خطوط کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے بلکہ اس وجہ سے اب تک بہت سے خطوط ضائع بھی ہو چکے ہیں اِس لیے قارئین سے گزارش ہے کہ خط و کتابت میں پورا پتہ اس طرح لکھا کریں۔　　"دفتر رسالہ طلوع اسلام بلیماراں دہلی"

بصائر

(ادارہ)

ہندوستان کے سوا دنیا کی تمام حکومتیں ملکی اور وطنی حکومتیں ہیں۔ افغانستان پر افغانیوں کی حکومت ہے۔ ایران میں ایرانیوں کا پرچم لہرا رہا ہے۔ ترکی میں ترک نوجوانوں کا اقتدار قائم ہے۔ اسی طرح انگلستان جرمنی۔ اٹلی فرانس۔ اور چھوٹی موٹی حکومتیں اپنے ہی باشندوں کے حسن انتظام سے چل رہی ہیں اور ہر جگہ قصۂ زمین برسر زمین کا معاملہ نظر آتا ہے۔ لیکن ایک صرف ہندوستان ہی جس پر ایک ایسی قوم کی حکومت قائم ہے جس کو اس سرزمین سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے یا وہ چند مقامات ہیں جہاں عرب آباد ہیں لیکن نو آبادیات کے نام سے ان پر فرانس۔ اٹلی اور انگلستان حکومت کر رہے ہیں چنانچہ آجکل آزادی اور غلامی کی تعریف ہی یہ ہو چکی ہے کہ جس ملک کی عنان حکومت اسکے باشندوں کے ہاتھ میں ہو وہ آزاد ہے اور جس پر دوسرے ملک کے باشندے حکمراں ہوں وہ غلام ہے۔ کمزور قوموں پر اجنبی مگر قوی قوموں کی حکومت کوئی نئی چیز نہیں ہے یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا چلا جائیگا دیکھنا صرف یہ ہے کہ اقوام غالب کی حکومت کے اجزائے ترکیبی کس انداز کے ہونے چاہئیں کہ مغلوبوں کو اپنا احساس مغلوبی ایک لمحہ کے لیے نہ ستائے بلکہ وہ اپنی مغلوبی کو خدا کی نعمت تصور کرنے لگیں یا بالفاظ دیگر دنیا میں وہ کونسی اجنبی حکومت ہے جسکے اپنی رعایا کے ساتھ اس قسم کے تعلق ہوں کہ اس حکومت کے استحکام و استقرار کے لیے انکے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلیں؟ موجودہ زمانہ میں تو ہمکو کوئی ایسی حکومت۔ کوئی ایسا نظام اور کوئی ایسی قوت نظر نہیں آتی کہ اگر وہ اس بدنصیب ملک کو چھوڑ کر جانے لگے تو رعایا اسکے قدم پکڑ لے اور رو رو کر استدعائیں کرے کہ خدا کے لیے آپ یہاں سے نہ جائیں خدا نہ کرے کہ آپکے سایہ سے ہمارے سر محروم ہوجائیں! آپ کہیں گے کہ ایسا ہونا تو قطعاً محال ہے۔ غالب قوم کا ملک چھوڑ کر چلے جانا تو مغلوبوں کے لیے فرحت و انبساط کا سامان ہوتا ہے۔ ایسا احمق کون ہے جو اجنبی قوت کے چلے جانے سے زار و قطار روئے اور ماتم سرائی میں مشغول ہوجائے! بلاشبہ یہ محال ہے مگر ساتھ ہی واقعہ اور حقیقت بھی ہے اور تاریخ نے

اپنے اوراق میں اس کو محفوظ کرلیا ہے مگر یہ واقعہ ان ہی غالب قوموں کیساتھ پیش آیا جنکی حکمرانی اپنی نہیں بلکہ اللہ کی تھی۔ جو فی الحقیقت "عبادی الصالحون" کے مصداق تھے اور جو راعی اور رعایا میں تفریق کرنا "ان الحکم الا للہ" کے منافی سمجھتے تھے۔ یقین نہ آئے تو تاریخ ایران کے اس درخشاں عہد پر نظر ڈالیئے۔ جب خدا کے پاک اور صالح بندوں نے وہاں حکومت الٰہیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔

حضرت فاروق اعظم کے زمانہ میں اسلام نے چار وانگ عالم پر اپنا وسیع شامیانہ پھیلایا اور مجاہدین کی جرار فوجیں ریگستان عرب سے نکلکر سمندروں کو پار اور خشکی تری کو عبور کرکے ایرانی سرحدوں پر پہنچیں۔ ایکطرف ایرانیوں کے جاہ وجلال سے مقابلہ تھا دوسری طرف قیصر کی مسیحی سلطنت کے ارکان بادیہ نشینان عرب کے قدموں سے متزلزل ہورہے تھے۔ اسلامی فوج کے سپہ سالار ابوعبیدہؓ نے رومیوں کے بہت سے مقامات فتح کر ڈالے اور اسطرح رومیوں کی حلقہ بگوشی اور ذلیل قسم کی غلامی سے لاکھوں انسانوں کو آزادی و حریت بخشی۔ عربوں کا یہ فاتحانہ اقدام رومیوں کے مقابلہ میں! مسیحی دنیا تڑپ اٹھی اور قیصر نے حزب اللہ سے مقابلہ کیلئے ایک جرار لشکر تیار کیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ اپنی فوج کے ہمراہ اسوقت حمص میں مقیم تھے انھوں نے اطلاع پاکر "و امرھم شوری بینھم" کے مطابق مجاہدین سے رائے طلب کی۔ مجاہدین نے مشورہ دیا کہ حمص میں قیام پذیر رہکر امدادی فوج کا انتظار کیا جائے۔ فرمایا اتنا وقت ہی کہاں ہے؟ آخر یہ رائے ٹھہری کہ حمص کو چھوڑ کر دمشق کو اپنا مستقر بنایا جائے کیونکہ ایک تو وہاں حضرت سیف اللہ خالد بن ولید موجود ہیں اور دوسرے وہاں سے عرب کی سرحد بھی قریب ہے۔ جب ارادہ پختہ ہو چکا اور حمص چھوڑنے کا وقت آیا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے حبیب بن مسلمہ کو جو خزانہ کے افسر اعلیٰ تھے بلایا اور فرمایا کہ دیکھو غیر قوموں سے جو جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا ہے وہ اس معاوضہ میں ہوتا ہے کہ دشمنوں سے انکی جان و مال کی حفاظت کی جائے افسر خزانہ نے کہا بیشک! فرمایا۔ تو اس نازک حالت میں ہم انکی حفاظت کا ذمہ کسطرح لے سکتے ہیں؟ اس لیئے ان سے جو کچھ وصول کیا گیا ہے انکو واپس کر دیا جائے! جنگ کا موقعہ ہے روپیہ اور خزانہ کی سخت ضرورت ہے مجاہدین ملک سے دور ہیں مگر امیر جیش حکم دیتا ہے

کہ رعایا کا روپیہ واپس کردو! رعایا بھی مسلمان نہیں۔ عیسائی اور یہودی! مرکز (امیر) سے حکم ملتے ہی کئی لاکھ کی رقم واپس کردی گئی! رقم ملتے ہی یہودیوں اور عیسائیوں کو یقین ہوگیا کہ اب مسلمان حمص میں نہیں ٹھہر سکتے۔ اصولاً ان کو مسلمانوں کے اس "فرار" سے خوش ہونا چاہیئے تھا۔ وہ مسرت کے مارے اچھلتے کودتے اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ اُسنے نہایت آسانی سے مسلمان جیسی "خونخوار" اور "جبر پسند والی" قوم کو یہاں سے نکالا۔ اور ہماری غلامی میں تبدیلی ہوگئی (آزادی)، مگر دیکھو عیسائیوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور یہودی الگ کھڑے رو رہے ہیں۔ عیسائی روتے تھے اور کہتے تھے کہ مسلمانو! خدا تم کو پھر واپس لائے۔ اللہ تم کو پھر ہم پر حکومت کرنی نصیب کرے۔ یہودی الگ کھڑے توریت کی قسم کھا رہے تھے کہ جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ قبضہ تو تمہارا ہی ہوگا اللہ کرے تم جلد واپس آؤ۔ انھوں نے اپنی قسم کو اس طرح پورا کیا کہ حمص کے پھاٹک بند کر لیئے تاکہ قیصر کی فوجیں اس میں داخل نہ ہونے پائیں۔

جب یہودیوں کو روپیہ واپس دیا گیا تو انھوں نے سالارِ اسلام سے مخاطب ہوکر کہا

"خدا کی قسم اگر عیسائی تمہاری جگہ ہوتے تو مال و متاع کو لوٹ کر ہم کو ذلّت کی موت مارتے اور ہماری آبرو خاک میں ملا دیتے۔"

سچ ہے ان الارض یرثہا عبادی الصالحون۔ ان ہی پاک انسانوں کو سلطنت اور حکمرانی کا حق تھا کیونکہ سلطنت اُن کی نہ تھی۔ بلکہ خدا کی تھی۔ انھوں نے غیر ملکی ہوتے ہوئے دوسرے ممالک کو فتح کیا مگر کبھی اپنے آپ کو رعایا سے اونچا نہ سمجھا۔ کبھی عیش و آرام کی زندگی بسر نہ کی۔ کبھی رعایا کا گلا نہ گھونٹا کبھی عالیشان محلوں میں نہ رہے انھوں نے حکومت کی تو خدا کی مخلوق کے فائدہ کے لیئے روپیہ جمع کیا تو بھوکوں، بیواؤں اور یتیموں کے لیئے۔ قوت حاصل کی تو فتنہ و فساد روکنے اور عدل و انصاف پھیلانے کے لیئے۔ اور یہی وہ چیز تھی کہ انکی روانگی پر ایک طرف عیسائی اشک بار ہیں اور دوسری طرف یہودی دعائیں دے رہے ہیں۔ یہ ہے رعایا کے دلوں پر حکومت کرنا۔ اور ان سے لینا اور ان ہی کو دینا۔ خدا کی رحمتیں ہوں ان پاکباز انسانوں پر جنہوں نے صالح سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

رعبِ فرنگ

(جناب اسد مُلتانی)

دانشورِ افرنگ کی تحقیق ہے مدّ آب　　بڑھتی نہیں بازیگریٔ علم کی حد سے

کچھ صاف سی بات تو نہیں دکھاتا ہے سچائی　　تا جھوٹ بھی بچ جائے شک و ریب کی زد سے

ہے دل میں نہاں اس کے ابھی تک وہ تعصب　　میراث میں پایا جو صلیبی اب و جد سے

اس میں کبھی انصاف سما ہی نہیں سکتا　　جو سینہ کہ معمور ہے دیرینہ حسد سے

دیکھو تو مسلمان کی اس سادہ دلی کو　　مرعوب ہے افرنگ کے معیارِ خرد سے

وہ چشم تو بینا ہی نہیں میری نظر میں　　دیکھے جو فقط غیر کی آنکھوں کی مدد سے

کیا ایسے مسلمان کا ایمان بھی ہے ایمان ؟

مانے جو محمدؐ کو فرنگی کی سند سے

تقریظات

مرثیہ اقبال

شاعرِ اسلام جناب اسدؔ ملتانی کا "مرثیۂ اقبال" طلوع اسلام کے جون کے پرچہ میں شائع ہو چکا ہے اس کے بعد اُن کی دوسری نظم "غمِ اقبال" کے عنوان سے جولائی کے پرچہ میں شائع ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ جناب اسدؔ نے اپنی ایک وجد آفریں نظم بتقریب "یوم اقبال" ۹ رجنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور میں پڑھی تھی۔ ادارۂ روزنامہ شمس۔ ملتان شہر نے ان ہر سہ نظموں کو یکجا ایک دیدہ زیب پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا ہے جسکے شروع میں جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز (بی اے) کے "چند الفاظ" بطور تعارف درج ہیں۔ جناب اسدؔ کی شاعری اور جناب پرویز صاحب کی نثر نگاری قارئین طلوع اسلام کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔ پمفلٹ کی طباعت وکتابت عمدہ۔ کاغذ نخپتہ۔ اور سرورق جاذبِ نظر ہے۔ اور ادارۂ مذکورہ بالا سے تین آنہ میں مل سکتا ہے۔ ادارۂ مذکور مستحق مبارک باد ہے کہ اس نے ان گراں مایہ جواہر ریزوں کو یوں محفوظ کر دیا۔ ہمیں آج تک جس قدر اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن میں بیک زبان اعتراف کیا گیا ہے کہ حضرتِ علاّمہ رح کی وفات پر جو کچھ لکھا گیا ہے جنابِ اسدؔ کا مرثیہ ان میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اسے الگ بھی شائع کیا جاتا۔

(مسلسل)

معارف القرآن (الٰہ۔ مسلسل)

انسان کی سب سے بڑی دکھتی رگ اس کا رزق ہے کسی قوم کا دوسری قوم پر غلبہ و استیلا ر ہوتا ہی اسوقت ہے جب وہ قوم کمزوروں کے رزق کے دروازوں پر اپنا تسلّط جمالیتی ہے ایک انسان دوسرے کے سامنے جھکتا اسوقت ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ میری روٹی اسکے ہاتھ میں ہے لیکن وہ قرآن جو کسی سرکش طاقت کے سامنے جھکنا انسانیت کی ذلّت قرار دیتا ہے (اور یہی چیز شرک بنجاتی ہے۔) رزق کے دروازوں کی چابیاں انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر خدا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے لہذا اسکے سوا اور کون الٰہ ہوسکتا ہے۔ کونسی ہستی ہے جسکے سامنے جھکا جائے +

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ ھَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰہِ یَرْزُقُکُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ۳۵/۳

اے نوع انسانی! تم پر جو اللہ کے احسانات (نعماء) ہیں اُن کو یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو زمین اور آسمانوں سے رزق پہنچاتا ہے! (۵۳) اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ سو تم کہاں اُلٹے جارہے ہو۔

فرعون نے اپنی خدائی کے ثبوت میں یہی دلیل پیش کی تھی کہ

انا ربکم الاعلیٰ ۷۹/۲۴ میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنیوالا ہوں

اسی ربوبیت۔ اِسی رزاقی کا ادعا سرکش قوتوں کے دماغ میں خدائی و کبریائی کا خناس پیدا کر دیتا ہے اور یہی دعویٰ غلط و باطل ہے۔ رزاقی اور ربوبیت صرف اُس ایک ذات کے لئے زیبا ہے جسے الٰہ واحد کہتے ہیں۔ اِس لئے کہ مُلک و سلطنت سب اُسی کی ہے (انسانوں کو تو اس لیے دی جاتی ہے کہ اُس کی مرضی کے مطابق انتظامات کرتے رہیں اِس کی تفصیل حکومت کے عنوان میں ملے گی،

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ ۳۹/۶

یہ ہے تمہارا اللہ۔ تمہارا رب (پرورش کرنیوالا) ملک (سلطنت) اسی کے لیے ہے اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں (۵۴) سو تم کدہر بھٹکتے پھر رہے ہو؟

رزق کے بعد سب سے بڑا خوف جو انسان کو دوسرے کے سامنے جھکاتا ہے۔ موت کا ڈر ہے، اصنامیات یونان کے دیوتاؤں اور ہندوستان کی دیویوں میں اکثریت انہی کی ہے جن کے سامنے موت کے خوف سے جھکا جاتا۔ اور ہندو تو ٹھیں موت ہی کے پھندے سے حق کہنے والوں کا گلا گھونٹتی ہیں لیکن قرآن کریم نے یہ اختیار بھی انسانوں یا دیوی دیوتاؤں سے چھین کر خدا کے سپرد کر دیا فرمایا:۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ۴۴/۸

اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے۔ وہی مارتا ہے (۵۵) تمہارا رب اور تمہارے آبا و اجداد کا رب ٭

پھر وہ ایسا الٰہ نہیں کہ کسی خاص خطۂ زمین والوں کا ہی الٰہ ہو اور دوسرے خطۂ ارض والوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ مختلف ممالک کے مختلف دیوتا۔ حتے کہ مختلف گاؤں کے مختلف دیوتا، پوجے جاتے ہیں لیکن اسلام کا الٰہ وہ الٰہ حقیقی ان جغرافیائی حدود و قیود سے بلند و بالا تر ہے، وہ تمام روئے زمین کا واحد الٰہ ہے مشرق و مغرب کا ایک خدا ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝ ۹/۷۳

مشرق و مغرب کا رب۔ اسکے سوا کوئی معبود نہیں پس اسی کو کارساز بناؤ۔

حتے کہ زمین و آسمان پستیوں اور بلندیوں میں وہی الٰہ واحد ہے۔

٭ کپلنگ کہاں ہے تاکہ دیکھ لے کہ مشرق و مغرب یوں آپس میں ملا کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۴۳/۸۴

اُسی کی ذات آسمان (بلندی) میں بھی الٰہ ہے۔ اور اسی کی ذات ارض (پستی) پر بھی الٰہ (۵۷) اور وہ حکمت والا علم والا ہے۔

یہ تو رہی جغرافیائی تقسیم۔ لیکن دُنیا میں مختلف ممالک کیطرح مختلف قبائل کے خدا، مختلف اقوام کے خدا، مختلف گروہوں کے خدا الگ الگ ہوتے ہیں لیکن اسلام کا الٰہ ان تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے یعنی وہ:۔

إِلَٰهِ النَّاسِ ۱۱۴/۳ تمام نوعِ انسانی کا مشترکہ الٰہ (۵۸)

ہے بلا لحاظ رنگ نسل۔ قوم، ملک سب کا ایک خدا، ایک الٰہ لہٰذا جب الٰہ ایک ہے تو تمام نوعِ انسانی ایک مشترکہ برادری ہے جس میں نسلی یا وطنی تفریق و تمیز کو کوئی دخل نہیں اس عالمگیر برادری اس اخوت بشری کا تصور قرآن کریم کے الٰہ کے تصور سے ہی پیدا ہوسکتا ہے اور یہی دینِ فطرت ہے یہ چیز ہمیں قرآن کریم نے ہی بتائی ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ لہٰذا تمام انسان ایک ایسی عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو رشتہ توحید سے بندھی ہوئی ہے

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۚ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّن بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۳۹/۶

اس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا پھر اس (نفس) سے (انسان) کا جوڑا پیدا کیا اور تمہارے لیے چارپاؤں کے آٹھ جوڑے پیدا کیے (اس کی تشریح اپنی جگہ آئے گی) تمہیں ماؤں کے ارحام میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر بناتا ہے۔ تین تاریکیوں میں یہ ہے اللہ تمہارا رب اسی کی سلطنت ہے، اُسکے سوا کوئی لائق عبادت نہیں تم کدھر پھرے جاتے ہو۔

پھر اس ایک الٰہ پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسان دوسرے انسان کے ساتھ معاملات میں اس چیز کو پیش نظر رکھے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے۔ اس کی مکافات۔ اسکا بدلہ۔ اس کی جزا و سزا

لازمی ہے اس صحیح ایمان سے دُنیا میں فتنہ وفساد باقی نہیں رہ سکتا کہ جب آپ اپنی ذمہ داری کا احساس اور دوسرے کے حقوق کی نگہداشت کرینگے تو جھگڑا پیدا ہی کیسے ہوگا، یہ تمام فتنہ سامانیاں پیدا ہی اس نظریے سے ہوتی ہیں کہ قوت اور طاقت والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کوئی پُوچھنے والا نہیں ہے۔ لیکن جو قرآن کریم کے الٰہ پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی ایسا نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ؀ ۴/۸۷

اللہ وہ ہے جسکے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ وہ یقیناً تمہیں قیامت کے دن جمع کریگا جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ (۵۹) اور خدا سے بڑھ کر سچی بات کہنے والا اور کون ہوسکتا ہے[۶]

آپ نے دیکھ لیا کہ دُنیا نے جن جن اغراض ومقاصد کو پیش نظر رکھ کر الگ الگ معبود تجویز کر رکھے ہیں اسلام نے ان تمام صفات حسنہ کو سمیٹ کر ایک ذاتِ واحد میں جمع کر دیا ہے۔ اس الٰہ حقیقی کا تعارف قرآن کریم نے اُسوقت کرایا جب کہ دنیا میں کہیں اس کا سچا نشان نہیں ملتا تھا اور یہ اس لیے کہ قرآن کریم خود اس الٰہ کیطرف سے دُنیا کو ملا ہے۔ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ فرمایا:۔

اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۶/۱۰۷

جو تیرے رَب کیطرف سے تجھ پر وحی کیا جاتا ہے اُس کی اتباع کر۔ اُسکے سوا کوئی الٰہ نہیں اور مشرکین سے اعراض کر

وہ قرآن جو اس الٰہ حقیقی کیطرف سے علم الٰہی کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۱۱/۱۴

پس بالیقین مانو کہ یہ (قرآن) علم الٰہی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اور یہ کہ اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں تو کیا تم سر تسلیم خم نہیں کرو گے!

فرشتے اس پیغام توحید کو لے کر نازل ہوتے تھے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا

إِنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ۝ ۱۶/۲

وہ فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے تاکہ وہ آگاہ کر دیں (یعنی اُن کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایسا کہیں کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ سو مجھ سے ڈرتے رہو ۔

اور اسی تعلیم کو نوعِ انسانی تک پہونچانا اور اُسکے ذریعہ سے فطرت خوابیدہ کو بیدار کرنا، قرآن کریم کا مسلک ہے۔ ارشاد ہے ۔

هَٰذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ ۱۴/۵۲

یہ نوعِ انسان کے لیے ایک واضح مضمون ہے۔ (احکام کا پہونچانا ہے) تاکہ اُسکے ذریعہ (فطرتِ انسانی کو) آگاہ کردے اور تاکہ یہ لوگ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے، اور تاکہ صاحبانِ علم اس سے (فطرت کے بھلائے ہوئے سبق کو) یاد کرسکیں

یہ ہے وہ الٰہ جسکے سامنے جھکنا زیبا ہے اور اسکے علاوہ کوئی دیوی دیوتا۔ کوئی تقدس وعظمت کا پیکرانسان ایسا نہیں جسکے سامنے جھکا جائے یا جسکے حضور جاکر قربانیاں پیش کی جائیں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۝ ۲۲/۳۴

اور ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی (یا طریق عبادت وقربانی) مقرر کر رکھی تھی تاکہ وہ ان چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اُسنے اُن کو عطا فرمائے ہیں سو تمہارا الٰہ وہی ایک ہے۔ سو اسی کے سامنے جھکو اور (اس طرح) جھکنے والوں کے لیے خوشخبری ہے

پھر قرآن کریم کا یہ مسلک نہیں کہ وہ کسی عقیدہ کو عقل وبصیرت کے خلاف اندھا دھند ٹھونسنا چاہتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ عقل صحیح اور قلب سلیم کو اپیل کرکے عقیدہ کو منواتا ہے اُسنے جب ایک الٰہ کیطرف دعوت دی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) دوسرے مذاہب یا دیگر اقوام کے "خداؤں" کی پرستش تے ہو

دیکھ نہیں سکتا تھا، بلکہ اس لیے کہ حقیقت ہی یہی ہے کہ الہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اسکے علاوہ کوئی دوسرا الٰہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اسکے لیے وہ دلیل محکم رکھتا ہے۔ اس چیز کے بیان کرنے کے بعد کہ یہ لوگ ادہر اُدہر کے معبود بنا لیتے ہیں (۲۱/۲۱) فرمایا:۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ ۲۱/۲۲

اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہوتا تو یہ ارض و سما (یہ سلسلۂ کائنات) درہم برہم ہو جاتا۔ سو اللہ رب العرش ان باتوں سے پاک ہے جو لوگ بیان کرتے ہیں

دوسری جگہ اس اجمال کی تفصیل بیان کی گئی ہے :۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ ۲۳/۹۱

اور اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا، اور نہ اسکے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا، اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔ سو اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جو لوگ بیان کرتے ہیں۔

دیکھنے میں تو یہ دلیل ایک مختصر سے فقرے میں آگئی لیکن معنوی اعتبار سے اُس کے اندر اہم حقائق پوشیدہ ہیں اگر آپ اس نظام عالم کے ربط وضبط پر دقتِ نظر سے غور کریں گے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ یہ عظیم الشان سلسلہ ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہا ہے اور اس محیر العقول مشینری کے مختلف پرزوں میں ایک خاص یک جہتی اور باہمی تعلق پایا جاتا ہے یہ ہوش رُبا کارخانہ اس نظم و نسق کے ساتھ کبھی چل ہی نہیں سکتا تا وقتیکہ اُس کے پیچھے ارادہ و مشیت صرف ایک نہ ہو اس کو قابو (CONTROL) میں رکھنے والی طاقت ایک نہ ہو۔ اگر اسکے پیچھے کہیں مختلف الارادوں والی دو قوتیں بھی موجود ہوں تو یہ نظام کبھی ایک سیکنڈ کے لیے نہ چل سکے۔ اگر مثلاً سورج کی رفتار اور گردش میں ایک ثانیہ کے ہزارویں حصہ کا بھی فرق پڑ جائے تو یہ نظامِ شمسی ایک آن واحد میں

پاش پاش ہو جائے۔ اور چونکہ آج سائنس کے انکشافات نے یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ اس سلسلہ کائنات کی جو چیزیں بظاہر ایک دوسرے سے الگ تھلگ، غیر متعلق اور آزاد نظر آتی ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے پیوستہ اور باہمی مربوط و منوط ہیں تو ظاہر ہے کہ اگر کہیں دو یا اس سے زیادہ مستقل بالذات، بالارادہ قوتیں اپنے اپنے اختیار و ارادہ کے ساتھ اس نظام عالم کا بند و بست اپنے اپنے ہاتھ میں لے لیں تو نتیجہ کیا ہو گا! قرآن کریم کا حسنِ بلاغت ملاحظہ ہو اس نتیجہ کے لیے ایک جامع لفظ استعمال فرمایا۔ لَفَسَدَتَا۔ اور اس لفظ کے اندر اس "دو عملی" یا طوائف الملوکی کے نتائج کی صحیح صحیح تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، جب کسی نظام کی ہر شے اپنے اپنے ٹھکانے پر صحیح ہیئت میں سرگرم عمل ہو تو اس حالت کا نام اعتدال ہوتا ہے۔ اور فساد کے معنی ہیں اعتدال کی حالت کا بگڑ جانا، کسی سلسلہ کا درہم برہم ہو جانا۔ پریشان و پراگندہ ہو جانا۔ ہر چیز کا اپنے ٹھکانے سے اکھڑ جانا، بے ربط ہو جانا، یہ ہے فساد جو ایک سے زائد مشیت و ارادہ کے کارفرما ہونے سے پیدا ہوتا ہے، ریل گاڑی کے انجن میں دو مختار کُل ڈرائیور بٹھا دیجیے۔ اور پھر تصور میں لایے اس منظر کو جو ان کے اپنے اپنے ارادوں کو عمل میں لانے سے پیدا ہو گا۔ لَفَسَدَتَا کی تفسیر سمجھ میں آ جائے گی۔ یہ متعدد خُداؤں کا تصور (خواہ وہ مستقل بالذّات ہوں۔ جیسے اہرمن و یزداں یا ایک خُدا، برہما، کے مختلف کارندے ہوں۔ جیسے دیوی دیوتا۔ یا اس کی قوتوں کے مختلف مظاہر جیسے شو، وشنو وغیرہ) یہ سب تصورات ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت کی یادگار ہیں، جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ نظامِ عالم کے مختلف شعبے الگ الگ کام کرتے ہیں، ان میں باہمی کوئی ربط نہیں، ہوائیں اپنی قوت سے چلتی ہیں اس لئے وایو دیوتا کی ضرورت ہے۔ بارش اپنے زور سے ہوتی ہے۔ اس لیے اندر دیوتا کی ضرورت ہے۔ پیدائش، زندگی موت الگ الگ شعبے ہیں اور ان سب کے الگ الگ انچارج ہیں، لیکن عقل انسانی نے جب اپنے عہدِ بلوغت میں، جوانی کے زمانے میں ان معتقدات اور تصورات کی حقیقت کو اپنے مشاہدات و تجربات کی رو سے بے نقاب کر دیا اور انسان نے بچشم خود ملاحظہ کر لیا کہ ع

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

تو آج اس عقیدہ کی کہاں گنجایش کہ نظام عالم ایک سے زیادہ ارادوں کے ماتحت چل رہا ہے اور چونکہ قرآن کریم انسانی علم وعقل کی انتہائی بلندیوں تک اس کی رہبری کرنے کے لیئے ملا ہے اس لیئے قرآنی حقایق علم وعقل کی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے ہیں۔ جہل اور توہم پرستی کا ساتھ دینے کے لیئے نہیں۔ اور جب یہ ذات اس قدر غیر محدود قوتوں اور لاانتہا اختیارات کی مالک ہے تو اسے اس چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ مختلف ایجنٹ، مختلف کارندے، اسکے دست بازو بنیں اس کا ہاتھ بٹائیں، نظم ونسق عالم میں مختلف شعبوں کے انچارج ہوں۔ یہ تو رہی عالم طبعی کی کیفیت اور اگر انسان کی تمدنی، عمرانی اور معاشرتی زندگی میں دیکھا جائے تو متعدد خداؤں کے عقیدہ سے جس قسم کا فساد رونما ہوتا ہے۔ اس کی مثال کے لیئے اس دور حاضرہ کا نمونہ سب سے موثر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام فتنہ وفساد۔ یہ عدم اطمینان وفقدان سکون کی آگ محض اس لیئے ہے کہ انسانوں نے الگ الگ معبود تراش رکھے ہیں۔ اور ہر ایک معبود دوسرے معبود سے برسر پیکار ہے گو دنیا آج بالعموم خدا کی منکر ہے لیکن ایک حقیقی الہ کے انکار سے دنیا نے ہزاروں غیر حقیقی الہ بنا رکھے ہیں (ان خداؤں کی تفصیل کہیں آگے ملے گی) انسان جس عالمگیر مواخات کی تلاش میں یوں سرگرداں ہے، اس کا سراغ صرف اس ایک عقیدہ میں ہے کہ تمام ممالک کا، تمام اقوام کا، تمام انسانوں کا خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ دنیا کو اسی کے قوانین کے ماتحت چلنا چاہیئے۔ اس ایمان کو پیدا کر دیجیئے پھر دیکھیئے کہ یہ تمام فساد امن میں تبدیل ہو جاتا ہے یا نہیں۔ فساد تو اس لیئے ہے کہ ایک سے زیادہ الہ ذہن انسانی نے تجویز کر رکھے ہیں۔ اٹلی کا الہ روس والوں کو نہیں جینے دیتا روس کا الہ جرمن والوں پر دھاوا بول رہا ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی "مخلوق" اپنے اپنے گروہ کو لے کر ایک دوسرے پر چڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا لفسدتا۔ ہر جگہ فساد ہی فساد ہے کوئی پرزہ اعتدال پر کام نہیں کر رہا۔ یہ بھی فساد کی تصویر کا ایک رخ ہے۔ اور جس سے آج کسی کو انکار نہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شرک کی اس شدت سے مخالفت کی ہے کہ شرک سے کوئی

نظام اپنی اصل حالت پر قایم ہی نہیں رہ سکتا۔ تاکید پر تاکید ہے کہ خدا کے ساتھ کوئی اور الہ نہ تجویز کرو۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ۵۱/۵۱

اور اللہ کے ساتھ کوئی اور الہ مت بناؤ۔ یقیناً میں اس کیطرف سے تمہیں صاف صاف آگاہی دینے کے لیے آیا ہوں۔

اس لیے کہ سرمدیت اور ابدیت صرف اسی ایک الہ کے لیے ہے۔ قدیم صرف اسی کی ذات ہے ہر ایک قوت فنا ہو جانے والی ہے۔ بقا صرف اسی کو ہے، اور نظامِ عالم کو چلانے کے لیے قوت بھی ایسی ہی ہونی چاہیئے جو فنا پذیر نہ ہو۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ۲۸/۸۸

اور اللہ کے ساتھ دوسرا الہ مت پکارو۔ اسکے سوا کوئی اور الہ نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر شئے فنا ہو جانیوالی ہے (۱) حکومت صرف اسی کی ہے اور اسی کی طرف لوٹکر جانا ہے۔ ۲۸/۸۸

نہ روح قدیم ہے نہ مادہ۔ نہ کوئی اور ذات ایسی ہے جو اس حکومت اور اختیار میں اُس کی شریک ہو

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ ۵۲/۴۳

کیا اُن کے لیے اللہ کے سوا اور معبود بھی ہے! اللہ انکے شرک سے پاک ہے۔

چونکہ یہ تمام قوتوں کو ایک ذات میں مرکوز کر دینے کا اعتقاد، نظم و ضبطِ عالم اور ہم آہنگی و یک جہتیٔ کائنات کی حقیقت پر مبنی تھا۔ اور یہ حقیقت ذہن انسانی کو ایک نئی چیز معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے جب انکے سامنے یہ عقیدہ پیش کیا گیا تو وہ بے حد متعجب ہوئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اور کونسی

---

(۱) Command

ایسی حقیقت ہے کہ علم وبصیرت نے اسے انسان کے سامنے پیش کیا ہو اور جہل اور توہم پرستی نے اس کا انکار نہ کیا ہو!!

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ ۳۸/۵

ہیں! کیا یہ ان تمام خداؤں کو ایک خدا بنا رہا ہے؟ یقیناً یہ تو ایک بڑی تعجب انگیز بات ہے،

اور اس عقیدہ کو (نعوذ باللہ) ایک مہمل شے سمجھ کر حقارت کی ہنسی ہنستے تھے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ○ ۳۷/۳۵

یہ وہ ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ تو تکبر کیا کرتے تھے

اور اس کے پیش کرنے والے کو (معاذ اللہ) دیوانہ بتاتے تھے:

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجْنُونٍ ○ ۳۷/۳۶

اور کہتے ہیں کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعرِ مجنون کے کہنے پر چھوڑ دیں

لیکن قرآن کریم نے ان کے اس انکار و اعراض کی کوئی پرواہ نہیں کی اس لیے کہ اسے علم تھا کہ ذرا علم و عقل کو ترقی کرنے دیجئے، انسانوں کی نگاہوں کے سامنے ذرا راز کائنات کھلنے دیجئے۔ یہ خود بخود ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس نظام کے پیچھے مشیت ایک ہی کارفرما ہو سکتی ہے۔ وہ نہیں متعدد نہیں

الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۱۵/۹۶

جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کرتے ہیں، انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا

(کہ حقیقت کیا ہے)

اسی لیے قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ لوگ جو ایک سے زیادہ معبودوں کے قائل ہیں ان کے پاس اپنے اس دعوے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۲۱/۲۴

کیا انھوں نے خدا کے علاوہ اور معبود اختیار کر رکھے ہیں؟ کہیے کہ آؤ اپنی دلیل لاؤ!

دیکھیے کتنا بڑا دعویٰ ہے اور کس قدر سچا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی مناظرہ میں ایک مشرک کسی توحید پرست کے

مقابلہ میں بڑے بڑے دلائل و حجج پیش کر رہا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مناظرہ میں وہ توحید پرست ساکت بھی ہو جائے لیکن مناظرہ تو اپنی اپنی علمیت اور قوت بیان کے مظاہرے کا اکھاڑہ ہوتا ہے خدا کے اس چیلنج سے تو یہ مفہوم ہے کہ جب علم و بصیرت کی فراوانی ہو جائے۔ حقائق بے نقاب ہو جائیں تو اسوقت کوئی مشرک اپنے مسلک کی تائید میں کوئی دلیل لائے اسوقت اُسے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی، کہ توحید حقیقتِ ثابتہ ہے، ظن و قیاس نہیں۔ دلیل و بُرہان مانگنے کا حق بھی اسی کو پہنچتا ہے جو علم و حقائق کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا ہو۔ ورنہ قرآن کے دعاوی تو ہمالیہ سے بھی زیادہ محکم اور اٹل ہیں۔ اوپر کی آیت میں بُرہان طلب کی ہے۔ یہ بھی ایک انداز بیان ہے یہ کہنے کا کہ اُن کے پاس کوئی بُرہان نہیں ہے اسی کو دوسری جگہ یوں واضح کر دیا:-

وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۲۳/۱۱۷

اور جو شخص اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود پکارتا ہے تو اُسکے پاس اس (عقیدہ) کے اثبات میں، کوئی دلیل نہیں ہو سکتی ۲۳/۱۱۷

اور اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ چونکہ اس عقیدہ کے مُدعی کے پاس کوئی دلیل و بُرہان نہیں ہے، اس لیے حقائق منکشف ہو جانے کے بعد یہ لوگ خود محسوس کرلیں گے کہ وہ کس قدر بڑی غلطی پر جمے بیٹھے تھے۔ اور اسوقت اس شکستِ پندار سے جو اُن کی کیفیت ہوگی وہ ظاہر ہے شرک کی حقیقت اسوقت کھلتی ہے جب انسان اپنی عظمتوں سے واقف ہو جائے۔ جب اسکے جوہر ذاتی کی قیمت اُس کی نگاہوں کے سامنے آ جائے تو اُسوقت اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ان حقیر چیزوں کو خدا بنا کر اُس نے اپنے آپ کو کس قدر ذلیل بنا رکھا تھا، اس علم کے بعد اُس کے دل کی کیفیت ہوگی وہ ظاہر ہے بشرطیکہ قلب میں صحیح احساس موجود ہو۔ اسی لیے فرمایا:

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۱۷/۲۲

(ترجمہ)

(اے انسان) خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود تجویز نہ کر۔ ورنہ تو راندہ ہوا، (بیٹھا رہ) جاوے گا

بے یار و مددگار رہ جائے گا۔ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا)۔ [۱۷/۲۲]

دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا [۱۷/۳۹]

اور خدا کے ساتھ دوسرا معبود مت اختیار کر ورنہ الزام خوردہ راندہ ہو کر جہنم میں

پھینک دیا جائے گا

سورۂ شعرا میں ہے:۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ [۲۶/۲۱۳]

اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود مت پکارو۔ ورنہ تو ان میں سے ہو جائے گا۔ جو

عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں

سورۂ ق میں ہے۔

ن الَّذِىْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيَاهُ فِى الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ [۵۰/۲۶]

جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنا لیتا ہے اُسے سخت عذاب میں ڈال دو ۔ ۔ ۔

یہی وجہ ہے کہ عباد الرحمٰن ۔ خدا کے بندے کبھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکتے ۔ کہ وہ اپنی اصلیت سے آگاہ

ہوتے ہیں

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ [۲۵/۶۸]

وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ دوسرا الٰہ تجویز نہیں کرتے ۔ ۔ ۔

ایسے عباد الرحمٰن کی مثال کے طور پر اصحاب کہف کو پیش کیا گیا ہے ۔ انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ خدا کے سوا کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکیں گے ۔ استبداد بھلا ایسے جذبات کی پرورش ہوتے کب دیکھ سکتا ہے ! اور ارباب مذہب اپنے خداؤں کے خلاف اس قسم کا نعرۂ بغاوت کب گوارا کر سکتے ہیں ! پتہ نہیں ان نوجوانوں کے خلاف کیا کیا سازشیں ہوئی ہوں گی کہ وہ بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے

له (LEST THOU SIT DOWN REPRESSED, FORSAKEN)

تفصیل آپ کو اصحاب کہف کے عنوان میں ملے گی، فرمایا:۔

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ۝ هٰۤؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ (۱۸/۱۴-۱۵)

اور ہم نے اُنکے دل مضبوط کر دیئے، جب وہ (عزم راسخ سے) اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے برملا کہہ دیا کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارینگے ورنہ اس صورت میں تو ہم بڑی بے جا بات کریں گے اور اس ہماری قوم کو دیکھئے! انھوں نے خدا کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں یہ لوگ ان معبودوں (کے جواز میں) کوئی کھلی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے! سو اس سے بڑھکر ظالم کون ہوگا جو خدا کیخلاف جھوٹی تہمت باندھے

اور ایک اصحاب کہف کے زمانہ پر ہی کیا موقوف ہے۔ اپنے آپ کو خدا منوانے والوں نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ فرعون نے حضرتِ موسےٰ کو ایسی ہی دھمکی دی تھی۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ (۲۶/۲۹)

اُس نے کہا کہ اگر میرے سوا تم نے کوئی اور معبود بنا یا تو (یاد رکھو) یقیناً تمہیں جیل میں بھجوا دوں گا

اور نشہ قوت و حکومت میں یہ طنز ملاحظہ ہو۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۲۸/۳۸)

فرعون نے کہا کہ اے سرداران ہیں تو اپنے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں سمجھتا۔ بس اے

ہامان تم ہمارے لیئے مٹی کی اینٹیں بنا کر ان پر آگ جلاؤ (پکاؤ ان کو پژاوہ میں)

پھر میرے لیئے ایک بلند مینار بناؤ۔ تاکہ میں اُس پر چڑھ کر موسےٰ کے خدا کو جھانکوں

اور میں تو اُسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں

دوسری جگہ ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا

فرعون نے کہا کہ اے ہامان میرے لیئے ایک بلند مینارہ بنادے تاکہ میں آسمان کی راہوں تک پہنچ جاؤں، پھر وہاں جاکر موسےٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو اُسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں ۳۶-۳۷

لیکن اس فرعونیت کا انجام بھی ملاحظہ فرماتے جایئے اور پھر دیکھیئے کہ لا برھان لہ (مشرک کے دعوے کا بلا سند ہونا) کس قدر حقیقت پر مبنی ہے، جب اپنی بے بسی ظاہر ہو گئی تو کتنی جلدی یہ حقیقت سامنے آگئی کہ واقعی الہ ایک ہی ہو سکتا ہے اور اس الہ کی صفات بھی وہی ہونی چاہیئں۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

حتےٰ کہ جب وہ (فرعون) ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس خدا کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔ اور کوئی الہ نہیں ہے اور میں جھک جانے والوں میں سے ہوں

یہ تو تھا جیتے جاگتے انسان کو خدا بنا لینا لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ شرک کی حقیقت ایک ہے لیکن اس کے مظاہرے کی شکلیں مختلف ہیں کہیں یہ بت پرستی کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسےٰ سے درخواست کی تھی کہ حضور ہمیں بھی ایک ایسا خدا بنوا دیجیئے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ ۱۳۸

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اُتار دیا، سو ان کا ایک ایسی قوم کے پاس
گذر ہوا جو اپنے بتوں (کی عبادت) پر جمے بیٹھے رہتے تھے وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ
ہمارے لیئے بھی ایک ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسے اُن کے خدا ہیں موسےٰ نے کہا کہ
تم (واقعی) بڑی جاہل قوم ہو۔

اُن کی اس جہالت پر دلیل بھی ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت موسےٰ نے فرمایا:۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۷/۱۴۰

کہا کہ کیا میں اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور معبود تجویز کردوں حالانکہ اس نے تم کو تمام
جہان والوں پر فضیلت عطا کی ہے

بُت پرستی کے خلاف کیا عجیب دلیل پیش کی گئی ہے! کہا گیا ہے کہ کمبختو! تمہیں تو اللہ نے تمام دنیا جہان، تمام کائنات سے افضل و اعلیٰ بنا یا ہے اور تم اپنی حقیقت سے بے خبر ایک پتھر کے بُت، ایک ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے سامنے جھکتے ہو، ذرا سوچو تو سہی کہ تم خود کیا ہو، اور چاہتے کیا ہو! بُت پرستی۔ یا اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا، انسان کا اپنی خودی، اپنی حقیقت نفس سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ اپنی کم مائیگی اور بیچیرزی کا اعتراف ہے۔ ذرا پہچانو تو سہی کہ تمہاری اپنی قیمت کیا ہے اور تم اس بے بہا جوہر کو کس درجہ حقیر و ذلیل کر رہے ہو۔

کافرا دل آوارہ دگر بارہ باو بند + برخویش کشا دیدہ دا ز غیر فرو بند
دیدن دگر آموز ندیدن دگر آموز!

لیکن قوم موسےٰ بھی ایک گونہ سچی تھی۔ صدیوں کی غلامی سے وہ کیفیت ہو چکی تھی جو مثنوی مولانا روم کی اس شیر کی ہوگئی تھی جو بھیڑوں میں رہتے رہتے اپنے آپ کو بھی بھیڑ ہی سمجھنے لگ گیا تھا۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے نہ آسکتی تھی کہ حضرت موسےٰ کیا کہتے ہیں۔ یہ خوئے غلامی میں پختہ ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت موسےٰ کی اس قدر حقیقت کشا تعلیم اور انقلاب انگیز تربیت کے باوجود۔ انہیں جونہی ذرا مہلت ملی حضرت موسےٰ کی آنکھ سے ذرا اوجھل ہوئے، اور جھٹ دہیں جا گرے جہاں سے انھیں اٹھایا تھا۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِیَ ؕ ۲۰/۸۸

پھر اس (سامری) نے اُن کے لیے ایک بچھڑا (بنا کر) پیش کیا جو ایک قالب تھا جس میں (بے معنی سی) آواز تھی۔ سو وہ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا اله، موسیٰ تو (یونہی) بھول رہا ہے (جو کسی اور اله کی طرف دعوت دیتا ہے) ∴ ∴

اور حضرت موسیٰ نے پھر اس مورتی کو جلا کر ذرہ باد کیا۔

وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا ۲۰/۹۷

اور (اے سامری) تو اپنے اس معبود کو دیکھ جس پر تو جما بیٹھا تھا (دیکھ) ہم اسے ابھی جلا دیں گے اور پھر اس کی راکھ کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔

تاکہ لوگوں پر یہ حقیقت کھل جائے کہ یہ معبود کس قدر بے بس تھا اور انسان اس کے مقابلہ میں کتنی قوت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اصنام پرستی کے علاوہ شرک کے مظاہرے کی کئی اور صورتیں بھی ہیں۔ مجوسی دو مستقل خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا۔ ایک برائی کا۔ ایک نور کا خدا، ایک ظلمت کا۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمائی

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ۱۶/۵۱

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو معبود مت بناؤ۔ معبود وہی ایک ہے سو تم لوگ خالص مجھ ہی سے ڈرو

کہ یہ تو صرف نظر کا پھیر ہے جو ظلمت کے لیے ایک الگ خدا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

(تفصیل کے لیے دیکھو شرک، خیر و شر)

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ
طلوع اسلام
بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فی ما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایہا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا
اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم
بات مانو اللہ رسول کی جب تمہیں ان کے طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار
(فرمان رسولؐ)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!

لا اسلام الا بالجماعۃ
(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب: محمد عثمان

بدل اشتراک: پانچ روپیہ سالانہ — فی پرچہ ۸

جلد (۱)　　شمارہ ۷　　بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

گہرہائے نایاب

حضرت علامہ اقبالؒ کی غیر مطبوعہ رباعی

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر یابی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰؐ رو

اسلامی نظام

(از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

قرآن کریم نے ملتِ اسلامیہ کا نظام وحدت اطاعت پر رکھا ہے یعنی اس کو سوائے اللہ کے کسی دوسرے کا مطیع نہیں بنایا:-

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۱۲

کسی کا فرمان نہیں سوائے اللہ کے اُسنے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اسکے کسی کے بندے نہ ہو، یہی ہے سیدھا دین۔ مگر اکثر آدمی نہیں جانتے

وہی بلا شرکت غیرے اصلی حاکم اور مطاع ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۲۵/۱۸ ۔ اور اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا

اُسنے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایت اور اُن کی عقلوں کو صحیح راستہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور نارضامندی کے اعمال کو واضح کرنے کے لیئے ایک ناقابل تغیر و تبدل کتاب اور مکمل دستور العمل قرآن کریم کو اتار دیا تاکہ اسکے مطابق عمل کرکے لوگ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دُنیا جہان کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۱۵۵/۶

اور یہ کتاب جس کو ہمنے اُتارا ہے مُبارک ہے اُس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ اُمید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

اللہ کی اطاعت کے معنی یہی ہیں کہ اُس کی کتاب کی پیروی کیجائے

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۱۱۴/۶

کیا اللہ کے سوا میں کسی اور کو حاکم بناؤں، حالانکہ اللہ تو وہ ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اُتاری ہے۔

اِس کتاب کے سوا کسی دوسرے کی پیروی ممنوع ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۳/۷

اُسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کیجانب سے اُتارا گیا ہے اور اُسکے سوا دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو!

چنانچہ جن لوگوں نے دُنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھیں گے تو چلا کر کہیں گے۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۠ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۳۳/۶۷

رسالت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) پیغمبری یعنی پیغام الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم وکاست پہنچا دینا۔ اِس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔

(۲) امامت یعنی اُمت کا انتظام، اسکی شیرازہ بندی، اُنکے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات جنگ وصلح وغیرہ اجتماعی اُمور میں اُن کی قیادت اور قیام مقامی وغیرہ۔ اِس حیثیت سے آپ کی طاعت اور فرمانبرداری لازم کیگئی۔

پہلی حیثیت یعنی پیغمبری کے لحاظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کیطرف سے آپ کے ذمہ لازم کر دیا گیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۶۷/۵

اے رسول جو تجھ پر اُتارا گیا ہے اُس کو پہنچا دے اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی!

لیکن بحیثیت امام لوگوں سے مشورہ لینے کے لیئے مامور تھے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۞ اور امورِ حکومت میں ان سے مشورہ لیا کرو

یہ امامتِ کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح فلاح کے لیئے قایم ہوئی قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ ہمیشہ رہنی چاہیئے قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے لیئے ہیں وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیئے ہیں جس میں آپ کے خلفا بھی داخل ہیں۔

یہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۞

اور جو رسول کی اطاعت کریگا اُسنے اللہ کی اطاعت کی

خلفائے رسول کی اطاعت بھی اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت ہے چنانچہ مرکز کے لیئے یہی لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۞

اے مومنو! اطاعت کرو اللہ اور اُسکے رسول کی اور اُس سے مُنہ نہ موڑو جس حال میں کہ تم سُن رہے ہو

اِس آیت میں "عنہ" کی ضمیر مفرد ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "اللہ و رسول" دونوں سے ایک ہی شئے مُراد ہے یعنی مرکز ورنہ قاعدہ کے مطابق یہاں "عنھما" ہونا چاہیئے تھا۔ اور "جس حال میں کہ تم سن رہے ہو" کی قید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہ ہے اور عربی میں اطاعت کے معنی ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۞

اے مومنو! اللہ و رسول کی بات مانو جب وہ تم کو ایسے کام کے لیئے بلائے جس میں تمہاری

زندگی ہو

یہاں بھی دعا کا صیغہ مفرد ہی اللہ و رسول دونوں کے لیے مستعمل ہوا ہے اور حکم بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے جو آپ کے تمام آنے والے خلفا پر شامل ہے

جنگ اُحد میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چونکہ بحیثیت امام کے تھا اسلیے قرآن میں "اللہ و رسول" دونوں کا حکم کہا گیا:۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۳/۱۷۲

جنھوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اٹھانے کے بعد

اسی طرح حج اکبر کے دن مشرکوں سے برائت کا اعلان جو مرکزِ اسلام کیطرف سے ہوا وہ "اللہ و رسول" دونوں کے نام سے ہوا۔

وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ

اور اعلان ہے اللہ اور اسکے رسول کیجانب سے لوگوں کیطرف حج اکبر کے دن کہ اللہ اور اسکا رسول مشرکوں سے بری ہے۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہیں "اللہ و رسول" دونوں کا محارب قرار دیا گیا

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا ۵/۳۳

جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے لڑتے اور روئے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اُن کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں الخ

ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لیے ہے کچھ عہدِ رسالت ہی تک محدود نہ تھی۔

الغرض بیسیوں آیات ہیں جن میں "اللہ و رسول" کا لفظ مرکز کے معنے میں مستعمل ہوا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

دستور العمل جس طرح اُمّتِ اسلامیہ کی انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے قرآن اُتارا گیا ہے اسی طرح اسکی

اجتماعی زندگی کا بھی دستورالعمل وہی ہے وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان ومکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اسی لئے جہاں ہر شخص کو ہدایت کیگئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ قرآن ہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکومت کرے

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۱۰۵/۴

ہمنے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اسکے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے کیطرف رخ کرنے کی ممانعت کیگئی۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۴۸/۵

اور انکے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل!

شدید تاکید کیگئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت روا نہیں ہے اور نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ اسپر کاربند رہنا چاہیئے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۴۹/۵

اور یہ کہ تو فیصلے کر ان کے درمیان اسی کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور انکی خواہشوں کے پیچھے نہ جا۔ اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے وہ تجھ کو ہٹا کر فتنہ میں نہ ڈال دیں!

یہاں تک کہ یہ وعید بھی کیگئی:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷/۵

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق حکم نہ دینگے وہ فاسق ہیں

فریضۂ امت | اسلام کے معنے ہی اطاعت کے ہیں امتِ اسلامیہ کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ ورسول یعنی مرکز کی مطیع رہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا

کہہ دے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اگر تم روگردانی کروگے تو اس کی ذمہ داری اُسکے اوپر ہے اور تمہاری ذمہ داری تمہارے اوپر ہے اور جو تم اُس کی اطاعت کروگے تو سیدھے راستے پر رہوگے +

مرکز کے وفادار رہو اور اُس سے غداری اور مفوضہ فریضہ میں خیانت کاری نہ کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ۸/۲۷

اے مومنو اللہ و رسول سے غداری اور جانتے ہوئے اپنی امانتوں میں خیانت کرو

مرکز ہی کی اطاعت کامیابی کا ذریعہ ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ۲۴/۵

مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کیطرف بُلائے جائیں کہ اُنکے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ کہہ دیں کہ ہمنے سُنا اور مان لیا۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں +

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہونگے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ ۝ ۵۸/۲۰ +

جو لوگ اللہ اور رسول سے مخالفت کرینگے وہ سب سے زیادہ ذلیل لوگوں میں سے ہونگے

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی نہیں رہتا جب کہ اللہ و رسول کسی امر کا فیصلہ کردے۔

یعنی مرکز ہر دینی یا دُنیاوی امر میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا مسلم کے لیے کوئی

چارہ نہیں اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے +

اطاعت | یہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن سوائے اللہ کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر کیا ہے اُن کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت فرمائی ہے، اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے، دینی اطاعت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی صرف اکیلے اللہ کی ہے انفرادی لحاظ سے قرآن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں موجود تھے اُنکی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد اس امامت کبریٰ پر آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہے جن کا فرض یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے مطابق احکام نافذ کریں اور اُمت کے منتخبہ افراد کو مشاورت کے لیے ساتھ رکھیں یہ احکام قطعی اور حتمی ہونگے جنسے سرتابی کرنیوالا اللہ و رسول کا دشمن ہوگا

الغرض دین اسلام محض ایک کتابی مذہب نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک مکمل عملی نظام ہے جو بدقسمتی سے مُدتہائے دراز سے مُسلمانوں کے ہاتھوں سے کھو یا گیا ہے اور اسی باعث وہ غارت ہوئے ہیں کیونکہ کسی ملت کی زندگی جب تک اُسکا زندہ مرکز نہ ہو سخت دُشوار ہے ۔

اجتماعی نظام کی پُوری شکل اس آیت میں ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ۴۴

اے مومنو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور تم میں سے جو اُمراء ہوں ان کی اطاعت کرو۔ اگر کسی بات میں تم تنازع کر بیٹھو تو اُسے اللہ و رسول کیطرف لوٹاؤ ۔ +

یعنی اصل مطاع اللہ ہے اسکی اجتماعی اطاعت ہوگی۔ رسول یعنی مرکز یا مرکز کے مقرر کیئے ہوئے اور اختیار دیئے ہوئے مُسلم اُمراء کے ذریعہ سے، اُن امراء کا کوئی فیصلہ یا حکم اگر مُسلمانوں کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اُس میں اُن کو اُمرا کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے اس قسم کے نزاعی اُمور میں مرکز کیطرف رجوع کرنا ہوگا، جو انکا فوراً قطعی فیصلہ کر دیگا ۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملت کا سارا اجتماعی اختیار مرکز کے ہاتھ میں ہے اُسی کی طرف سے ہر شعبہ کے امراء کا تقرر ہوگا، مثلاً امراءِ ملک، امراءِ فوج امراءِ عدل، اُمراءِ حج وائمہ صلوٰۃ و تعلیم و ارشاد وغیرہ نیز اُس کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ افرادِ ملت اور اُمراءِ ملت کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق پیدا نہ ہونے دے۔ اس انتظامی سلسلہ سے اُمت کا کوئی فرد باہر نہیں نکل سکتا۔

اس نظام میں اربابِ علم و عقل کو فکر کی پوری حریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجاتِ عالیہ کی سربلندی بھی عطا کی ہے لیکن اُن کو مطاع یا متبوع نہیں قرار دیا، اُن کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج امت کے لیے اُسی وقت حجت ہونگے جب مرکز سے مسلم ہو کر اُس کو ملیں گے۔ اسی طرح واعظوں کو وعظ اور مرشدوں کو رہنمائی کی اسی وقت اجازت ہوگی جب وہ مرکز کا پروانہ رکھتے ہونگے

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو اللہ و رسول کہتا ہوں، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

میں قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں اسی بنا پر اللہ و رسول کا یہ مفہوم کہ اُس سے مراد مرکز یعنی امام وقت ہے چند آیات ہی سے واضح کیا ہے جو اہل بصیرت کے لیے کافی ہیں اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش ہے، مگر عام اہل اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کی بھی سند چاہتے ہیں اور مدتہائے دراز سے اسکے خوگر ہو رہے ہیں اسلیئے اُن کی تسکین خاطر کیواسطے چند ائمہ تفسیر کے اقوال بھی نقل کیے دیتا ہوں جنہوں نے اللہ و رسول کے معنی امام وقت ہی کے لکھے ہیں۔

امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت میں قل الانفال للہ والرسول کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

وَاَولی ہذہ الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال ہی زیادات یزیدہا الامام لبعض الجیش او جمیعہم

انفال کے معنے کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنھوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لیے کرتا ہے۔

یہاں انفال کے معنے سے مجھے بحث نہیں مُدعا صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول کی تفسیر انھوں نے امام وقت لکھی ہے

امام رازی نے آیت ۳۳ انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ کے تحت میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

"قال ابوحنیفۃ اذا قتل واخذ المال فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء"

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے۔

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں:

"عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع بہ ما یشاء"

سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

یہی امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:-

"قال ابن عباس وسعید بن المسیب ومجاہد وعطا والحسن البصری وابراہیم النخعی والضحاک وابوثور من شہر السلاح فی قبۃ الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر بہ وقدر علیہ فامام المسلمین فیہ بالخیار"

حضرت ابن عباس، سعید بن المسیب، مجاہد، عطا، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک، اور ابوثور نے کہا ہے کہ جسے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پُرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اُس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں ایک تو یہ کہ اللہ و رسول سے مُراد امام وقت ہے اور دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرت صلعم کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں اور یہی دونوں باتیں ہمیں آیات سے واضح کی ہیں

تکملہ اس مضمون کے متعلق بعض لوگوں نے زبانی اور بعض لوگوں نے بذریعہ تحریر مختلف قسم کے سوالات کیے جن سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ توضیح طلب ہے اسلیے ضروری معلوم ہوا کہ اُن میں سے متعقل سوالات کو چُن کر ترتیب کے ساتھ معہ اُنکے جوابات کے لکھوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱)

س۔ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں ایک پیغمبری جسکے ذریعہ سے قرآن ملا۔ دوسری امامت یعنی ملّت کی مرکزیت جو آپ کی ذات سے قایم ہوئی اتباع قرآن کی شرعی حیثیت مسلم ہے مگر مرکز تو ایک دُنیاوی ادارہ ہے اگر نہ ہو جیسا کہ آج کل ہے تو اس سے مسلمانوں کے اسلام میں کیا خرابی آتی ہے

ج بلا مرکز کے ملّت کے مقاصد متعین نہیں ہوتے اور نہ اس میں اجتماعی عمل صالح کی حرکت پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ بیابان کے ریگ کے ذرّوں کیطرح منتشر رہتی ہے جو ہر ہوا اور آندھی کے ساتھ جدھر کی بھی ہوا اُڑتی رہتی ہے۔ قرآن اُمّت کا ایمان ہے اور مرکز اُس کا اجتماعی عمل۔

قرآن میں اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت کے احکام جو مسلمانوں کو دیے گئے ہیں، وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مرکز کی حیثیت بھی شرعی ہے، وہ محض دُنیاوی ادارہ نہیں ہے، ملّتِ امام کے بغیر ایسی ہی ہے جیسے جسم سر کے بغیر جس کا انجام ہلاکت ہے۔

(۲)

س۔ اللہ و رسول و اُولوالامر کی اطاعت بلا مرکز کے بھی اِسی طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن و سُنّت اور علما کی اطاعت کی جائے جیسی کہ آج کل ہم کر رہے ہیں۔

ج۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں کہ باوجود اپنی کثرت تعداد کے اور باوجود عالم میں اپنی زبردست جغرافی حیثیت کے اور باوجود اسکے کہ اسلام میں تمامتر بہادر اور جنگ آور قومیں داخل ہیں جن کے پس پشت عظیم الشان تاریخیں ہیں پھر بھی دوسروں سے کمزور اور ذلیل و خوار ہیں بلکہ اُمت کا بیشتر حصہ شرک اور کفر کا محکوم اور غلام ہے جو اسلام کا جزر صالح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے زندہ مرکز نہ ہونے کا اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث کو لے لیا کہ جس طرح چاہیں اُن پر عمل کریں یا نہ بھی عمل کریں

تو اطاعت کا مطالبہ کرنے والا کون ہے یہ علماء تو ان کا حلقہ اثر محدود ہوتا ہے جس سے مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ علاوہ بریں وہ خود اکثر آپس کی مخالفت کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں مبتلا رہتے ہیں اور اُمت میں اور زیادہ تفرقہ و انتشار کا موجب ہوتے ہیں۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں امت کو اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔

(۳)

س۔ تم نے اللہ و رسول کا مفہوم امام وقت ثابت کیا ہے لیکن علماء اس کے معنے کتاب و سنّت کے سمجھتے ہیں کیا اللہ کے لئے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان دو لفظوں کے بجائے صرف ایک لفظ امام کہہ دیتا تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

ج۔ قرآنی الفاظ منشاء مقصود کے مطابق ہوتے ہیں صرف امام کا لفظ کہنے سے اسلامی مرکز کا صحیح مفہوم نہیں ادا ہو سکتا تھا کیونکہ امام کہتے ہیں پیشوا اور رہبر کو خواہ کسی قسم کا ہو لغوی معنی کے لحاظ سے آج ہٹلر بھی جرمن قوم کا امام ہے لیکن اللہ کو بیان کرنا مقصود ہے اس امام کا جو قرآنی احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امامت کا چلانے والا ہو یہ مفہوم صرف اللہ و رسول ہی کے لفظ سے ادا ہو سکتا تھا۔ جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسی کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

(۴)

س۔ پھر بھی یہ بات حل طلب رہی کہ علماء نے اللہ و رسول سے مرکز ملّت کیوں نہ سمجھا

ج۔ میں نے اپنے مضمون میں ایسے مفسروں کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اللہ و رسول سے امام وقت ہی سمجھا ہے بے شک عرصہ دراز سے استبداد کے تسلط اور جامد تقلید نے علماء کے زاویہ ہائے نگاہ بدل دیئے ہیں وہ دین اسی کو سمجھتے ہیں کہ کتاب و سنّت بلکہ ائمہ کی فقہ پر عمل کرتے رہیں حالانکہ اس سے اجتماعی زندگی نہیں پیدا ہو سکتی حیات ملّی کے لئے قرآن کے ساتھ زندہ امام کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

(۵)

س۔ ایک سنّی مولانا نے کہا کہ کیا ضمانت ہے کہ امام وقت غلطی نہ کریگا۔

ج۔ کیا آپ کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما معصوم تھے؟ اگر نہیں تھے تو اُن کو خلیفۂ رسول بناتے وقت یہ سوال اُمّت نے کیوں نہیں اٹھایا؟

مگر جواب الزامی ہے تحقیقی جواب یہ ہے کہ غلط اور صحیح کے جو معنی عرف عام میں ہیں کہ جو حقیقت کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جو حقیقت کے مطابق ہو وہ صحیح ہے وہ نظام حکومت اور قانون عدالت میں نہیں ہیں۔ یہاں غلط وہ ہے جو بے ضابطہ ہو اور صحیح وہ ہے جو باضابطہ ہو ہمارے اصولیین نے بھی یہی لکھا کہ جب اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قوانین وضوابط کے مطابق کردے تو چاہے وہ حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ ہوگا، بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "القضاء نافذ شرعاً و دیانۃً" یعنی نہ صرف شرعاً بلکہ اللہ کے نزدیک بھی۔

ظاہر ہے کہ امام اُمّت کا قابل ترین فرد یا بہترین شخصوں میں سے ایک ہوگا جسے ساتھ قرآن کی روشنی اور شورہ کے لیے منتخب جماعت بھی ہوگی پھر ساری اُمّت کے ارباب علم و عقل بھی اصلاح کا خیال رکھیں گے ان سب کے بعد بے ضابطگی تو ہو ہی نہیں سکتی اور عرفی غلطی کا بھی خطرہ کم رہ جاتا ہے۔

علاوہ بریں غلطی سے اس قدر خوف کیوں ہے، فطرت نے اس کو انسان کی سرشت میں اسواسطے رکھا ہے کہ وہ زیادہ چوکنا ہوشیار اور خبردار رہے، اس لیے وہ انسان کی ترقی میں معاون ہے اور قصداً نہ ہو تو اس سے جس قدر نقصان ہوجاتا ہے بعض حالتوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچاتے اور غلطیاں کر کرکے ہی لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

(۶)

ایک شیعہ بزرگ نے فرمایا کہ مسئلۂ امامت میں تم اسی نقطہ پر آگئے جو ہماری جماعت کا ہے مگر یہ واضح نہیں ہوا کہ امام منصوص ہونا چاہیئے جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے یا جمہوری جیسا کہ سنّی کہتے ہیں۔

ج۔ میں کسی فرقہ بندی کا قائل نہیں ہیں نے جو کچھ لکھا ہے بلا خیال شیعہ یا سنّی کے خالص قرآنی

تعلیم کو لکھا ہے میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ قرآن جو تمام مسلمانوں کی دینی کتاب ہے، اور سب کے سب بلا استثناء اس پر ایمان رکھتے ہیں اس کی روشنی میں حسب اقتضائے زمانہ وضرورت ملّت کو چلانے اور ان سے اطاعت لینے کے لیئے زندہ امام ناگزیر ہے اور بلا اسکے امت کی اجتماعی زندگی کی کوئی صورت نہیں،

رہا امام منصوص کا عقیدہ تو اس کا ثبوت قرآن سے نہیں ملتا۔ اس لیئے میں امام متفق علیہ کا قائل ہوں یعنی جس پر جمہور اُمّت اتفاق کرے بشرطیکہ وہ قرآن کا تابع ہو اور شوریٰ سے کام کرے +

(۷)

انہوں نے پھر سوال کیا کہ متغلب بھی امام ہوسکتا ہے ؟ اور خلفاء بنی اُمیّہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟

ج میں کہہ چکا ہوں کہ امام وہ ہے کہ جو قرآن اور اُمّت کے شوریٰ کے مطابق کام کرے تغلب بھی امت کی شرکت ہی سے ہوتا ہے اس لیئے متغلب بھی امام ہوسکتا ہے بشرطیکہ ملّت کا اسپر اتفاق ہوجائے +

خلفاء بنی اُمیّہ میں استبداد تھا اور وہ مسلمانوں کے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے، اس لیئے وہ دُنیاوی بادشاہ تھے، نہ کہ امام، بجز حضرت عمر بن عبدالعزیز کے،

(۸)

س۔ کیا ایک زمانہ میں کئی امام ہوسکتے ہیں ؟

ج ہرگز نہیں کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے نیز اس سے ملّت کی وحدت فنا ہوجائیگی، ہاں امام وقت کے ماتحت مختلف اقوام و ممالک میں ہزاروں امام بیک وقت ہوسکتے ہیں یہ قرآنی اصطلاح کے مطابق اولوالامر کہے جائینگے +

(۹)

س۔ موجودہ زمانہ میں امامت نصب کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے ؟

ج۔ آج کل ملّت کا صرف ۱/۱۰ حصّہ آزاد ہے اور ۹/۱۰ غیروں کا محکوم۔ نصب امام آزاد مسلم قوموں کا فریضہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ انکا رُخ بھی اسطرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرکز قائم کریں۔

(۱۰)

س۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس صیغہ میں کیا کرنا چاہیئے۔ اور امام نہ رکھنے کی وجہ سے تم ہم کو مسلمان بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟

ج۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم محکوم ہیں اور ہمارے اوپر وہ قوانین نافذ ہیں جو حکمراں قوم نے بنائے ہیں ایسی حالت میں ہم یہی کرسکتے ہیں کہ باہمی اختلافات کو چھوڑ کر قرآن کیطرف آئیں اور وحدت عمل پیدا کریں اور چاہے ہم میں کتنی ہی جماعتیں اور جمعیتیں ہوں۔ لیکن ایک مرکزی انجمن جو آئین کے ماتحت ہو، متفقہ طور پر تمام ملت کے لیے ضروری ہے جس کا رکن ہر ہندی مسلم کو ہونا چاہیئے۔ ملت کے اس باہمی ربط سے آئندہ کے لیے راستے کھلیں گے۔

باقی رہا ہندوستان کے مسلمانوں کے اسلام یا کفر کا سوال تو میں اس قسم کے فتوؤں کو ناروا جراٴت سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک ہر وہ شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے وہ مسلمان ہے اور جو نہ کہے وہ نہیں میں خود بھی ہندوستان ہی کی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والی جماعت کا فرد ہوں۔ جو سب کا حال ہے وہی میرا حال ہے۔

وَمَا اَنَا اِلَّا مِنْ غَزِيَّةَ۔ اِنْ غَوَتْ
غَوَيْتُ. وَاِنْ تَرْشُدْ غَزِيَّةُ اَرْشُدْ

33475
14.6.76

وارد ہا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان وارد ہا کی تعلیمی اسکیم پر جناب رازی کا یہ عظیم الشان تبصرہ۔ اب کسی تبصرہ کا محتاج نہیں ہا۔ کئی کئی ہزار کے دو اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ اب تیسری بار چھپ کر شائع ہوا ہے اور نصف سے زائد نکل چکا ہے اسے خود بھی پڑھیئے اور دوسروں کو بھی پڑھ کر سنایئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ "قومی حکومتوں" کے دور میں مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ رکھنے اور ان پر ہند و تہذیب کو مسلط کرنے کی کیسی ترکیب ایجاد کی گئی ہے۔ قیمت فی نسخہ ایک آنہ محصول ۔/

(منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی)

قرآن اور قرآنی دلائل

(گزشتہ سے پیوستہ)

(از ادارہ)

مذہب کی جڑ اور ایمان کی بُنیاد خدا کے وجود کا اقرار ہے اسی لیئے ہر مذہب والے نے پہلے اسی مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے متکلمین اسلام کو جب دہریوں اور خدا کے منکروں سے سابقہ پڑا تو انکو خدا کے وجود پر دلائل قایم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اُنھوں نے وجود باری تعالیٰ پر دلائل قایم کیئے اور ان دلائل کو یا تو اپنے دماغ سے اختراع کیا یا فرفوریوس اور ارسطو کے کلام سے اخذ کیا اور اس تگ و دو میں انکو خیال ہی نہ رہا کہ قرآن حکیم وجود صانع پر خود کیا دلائل قایم کرتا ہے اور اُسکے مقدمات کس قدر یقینی اور اقرب الی الفہم ہیں، مثلاً ملاحظہ فرمایئے۔

متکلمین کی اختراعی دلیلیں

یُونانی فلاسفہ نے تسلیم کیا ہے کہ عالم کا سلسلہ منتہی ہے اور اسکی ایک علت ہے جو اسکی پیدایش اور تخلیق کا سبب ہے اُسپر ارسطو نے یہ دلیل قایم کی تھی کہ عالم متحرک ہے اور ہر متحرک کے لیئے محرک کا ہونا ضروری ہے اسلیئے عالم کا بھی کوئی نہ کوئی محرک ہوگا جس کو خدا یا علت العلل کہنا چاہیئے یہ دلیل ایسی ہے کہ کوئی سلیم العقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتا ایک دہریہ کہہ سکتا ہے کہ حرکت مادّی ذرات کا خاصہ ہے۔ اسلیئے حرکت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے متکلمین اسلام نے جب دیکھا کہ اس دلیل سے کام نہیں چلتا تو اُنھوں نے صانع عالم کی ایک دوسری دلیل قایم کی اُس کو سمجھنے کے لیئے اُمور ذیل ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

(۱) عالم جوہر و عرض یا صفت و موصوف کے مجموعہ کا نام ہے، اور یہ دونوں حادث ہیں۔

(۲) اعراض کا حدوث بدیہی ہے، سکون کے بعد حرکت اور حرکت کے بعد پیدایش روزمرّہ کا مشاہدہ

ہے اعیان یا جواہر کے حدوث کی وجہ یہ ہے کہ انکے ساتھ اعراض پائے جاتے ہیں۔

(۳) جو چیز حاوث کا محل ہو وہ خود حادث ہوتی ہے' لہٰذا جواہر و اعیان بھی حادث ہیں۔

اسکے بعد متکلمین یہ دلیل قایم کرتے ہیں کہ عالم حادث ہے لہٰذا اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہی ہوگا اور وہ خدا ہے' ابن رُشد فلسفی نے اس دلیل کے پرخچے اڑا کر یہ زبردست خدشہ وارد کیا ہے کہ اسکا کیا ثبوت ہے کہ جو چیز اعراض کا محل ہے اُس کا حادث ہونا ضروری ہے ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اعراض بے شک حادث ہونگے لیکن نفس محل حادث نہ ہوگا کیونکہ اگر کسی چیز پر پے در پے اعراض وارد ہوتے رہیں تو اُسکے محل کا حادث ہونا لازم نہیں آتا اسکے بعد ابن رشد کہتا ہے کہ:۔

ولو کلف الجمہور العلم من ھذہ الطرق لکان من باب تکلیف ما لا یطاق و ایضا فان الطرق التی سلک ھؤلاء القوم فی حدوث العالم قد جمعت بین ھذین الوصفین معاً اعنی ان الجمہور لیس فی طباعہم قبولہا ولا ھی مع ھذا برھانیۃ فلیست تصلح لا للعلماء ولا للجمہور۔

اگر ان طریقوں سے عوام کو علم کے لیے مکلف کرنا جائے تو یہ تکلیف مالا یطاق کی قبیل سے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہوگا، نیز اُن لوگوں نے حدوث عالم کے بارے میں جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ دو اوصاف کے جامع ہیں یعنی ان دلائل کو نہ تو عوام سمجھ سکتے اور نہ انکو قبول کرسکتے ہیں اور نہ وہ فی نفسہ برہانی اور یقینی ہیں لہٰذا وہ نہ علماء کے لیے مفید ہیں اور نہ عوام کے لیے۔[1]

جب متکلمین کی یہ دلیل بیکار ثابت ہوئی' اور اسکا ضعف خود انپر بھی واضح ہوگیا تو انھوں نے وجود صانع پر ایک اور دلیل قایم کی اور امکان و وجوب کے پردہ میں اپنی خفت کو مٹانا چاہا چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ عالم' ممکن ہے یعنی جائز العدم اور جائز الوجود ہے۔ اسلیئے وہ ایک ایسی ہستی کا محتاج ہے جو اسکا مرجح اور مخصص ہو اور وہ مرجح خدا ہے۔

---

[1] دیکھو ابن رشد کی کتاب کشف الادلہ صفحہ ۴۶ مطبوعہ مصر۔

مگر خدا کے وجود پر یہ دلیل بھی نہایت کمزور ہے اور جو شبہات اسپر وارد ہوتے ہیں انکا جواب متکلمین کے بس کا نہیں ہے۔

اگر متکلمین کے دلائل سے خدا کا وجود ثابت بھی ہو جائے تب بھی وہ دلیلیں ایک مسلمان کے لیئے ایک خدا پرست کے لیئے اور اس شخص کے لیئے جو خدا کی ذات و صفات کا صحیح تصور پیدا کرنا چاہتا ہے قطعاً ناقابل قبول ہیں کیونکہ ان دلائل سے جس "خدا" کا ظہور ہوتا ہے وہ محض خیالی، ذہنی اور ناکارہ ہے ان دلائل سے یہ کہاں ثابت ہوگیا کہ وہ خدا فاعل مختار، فعال لما یرید ہے جامع الصفات والکمالات ہے۔ قادر و علیم ہے، سمیع و بصیر ہے، خالق و ناصر ہے اور رحمٰن و رحیم ہے؟ خدا کی معرفت حاصل کرنے والوں کو ہرگز ایسے خدا کی ضرورت نہیں جو محض ذہنی اور اعتباری ہو اور ان کو اس سے کوئی اُنس اور محبت پیدا نہ ہو، یاد رکھیئے خدا کا مسکن قلبِ مومن ہے، دماغِ فلاسفر نہیں ہے

قرآن اور صانع عالم

لیکن قرآن حکیم نے باری تعالےٰ یا خالق کائنات کے وجود مقدس پر جو دلائل قایم کیے ہیں ان سے خودبخود

(۱) اذعان و یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) ہر عامی اور جاہل کو تسلّی حاصل ہو جاتی ہے۔

(۳) اور خودبخود ان سے ایک ایسے خدا کے وجود کا پتہ چل جاتا ہے جو صفات حسنہ کا جامع اور کمالات و حسنات کا سرچشمہ ہے ایسا خدا جو قلبِ انسانی کو تسکین و طمانیت کے نُور سے بھر دیتا ہے۔

اب آیئے قرآن حکیم کیطرف اور دیکھئے کہ وہ اپنے دعوے پر کس طرح دلیل قایم کرتا ہے اور اسکے مقدمات کس قدر بسیط اور سہل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے خدا کے وجود پر تین طرح کے دلائل قایم کیئے ہیں

اوّل۔ وہ منافع کائنات سے دلیل لاتا ہے اور انسان کو کائنات میں غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تمام عالم نوع انسانی کے فائدہ کے لیئے بنایا گیا ہے اگر اسکا بنانیوالا کوئی صاحبِ حکمت و ارادہ اور علیم و خبیر نہ ہو تو یہ چیز اس سے حاصل نہیں ہوسکتی

الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر ۰

کیا جسنے تمام عالم پیدا کر دیا وہ علم سے خالی ہوسکتا ہے؟ بلا شبہ وہ تو لطیف اور خبیر ہے

چنانچہ فرمایا:۔

(۱) وآیۃ لھم الارض المیتۃ احیینا ھا واخرجنا منھا حبا فمنہ یاکلون ۰ وجعلنا فیھا جنٰت من نخیل واعناب وفجرنا فیھا من العیون ۰ لیاکلوا من ثمرہ وما عملتہ ایدیھم افلا یشکرون ۰

اوران کے لیے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم مُردہ زمین کو از سر نو زندہ کر دیتے ہیں۔ اور اس سے دانے نکالتے ہیں اور وہ اسکو کھاتے ہیں اور ہم اس میں کھجور اور انگور کے باغ لگا کر چشمے بھی جاری کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی محنت کا نتیجہ دیکھیں اور پھل کھائیں۔ ان نعمتوں پر آخر وہ کیوں سپاس گزار نہیں ہوتے؟

(۲) اَلَّذِیْنَ یتفکرون فِیْ خلق السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض ربَّنَا مَا خلقت ھٰذا باطلاً

جو لوگ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے مُربی! تو نے انکو عبث اور بے فائدہ پیدا نہیں کیا

(۳) فلینظر الانسان الیٰ طعامہ انا صببنا الماء صبا ۰ ثم شققنا الارض شقا ۰ فانبتنا فیھا حبا ۰ وعنبا وقضبا ۰ وزیتونا ونخلا ۰ وحدائق غلبا ۰ وفاکھۃ وابا ۰ متاعا لکم ولانعامکم ۰

انسان ذرا اپنے کھانے کیطرف تو دیکھے ہم نے اسپر پانی چھڑکا۔ پھر زمین کو پھاڑ کر اس میں سے غلہ انگور اور ترکاری پیدا کی اور زیتون اور کھجور بھی اسی کے ساتھ لہلہاتے باغ اور ان میں پھل پھول پیدا کیے جو تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے متاع زندگی ہیں

دوئم۔ قرآن حکیم مخلوقات کی پیدائش سے خالق کے وجود پر بھی استدلال کرتا ہے +

(۴) اولم ینظروا فِیْ ملکوت السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض وَمَا خَلَقَ اللہ من شیءٍ

(باقی آئندہ)

تفسیر اسرارِ خودی !

مبحث ششم

(از جناب خان محمد یوسف صاحب سلیم چشتی بی اے (آنرز)

یہ مضمون میں نے اپنے دوست سید محمد شاہ صاحب ایم اے کی فرمائش پر لکھنا شروع کیا تھا اور اس کی پانچ قسطیں انکے رسالہ "پیغام حق" میں شائع بھی ہوئیں، لیکن بعض وجوہ سے یہ رسالہ بند ہوگیا۔ اسلیئے اب میں یہ سلسلہ رسالہ طلوع اسلام میں جاری کر رہا ہوں۔

یہ مضمون علامہ مرحوم کی مایۂ ناز تصنیف اسرارِ خودی کو مسلمانوں سے متعارف کرنے کی ایک ابتدائی حقیر سی کوشش ہے، اور اسکا مقصد علامہ کے فلسفہ کی تشریح نہیں ہے، بلکہ اس کو اردو زبان میں پیش کرنا، تاکہ مسلمانوں کی توجہ اس اہم کتاب کیطرف مبذول ہوسکے، اس کتاب کی تشریح و توضیح، ایک مستقل کتاب کی صورت میں پیش کیجائے گی۔

یہ مضمون رسالہ طلوعِ اسلام میں باقاعدہ ہر ماہ شائع ہوگا حتیٰ کہ اسرار خودی اور رموزِ بیخودی دونوں مثنویوں کے مطالب بطرز اجمال ناظرین کے سامنے آجائیں۔

ہر چند یہ قسط عنوان مذکورہ صدر کی چھٹی کڑی ہے لیکن چونکہ اصل مسئلہ یہی ہے کہ خودی کیا ہے اور اسکا استحکام و تربیت کس طرح ہوسکتی ہے اس لیے اس کڑی کے آغاز سے بھی سلسلہ غیر مربوط نہیں رہے گا۔

مراحل سہ گانہ

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ترقی اور کامیابی تمامتر استحکام و تربیت خودی پر منحصر ہے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہو گا کہ خودی کی تربیت کس نہج اور کس صورت سے کیجائے۔

علامہ نے اِسکا جواب یہ دیا ہے کہ تربیتِ خودی کے تین مراحل (A G E S) ہیں مرحلۂ اوّل کا نام اطاعت ہے۔ مرحلۂ دوم کا نام ضبط نفس ہے اور مرحلۂ سوم کا نام نیابت الٰہی ہے۔ ذیل میں ان مراحل سہ گانہ کی تشریح درج کیجاتی ہے۔

مرحلۂ اوّل

اگر کوئی شخص اپنی خودی کی تربیت کا خواہاں ہے تو اُسے سب سے پہلے اطاعت کو شعار زندگی بنانا چاہیئے۔ اور فرائض منصبی کے ادا کرنے کو مقصدِ حیات سمجھنا چاہیئے۔

واضح ہو کہ اطاعت اور ادائے فرض دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لہٰذا مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ اطاعت (فرمانبرداری) تربیت خودی کے لیئے پہلی اور لازمی شرط ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس شخص کی فرمانبرداری یا اطاعت کیجائے؟ اِسکا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کی۔

کس طرح؟ قرآن مجید خدا تعالےٰ کا عطا کردہ دستور العمل ہے اور دستور العمل کی اطاعت ہی دراصل خدا کی اطاعت ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اِس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ مسلمانوں کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، یہ کیوں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی اطاعت کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس دستور العمل کی اطاعت کیجائے جو آپنے دُنیا کو دیا۔

نوٹ۔ اسلام شخصیت پرستی سے بالاتر ہے، وہ انسان کو خدا پرستی کی تعلیم دیتا ہے، اور مسلمان صرف خدا کے حکم کا پابند ہے۔ رسول کا حکم بھی خدا کا حکم ہوتا ہے اور آیہ قرآنی من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اسپر دال ہے۔ مسلمان آنحضرتؐ کے نام پر جان قربان کرنا سعادت سرمدی یقین کرتا ہے مگر اسلیئے نہیں کہ آپ فلاں ابن فلاں کے بیٹے تھے۔ بلکہ اسلیئے

کہ آپؐ نے ہمیں قرآن مجید جیسی نعمت عطا کی +

مسلمان اپنے ہادی برحقؐ کو نہ خدا سمجھتے ہیں نہ خدا کا فرزند بلکہ عبدہٗ و رسولہٗ۔ اور واضح ہو کہ عبد اور عبدہٗ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، یہ وہ بلند مقام ہے جس کی رفعت کا اندازہ بھی دشوار ہے علامہ خود لکھتے ہیں۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر

اب یہ اشعار پڑھیئے۔

توہم از بار فرائض سرمتاب — برخوری از عندہٗ حسن المآب"

یعنی (جس طرح اُشترِ صحرائی کمال صبر و استقلال کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتا ہے اسی طرح اے انسان) تو بھی ادائے فرض میں کوتاہی نہ کر۔ اگر تو اپنے فرائض کو اچھی طرح ادا کرے گا اور اطاعت کو اپنا شعار زندگی بنائے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ تجھے اسکا اجرِ عظیم عطا فرمائے گا جیسا کہ اُسنے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۲

(زن و فرزند، دولت مال اور ثروت دنیوی) یہ سب چیزیں دُنیا کی زندگی کی پونجی ہیں اور اللہ کے پاس (حیات انسانی کا) بہترین مقصد موجود ہے

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار

یعنی اے غفلت شعار اطاعت الٰہی میں سرگرمی دکھا کیونکہ جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے

FREEDOM IS BORN OUT OF OBEDIENCE TO THE DIVINE LAW

فلسفہ جبر و اختیار

حکیم الامتہ نے اس شعر میں ایک زبردست زندگی بخش حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اگر مسلمان حکومت کے طالب ہیں تو انہیں۔ اطاعت (الٰہی) کو اپنا شعار بنانا چاہیئے۔

می شود از جبر پیدا اختیار

مغربی اور مشرقی دونوں ممالک کے فلاسفہ اور حکما میں صدیوں سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ گزشتہ ڈھائی ہزار سال میں جو کچھ اس پر لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ تین آرا میں منحصر کیا جا سکتا ہے:-

(ا) انسان مجبور محض ہے

(ب) انسان مختار ہے۔

(ج) انسان مختار بھی ہے مجبور بھی ہے

علامہ نے ان تینوں قیاسات سے بچ کر ایک نئی بات پیش کی ہے جو آن کی (اوریجنیلٹی آف تھاٹ) جدت طرازی اور اجتہاد فکر کی ایک روشن دلیل ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جبر و اختیار کی بحث کو اس طرح سلجھایا ہے کہ بے اختیار مرحبا کہنے کو دل چاہتا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے یہ سوال انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا چلا آیا ہے کہ میں مجبور ہوں یا مختار؟ علامہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ ہر انسان حالت جبر پہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ پیدا ہونا ہی مجبوری کی دلیل ہے۔

لیکن اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے اطاعتِ الٰہی اختیار کرے، تو انجام کار یہ رنگ اطاعت اس میں شان اختیار پیدا کر دیگا

ہر انسان فطرتاً مختاری و حکمرانی کا آرزو مند ہے علامہ نے اپنے فلسفہ میں اُسے تکمیل آرزو کا نہایت سادہ اور یقینی طریقہ بتا دیا ہے کہ اگر تم حکومت (اختیار) کے آرزو مند ہو تو خدائی دستور العمل (قرآن مجید) کی اطاعت کرو۔ صاحبِ اختیار ہو جاؤ گے، گویا اول اطاعت بعدہٗ حکومت

اس شعر میں جو جبر و اختیار کے لفظ آئے ہیں اُن کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں جو میں نے اوپر بیان کیے، یعنی اختیار بمعنی حکومت اور جبر بمعنی اطاعت۔

ایک سوال

اب سوال یہ ہے جبر سے اختیار کیونکر پیدا ہو سکتا ہے؟ (باقی آئندہ)

امام

(از جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

عروج پا نہیں سکتی جہاں میں وہ ملت
کہ جسکا کوئی نہ مرکز ہوا ورنہ کوئی نظام

ہو اگرچہ ریگ بیاباں کیطرح لاتعداد
ہوا کے جھونکوں میں اُڑتی پھریگی صبح و شام

اگر ہو نظم تو ملت ہے آہنی دیوار
کہ جسکے سامنے طوفاں کو بھی نہیں ہے قیام

یہ نظم کیا ہے فقط ایک نقطۂ مرکز
زبان شرع میں جس کو کہا گیا ہے امام

ہیں اجتماعی مقاصد اسی سے وابستہ
امام زندہ ہے ملت کی زندگی کا قوام

جہاں کی دوسری قوموں کا نسب ہے مدار
مگر ہے ملتِ اسلام جامع الاقوام

اساس اسکی ہے لبس "لا الہ الا اللہ"
اسی اساس پہ قائم ہوئی اخوت عام

نہ کوئی نسل، نہ کوئی زبان، نہ کوئی ملک
ہے امتیاز سیاہ و سفید و سرخ حرام

ہے اسکے ربط میں قوموں کا ارتباط بہم
ہے اسکے نظم میں دنیا کی اُمتوں کا نظام

یہ کیا غضب ہے کہ مسلم کو یہ نہیں معلوم
سپرد کیگئی اس کو امامتِ اقوام

امامِ ملتِ اسلام نائب حق ہے
تمام اہل جہاں جسکے حکم کے ہیں غلام

اگر ہے دین محمد کا پاس اُمت کو
تو آج نصب امامت ہے اسکا پہلا کام

حقایق و عبر

(ادارہ)

مسلمانوں کی تنظیم

طلوع اسلام اس مسلک کے پیش نظر جاری کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق ہر اہم مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے۔ الحمدللہ علیٰ ذلک کہ توفیق ایزدی اُسنے دورِ حاضرہ کے سیاسی مباحث کے متعلق اسوقت تک جو کچھ لکھا ہے اُسنے اربابِ فکر و نظر کی توجہات کو پھر اس نقطہ کیطرف مرکوز کرنا شروع کر دیا ہے کہ فی الواقع مسلمانوں کے ہر شعبۂ حیات میں قرآن کریم ہی انکا خضر راہ بن سکتا ہے اس ضمن میں ہم ابتدا سے قومیت پرست حضرات کی خدمت میں گزارش کر رہے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو اتنا تو بتا دیں کہ اس دور انتشار و خلفشار میں سیاسی مسلک کی بابت قرآن کریم مسلمانوں کو کون سی راہ دکھاتا ہے۔ لیکن جیسا اندیشہ تھا۔ ان حضرات میں سے کسی نے اس گزارش کو تا حال درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ غالباً اس وجہ سے کہ اُنکے نزدیک سیاست کو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے مسائل کو اتنی اہمیت دیں کہ آئے دن اُنکے متعلق مباحث و مناظرات منعقد ہوں۔ اور مقدمہ بازیوں تک نوبت پہنچ جائے وہ اس اہم مسئلہ کی ضرورت محسوس نہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں سیاستِ حاضرہ میں مسلمانوں کا مسلک کیا ہونا چاہیئے۔

جن رسائل نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ ان میں سے ایک رسالہ کا مضمون "مسلمانوں کی تنظیم" پر ہماری نظر سے گزرا ہے۔ جس میں گو طلوع اسلام سے براہ راست خطاب نہیں لیکن اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون کے پیش نظر ہمارے مضامین تھے۔ بہر حال چونکہ مضمون مذکور

طلوعِ اسلام کے مسلک کی تردید میں ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان غلط فہمیوں کو دُور کر دیں جو اس مضمون کی اشاعت کی محرک معلوم ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر وہ اپنے ہم مسلک حضرات کو بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن انکے ساتھ ہے!

صاحبِ مضمون نے سب سے زیادہ زور اس بات کو ثابت کرنے میں صرف فرمایا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جس مسلک کے ساتھ اکثریت ہو وہی مسلک حق و عدل کا ہوتا ہے انکے نزدیک ایسی "تنظیم" جسکے لئے بھیڑ کا لفظ زیادہ موزوں" ہوتا ہے کبھی حق پر نہیں ہوتی، اس بنا پر وہ ان لوگوں کو جو مسلمانوں کے الگ "جماعتی نظام" کو از روئے قرآن کریم ضروری قرار دیتے ہیں یہ طعن دیتے ہیں کہ حیرت ہے کہ اگر کوئی اس غوغائے عام میں شریک نہیں تو آپ اسے غدار ملّت، خائنِ قوم، فی الدرک الاسفل من النار کا مستحق اور من شذ شذ فی النار کا مستوجب قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اسکے جماعت ہونے کی آپکے پاس بڑی دلیل صرف یہ ہے کہ اس کی تعداد زیادہ ہے"۔ اسکے بعد سورۂ مائدہ کی ایک آیت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو مسلک اکثریت کا ہو وہی حق کا مسلک ہوتا ہے۔

ہم اگر چاہتے تو بطور الزامی۔ جواب کے وہ تمام اسناد پیش کر کے جن میں "سوادِ اعظم" کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، دریافت کر سکتے تھے کہ ان دونوں میں وہ کس طرح تطبیق دینگے لیکن چونکہ ہمارا مقصد مناظرہ نہیں۔ اسلئے ہم اس طریقِ فکر و نظر سے مجتنب ہو کر اہمِ حقیقت کیطرف رجوع کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ:۔

(۱) مسلمان دُنیا میں ایک مستقل قومیت (جماعت) کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا مدار وطن، نسل، رنگ، زبان کی وحدت پر نہیں، بلکہ وحدتِ افکار و اعمال پر ہے، جسے ایمان و عمل صالح کہتے ہیں۔

(۲) مسلم و غیر مسلم ملکر ایک متحدہ قومیت کے اجزا نہیں بن سکتے کیونکہ قومیت کے لئے از روئے اسلام وجۂ جامعیت ایمان ہے اور غیر مسلم اُسے کہتے ہیں جو دولتِ ایمان سے بے بہرہ ہو۔

(۳) مسلمان من حیث الجماعت اپنے مرکز کی قیادت میں غیر مسلموں سے برّ و تقویٰ کے کاموں میں

میثاق و معاہدہ کی رُو سے اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق تمام معاملات کا فیصلہ باہمی مشورے سے ہوگا اور ان فیصلوں کی تنفیذ مرکز کیطرف سے ہونی چاہیئے۔

(۵) مسلمانان ہند کا اولیں فریضہ اس قسم کی جماعت کا قیام ہے کیونکہ اسکے بغیر اُن کی زندگی اسلامی زندگی

اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اس مسلک کو اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ کتاب و سُنّت کی رو سے صرف یہی راستہ صراطِ مستقیم ہے اس دعویٰ کے ثبوت میں طلوعِ اسلام قرآن و سنت برابر پیش کر رہا ہے جو قومیت پرست مسلمان اس مسلک کو غلط سمجھتے ہیں وہ خدارا قرآن و سُنّت سے اپنے دعوے کے اثبات میں کوئی دلیل پیش کریں ورنہ جو ہماری دلیل نہیں اُسکے بطلان میں اتنی کاوش۔ اور جن دلائل پر ہمارے دعوے کی بُنیاد ہے اُن سے اغماض صحیح طریق استدلال نہیں ٭

صاحبِ مضمون نے شرکت کانگریس کے جواز میں ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جسے دیکھ کر بے حد تاسف ہوا اس کا بیان کرنا صرف اس لیئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ کانگریس میں شامل ہونے والے حضرات کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں کس قسم کے دلائل ہیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ جب حضرت موسےٰؑ بنی اسرائیل کو لیکر فلسطین کیطرف بڑھے تو اُن سے کہا کہ یہ وہ مُلک ہے جسے اللہ تعالےٰ نے تمہارے لیئے مقدر کر رکھا ہے۔ لہٰذا بے دھڑک اس میں داخل ہو جاؤ۔ اُسنے غلبہ و استیلا تمہارے لیئے لکھ دیا ہے۔ فرمایا۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۵ / ۲۱-۲۳)

اے میری قوم داخل ہو جا اس مقدس سرزمین میں جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دی ہے اور قدم پیچھے نہ ہٹاؤ کہ تم نامراد دل میں ہو جاؤ۔ بولے اے موسیٰ اس میں طاقتور لوگ ہیں۔ اور ہم اس میں داخل نہ ہوں گے، تا آنکہ وہ وہاں سے نکل جائیں پس وہ اگر اس سے نکل گئے تو ہم اس میں داخل ہونگے، دو آدمیوں نے جو ان میں سے تھے جو اللہ سے ڈرتے تھے جن دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا۔ کہا دروازہ پر داخل ہو جاؤ پس جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تم ہی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مومن ہو۔

چونکہ ان آیات میں "داخل ہو جاؤ" کے الفاظ آئے ہیں اس لئے اس سے ان حضرات کو سند مل گئی کہ کانگریس میں داخل ہو جاؤ (تفسیر ملاحظہ فرمایئے):۔

"ان آیتوں کو خوب غور سے پڑھو۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ فلسطین میں داخل ہو جاؤ لیکن ساری قوم پر جبن و بزدلی کی موت طاری ہے وہ جواب دیتی ہے کہ عمالقہ طاقتور ہیں تعداد میں زیادہ ہیں، انکے پاس مال و زر ہے ہم داخل ہوئے اور وہ ہم کو نگل گئے، پس اسوقت تک ہم اس سرزمین کیطرف قدم بھی نہ بڑھائیں گے جب تک یہ موجود ہیں ہاں یہ نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو سکتے ہیں۔ دیکھو پوری قوم کا دل خوف سے بیٹھ چکا ہے صرف ایک چھوٹی سی جماعت زندہ ہے۔ ان میں سے صرف خدا کے دو بندوں میں ایمان اور زندگی کی پوری حرارت موجود ہے چونکہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں (یخافون) اس لیے انسانوں کے ڈر سے، چاہے ان کی تعداد کتنی ہی ہو، انکے دل آشنا نہیں ہیں۔ قوم کی عام گمراہی کے باوجود ان کو راہ حق معلوم ہے (انعم اللہ علیہما) یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن میں منعم علیہم اس جماعت کو کہا گیا ہے جو صراط مستقیم پر ہو، اس کی شرح طولانی ہے، قوم کی اس بزدلی اور گمراہی پر انکا ایمان جوش میں آجاتا ہے، وہ پکارتے ہیں کہ اے لوگو! بزدل مت بنو، آگے بڑھ کر داخل ہو جاؤ۔ تعداد کی کثرت اور سروسامان کی قوت سے مت ڈرو، خدا پر بھروسہ کرو اسکا بھروسہ ہی اصل قوت ہے۔

قرآن مجید کا اعجاز دیکھو وہ کس طرح ہماری زندگی کے تمام گوشوں کے لیئے اپنے اندر ہدایت رکھتا ہے اور کس طرح اس نے بنی اسرائیل کی زندگی کی یہ سرگزشت ہمارے لیئے محفوظ کر دی ہے جو ہزاروں برس کے بعد بھی ہمارے حالات پر اس طرح منطبق ہو رہی ہے گویا آج ہی کی حکایت ہے

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

آؤ آج کے حالات کا تجزیہ کر دیں!

(۱) تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتحمندی تمہارے ہی لیئے ہے۔

(۲) لیکن اکثریت کے خوف اور اُسکے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے۔ اس لیے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاکِ مذلت پر لوٹ رہے ہو۔

(۳) صرف تھوڑے ہیں جو زندہ ہیں اسلیئے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں پس انسانوں کا خوف کبھی ان کو نہیں ڈراتا۔

(۴) اور اُن میں سے شاید دو ہی ہیں جو غیرت و حمیت ایمانی کا اصل جوش رکھتے ہیں اور ان پر اللہ کا انعام ہے۔ اسلیئے ایک پوری بھیڑ کے غوغا نے بھی اُن کی راہ گم نہیں کی ہے۔

(۵) وہ تعداد کی کثرت اور سر و سامان کی فراوانی سے زیادہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اس لیئے کہ وہ سچے مومن ہیں۔ اور پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم نے عزم و ہمت کے ساتھ قدم بڑھایا تو آخر کی فتحمندی ہمارے ہی لیئے ہے +

اب ایمانداری کے ساتھ فیصلہ کر دو کہ یہاں قرآن کس کے ساتھ ہے؟ بہت بڑی بھیڑ کے ساتھ جو خوف و ہراس کے بستر پر دم توڑ رہی ہے یا عزم و ہمت کے ان دو داعیوں کے ساتھ جو وقت کے غوغائے عام میں اپنی راہ دیکھ رہے ہیں اور بے دھڑک اسی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں مگر تم تو ان کو من شذ شذ فی النار اور فی الدرک الاسفل من النار کی وعید سناتے ہو کہ وہ تمہاری جماعت سے الگ ہو گئے۔ ان ھذا الشئ عجیب"۔

یہ ہے شرکت کانگریس کی دلیل۔ اب قرآن کریم کی ان آیات کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ بات کیا تھی۔ اور اس سے نتائج کیا نکالے جارہے ہیں، بات یہ تھی کہ :۔

(۱) بنی اسرائیل کے لئے ارض مقدس کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تھا۔

(۲) اپنے دو رسولوں کی معرفت یہ پیغام اُن تک پہنچا دیا تھا۔

(۳) بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ بڑھے چلو وہاں کے باشندوں سے لڑائی کرو۔ فتح تمہاری ہوگی۔

(۴) وہ دو بزرگ جو قوم کو اس راستہ کیطرف دعوت دیتے تھے خدا کے رسول تھے جنکو اللہ تعالیٰ سے اس غلبہ و نصرت کی بشارت مل چکی تھی۔

اسکے مقابلہ میں ہمارے کانگریس پرست عالم قرآن کے نتائج مستخرجہ ملاحظہ ہوں۔ وہ فرماتے ہیں۔

(۱) اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اکثریت سے نہ ڈریں اور کانگریس میں بے دھڑک شامل ہو جائیں +

(۲) شرکت کانگریس کے بعد فتح ان کی ہوگی۔

(۳) وہ دو انسان جن کو (نعوذ باللہ) مثیل موسیٰ و ہارونؑ ٹھیرایا گیا ہے۔ غالباً ان سب سے لوگ واقف ہوں گے۔ اِن سے پوچھیئے کہ :۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے کیا بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا کہ جا کر اہل فلسطین کی اکثریت سے محبت اور دوستی کے تعلقات پیدا کرو اور دونوں ملکر ایک متحدہ قومیت بنا ڈالو یا یہ کہا تھا کہ من حیث القوم اپنے مرکز کی زیر قیادت قوم مخالف کے مقابلہ کیغرض سے ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔

(۲) کیا اللہ تعالیٰ نے قوم پرست مسلم حضرات کو کہیں یہ وعدہ دے رکھا ہے کہ تم ہندوؤں سے ملکر ایک متحدہ قومیت بنالو پھر فتح تمہارے لئے مقدر کر دی گئی ہے؟

(۳) کیا اِن ہر دو مولانا حضرات کو اللہ تعالیٰ نے ایسا الہام بھی کیا ہے کہ یہ متحدہ قومیت ہی مسلمانوں کے لیئے صحیح راہِ عمل ہے؟

(۴) کیا یہ ہر دو حضرات کانگریس میں شامل ہو کر خدا کی اطاعت کیطرف دعوت دے رہے ہیں یا

ہندوؤں کی اطاعت کیطرف بلائے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ کانگریس کے جمہوری نظام کے ماتحت ان حضرات پر کانگریس کے فیصلوں کی اطاعت لازم ہے جو دوسرے معنوں میں ہندوؤں کی اکثریت کے فیصلے ہیں۔ اس لیے مسلمان اگر ان کی اطاعت کریں تو کیا یہ بالواسطہ ہندوؤں کی ہی اطاعت نہ ہوگی؟

یہ ہے نمونہ ان حضرات کی قرآن فہمی کا۔

اگر یہ حضرات سورۂ مائدہ کی انہی آیات سے استدلال کرنا چاہتے ہیں تو وہاں تو اس قوم کو یہ حکم تھا کہ عمالقہ سے لڑائی کرو، اسکے بعد وہاں اپنی حکومت قایم کرو، سو یہ قومیت پرست حضرات ذرا جرأت دکھائیں اور متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیں کہ "شرکت کانگرس سے ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں سے ہر طریق پر جنگ کیجائے اور انہیں ذمی بنا کر ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت قایم کیجائے"۔

فیصلہ آپ یہ ہے کہ ہمت آزمائی اور عمل کے میدان میں اکثریت کے خوف اور اسکے سامان اور روپیہ کی کثرت نے کس کو سراسیمہ کر رکھا ہے کون عزم وہمت سے محروم ہو کر پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہا ہے کون ہے جسے صرف "اللہ کا خوف ڈراتا ہے اور انسانوں کا خوف کبھی نہیں ڈراتا"۔ ہندوؤں کے ساتھ ملنے والوں کی یہ حالت ہے یا انکے مقابلہ میں اپنی جماعت کی تنظیم کرنے والوں کی؟ دیکھنا یہ ہے کہ غیرت وحمیت ایمانی کا اصل جوش ان دو حضرات میں "جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور جنپر اللہ نے اپنا انعام کر رکھا ہے"۔ مذکورۂ بالا اعلان کی توفیق پیدا کرتا ہے یا اکثریت کے سامان اور روپیہ و زر کی کثرت ان کو سراسیمہ کر دیتی ہے"؟

پھر ایمانداری کے ساتھ فیصلہ ہو جائیگا کہ قرآن کس کے ساتھ ہے؟

اسی رسالہ کے ہم مشرب ایک اور رسالہ نے طلوع اسلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"لیکن جمہور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مذہب اور سیاست دونوں میں خصوصاً مذہبی پہلو سے یہ۔ اسکے (طلوع اسلام کے) خیالات ومعتقدات خالص جماعتی اور عام مسلمانوں کے مسلک سے

بالکل علیحدہ ہیں۔"

یعنی۔ایک صاحب تو فرماتے ہیں کہ:۔

طلوعِ اسلام کا مسلک جمہور کا مسلک ہے لیکن چونکہ یہ ضروری نہیں کہ جمہور کا مسلک ہمیشہ حق و عدل کا مسلک ہو اسلیئے طلوع اسلام کا مسلک غلط ہے۔

لیکن اُنکے ہم مشرب دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

طلوع اسلام کا مسلک جمہور اسلام کا مسلک نہیں ہے اور چونکہ صحیح مسلک جمہور کا ہوتا ہے اس لیئے طلوع اسلام کا مسلک صحیح نہیں۔

حالانکہ طلوع اسلام کا مسلک صرف کتاب و سُنت کا مسلک ہے۔

مؤخرالذکر رسالہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"بے شک اسلام ایک مستقل قومیت ہے لیکن اُسے اتنا محدود کر دینا کہ اسلام اور مُسلمانوں کے فائدے کے لیئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی گنجایش باقی نہ رہے نہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح ہے اور نہ مسلمانوں کے لیئے مفید۔"

یعنی:۔ ۱۔ اسلام ایک مستقل قومیت ہے اور کفر ایک الگ قومیت } اور ان دو مختلف قومیتوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قومیت کا وجود عمل میں آسکتا ہے!

ہمیں معلوم نہیں کہ ان سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ "جماعتی نظام" کے قرآنی تصوّر سے غیر مسلموں کے ساتھ نیک کاموں میں اشتراکِ عمل کی گنجائش باقی نہیں رہتی، ہم تو کتاب سنت کو یہ سمجھے ہیں اور اسکےلیئے ہمارے پاس دلائل و براہین موجود ہیں کہ اسلام ہیئت اجتماعیہ سے متعلق بِرّ و تقویٰ کے معاملات میں غیر مسلموں سے من حیث الجماعت اشتراکِ عمل کی اجازت دیتا ہے، مگر انفرادی طور پہ کفار کی جماعتوں میں شامل ہو کر اور اس طرح ایک "متحدہ قومیت" بنا کر اشتراک عمل کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم اول الذکر اشتراکِ عمل کے زبردست حامی اور آخرالذکر قسم کے اشتراکِ عمل کے سختی سے مخالف ہیں۔اگر کوئی صاحب اسکے خلاف ثابت کرسکتے ہوں۔ تو فاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ وہ از خود ایک مسلک متعین کرکے قرآن کریم کو اس پر ڈھالنے کی کوشش نہ فرمائیں بلکہ قرآن کریم کو سامنے رکھیں اور جس مسلک کیطرف وہ رہنمائی کرے، صرف اسپر گامزن ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایک مدت کی فرقہ سازی، گروہ بندی، تحزب و تشیع، لامرکزیت اور انفرادیت نے مسلمانوں کی نگاہوں سے "جماعتی" اور مرکزی نظام کو اوجھل کردیا ہے اور چونکہ جماعتی نظام سے وہ تمام گروہ بندیاں ٹوٹتی نظر آتی ہیں جن میں اُمت تقسیم ہو رہی ہے اس لئے وہ حضرات جو اپنے اپنے دائروں کے مرکز بنچکے ہیں اِس تصور سے ڈرتے اور کانپتے ہیں، اور مسلمانوں کو اسطرف آنے سے طرح طرح کے خوف دلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ کبھی دیکھ نہیں سکتے کہ اُنکے خودساختہ طلسم ٹوٹ جائیں۔ لیکن قرآن کریم کے عصائے موسوی کے سامنے "سحر کی یہ رسیاں" کب تک نظرفریب بنتی رہیں گی۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا!
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

یہ مضمون پریس میں جا چکا تھا کہ مؤقر معاصر صدق لکھنؤ، بابت ۱۱ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ذیل کا شذرہ محولہ بالا مضمون "مسلمانوں کی تنظیم" پر ہماری نظر سے گزرا۔ جسے ہم شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

حیدرآباد دکن سے علوم مشرقی و مغربی کے جامع ایک فاضل اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔
پچھلے ہفتہ اخبار ... میں رسالہ ..... سے ایک مضمون تنظیم کے عنوان سے نقل ہوا ہے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ آج کل مسلمان جو تنظیم کر رہے ہیں وہ ہندو اکثریت کے خوف پر مبنی نہیں ہے یہ غیراللہ کا خوف ہے، حالانکہ مسلمانوں کا نظم خوفِ خدا پر مبنی ہونا چاہیئے چند آیات کی تشریح اس روشنی میں کیگئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کانگریس میں غیر مشروط شرکت کی دعوت دینے والے دو اصحاب (غالباً مولانا .... اور .....) کیطرف اشارہ ہے، کو موسیٰ اور ہارونؑ کی جگہ اور اُنکے نقشِ قدم پر کام کرنے والا قرار

دیا گیا ہے"

یہ عجیب و غریب منطق و تاویل ہے، کانگرس کا کام اور ساری تنظیم برطانوی شہنشاہیت کے خطرات کے خلاف ہے، گویا برطانوی شہنشاہیت کے خطرات پر کام مبنی ہو تو عین حق پرستی بہت ۔ حالانکہ یہ بھی غیر اللہ ہی ہے لیکن اگر برطانوی طاغوت اور ہندو مشرکین دونوں فتنوں کے خلاف کوئی جماعت منظم ہو تو یہ بے دینی ہے شرک خفی ہے غیر اللہ سے خوف زدہ حقیقۃً کون ہے؟ جو بلا شرط مشرکین سے موالات پر آمادہ ہو جائے، یا وہ جو سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرے؟ قرآن مجید میں فتنۂ ظالمین سے نجات کی جو دعائیں ہیں، یا قوم کفار سے نجات کی جو اسند عا درج ہے انکا کیا منشار ہے؟ خود قانون جہاد کفار و مشرکین کے فتنوں کے خلاف منظم ہو کر کام کرنے کے سوا اور کیا مفہوم رکھتا ہے؟ مولانا.... رح کے تفسیری کارناموں کی اشاعت کا اہتمام کرنے والوں کے قلم سے قرآن مجید کی یہ تفسیر کس درجہ حیرت اور افسوس پیدا کرنے والی ہے"!

(۲) سُنّی لیگ

لکھنؤ میں ایک سُنّی لیگ کی بنیاد ڈالی گئی ہے، ہمیں اس سے تو غرض نہیں کہ یہ لیگ کس بنار اور کس غرض سے قایم کیجا رہی ہے لیکن ہم کارکنان لیگ کے سامنے ایک اہم سوال رکھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہندوستان کا ایک سب سے بڑا مسلم رئیس جو خود سُنّی تہا اور جسکے آبار و اجداد سُنّی تھے۔ اپنی تفضیلیت کا اعلان کرتا ہے جو دراصل اس کی شیعیت کا پردہ ہے، امرار کا جو اثر عوام پر ہے وہ ظاہر ہے اس لیئے اس لیگ کا فریضہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسکے اس عقیدہ کی مخالفت کرے۔ ہم منتظر ہیں کہ دیکھیں یہ حضرات اس مسئلہ میں مداہنت اور چشم پوشی سے کام لیتے ہیں یا اعلائے کلمۃ الحق کرتے ہیں۔

(۳) جمعیت تحفظ ناموس اسلام

اسی طرح مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی نے الحاد و بے دینی کو رد کرنے اور ناموس اسلام کے تحفظ کے لیئے ایک جمعیت عُلما و فضلا کے قیام کی تجویز پیش کی ہے ہم حضرت مولانا کی خدمت میں گزارش کرینگے کہ اگر یہ جماعت وجود میں آجائے تو سب سے پہلے اسکے سامنے وہ مسئلہ رکھا جائے جو آج ہندوستان کے مسلمانوں میں اس طرح باہمی تفریق و تشتت کا موجب بن رہا ہے یعنی کانگریسی اور مسلم لیگی خیالات میں اختلاف آرا۔ اگر اسلام میں دین و سیاست ایک چیز ہے تو ان حضرات کو سب سے پہلے متعین کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے لیئے صحیح راستہ کون سا ہے ورنہ یہ اعلان کردیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں

ہم اس مسئلہ میں اس جماعت کے سامنے رکھنے کی تجویز اس لیئے پیش کر رہے ہیں کہ اوّل تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس جماعت کے عناصر ترکیبی میں مختلف خیالات کے حضرات کو یکجا کرنے کی تجویز ہے دوسرے یہ کہ ناموس اسلام کے خلاف آج سب سے بڑا حملہ خود مسلمانوں کے اس نوجوان طبقہ کیطرف سے ہو رہا ہے جو قومیت پرستی کی آڑ میں اشتراکیت روس کے دلدادہ ہو چکے ہیں اور اس طرح الحاد و بیدینی کی علانیہ تبلیغ کر رہے ہیں اور بدبختی سے قومیت پرست علماء کا طبقہ سیاسی مسلک میں اُن کی یک رنگی کے باعث، انکے خلاف بالعموم لب کشائی نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے مولانا دریاآبادی ہم سے زیادہ واقف ہیں۔ اگر سیاسی مسلک میں مسلمانوں کے اختلاف آرا کا کسی طرح فیصلہ ہو جائے تو ناموس اسلام کے تحفظ میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

---
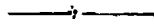
(۴) مذہب اور سیاست

طلوع اسلام کئی بار اس حقیقت کا انکشاف کر چکا ہے کہ سیاست حاضرہ میں مسلمانوں کے لیئے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اپنوں اور بیگانوں کیطرف سے یہ بات اُنکے ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے، سیاسی معاملات میں اسکا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے

چنانچہ حال ہی میں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے شملہ میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا :-

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قایم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں۔ اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر اور مذہب اور خدا کو اُن کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے اور انہیں زمین کے معاملات میں خواہ مخواہ نہ گھسیٹا جائے ..... اس چیز کا تو اب تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست کے ساتھ ملا دیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قایم ہوسکتا ہے یا جذبۂ حب الوطنی محض قومیت پرستی کی بنا پر پرورش پاسکتا ہے ..... یعنی اس ماترِ بھومی سے وابستہ ہوجانے سے جسنے تمہیں پیدائش اور زندگی عطا کی ہے اور جو مرنے کے بعد بھی تمہیں آغوش میں لے گی ..... عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اس نظریہ پر قایم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے سے منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بنجائیں" (ہندوستان ٹائمز $\frac{9}{8}$ ۵)

(۵) مذہب وتصوف

سیاست کو مذہب سے الگ کرنے کے لیئے جو معصوم و مقدس کوششیں ہو رہی ہیں، اس ضمن میں یوگ (تصوف) کو نمایاں کرکے سطح پر لایا جا رہا ہے کیونکہ یہی وہ سانچہ ہے جس میں اکبر کا دینِ الٰہی۔ اور دورِ حاضرہ کا برہمو سماج ایک نئی شکل اختیار کرکے متحدہ قومیت کا مذہب بن سکے گا۔ پچھلے دنوں شملہ کے آریہ سماج مندر میں ایک مذاکرہ علمیہ ..... (DEBATE) کا انعقاد ہوا۔ عنوان یہ تھا کہ :-

"ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ اس ہندو مسلم اتحاد پر مبنی ہے۔ جس کی اساس یوگ (تصوف) پر رکھی جائے"

موافقین نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں صرف وہ مذہب اتحاد و یگانگت کا ضامن ہو سکتا ہے جو دین الٰہی کی شکل کا ہو اور جس میں اہنسا کی تعلیم بطور روح کے کام کر رہی ہو مخالفین میں نوجوان طبقہ تھا اور انکا مطمح نظر یہ تھا کہ مذہب خواہ کتنی ہی معصوم شکل میں کیوں نہ ہو ہندوستان کی ترقی کے راستے میں ایک زبردست روڑا ہے، جب تک اُسے خارج السلد نہیں کیا جائیگا۔ ہم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اس قسم کے مذاکرات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدہر کو ہے اور بتدریج غیر محسوس طور پر ذہنیتوں میں کس قسم کی تبدیلی واقع ہو رہی ہے، نوجوان طبقہ تو ایک طرف رہا، پچھلے دنوں۔ نواب سر اکبر حیدری نے ڈہاکہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے" مذہب کا مفہوم سمجھنے کی کوشش صرف تصوف اور روحانیت کی وساطت سے کرنی چاہیئے اور ظواہر رسوم کو مذہب نہیں سمجھنا چاہیئے"۔ (نگا ۷ اگست ۱۹۳۸ء)

دیکھیے۔ وار دہا کے "بجلی گھر" سے جو برقی رو نکلتی ہے وہ کس طرح ہر کہ ومہ کو اندر ہی اندر متاثر کیے جاتی ہے حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے لگلے دنوں جمعیت العلماء کی اہمیت بتاتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر علماء نہ رہے تو تمہاری نماز روزے کس طرح باقی رہیں گے (تقریر لائلپور) لیکن انہیں کون بتائے کہ جب مذہب ہی اس قسم کا ہو جائے گا تو نماز روزے کی ضرورت ہی کہاں رہے گی اے کاش! یہ حضرات کہیں ان طوفانوں کو بھی محسوس کر سکیں جو ہندوستان سے قصر اسلام کو بہالے جانے کی فکر میں ہیں۔

---

(۶) ہند و لنوازی

شملہ کا ذکر آگیا تو وہاں کے ایک اور جلسہ کی تصویر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ ۹ ستمبر کو تعلیم کے عنوان پر مسٹر ستیا مورتی کی تقریر تھی۔ اور مسٹر آصف علی جلسہ کے صدر تھے۔ جب وہ کرسی صدارت کو مزین فرمانے کے لیے تشریف لائے تو انکا حسب معمول تالیوں سے "سواگت" ہوا اسکے جواب میں انہوں نے

ہاتھ جوڑ کر گردن جھکاتے ہوئے پرنام کیا پھر اپنی صدارتی تقریر میں (اُردو میں) فرمایا کہ ٹیچر کا بڑا درجہ ہوتا ہے "یم کرائسٹ۔ بُدھ۔ محمدؐ کو بھی ٹیچر ہی کہتے ہوئے مہاتما گاندھی بھی اسی قسم کے ٹیچر ہیں" انھوں نے گاندھی کے نام کے ساتھ تو مہاتما کے تعظیمی الفاظ کی ضرورت سمجھی لیکن سرور کائنات نبی اکرمؐ (فداہ ابی وامی) اور دیگر بانیان مذاہب کے ناموں کے ساتھ کسی تعظیمی لفظ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پھر یہ بھی کہا کہ مہاتما گاندھی ہمیں اٹھارہ برس سے ان سچائیوں کی تعلیم دے رہے ہیں جن کی وجہ سے ہم آج اتنے بلند ہوگئے ہیں ان کو قطعاً یاد نہ آیا کہ آج سے چودہ سو برس پیشتر فاران کی چوٹیوں سے بھی ایک نورانی شمع روشن ہوئی تھی جس نے انسانیت کو اتنا بلند کردیا تھا کہ آسمان کی رفعتیں بھی اسکے سامنے سرنگوں ہوگئی تھیں اور جس کی درخشندگی اور تابندگی کا یہ عالم ہے کہ ظلمت کدۂ عالم میں جہاں کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی سراجِ منیر سے کسبِ ضیا کرتی ہے۔ ہم ان حضرات سے صرف اتنا عرض کرینگے کہ اور تو سب کچھ چھوڑا ایسے مخلوط مجمعوں میں مسلمانوں کے جذبات کا ہی کچھ احترام کرلیا کریں کہ

آخر گنہ گار ہیں کافر نہیں ہیں یہ

اطلاع دیجیے

چونکہ ڈاکخانہ کی کوتاہیوں کے باعث بہت سی شکایات آئی ہیں کہ خریداروں کو ستمبر کا پرچہ نہیں ملا حالانکہ دفتر سے کمال احتیاط کے ساتھ پرچے وقت پر روانہ کیئے گئے تھے اسلیئے خریداروں کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر انہیں وقت پر پرچہ نہ ملے تو آٹھ روز کے اندر اندر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دفتر کو دیں تاکہ رسالہ دوبارہ اُن کی خدمت میں ارسال کردیا جائے آٹھ روز کے بعد دفتر کے لیئے کسی حکم کی تعمیل ناممکن ہوگی۔ رسالہ ہرماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(مینیجر)

زبان کا مسئلہ[1]

رازی

"واردھا اسکیم" والے مضمون[2] میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انھیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا ورنہ، انکے علاوہ سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرم عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی پرسکون روانیوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدان سیاست میں ایک "متحدہ قومیت" کی تشکیل کا حسین تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج وعواقب کو جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، "بدیشی حکومت کے خاتمہ" کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلاف مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑہ اٹکاتا ہے اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیان عالم پر فوقیت رکھتا ہے، چونکہ بچوں کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درسگاہوں میں ایک ایسے مذہب

---

[1] میرا ایک مضمون "متاع کارواں" کے عنوان سے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا زیر نظر مضمون انہی خطوط پر متشکل ہے اور اکثر اقتباسات بھی اسی سے لئے گئے ہیں۔ منہ

[2] مطبوعہ طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۳۸ء۔ اور جو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ منہ

کی تعلیم کی تجویز کی جارہی ہے جو اکبر کے دین الٰہی یعنی دور حاضرہ کے برہمو سماج کے خطوط پر مشتمل ہے۔ ہمسا کے مسلک سے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی انگیخت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی جگہ اہمسا کا فلسفۂ حیات جنت قلب و نظر بنا کر پیش کیا جائے اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو "رونش" کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آہنگ "سنبوسہ" بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے اردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ کی اہمیت

مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جارہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن انھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں۔ زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے۔ اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جسوقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جارہی ہے۔

یہ ایک "تنگ نظر" مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے موید ہیں چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں۔

"ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس

پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اسکی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں.... کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اسوقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جاسکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جسکا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدلجاتی ہیں۔ آوازیں بدلجاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہوجاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے" (میری کہانی جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیئے اور انھیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے کیونکہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔

اُستادانِ ازلی۔

ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں بتا چکے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو مٹانے کے لئے ہندو کسطرح انگریز کے قدم بقدم چل رہا ہے۔

اِس لیئے کہ بساطِ سیاست کی تمام چالیں ہندو نے انگریز ہی سے سیکھی ہیں انگریزوں نے انگریزی زبان کو سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم قرار دیکر جو کاری ضرب **Master stroke** لگائی تھی اسکا نتیجہ آپ اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے غلاموں کی زبان (ورنیکلر) کو بحکم نہیں مٹایا اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے زندہ رہنے کا حق اسی طرح دیا۔ جسطرح "مذہبی آزادی" کا حق عنایت کیا ہے بلکہ اسی طرح کراچی کے رزولیوشن میں' بنیادی حقوق" کے سلسلہ میں کانگریس کی طرف سے یہ حق دیا گیا ہے۔ انگریزوں نے صرف اتنا ہی کیا کہ ذریعۂ تعلیم کو بدل دیا۔ اور جدید زبان جاننے والوں کے لیے ترقی کے دروازے کھولدیئے۔ سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی مدت نہیں مگر آپ نے دیکھا کہ اس سو سال کے اندر اس پالیسی نے کیا نتائج پیدا کر دیئے۔ ہم انگریزی پر لوٹ پڑے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات اپنی زبان سے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ماضی سے۔ اپنی قومی روایات سے اپنے لٹریچر سے۔ اپنی تہذیب و تمدن سے اور اپنے خیالات سے بیگانہ ہو گئے۔ انگریزی زبان اور انگریزی قوم کے خیالات ہمارے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں گھس گئے اور اس پالیسی نے ہمیں اندر سے بدل دیا (جسے قرآن کریم "تغیر نفس" کہتا ہے کہ جس کے بدلنے سے ساری قوم بدل جاتی ہے) گویا وہ مقصد حاصل ہو گیا جسکے پیش نظر میکالے اور اسکے رفقا کار نے یہ شاہ ضرب تجویز کی تھی یعنی" اس زبان کے ذریعہ سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر روح کے اعتبار سے انگریز ہو گی" ذرا اپنے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ کی ساخت کو ملاحظہ فرمایئے وہ کسقدر مغربی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ انگریزوں نے مذہبی آزادی کو برقرار رکھا مسلمانوں کی تہذیب و تمدن میں مداخلت نہیں کی لیکن ایک زبان کے بدل دینے سے قوم کی قوم کو اپنے مذہب اور تمدن سے اسقدر بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بنا دیا کہ عیسائی مشنریز پادری ہزار برس بھی مسیح کی منادی" کرتے

رہتے تو یہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ ہماری حالت آج یہ ہے کہ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی نگاہ سے ہیں، کان اپنے ہیں لیکن سُنتے کسی اور کی قوت سماعت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے ذریعہ ادراک سے ہیں ہم بالکل "ہز ماسٹرز وائس" بن گئے ہیں۔ ایک انگریز مُسلمان ہوکر بھی "انگریز" ہی رہتا ہے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ مُسلمان مُسلمان کہلاتے ہوئے بھی "مُسلمان" نہیں ہوتا۔ یہ قلبِ نظر کی تبدیلی کس چیز نے پیدا کردی؟ یہ ذہنیت کس نے بدل دی؟ صرف ایک زبان کی تبدیلی نے۔ اور وہ تبدیلی بھی جبری تبدیلی نہیں۔ آپ کی زبان کو مٹا کر نہیں۔ ہنسی خوشی۔ آپ کی پوری آزادی برقرار رکھتے ہو مدرسوں میں عربی۔ فارسی۔ اُردو کی تعلیم کی باقاعدہ اجازت دیتے ہوئے تعلیم کو اختیاری رکھتے ہوئے (یعنی جسکا جی چاہے بچے کو پڑھائے نہ جی چاہے نہ پڑھائے) آپ کے رسم الخط کو برقرار رکھتے ہوئے! سمجھے آپ کہ زبان کا مسئلہ کسقدر اہم ہے۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار

"شاگردانِ رشید"

ہندوستانی قومیت کے معمار بھی انھیں کے شاگرد ہیں انھوں نے اپنی قومیت کو بنانے اور دوسروں کی قومیت کو بگاڑنے کی تدابیر بھی انھیں سے سیکھی ہیں۔ انگریز چونکہ غیر مُلکی تھا اس لئے اس کے نظر فریب مصالح مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے لیکن یہ چونکہ اسی ملک کے لوگ ہیں اس لئے انکے لیئے وہ انقلاب پیدا کر دینا آسان ہے جس کی جرأت ان کے اُستاد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انکے پاس "وطن کی مشترکہ فلاح و بہبود" کا دعویٰ ایک ایسا کارگر حربہ ہے جسکے ذریعہ وہ مُسلمانوں کو مکمل فریب دے سکتے ہیں (اور دے رہے ہیں) اور کوئی انکو ٹوکنے کی جرأت نہیں کرسکتا تاوقتیکہ اس میں ٹوڈی۔ رجعت پسند۔ سامراج پرست کے گھناؤنے القاب سننے کی ہمت نہ ہو۔ انگریز یہاں "متحدہ قومیت" کا تصوّر پیش نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ ایسا کرنے سے انکی اقلیت یہاں کی اکثریت میں

گم ہوجاتی لہذا انھوں نے حاکم و محکوم کے فرق کو محفوظ رکھا لیکن اسکا تلخ نتیجہ آج انکے سامنے ہے۔ ہندو اس تجربہ سے فائدہ اوٹھانا چاہتا ہے اور بجائے اسکے کہ اپنی اکثریت کو الگ حاکم قوم کی شکل میں متمیز کرکے اقلیتوں کے دل میں محکومیت کے نفرت انگیز احساس کو زندہ رکھے جو بالآخر حاکم قوم کے خلاف انقلابی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام کے لیئے یہ بات زیادہ مصلحت آمیز سمجھتا ہے کہ ایک متحدہ قومیت کے جاذبِ نظر تصور کو پیش کرکے اقلیتوں کو اکثریت کی زنبیل میں لپیٹ لے اور انکا رنگ بو قائم نہ رہنے دے۔ اقلیتیں یہ سمجھ کر خوشی خوشی اکثریت کے اندر جذب ہوجائیں کہ ہم جمہوری حکومت کی مشینری کا ایک جزو لاینفک بن رہی ہیں گو کہ حقیقت یہ ہو کہ وہ مشینری ان کو اس انداز سے بیکار رکھدے کہ آئندہ انکی طرف سے کوئی خطرہ ہی باقی نہ رہے۔ یعنی یہ اپنا الگ قومی تشخص کھو کر اکثریت کے اندر ہی جذب ہوجائیں۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری مخلوط انتخاب۔ مخلوط پرچم۔ مخلوط نام۔ مخلوط تعلیم۔ اور اس کے بعد مخلوط زبان اسی مخلوط قومیت کی طرف لے جانے والے راستے ہیں جن سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ مسلمانوں کی اہم اقلیت جو ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی حالت میں اکثریت کی حکومت کے لیئے خارِ چشم کا حکم رکھتی ہے۔ اکثریت کے اندر جذب ہوجائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے مسلمانوں کی زبان کا مٹانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے لیئے آج ہندو پوری سرگرمی سے مصروف جد و جہد ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم "واردھا اسکیم" والے مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ آزادیِ ہند کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی نے "سیاست" سے الگ ہوکر خالص "اصلاحی" تحریکوں کو اپنا نصب العین زندگی بنا رکھا ہے۔ ان میں اچھوتوں کی اصلاح اور ہندی کی ترویج اہم تحریکیں ہیں۔ خدانکردہ انکا مقصد یہ نہیں کہ اردو زبان اور اسکے رسم الخط کو مٹا ڈالیں۔ انکا مقصد تو صرف اسقدر ہے۔ اور کسقدر پاک مقصد ہے کہ ہندی زبان کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ

ہندوستان کی "قومی زبان" بنا دیں۔ اگر اسکا نتیجہ عملاً وہی نکلتا ہو جو اُردو زبان کے مٹانے کا ہو سکتا ہے یا اس سے اُردو زبان خود بخود "مٹ جائے" تو اس میں مہاتما جی کا کیا قصور اس لئے کہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے انچارج ڈاکٹر اشرف صاحب ہمکو ایک سرکاری کمیونک میں یقین دلا رہے ہیں کہ گاندھی جی کو ایسا کرنیکا پورا پورا حق حاصل ہے اور انکا یہ فعل "فرقہ پرستی" نہیں - ہاں اس کے مقابلہ میں کچھ کہنا ضرور "فرقہ پرستی" ہے

گاندھی جی کا خیال یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور وہ دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے (ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء) مگر یہ بات وہ ہندو "فرقہ پرست" ہونے کی حیثیت سے نہیں کہتے بلکہ انکا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان اور دوسری قوموں کو ملا کر جو قوم بنانا پیش نظر ہے اسکی زبان ہندی ہو اور رسم الخط ہندوستانی۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے وہ طریق کار اختیار کیا ہے جو ایک ٹھیٹھ "قوم پرست" کو اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ جب کانگریس میں تشریف لاتے ہیں تو ہندوستان کی مشترک "قومی زبان" کا نام "ہندوستانی" رکھتے ہیں مگر جب ہندی سمیلن میں تشریف لیجاتے ہیں تو اسی قومی زبان کا نام "ہندی" ہو جاتا ہے۔

مدراس میں ہندی سمیلن کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں گاندھی جی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا

"صرف ہندی زبان ہیں جسکا بعد میں جا کر دوسرا نام ہندوستانی اور اُردو بھی پڑ گیا، اور جو دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اسکی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترک زبان قرار دیجائے" (ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی کا کمیونک)

اسی رجحان کے تحت "ہندی ہندوستانی" کی اصطلاح وضع کی گئی اور پھر اسکا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) ہو گیا۔

ایک دوسرے موقع پر بھارتیہ ساہتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کے اجلاس منعقدہ

۲۔ اس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اسکے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معاشی کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپکو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کس طرح کام کرتی ہے

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اسکی تعریف میں اُردو آجائے جب ۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی" اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اُردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اُردو اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔ اسکے بعد بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا زمانہ آیا جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اسکے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی ہندوستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی، مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور مخالفت کی مگر میں انکی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں ہندی کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اُردو کو داخل کر چکے تھے۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اس وقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو ہندی نام سے یاد کیا ہے پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حدبندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ و غوغا کیوں ہے؟

اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ جہانتک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے وہ صرف ایسی ہندی سے لاگ کھا سکتی ہیں جنہیں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ

یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں۔"

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو "قومیت ہند" کے اس معمار اعظم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اس میں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنے کی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اس میں ہندی اسالیب بیان، سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کی جائیں اور اس طرح "ہندی" کا دامن اردو کو سمیٹے ہوئے سکڑنا شروع ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے۔ بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اردو اس طرح پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سردست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیشن کے کھلونے سے اردو والے دل بہلاتے رہیں، جب "قوم پرستی" بڑھے گی اور اس کے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائیگا۔ ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ پہلے عبداللہ کا نام پرمیشری داس رکھ دیا جائے۔ جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں برپا کرتے ہو، پرمیشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں، صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پرمیشری داس ذرا کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو، اپنا ہی بھوجن ہے تم کھاتے ہو تو تم رکھ کر کھانے لگو، اس میں کوئی حرج تو ہے نہیں اور فائدہ یہ ہے کہ یہ کروڑوں کی آبادی جس کے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائیگی۔ جب پرمیشری داس اس معقول تجویز کو بھی مان لیں تو انکو زیادہ نہ چھیڑو، آہستہ آہستہ شدھی کے راستہ پر بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو ان کے صاحبزادے دھرم چند (جو شاید پہلے قمر الدین ہوتے) یا ان کے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے) اگر یہ چال چلی جائے تو خود بخود شدھ ہو جائیں گے بغیر اس کے کہ ان کی شدھی کے لئے شنکر اچاریہ آف شاردھا پیٹھ کی مدد حاصل کی جائے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

۲: اس میں گاندھی جی نے جو تقریر فرمائی اسکے حسب ذیل فقرے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے شعبۂ اطلاعات سیاسی و معیشی
کے سرکاری بیان سے نقل کیے جاتے ہیں جن سے آپکو اندازہ ہوگا کہ "فرقہ پرستی" کے برخلاف "قوم پرستی" کسطرح کام کرتی ہے

میں نے آج نہیں بلکہ ۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی
دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کردیں کہ اسکی تعریف
میں اردو آجائے جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار سمیلن کی صدارت کی تو میں نے "ہندی"
اصطلاح کی باضابطہ طور پر اسطرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور
مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس
توضیح سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو اور پنڈت
شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔ اسکے بعد بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا زمانہ ہے
جو ہندی سمیلن کی ضمنی تحریک ہے۔ اسکے اجلاس میں میری سفارش پر ہندی کے بجائے ہندی
ہندستانی کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس اجلاس میں میری پرزور
مخالفت کی مگر میں انکی تجویز نہ ماننے کے لیے مجبور تھا۔ اگر مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق میں
ہندی کے لفظ کو نکال دیتا تو یہ میرے اور سمیلن کے اوپر ظلم تھا اس لیے کہ یہ لفظ ہندی سمیلن
والوں کا دیا ہوا تھا اور وہ میری سفارش پر ہندی کی تعریف میں اردو کو داخل کر چکے تھے۔
اس بات کو بھی ذہن میں رکھیے کہ "ہندی" لفظ کچھ ہندوؤں کی اختراع نہیں ہے یہ نام مسلمانوں کی
آمد کے بعد پڑا ہے اور اس سے مراد وہ زبان ہے جو اسوقت شمالی ہند کے ہندو مسلمان بولتے
اور لکھتے پڑھتے تھے۔ لاتعداد مشہور و معروف مسلمان مصنفوں نے اپنی مادری زبان کو ہندی کے
نام سے یاد کیا ہے پھر اب جبکہ ہندی زبان کی حدبندی میں ہندو اور مسلمان دونوں کی
ہر قسم کی تحریری اور تقریری زبان شامل ہے تو لفظوں کے اختلاف پر یہ ہنگامہ اور غوغا کیوں ہے؟
اس بحث کا ایک پہلو اور بھی سوچنے کے قابل ہے جہانتک جنوبی ہند کی زبانوں کا تعلق ہے
وہ صرف ایسی ہندی سے لاگ کھا سکتی ہیں جنمیں سنسکرت کے الفاظ کی ملاوٹ ہو اس لیے کہ

یہ زبانیں سنسکرت کے بعض الفاظ اور سنسکرت آوازوں سے مانوس ہیں"۔

اب آپ کے سامنے ہندوستان کی "قومی زبان" کے ارتقاء کا وہ پورا نقشہ آجاتا ہے جو قومیت ہند کے اس معمار اعظم کے پیش نظر ہے۔ اس نقشہ کے مطابق پہلا مرحلہ یہ ہے کہ "ہندی" کے دامن کو پھیلا کر "اردو" کو اسمیں سمیٹ لیا جائے۔ اردو کے علیحدہ نام سے جو امتیاز ان دونوں زبانوں میں پیدا ہوتا ہے وہ محض ذرا سے تبدیل نام کے ساتھ مٹا دیا جائے اور ان دونوں کو ملا کر ایک نام "ہندی" سے موسوم کیا جائے تاکہ یہ تخیل زندہ نہ رہ سکے کہ یہ دو الگ زبانیں ہیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے تعلق پیدا کرنیکی خاطر اردو کو آہستہ آہستہ ہندی کے قریب لایا جائے۔ اسمیں ہندی اسالیب بیان سنسکرت الفاظ اور سنسکرت آوازیں پیدا کیجائیں اور اس طرح "ہندی" کا دامن اردو کو سمیٹے لئے ہوئے سکڑنا شروع ہو یہانتک کہ وہ اپنے اسالیب بیان اور اپنے ذخیرۂ الفاظ اور آوازوں کی حد تک کوئی علیحدہ زبان نہ رہے۔ بلکہ ہندی کے وجود میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب اردو اس طرح پر ہندی میں تحلیل ہو جائے تو رفتہ رفتہ رسم الخط کے امتیاز کو بھی دور کر دیا جائے۔ سر دست رسم الخط کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی ریزولیوشن کے کھلونے سے اردو والے دل بہلاتے ہیں۔ جب قوم پرستی بڑھے گی اور اسکے اثر سے زبان کے الفاظ اور آوازوں میں تغیر پیدا ہو گا تو آہستہ آہستہ رسم الخط خود بدل جائیگا۔ ان تینوں مرحلوں کو اگر آپ ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ پہلے عبداللہ کا نام پریشری داس رکھ دیا جائے جب وہ اس پر کان کھڑے کرے تو اس سے کہا جائے کہ میاں محض لفظوں کے اختلاف پر ہنگامہ اور غوغا کیوں بپا کرتے ہو۔ پریشری داس کے معنی بھی تو وہی ہیں جو عبداللہ کے ہیں صرف الفاظ ہی تو بدلتے ہیں معنی میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ جب وہ اس طرح سمجھانے پر مان جائے تو پھر اسے یہ سمجھایا جائے کہ بھائی پریشری داس ذرا کبھی کبھی دھوتی باندھ لیا کرو۔ اپنا ہی بھوجن جو تم کھاتے ہو تو چوکی رکھ کر کھانے لگو اسمیں کوئی حرج تو ہے نہیں اور فائدہ یہ ہے کہ یہ کروڑوں کی آبادی جسکے ساتھ تمہارا رہنا سہنا اور مرنا جینا ہے اس سے تمہاری اجنبیت دور ہو جائیگی۔ جب پریشری داس اس قسم کی معقول تجویز کو بھی مان لیں تو انکو زیادہ نہ چھیڑو آہستہ آہستہ انہیں اسی راستہ پر بڑھنے دو۔ اگر وہ نہیں تو انکے صاحبزادے دھرم چند (جو شاید پہلے قمر الدین ہوتے) یا انکے پوتے رام پیارے (جو حبیب اللہ ہوتے اگر یہ چال نہ چلی جاتی) خود بخود شدھ پیدا ہونگے بغیر اسکے کہ انکی شدھی کے لئے شنکر اچاریہ آف شاردھا پیٹھ کی مدد حاصل کیجائے۔ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنیکی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہندی زبان

مہاتما گاندھی نے اپنے دعوے کے اثبات میں اس واقعہ سے بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ قدیم زمانہ میں خود مسلمان بھی اُردو کو ہندی کے نام سے تعبیر کیا کرتے تھے اس لئے اگر اب ہندوستان کے مشترکہ زبان کا نام "ہندی" رکھدیا جائے تو یہ گویا اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا یہ دلیل بظاہر کسقدر خوش آئند و محکم ہے اور کتنی انصاف پر مبنی ہے، لیکن جن حضرات کی نگاہ تاریخ کے اوراق پر ہے۔ انہیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی کہ مہاتماجی نے حقیقت کو کتنے باریک "چلمنی پردہ" میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مسلمان، قواعدِ زبان کی رو سے ہند کی ہر چیز کو یائے نسبتی کے ساتھ ہندی کہتے تھے، (جیسے عرب سے عربی۔ فارس سے فارسی۔ اسی طرح ہند سے ہندی) اس وقت یہاں کی مروجہ زبان کے مقابلہ میں کوئی اور زبان ایسی تھی ہی نہیں، جسے اصطلاحاً ایک الگ نام رکھانے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ زبان جسے آجکل کی اصطلاح میں "ہندی" کہتے ہیں بعد کی پیداوار ہے۔ اور خالص ہندوانہ ذہنیت کی پیداوار۔ ارباب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک اُردو کے مقابلہ میں کسی اصطلاحی "ہندی" زبان کا چرچا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں للوجی نے پریم ساگر نامی کتاب لکھی۔ یہ ناگری رسم الخط میں تھی اور اس میں اُردو اس قسم کی استعمال کی گئی تھی جس سے فارسی کے عناصر فی الجملہ خارج کر دیئے گئے تھے، اور اُن کی جگہ سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے تھے، یہ تھی ہندی کی کتاب۔ یعنی اُردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان جسے اصطلاح میں ہندی کہا گیا۔ چونکہ اس زبان کا رسم الخط فارسی رسم الخط (یعنی مسلمانوں کے رسم الخط) سے مختلف تھا، اور سنسکرت کے رسم الخط (یعنی ہندوؤں کی قدیم زبان کے رسم الخط) کے مطابق۔ نیز اس میں عربی فارسی الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس لئے ہندوؤں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لینے لگے، مسلمانوں کے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اس لئے انہوں نے

اس تحریک کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن ہندو تو بساط سیاست کے بڑے گہرے شاطر واقع ہوئے ہیں، مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ تحریک بھی بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ ۱۸۶۹ء میں اس نے ایک خاص منظم صورت اختیار کرلی جبکہ ۶ ردسمبر کو بابو سردو پرشاد نے یہ مطالبہ پیش کر دیا　کہ الہ آباد انسٹی ٹیوٹ کی روئداد اردو کے بجائے ہندی میں لکھی جائے اسوقت کچھ ارباب بصیرت مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا۔ اور سرسید۔ سید وارث علی خان بہادر میر سید محمدؐ۔ فدا حسین اور منصور احمد وغیرہ حضرات نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ۔ جلوۂ طور میرٹھ۔ اور اودھ اخبار لکھنؤ میں اس کے خلاف مضامین لکھے۔ مسلمانوں کا چونکہ دور انحطاط تھا اس لئے اُن کی مساعی قلم و قرطاس کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بلکہ اس کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن ہندو اپنی دوسری تحریکوں کی طرح اس تحریک کو بھی منظم طریق پر آگے بڑھاتے رہے۔ اور پوری استقامت کے ساتھ اسے جاری رکھا حتیٰ کہ اب وہ اسے ایک قومی تحریک کا خوشنما لباس پہنا کر میدان عمل میں لے آئے ہیں، ہندو ان تمام تحریکوں کو کم وبیش نصف صدی سے آتش خاموش کیطرح اندر ہی اندر سلگاتے چلے آرہے ہیں، اور مسلمانوں کو اسوقت ہوش آیا ہے۔ جبکہ وہ پوری حدت اور تمازت کے ساتھ شعلہ بار ہو چکی ہیں، پھر چونکہ ہندو ان تمام تحریکوں کو منظم طریق پر چلا رہے ہیں نہ کہ ہنگامی انداز سے اس لئے انہوں نے ایک "مشترکہ مقصد" یعنی "حصول آزادی کے لئے متحدہ قومیت کی تشکیل" کی کشش کے ماتحت کچھ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اور اس طرح سے ان خالص ہندوانہ تحریکوں کو "قومی" تحریکوں کا لیبل لگا کر میدان سیاست میں لئے آرہے ہیں ۱۸۶۹-۷۰ء میں چونکہ ایک طرف سرسید اور منصور احمد وغیرہ مسلمان تھے، اور دوسری طرف بابو شیو پرشاد اور نوین چندر راؤ وغیرہ ہندو۔ اس لئے ہندوؤں کی تحریک ترویج ہندی خالص ہندوانہ تحریک تھی۔ لیکن آج چونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ ڈاکٹر اشرف اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ہیں، اس لئے آج وہی تحریک قومی تحریک بن گئی ہے،

اور اس کی مخالفت کرنے والے خود مسلم قومیت پرست حضرات کے نزدیک۔ انتہائی نفرت انگیز انقلاب کے مستحق۔ یہ ہیں بساطِ سیاست کی گہری چالیں!!

ہندو ذہنیت کا مظاہرہ

جب یہ تحریک اس زور اور قوت کے ساتھ پھیلائی جانے لگی تو مسلمانوں کی وہ جماعت جس کی دیدہ ور نگاہیں "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ زبان" کے فریب کو بے نقاب دیکھ چکی تھیں، اس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہا کہ یہ محض ایک ادبی اور مجلسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان کی ملی اور جماعتی موت و حیات کا رشتہ بندھا ہوا ہے۔ تو کانگریس کا ہندوانہ سیلاب بلا چار وں طرف سے ابھر امنڈ آیا مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے خود تسلیم کیا ہے کہ ایک قوم کی تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لئے یا برقرار رکھنے کے لئے زبان کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اس اہمیت کا احساس کرتے ہوئے مسلمانوں نے ہندوؤں کے اس طرز عمل کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی زبان کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو انہی پنڈت جی نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ "فارسی اور دیوناگری کے جھگڑے احمقانہ ہیں" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۳)

اللہ اکبر! وہی رسم الخط جس کے بدل جانے سے خود پنڈت جی کے الفاظ میں یہ اندیشہ ہے کہ "الفاظ کی شکلیں بدل جائینگی۔ آوازیں بدل جائینگی خیالات بدل جائیں گے۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جائے گی، اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جائیگا۔ جو مردہ ہو چکی ہے"۔ جب اس کے تحفظ کے لئے مسلمان آواز بلند کریں تو یہ جھگڑا احمقانہ بن جاتا ہے! یہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ خود پنڈت جی بیان فرماتے ہیں کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو"

(جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اس لیے اگر مسلمان اپنی زبان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنا چاہیں تو وہ فرقہ پرست "ہیں:-

"مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہندوستان میں فرقہ پرستی طاقتور رہے، اور اس بنا پر زبان میں علیحدگی پسندی کا رجحان بھی وحدت کے رجحان کے ساتھ ساتھ برابر اپنا اثر دکھائے جا رہا ہے۔ قوم پرستی کے پورے نشوونما کے ساتھ یہ علیحدگی پسندی جو زبان کے معاملہ میں پائی جاتی ہے یقیناً فنا ہو جائے گی .... ایک علیحدگی پسند حامی زبان کو اوپر سے کھرچو تم دیکھو گے کہ اندر سے وہ فرقہ پرست ہے۔ بلکہ زیادہ تر تم اکو ایک سیاسی رجعت پسند پاؤ گے" (یہ پنڈت جی کا ایک مضمون ہے جو ہندوستان کے اکثر اردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے)۔

ان تصریحات سے آپ پنڈت جی کا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، زبان اور رسم الخط کے مسئلہ کو ایک قابل نفرت "فرقہ وارانہ مسئلہ" قرار دینا اور "سیاسی رجعت پسندی" سے موسوم کر کے اسکو اور زیادہ ذلیل بنانے کی کوشش کرنا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ پنڈت جی زبان اور رسم الخط کی اہمیت سے ناواقف ہیں، نہیں بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، وہ اس کی اہمیت سے خوب واقف ہیں، اور اسی واقفیت کی بنا پر وہ اس کے خلاف اپنی مخصوص سیاسی زبان کے شدید ترین الفاظ ——— "فرقہ پرستی"، "رجعت پسندی"، "سامراج پرستی" وغیرہ ——— پورے زور کے ساتھ استعمال کرتے ہیں تاکہ اس گولہ باری سے یہ قلعہ کسی طرح منہدم ہو جائے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے پاس اپنی ایک مخصوص قومی زبان کا محفوظ رہنا در اصل ان کی مخصوص قومیت کے محفوظ رہنے کا ہم معنی ہے، جب تک یہ زبان ایک علیحدہ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ الفاظ اور اسالیب بیان موجود ہیں، جو اسلامی ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس وقت تک مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کی مستقل قومی تہذیب فنا نہیں ہو سکتی اور نہ اس لٹریچر سے بیگانہ ہو سکتے ہیں، جو ان کے ذہن میں اس قومیت اور اس تہذیب کی قدر و قیمت پیدا کرتا ہے، اس حقیقت سے بے خبری نہیں بلکہ کامل باخبری ہی ان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ زبان میں "علیحدگی پسندی" کے رجحان کو "فرقہ پرستی" جیسے گھناؤنے

القاب سے یاد کرکے آزادی پسند مسلمانوں میں اس کے
خلاف نفرت پیدا کریں، اس لئے کہ دراصل ان کا نصب العین ہندوستان کی تمام
آبادی کو ایک "قوم" بنانا اور جُدا جُدا قومیتوں کو فنا کردینا ہے، اُن کے نزدیک "سیاسی رجعت پسندی"
یہ ہے کہ اس ملک کی کوئی قوم اپنی مستقل قومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور "سیاسی ترقی
پسندی" یہ ہے کہ سب قوموں کے لوگ اپنی اپنی قومیتوں کو چھوڑ کر اس "ایک قوم" میں جذب ہو جائیں
جسے پنڈت جی وجود میں لانا چاہتے ہیں اس قسم کی متحدہ قومیت پیدا کرنے کے لئے منجملہ دوسری
تدابیر کے ایک یہ تدبیر بھی ضروری ہے کہ ایک "مشترک قومی زبان" پیدا کی جائے، اور ہر ایسی زبان کو
مٹا دینے یا کم از کم مسخ کر دینے کی کوشش کیجائے جو کسی قوم کی جُداگانہ قومیت کو سہارا دیتی ہے
یہی نصب العین ہے جس کو پیش نظر رکھ کر "ہندوستانی" زبان کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے
آخر منزل مقصود پنڈت جی کے نزدیک بھی یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط دونوں میں "علیحدگی پسندی"
کے رجحان کو مٹا دیا جائے۔ لیکن وہ اپنے ہم مشربوں سے زیادہ ہوشیار ہیں اس لئے کہتے ہیں
کہ تدریج کے ساتھ ایک ایک قدم بڑھاؤ، دفعتاً رسم الخط پر ہاتھ ڈالوگے تو شکار ہاتھ سے نکل جائیگا لہذا
سر دست اس کی حفاظت کا اطمینان دلاؤ۔ اور پہلے الفاظ و اسالیب بیان میں "علیحدگی پسندی" کا
رجحان دُور کرنے کی کوشش کرو۔ جب اُردو زبان عربی و فارسی الفاظ کے ذخیروں سے خالی
ہوکر ہندی الفاظ سے بھرپور ہو جائے۔ جب ذخیرۂ الفاظ کے بدلنے سے اسالیب بیان اور خود حقیقت
بیان میں تغیر پیدا ہو جائے تو سمجھ لو کہ آدھا معرکہ سر ہو گیا۔ اسکے بعد دیکھیں گے مستقبل نے
اگر کوئی مناسب موقع فراہم کر دیا تو رسم الخط میں بھی "علیحدگی پسندی" کا رجحان مٹا دیا جائے گا
اور "مشترک قومی زبان" کی تخلیق پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دانشمندانہ
پالیسی اور کیا ہو سکتی ہے اسی بنا پر پنڈت جی فرماتے ہیں :۔

"اس لئے دانشمندی کے ساتھ ہم نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ دونوں رسم الخطوں
کو پوری آزادی حاصل رہے اگرچہ یہ ان لوگوں پر ایک مزید بار ہوگا جنہیں دونوں

کو سیکھنا پڑیگا اور ایک حد تک علیحدگی پسندگی کے لئے بھی مددگار ہوگا مگر ہمیں اپنی نقصانات کے ساتھ کام کرنا پڑے گا، کیونکہ ہمارے لئے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ...... مستقبل ہمارے لئے کیا کچھ لائے گا، اس کی مجھے خبر نہیں، مگر سردست دونوں کو باقی رہنا چاہیئے" (پنڈت جی کا مذکورۂ بالا مضمون)

میں اس امر میں کوئی شک شبہ نہیں رکھتا کہ ہندی اور اُردو دونوں ایک دوسرے کے قریب آکر رہیں گی۔ خواہ یہ دونوں مختلف لباس پہنے رہیں، مگر اپنے جوہر اور روح کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہوں گی، جو قوتیں اس وحدت کی تائید کر رہی ہیں وہ اسقدر طاقتور ہیں کہ افراد اُن کی مزاحمت نہیں کرسکتے، یہاں قوم پرستی ہے اور ایک متحد ہندوستان دیکھنے کی خواہش عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اسی کی فتح ہوکر رہے گی ..... اگرچہ ہم خوشی کے ساتھ اس علیحدگی کو برداشت کرینگے جو اسوقت قائم ہے مگر ہم کو وحدت قایم کرنیوالوں کی اس عمل میں مدد دینی چاہیئے" (مضمون مذکور)

یہاں آکر پنڈت جواہرلال نہرو اور مہاتما گاندھی کے راستے ملجاتے ہیں۔ اگرچہ پنڈت جی علیحدگی کے رجحان کو سخت قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور مہاتما جی کے طرزِ عمل میں علیحدگی پسندی کا یہ رجحان بالکل نمایاں ہے، اس بنا پر پنڈت جی کو مہاتما جی سے نہ صرف اختلاف کرنا چاہیئے تھا، بلکہ انہیں "فرقہ پرست" اور سیاسی "رجعت پسند" کہنا چاہیئے۔ مگر چونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے اور دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کیطرف دو علیحدہ راستوں سے چلکر ایک مقام پر ملجاتے ہیں اس لئے دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو کھرچنے کیضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ پنڈت جی مہاتما جی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"کم سمجھ لوگ خود گاندھی جی کو اُس چیز کا مجرم ٹھہراتے ہیں جسکے خلاف اُنھوں نے اپنا پُورا زور لگا دیا ہے" (جامعہ مورخہ اکتوبر ۳۶ء ص ۹۰۳)

کھلی ہوئی "فرقہ پرستی" کے مقابلہ میں "قوم پرستی" زیادہ کامیاب چیز ہے آپ علانیہ ہندو

کیسے جال پھیلائیں گے تو چند بے وقوف پرندوں کے سوا کوئی اس میں نہ پھنسے گا۔ دام ہمرنگ زمین ہونا چاہیئے، دانہ بکھرا ہوا ہونا چاہیئے، اور ایک ہوشیار شکاری جو پرندوں کی ذہنیت سے خوب واقف ہو، آپ کی مدد پر ہونا چاہیئے، تاکہ وہ ہر طرف سے گھیر گھیر کر پرندوں کو دام کے پاس لائے۔ پھر دیکھئے کہ پرندوں کے رب النوع تک جال میں پھنسے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہندوستان کی مشترک فلاح وبہبود کا نام لے کر "قومیت" کا جال بچھائیے اس پر سیاسی ترقی اور معاشی خوشحالی کا دانہ پھیلائیے، اور ایک نقیب چھوڑ دیجئے جو اطراف و نواح میں اعلان کرتا پھرے کہ جو پرندہ اس جال کیطرف نہ آئے گا وہ فرقہ پرست اور سیاسی رجعت پسند قرار دیا جائے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جائیگا کہ ہمارے سامنے اسوقت سب سے بڑا سوال ہندوستان کے افلاس اور بے روزگاری کا ہے اور جو دانہ بکھرا ہوا ہے (نیچے بچھے ہوئے جال کا ذکر نہ کیجئے) اسی سوال کو حل کرنے کے لیئے بکھیرا گیا ہے اسکے بعد آپ دیکھیں گے کہ جھنڈ کے جھنڈ آپ کی طرف آئیں گے اور اسی طرح آپ کے جال پر گریں گے جیسے شمع پر دانے گرتے ہیں ۔

اثرات

ترویج ہندی کی تحریک کو "قومی تحریک" کی شکل اختیار کیئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اسکے نتائج و اثرات اس قدر واضح اور بیّن طور پر سامنے آچکے ہیں کہ اگر ہند دلنوازی کی پٹی کو آنکھوں سے اُتار کر دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان اس خطرے سے انکار کرسکے جو مستقبل قریب میں اس راستہ سے اُن کی تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لیئے ایک سرکش و بیباک طوفان کی طرح بڑھتا چلا آرہا ہے۔ قبل اسکے کہ ہم اُس کی چند مثالیں بیان کریں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کانگریس کا (جو ہندوستان میں ہندؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی نمائندگی کی مُدعی ہے) اِس باب میں لفظی دعوے کیا ہے، تاکہ اسکے بعد اچھی طرح سے معلوم ہوسکے کہ دعوے کیا ہے اور عمل کیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مسلمانوں کو جب کبھی ہندؤں کے کسی طرز عمل کے خلاف شکایت پیدا ہوتی ہے تو ہندؤں کی مدافعت

اور برہیت میں حضرت مولانا آزاد جھٹ گواہوں کے کٹھرے میں تشریف لے آتے ہیں، اور مسلمانوں کو مورد الزام اور ہندوؤں کو حق بجانب قرار دیتے میں پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، زبان کے مسئلہ میں بھی جب مسٹر جناح نے مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہوئے ہندوؤں کی روش کو مفاد اسلامی کے خلاف ثابت کیا تو حضرت مولانا کیطرف سے ایک طول طویل بیان اخبارات میں شائع ہوگیا جسکے دوران میں وہ فرماتے ہیں:-

"میں مسٹر جناح کو یقین دلاتا ہوں کہ انھوں نے اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ سنا ہے، وہ بالکل غلط ہے اگر وہ حقیقت حال معلوم کرنے کی ذراسی کوشش بھی کریں گے تو ان کو اپنے الزامات پر افسوس ہوگا، کانگرس کی قرارداد اور نہ صرف قرارداد، بلکہ اس کا عمل بھی ذمہ دار مسلمان جماعتوں اور حامیان اردو کے مطالبات کے بالکل مطابق ہے اور فی الحقیقت وہی مسلے کا ایک ہی صحیح حل ہے یعنی وہ صاف وسلیس اردو جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے قومی اور ملک کی باہمی صوبائی زبان کے طور پر تسلیم کیجائے اور دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط تحریر کتابت کے لیئے استعمال کیئے جایئں۔

یہ زبان ایک اور یکساں ہے اور دونوں رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے اور ہر شخص جس رسم الخط کو چاہے اختیار کر سکتا ہے حکومت دونوں رسم الخط کے لیئے آسانیاں مہیا کریگی اُسنے سادہ اردو کے لیئے "ہندوستانی" کا لفظ تجویز کیا ہے۔ تاکہ دونوں رسم الخط پر حاوی ہو سکے"

مسٹر جناح کہتے ہیں کہ کانگرس جو قومی جماعت ہونے کی مدعی ہے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میونسپل اور گورنمنٹ اسکولوں میں ہندی کو لازمی قرار دے لیکن ہندی سے انکی کیا مراد ہے، کیا اُن کی مراد اس سے وہ زبان ہے جو صرف دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ان کی مراد یہی ہے تو میں اُن کو بتاؤنگا کہ کسی کانگرسی حکومت نے دیوناگری رسم الخط کو لازمی قرار نہیں دیا، یہ صرف "ہندوستانی" زبان ہے جو لازمی قرار دی جائیگی

رسم الخط اختیاری ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اردو ہو اور ہوسکتا ہے کہ وہ دیوناگری ہو۔
میں مسٹر جناح کی توجہ واردھا اسکیم کیطرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کو ڈاکٹر
ذاکر حسین کا بورڈ بروئے کار لا رہا ہے اُسنے اساتذہ کی تعلیم میں اس امر کو لازمی
قرار دیدیا ہے کہ وہ دونوں رسم الخط کی تعلیم حاصل کریں اور دونوں کی تعلیم دینے
کے قابل ہوں تاکہ ہر طالب علم اس رسم الخط میں مدرس سے تعلیم حاصل کرسکے،
جس کو وہ پسند کرتا ہے۔

ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

کیا مسٹر جناح کی مراد "ہندی" سے وہ زبان ہے جس میں جان بوجھ کر سنسکرت کے غیر مانوس
اور عجیب غریب الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے جن کو لوگ عام طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر انکی
مراد یہ ہی ہے تو میں اُن کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں کچھ نہیں جانتے اور
جو کچھ وہ جانتے ہیں وہ بالکل گمراہ کُن ہے۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کانگرس جس
زبان کو رواج دے رہی ہے وہ اُردو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اُردو جو سادہ
وسلیس ہو۔ اور عربی فارسی اور سنسکرت کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ سے مبّرا ہو
(زمزم - $\frac{6}{38}$ 15)

اس بیان کی رو سے حضرت مولانا نے مسلمانوں پر واضح کرنا چاہا ہے کہ کانگریس کی قرار داد و عمل کی رو سے۔
(۱) قومی زبان وہ صاف اور سلیس اُردو ہوگی جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے
(۲) زبان ایک ہی ہوگی البتہ وہ اُردو اور ناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائیگی۔
(۳) اس مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا۔
(۴) اس میں عربی۔ فارسی، سنسکرت کے نامانوس اور غیر معروف الفاظ نہیں ہونگے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے جائیے کہ اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر معروف اور نامانوس الفاظ خارج
کرکے پوتر بھارت ماتا کی دیوبانی کو شُدھ کرنے والے مولانا آزاد دہی آزاد ہیں جو کبھی الہلال

کے مُدیر تھے، اور اُردو کے متعلق جن کا اسوقت خیال یہ تہا کہ :-

اُردو، فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے ماتحت ہے۔ اس کا کوئی خاص علمی لٹریچر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبان پر ہیں۔ سب کی سب عربی ہیں پس اُردو کے تراجم علوم میں الفاظ عربیہ کا استعمال ناگزیر اور اس لیئے سند کے لیئے اردو بول چال نہیں بلکہ عربی لغت اور اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب ہے ۔۔۔۔۔ (ہم) اردو میں جب کسی علم و فن کو لکھیں گے تو چونکہ سارد و اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیر اثر اور بکلی ماتحت ہے اسلیئے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑیگا۔ (الہلال ۹/۳ ۱۷)

ادبی پہلو کے علاوہ اُردو زبان میں عربی الفاظ کے استعمال کے متعلق حضرت مولانا کے نزدیک ایک اہم پہلو اور بھی تہا۔ فرماتے ہیں :-

"لوگ معترض ہیں کہ مصطلحات اُردو کے لیئے عربی کی مراعات استحقاق پر میں کیوں زور دے رہا ہوں یہ کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ حتے الامکان عربی ہی کے الفاظ اُردو کی ادبیاتِ علمیہ میں استعمال کیئے جائیں لیکن شاید یہ نکتہ اُن کی نگاہوں سے مخفی ہو کہ صرف عربی ہی نہیں، بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لیئے ایسے ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اصطلاحات حدیثہ کا سوال جانے دیجئے، مسلمان آج تمام اطراف عالم میں پھیلے ہیں، اُن کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ہے لیکن مصطلحاتِ دینیہ اور علمیہ اب تک ایک ہیں، اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ پھر کوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئیندہ کے لیئے اس سے سلب کر لیا جائے ۔۔۔۔ عربی اُم لغتِ اسلامیہ ہے۔ زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیئے کافی اسباب و سامان اپنے پاس رکھتی ہے"۔

(الہلال مورخہ ۱/۱۴ ۱۵)

کیا ہم حضرت مولانا سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ عربی کا وہ استحقاق جو تیرہ سو سال سے مسلم چلا آتا ہے آج اس کے سلب کرنے کا مجرم کون بن رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ام نعمت اسلامیہ کی آغوش سے اس کے بچوں کو چھین کر انہیں پرائیں تہذیب کے ناتھ آباد (یتیم خانہ) میں داخل کر رہا ہے؟ وہ کون ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان سے عربی فارسی کے الفاظ خارج کرکے اطراف عالم کے مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع کرنے کی فکر کر رہا ہے؟

اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی　　　یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

کہ دیا جائے گا کہ اردو سے محض عربی فارسی کے غیر معروف اور "نامانوس" الفاظ خارج کئے جائیں گے۔ تمام الفاظ نہیں لیکن یہ فرمائیے کہ وہ کونسی کسوٹی ہو گی جس پر یہ پرکھا جائے گا کہ فلاں لفظ "غیر معروف" ہے اور فلاں معروف و مانوس۔ جن کے ہاتھ میں وہ کسوٹی ہوگی ان کی تو آج ہی سے یہ روش شروع ہو گئی ہے کہ وہ الفاظ جو صدیوں سے زیر استعمال ہیں اور جن کو بچہ بچہ سمجھتا ہے انہیں بھی "غیر معروف" قرار دیا جا رہا ہے صوبہ متحدہ کو کون نہیں سمجھ سکتا لیکن وہاں کانگریس حکومت کی وزارت کے ایک زبردست رکن نے یہ تجویز بھی پیش کر دی ہے کہ یہ غیر مانوس لفظ ہے۔ اس کی جگہ "مدھیہ صوبہ" کا مانوس لفظ استعمال کرنا چاہئے معلوم نہیں "صوبہ" کی جگہ ان کو کوئی "مانوس" لفظ کیوں نہ مل سکا۔ یا مثلاً صوبہ متوسط میں "مدرسہ" جیسے غیر معروف لفظ کی جگہ "ودیا مندر" کا مانوس لفظ سرکاری طور پر وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح خدمت استقبال۔ انصاف۔ بنیاد۔ عورت۔ مرد۔ جیسے غیر مانوس الفاظ کی جگہ سیوا۔ سوا گت۔ نیاؤ۔ نیو۔ استری۔ پرش۔ جیسے مانوس الفاظ بدل کر لائے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ لیکن۔ صرف کی جگہ بھی پرنتو اور کیول نے لے لی ہے۔ غیر معروف و نامانوس الفاظ کو اردو سے خارج کرکے جدید ہندوستانی زبان کی کیا شکل بنائی جا رہی ہے۔ اس کے لئے یو۔ پی۔ کے ایک کانگریس پرست کی شہادت ملاحظہ فرمائیے

> اگر مولانا ابوالکلام آزاد جو کانگریس پارلیمنٹری کے ممبر ہیں۔ اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ کانگریسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں تکلیف فرما کر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں۔ اور ان تقریروں کو سنیں جو ہندو ممبروں اور ہندو

وزراء کی طرف سے ادا ہوتی ہیں تو مجھے یقین ہے ۔ کہ وہ بھی ضبط نہ کر سکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے لہ

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہند و پبلک بھی پچاس فیصدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے ۔ پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جا رہا ہے ۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان اور اسی رسم خط میں قلمبند کی جاتی ہیں ۔ اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جا رہا ہے یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفا دینے پر مجبور ہوئے کہ دفتر کانگریس سے جو اطلاع اور جو اعلان شائع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے درآنحالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اردو زبان اور اردو رسم خط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شائع کئے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس وقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئیگا تو سب سے پہلے اس چیز کو خو کیا جائے گا جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے ۔" (نگار ۔ اگست ۳۸ء)

ان واقعات سے مولانا آزاد کے دعوے کی اصل حقیقت کو بھی معلوم کر لیجئے کہ ہندوستانی زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے گی یہ باتیں تو وہ ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہیں لیکن ان کوششوں سے زبان میں جو تبدیلی غیر محسوس طور پر واقع ہو رہی ہے اس کا اندازہ غور اور تدبر کا محتاج ہے آپ کسی سینما ہال میں جائیے اور سنئے کہ وہاں فلم میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ کس دیش کی بھاشا ہے ۔ حالانکہ تماشائیوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی ہے ۔ یعنی ہندی کا پروپیگنڈا اس روپے سے ہوتا ہے جس کا

لہ اب تو یہ مولانا آزاد کے متعلق حسن ظن ہی ہے ورنہ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند ۔ منہ

لہ الحمد للہ کہ ان میں اتنی حمیت باقی تھی ۔ منہ

بیشتر حصہ خود مسلمانوں کی جیب سے جاتا ہے۔ یا کسی شام ریڈیو کے پاس بیٹھکر سنئے کہ غیر محسوس ط
زبان کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ مقررین کو چھوڑیئے۔ خود براڈ کاسٹنگ اسٹیشن (محطہ نشر الصوت؛
(جو محکمہ بھی مرکزی حکومت کے ماتحت ہے) جو خبریں نشر کی جاتی ہیں ان میں بھی سواگت۔ سیوا۔ ا
جیسے الفاظ بلا تکلف استعمال ہونے شروع ہو گئے ہیں حتیٰ کہ ان کے مطبوعہ پروگرام میں بھی "مجلس" کی
سبھا کا لفظ آچکا ہے۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ صوبہ متوسط میں مدرسہ کی جگہ ودیا مندر کا نام سرکاری طور پر وضع کیا
مولانا آزاد سے دریافت کیا گیا کہ صاحب! آپ تو فرماتے تھے کہ اردو زبان سے عربی۔ فارسی کے غیر
الفاظ نکالے جائیں گے۔ یہ مدرسہ کونسا غیر معروف لفظ ہے جس کی جگہ ودیا مندر جیسا مشہور و معروف
تجویز کیا گیا ہے تو اس پر آپ نے فرمایا کہ مسلمان اسے بیت العلوم کہہ لیا کریں۔ جھگڑا ختم ہوا۔ سرکاری نام
مندر ہی رہیگا۔ لیکن یہی سوال جب مسٹر شکلا سے کیا گیا جو ودیا مندر سکیم کے روح رواں ہیں تو انہوں
فرمایا کہ

ودیا مندر اپنے اندر کئی کششیں رکھتا ہے۔ صوبہ کی ننانوے فیصدی آبادی کے لئے یہ
روحانی وجدان کا ذریعہ اور ان کے جذبۂ خیر کو ابھارنے کا باعث ہوگا (ودیا من

بحوالہ انقلاب مورخہ ۲۹ ۔ ۶ ۔ ۳۶ء) آپ نے دیکھا کہ ایک نا
تبدیلی سے کسی قوم کے بچوں کے جذبۂ روحانی پر کیا اثر پڑتا ہے یہ تو تھا ہندو بچوں کے جذبات کا اح
لیکن اسی صوبہ میں دادر کی میونسپل کمیٹی نے اردو سکول کا نام اردو ودیا مندر رکھدیا تو مسلمانوں نے اس
نام کے خلاف احتجاج کیا۔ کونسل میں سوالات ہوئے۔ تو ان کے جواب میں وہی مسٹر شکلا فرماتے
نام بیشک بدل دیا گیا ہے لیکن نام کے بدل دینے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں ہو
اور نہ اس سے کسی فرقہ اور مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود ہے" (مسلم لیگ مؤرخہ ۲۴ ۔ ۶ ۔ ۳۶ء
اردو لفظ کی جگہ ہندی لفظ کا استعمال ہندو بچوں کے لئے روحانی وجدان کا ذریعہ اور جذ
ابھارنے کا موجب ہو جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے بچوں کو اس سے کوئی روحانی کا دشوا

ہوتی، یہ ہے مسلمانوں کے جذبات کا احترام!!! اور اس پر مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کی شکایات ودیا مندر کے نام سے عبث ہیں" (انقلاب بابت ۲۹) خدا جانے حضرت مولانا کے نزدیک ہندوں کے خلاف مسلمانوں کی کوئی شکایت بھی معقول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ جب سے وہ مسلمانوں سے الگ ہو کر کانگریس میں جا ملے ہیں، مسلمانوں کی قوم، سب باتیں نامعقول اور بیجا کرنے لگی ہے۔

انجمن ترقی اُردو (دکن) نے اپنے کچھ مبلغ صوبہ متوسط میں بھیجے کہ وہ بچشم خویش وہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے صحیح صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان میں سے ایک مبلغ، سید شیر علی حاتمی نے الہ آباد میں ایک تقریر کے دوران میں بتایا کہ صوبہ متوسط میں ابھی سے یہ حالت ہو چکی ہے مانڈ ہونا ضلع چھند واڑہ کے اسکول میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ہر صبح پرارتھنا کرنی پڑتی ہے، سامنے سرسوتی کا بت لا کر رکھ دیا جاتا ہے، سب بچے اس بت کے سامنے گیان اور ودیا پراپت ہونے کی پرارتھنا کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان بچے کو آپ سلام کریں تو جواب میں وہ "نمستے" اور "جے رام جی" کی ہی کہے گا۔ (انقلاب۔ مورخہ ۱۰)

یہ بھی واضح رہے کہ ودیا مندر کی اسکیم کی رو سے وہاں بچوں کو ہندی لازمی طور پر سکھائی جائی ہے (ایضاً)، اس واقعہ کو سامنے رکھیے اور مولانا آزاد کے بیان پر پھر ایک نگاہ ڈالیے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ کوئی رسم الخط جبری نہیں ہوگا۔

یہ تو تھا ہندی ترویج کا معاملہ لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کی تخریب کے متعلق بھی وہاں کچھ کمی نہیں کی جا رہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو (دکن) اپنے ایک بیان میں رقمطراز ہیں:۔

> "اب کانگریس حکومت کی نظرِ عنایت ملاحظہ ہو۔ اس زریں عہد میں ضلع بیتول کا واحد اردو مدرسہ ہندی اسکول میں ضم کر دیا گیا ہے۔ آٹھنیر کا اردو اسکول توڑ دیا گیا ہے اور کوتر سیہ کے ورنیکلر مڈل اسکول سے اردو کو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔" (انقلاب ۲۲)

اور اسپر مولانا آزاد مسلمانوں کو ڈانٹ بتاتے ہیں کہ تم خواہ مخواہ شور مچاتے ہو

پھر مولانا آزاد کا بیان ہے کہ زبان ایک ہی ہوگی البتہ دو مختلف رسوم الخط (اُردو اور ...) میں لکھی جائیگی لیکن عمل اسپر یوں ہو رہا ہے کہ یو پی کی کانگرسی حکومت کے ماتحت کتب قوانین، تراجم "ہندوستانی" میں شائع ہو رہے ہیں اُن میں جو کتابیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی زبان اور ہوتی ہے اور جو اُردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اُن کی اور۔ (نگار بحوالہ احسن)

پھر حضرت مولانا نے کانگریس کا فیصلہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس مشترکہ زبان کا نام ... ہوگا لیکن ہم مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں دیکھ چکے ہیں کہ وہ اس بات پر بڑی شدت سے مصر ہیں کہ زبان کا نام "ہندی الفو ہندوستانی" ہوگا اور جب مولوی عبدالحق صاحب نے اسپر اعتراض کیا تو مہاتما جی کا اصرار اور بھی بڑھ گیا۔ اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اس میں سے "ہندی" کا لفظ ہٹا کر صرف "ہندوستانی" نام رکھنا کبھی گوارا نہیں کرونگا۔ چنانچہ اُنکے نزدیک اسکا نام "ہندی الفو ہندوستانی" ہی ہے، یعنی اصل نام تو ہندی ہی ہے البتہ اسی کو عرف عام میں "ہندوستانی" بھی کہا جاتا ہے، مہاتما جی سے کسی نے نہیں کہا کہ لفظ "ہندی" پر اصرار فرقہ پرستی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ڈاکٹر ... ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے البتہ اسکے خلاف کچھ کہنا یہ فرقہ ... اگر کہیں مسٹر جناح یہی طرز عمل اختیار کرلیں اور کہہ دیں کہ اس زبان کا نام اُردو یعنی "ہندوستانی" ہے تو آپ دیکھیں کہ کس طرح شور مچا دیا جاتا کہ یہ فرقہ پرستی ہے، رجعت پسندی ہے، ٹوڈیت ہے، ... کا رجحان (SEPARATIST TENDENCY) ہے متحدہ قومیت کی تشکیل کے خلاف۔ خدا جانے کیا کیا ہے۔

پھر مہاتما گاندھی کی تقریر مدراس میں آپنے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اُنکے نزدیک "ہندی ہندوستانی" وہ زبان ہوگی جو جنوبی ہند کی زبانوں سے قریب تر ہوگی اور اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہونگے لیکن بایں ہمہ مولانا آزاد مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ جدید زبان ...

سلیس زبان ہوگی جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جس میں عربی ۔ فارسی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نہیں ہوں گے ۔ یعنی مہاتما جی زبان کی گاڑی کو مدراس کی طرف لئے جارہے ہیں اور مولانا صاحب مسلمانوں سے کہ رہے ہیں کہ نہیں یہ تمہاری نگاہ کی تنگ نظری کا ثبوت ہے تم یہی سمجھو کہ گاڑی لکھنؤ کی طرف آرہی ہے ۔ اور جو شخص اپنی آنکھوں سے گاڑی کو دیکھکر کہدے کہ نہیں صاحب یہ تو ہمارے سامنے مدراس کی طرف جارہی ہے شمال اور جنوب کا فرق کوئی ایسا غیر محسوس فرق نہیں ہے جسے ہم یوں پہچان نہ سکیں تو کہدیا جاتا ہے کہ تمہیں تعصب اور فرقہ پرستی نے اندھا کر دیا ہے ۔ گاڑی شمال ہی کی طرف آرہی ہے ۔ خدا کرے کہ کہیں ان حضرات کو بھی وہی آنکھیں مل جائیں جن سے جمہور مسلمان دیکھتے ہیں پھر ان سے پوچھیں کہ گاڑی کدھر جارہی ہے ۔

زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں کیا جانئے کیا کہتا ۔ کیا دیکھتا ۔ کیا کرتا

مسلمانوں کا طرز عمل

ہندوؤں کے متعلق تو آپنے دیکھ لیا کہ وہ اردو زبان کو ہندی بنا دینے میں کس برق رفتاری کے ساتھ بڑھتے چلے جارہے ہیں ۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کہ مسلمان اس باب میں کیا کہہ رہے ہیں (اور ہو بھی کیوں ؛ انہوں نے مسلمانوں کی دوستی کا دم کس دن بھرا تھا جو ان سے اس قسم کی توقع کی جائے) لیکن اس کے مقابلہ میں اردو کو شدھ کر دینے میں خود مسلمانوں کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندوؤں کے مقصد کو قریب تر لانے میں اور بھی زیادہ ممد و معاون بن رہا ہے ۔ مسلمان مقررین ۔ مصنفین جرائد و رسائل محض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر اب آہستہ آہستہ اس قسم کی زبان استعمال کرنے لگے ہیں جس زبان کا آج سے دس برس پیشتر کہیں پتہ نہیں چلتا اس کی بہترین شہادت سندر لال جی الہ آبادی کا وہ خط ہے جو انہوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا اور اب تو حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے وہ فرماتے ہیں :-

اُردو رسالوں میں دو دوان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لکھے اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اُردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ ایک مسلم اُردو رسالہ کی زبان پر کسی کٹّر مسلمان نے اعتراض کیا آپ کو تعجب ہوگا، و دوان (عالم) ایڈیٹر نے جواب دیا کہ میں حجازی اُردو سے اپنے رسالہ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا" اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اُردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالہ میں نہیں ہو رہا ہے، لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال سے میں نے اُردو نظم و نثر کے چند نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پر چار سبھا کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنہیں اگر آپ جوں کے توں حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرا دیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ اُردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جا سکتا ....
آپ خود کسی وقت آئندہ کی ہندوستانی زبان کے لحاظ سے ہندوستانی جیسی زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سُن کر اُردو داں اور ہندی داں دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا دونوں سمجھتے تھے لیکن ناگپور کی جو آپ کی تقریر جوں کی توں دلّی کے جامعہ میں چھپی ہے وہ چیز نہیں ہے ۔ (جامعہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اس کی ضرورت سے زیادہ رواداری نے اکثر تباہ کیا ہے۔ رواداری بڑی عمدہ چیز ہے بشرطیکہ خودکشی پر آمادہ نہ کردے ۔ دوسرے معاملات کی طرح زبان کے معاملہ میں بھی یہ اپنی اسی رواداری سے کام لے رہا ہے ۔ ہاتھ باندھ کر منتیں کرتا چلا جا رہا ہے کہ مہاراج! ہم اُردو کا نام بدلے دیتے ہیں۔ ہم اس کے رسم الخط کو بھی درست کرلیں گے مگر ہم تو یہ کرتے ہیں کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نہیں لائیں گے، آپ خود دیکھ لیجیے کہ ہم ہندی کے الفاظ کس کثرت سے اس زبان میں داخل کر رہے ہیں ہم آپ کے آپ پرستاؤ کا سواگت کرتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سار

ہندوستان کی جنتا کے سماجی سدھار کے لئے۔ پرنتو آپ سے کیول اتنی آشا ہے کہ ہمیں اس بھاشا کو زندہ رکھنے کی آگیا دے دیجئے۔ یہ روش بڑی تباہ کن ہے۔ اس کا کوئی مفید اثر "قوم پرستوں" پر نہیں پڑ سکتا۔ ان کو آپ کی زبان کی "دشواریاں" اس کے بدلنے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ وہ جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا ہے جس کے تحت اسپین کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی نادرۂ روزگار عمارات کے حسین و جمیل نقوش کھرچ ڈالے تھے، اس لئے نہیں کہ ان کو آرٹ سے کوئی دشمنی تھی، بلکہ صرف اس لئے کہ اسلامی خون رکھنے والی نسلوں میں ان نقوش سے اپنے ماضی کی اور اپنی قومیت کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ بالکل اسی جذبہ کے تحت زبان سے "علیحدگی پسندی کے رجحان" کو مٹانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں اور مسلمان سمجھ رہا ہے کہ رواداری سے کوئی بیچ بیچ کا راستہ پیدا ہو جائے گا۔

تم ریڑھ کی ہڈی کے بغیر محض نرم گوشت بن کر اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے۔ اگر استقامت چاہتے ہو تو اپنے اندر ریڑھ کی ہڈی پیدا کرو۔ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے"، تو کیوں نہیں کہتے کہ ہاں صاحب! یہ ہماری زبان ہے۔ ہماری زبان رہے گی۔ اور جب تک ہم موجود ہیں اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔

یاد رکھئے زبان کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں جسے آپ یونہی ایک نظری بحث (ACADEMIC DISCUSSION) قرار دے کر آگے گذر جائیں اور اردو زبان پر تاریخی مقالات لکھ کر مطمئن ہو جائیں کہ آپ نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ اردو ہی ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار پا سکتی ہے۔ یہ بحث اس سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس لئے کہیں زیادہ قوتِ عمل کی محتاج۔ ذرا غور فرمائیے کہ آپ کے اسلامی تمدن اور مذہب کا تیرہ سو سال کا ذخیرہ اولاً عربی زبان میں ہے۔ ہندوستان کا مسلمان سوائے عربی مکاتب کے چند طالبعلموں کے) اس ذخیرہ سے بالکل ناآشنا ہو چکا ہے۔ اور اس لئے اپنے متعلق "معلومات" کے لئے مغرب کے مستشرقین کا محتاج ہے۔ وہ جس قسم کی

معلومات بہم پہونچتے ہیں ارباب علم سے پوشیدہ نہیں پھر اس خزانہ کا کچھ حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہاں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بھی بے بہرہ ہو چکا ہے۔ اس کے نزدیک کتب عربی اور فارسی کس درجہ مہمل ہو چکی ہے۔ اس کا نظارہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کسی کباڑی کی دوکان پر دیکھئے۔ نادرۂ روزگار کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر ردی کے بھاؤ بکتے ہیں۔ جمع شدہ ذخیرہ یوں ضائع ہو رہا ہے اور آئندہ ایک کتاب بھی ان زبانوں میں یہاں نہیں چھپتی چھپے کس کے لئے؟ عربی اور فارسی یوں ختم ہوئی۔ اس کے بعد کچھ تھوڑا سا سرمایہ علمی اردو میں منتقل ہوا تھا۔ اب جس وقت آزاد ہندوستان کی زبان ہندی (یا براہ فریب نگاہ ہندوستانی) ہوئی تو آپ دیکھیں گے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں اردو کا تمام ذخیرہ اسی طرح آثار قدیمہ والوں کی نذر ہو جائے گا جس طرح آج عربی اور فارسی کا ہو چکا ہے۔ اور اور جب کوئی قوم اپنے اسلاف کے سرمایۂ علمی سے محروم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی تہذیب۔ تمدن۔ لٹریچر۔ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ انگریزوں نے یہاں پہونچکر نہ تو انگریزی کو بالجبر رائج کیا۔ نہ عربی۔ فارسی کو جبراً اسکولوں سے خارج کیا۔ لیکن ایک سو سال کے عرصہ میں جو کچھ تبدیلی یہاں ہو گئی وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اپنی زبان پر غیروں کی زبان کے غالب آجانے سے قوم کی ذہنیت بدل گئی۔ اور قوم کی قوم علمی سرمایہ کی اس متاع گراں بہا سے تہی دامن ہو گئی جو صدیوں سے اس کے لئے مایہ ناز تھی۔

رسم الخط کا مسئلہ

پھر مسلمان کے لئے رسم الخط کا مسئلہ اس سے بھی اہم ہے۔ اردو کا رسم الخط (دائیں سے بائیں طرف) عربی رسم الخط ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندی رسم الخط (بائیں سے دائیں طرف) سنسکرت کا رسم الخط ہے۔ آپ کا رسم الخط تمام عالم اسلامی کے ساتھ آپ کا تعلق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات جسے پان اسلامزم کا ہوّا بنا کر ڈرایا جاتا ہے) ہندوؤں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھٹکتے رہے ہیں۔ یہ تمام "معصوم کوششیں" جو بتدریج اردو رسم الخط کی جگہ ہندی رسم الخط کی

ترویج کی طرف کشاں کشاں لیئے جارہی ہیں دراصل اسی جذبہ کا مظاہرہ ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو باقی عالم اسلامی سے الگ کر کے انھیں ہندی قومیت میں جذب کرنے کے لیئے ہر ہندو کے دل میں موجزن ہے۔ یہ اتنا بڑا خطرہ ہے کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بروقت آگاہ نہ ہوئے اور قومیت پرست مسلمانوں کے ہمدردی سے لبریز بیانات پر بھروسہ کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ وہ اپنی اصل سے اس طرح کٹ جائیں گے جس طرح فصلِ خزاں میں ایک شاخ درخت سے ٹوٹ کر گر پڑتی ہے اور جس کے لئے پھر کبھی مژدۂ بہار نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے مصیبت تو یہاں خود اپنوں کی لائی ہوئی ہے۔ سی۔ پی میں اگر ہندی کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے تو مسلمانوں کو اس سے اتنی ہی شکایت ہو سکتی ہے کہ کانگریس باوجود قومی جماعت کے ادعا کے خالصۃً فرقہ دارانہ اقدام کر رہی ہے لیکن سینۂ مسلم کا ناسور تو اُس وقت رستا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ دہلی کے جامعۂ ملیہ میں جو ایک آزاد اسلامی درسگاہ ہونے کی مدعی ہے۔ ابھی سے ہندی کی تعلیم جبری کر دی گئی ہے۔ جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کا کیا شکوہ!!

کہدیا جا سکتا ہے کہ تم نے انگریزی بھی تو سیکھی تھی جس کا رسم الخط اردو سے مختلف تھا، لیکن انگریزی سیکھنا تو غلامی کی لعنتوں میں سے تھا اگر آزادی کی برکات کا نتیجہ بھی وہی کچھ ہوا تو دونوں میں فرق کیا ہوا؟ پھر انگریزی ہندوستان کی متحدہ زبان نہیں قرار دی گئی تھی وہ حاکم قوم کی زبان رہی تھی۔ اگر ہندو یہ اعلان کر دیں کہ ہندی ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے، جس کے ہاتھ میں نظام حکومت ہوگا اس لیئے اقلیتوں کو یہ زبان بجبر سیکھنی پڑیگی تو بات صاف ہو جائے اس مقصد کو متحدہ قومیت کے مشترکہ مفاد کے نقاب میں کیوں پیش کیا جا رہا ہے؟

پھر کہدیا جاتا ہے کہ ترکوں نے اپنا رسم الخط ترک کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے جو عربی رسم الخط سے مختلف ہے تو تم بھی ایسا کر لوگے تو کیا حرج ہوگا سو اول تو ترکوں کے حالات

ہم سے مختلف ہیں۔ انکی حکومت اپنی ہے۔ زبان اپنی ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کن مصالح کی بنا پر رسم الخط کو بدلا ہے لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ترکوں کا ہر فیصلہ ہمارے لئے سندی ہے؟ ہم اپنے فیصلے اپنے حالات کے مطابق خود کریں گے۔ ہمارے فیصلے ہندو اکثریت کیوں کرے۔

بعض حضرات کو کہتے سنا ہے کہ ہم ہندی رسم الخط اختیار کرکے اپنا تمام لٹریچر ہندی میں منتقل کردیں گے اور اس طرح اسے ہندوؤں تک پہنچا کر اپنے مذہب اور تہذیب کی تبلیغ کرسکیں گے۔ بگلہ پکڑنے کا یہ طریق ایسا "استادانہ" ہے جسکی جسقدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ آج جتنے ہندو اچھی طرح سے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں پوچھئے کہ وہ آپکے اسلامی لٹریچر کو کتنا پڑھتے ہیں اور انکے خیالات کو آپنے کس حد تک متاثر کیا ہے؟

پھر کہا جاتا ہے کہ اُردو میں ۸۰ فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں اس لئے اسے ہندی میں تبدیل کردینے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ جب اُردو میں ۸۰ فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں جو ہندوؤں کی آبادی کے تناسب سے بھی زیادہ ہیں تو اسی زبان کو قومی زبان کیوں نہ قرار دیدیا جائے۔ مسلمانوں کا تو اس میں پھر بھی بیس فیصدی ہی حصہ رہیگا لیکن ہندو تو اتنا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو اسے سو فیصدی ہندو بنانا چاہتا ہے اور رسم الخط وہ اختیار کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں اس کے سوا اور کوئی نہ سمجھے معلوم نہیں حکومت حاصل کر کے یہ باقی دنیا سے کس رسم الخط میں خط و کتابت کیا کریں گے؟ اُردو رسم الخط سے تو پھر بھی کم و بیش آدھی دنیا واقف ہے۔

نمونہ "ہندوستانی"

آخر میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس "ہندوستانی" کا نمونہ بھی دکھادیا جائے جو آپ کے آزاد ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے والی ہے۔ بھارت ساھتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور منعقدہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

"اس سبھا کا سبھا پتیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دو لیش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو۔ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا شیلو اکیشتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لیکر کھنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر ڈبرو گڑھ تک جو یہ دیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اسکے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتی ہیں تو اس دیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری تیاوی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی یتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں (رسالہ جامعہ مئی سنہ ۱۹۳۶ء)

یہ ہے وہ مولانا آزاد کے بیان کے مطابق صاف سلیس اردو جو شمالی ہند کے شہروں میں بولی جاتی ہے۔

اس سے بھی دلچسپ ایک اور نمونہ ہے۔ بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے "ذریعہ تعلیم کے متعلق جو حکم حال ہی میں صادر فرمایا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں۔

ہندوستانی زبان کو سنسکرت سے بھرنے یا فارسی سے ملانے کے خلاف اکثر یورپین اور ہندوستانی فضلا نے آوازیں بلند کی ہیں جن میں چند کے نام حسب ذیل ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ میں ان میں سے فقط دو حضرات یعنی پنڈت گردھر شرما اور مولانا وحید الدین سلیم کے خیالات درج کرتا ہوں۔ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"سنسکرت مایا بنا کر آپنے بنگال۔ مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار کریں کنتو (مگر) وہ کیول شکشیتوں (پڑھے لکھوں) کی بھاشا (زبان) بن گئی۔ سروسادھارن (عوام) اسے بالکل نہ سمجھ سکے۔ تو کیا لابھ (فائدہ) ہوا۔ لابھ کیا بڑی ہانی (نقصان) ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد (الفاظ) ہی یہ تھا م لینی چاہئے۔ لیکن جب ان سے آوشکتا پوری (ضرورت) نہ ہو تب سنسکرت بھاشا سے سرل شبد (آسان الفاظ) لینے چاہئیں

(کلیم بابت اگست سنہ ۱۹۴۶ء)

یعنی پنڈت جی نے ہندوؤں کو نصیحت کی ہے کہ ہندی زبان کو ایسا سلیس لکھو کہ اس میں سنسکرت کے

غیر مانوس الفاظ نہ آئیں لیکن جس زبان میں انہوں نے خود یہ پیغام دیا ہے اس کے سمجھنے کے لئے مہاراج بکرماجیت کے کسی نورتن کی ضرورت ہے۔ یہ ہے نمونہ آسان اُردو کا جو آپ کی مشترکہ زبان بنیگی۔ مولانا آزاد ان باتوں کے متعلق کسی بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ہندوؤں کے جی میں جو کچھ آئے کریں وہ معقول اور حق بجانب ہے۔ البتہ کبھی مسلمان کوئی شکایت کرے تو انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہندوؤں کی صفائی پیش کر دیں۔ ان مثالوں کو شاید کوئی یہ کہہ کر مسترد کر دے کہ یہ کوئی سند تھوڑی ہیں؟ آئیے ہم آپ کو ایک ایسا نمونہ دکھائیں جس کے مستند ہونے میں کسی کو کلام نہ ہو۔ صوبۂ متحدہ کی کانگریسی حکومت کے وزیر تعلیمات آنریبل سری سمپورنانند جی نے ایک تقریر کی جس کا ترجمہ "ہندوستانی" زبان میں فوراً گورنمنٹ کے محکمۂ اطلاعات نے شائع کیا ہے۔ اس کے مستند ہونے میں تو کسی قسم کا شبہ نہیں ہو سکتا؟ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کونسی زبان میں ہے۔ واضح رہے کہ یہ زبان اس لکھنؤ سے شائع ہو رہی ہے۔ جو ہندوستان بھر میں اردو کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ تقریر مع عنوان یہ ہے۔

"شکشا سنگھٹن سمتی کے سمکش سنکیت پرانت کے شکشا سچیو مانئے شری سمپورنانند جی کا دیاکھیان (پرکاشن وبھاگ سنکیت پرانتئے گورنمنٹ)

ادھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک وششتا ہے کہ شکشت منشیا کے پرت لوگوں کا آگرہ تشر بیت ورشدہ اور بیاپک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سبئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس شیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا انبھون کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے کو جس مانسک اور بلد ہارتک پرستھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو سماجک راج نیتک اور ارتھک ادھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو دیاپی پرگت کو ہمارے سمکرنش سندیہ ایک بشیش روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وششیس بھارتئے سمسیہ بنا دیا ہے۔" ذرا آواز دیجئے مولانا آزاد صاحب کو اور ان سے پوچھئے کہ "سلیس اُردو" جسے جنتر منتر والوں کی اصطلاح میں "کالا علم" کہا جا...

شمالی ہندوستان کے کس شہر میں بولی جاتی ہے ؟

باب دوم

کچھ اپنوں سے

آپنے دیکھا کہ اس آئینی تبدیلی کے دور میں "حصولِ آزادی" کی آڑ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی امتیازی خصوصیات مٹانے کے لئے ہندو اکثریت جو طریق کار اختیار کر رہی ہے - اس میں زبان کی تبدیلی کتنا زبردست حربہ ہے - لیکن سوال صرف یہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں ؟ اصل سوال یہ ہے کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں مسلمان بنکر رہنا چاہتے ہیں اور اپنی آنیوالی نسلوں کو مسلمان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں انھیں کیا کرنا چاہیئے - تحفظ زبان کے بارے میں ہمارے سامنے کیا تعمیری پروگرام ہونا چاہیئے۔ اسکے متعلق کسی دوسری صحبت میں گزارش کی جائیگی - اس وقت ہم چند باتیں اپنی "ادبی برادری" سے کرنا چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں سب سے اہم ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے

سوال یہ ہے کہ ہم زبان چاہتے کس لیئے ہیں ؟ زبان بذاتِ خود تو کوئی اہم چیز نہیں ہے اسلیئے محض اس کا تحفظ مقصود بالذات قرار نہیں دیا جا سکتا ، زبان کا تحفظ ہم اسلیئے چاہتے ہیں کہ اسکے ذریعہ ہمارے تمدن - ہمارے کلچر کی حفاظت ہوتی ہے لیکن کیا جو کچھ آجکل عام طور پر ہماری ادبی پیداوار ہے وہ ایسی ہی ہے جسے اسلامی تمدن اور اسلامی ثقافت کا آئینہ دار کہا جا سکے ؟ جواب ظاہر ہے ! ہمارے نوجوان لکھنے والوں میں ایک جماعت تو ایسی ہے جس نے اپنی تمام مساعی کو اس بات کیلیئے وقف کر رکھا ہے کہ مذہب اور شعائرِ ملت کے خلاف "جہادِ عظیم" کیا جائے - اوّل تو کالجوں کی تعلیم ہی اس نہج پر رکھی گئی ہے کہ بی اے کرنے تک دماغ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو جاتا ہے اس پر آزادیٔ ہند کے قائدِ اعظم کے یہ ارشادات کہ ملک میں جس قدر مصائب موجود ہیں اُن سب کا ذمہ دار مذہب ہے ، نوجوانوں کو مذہب کی مخالفت نہیں بلکہ تضحیک و تمسخر کے لیے بالکل

مسلح کر دیتے ہیں پھر وہ اشتراکیت کی ایک خیالی جنت کے نشہ میں اس قدر مدہوش و بے باک ہوجاتے ہیں کہ سوقیانہ استہزا اور بازاری تمسخر انکے نزدیک عین معیار شرافت قرار پا جاتا ہے اور اس بدمستی میں بقول بلدرم انکے منہ سے لوبے فحش کے ایسے بھبکے نکلتے ہیں کہ نکیرین بھی پناہ مانگیں

ایک اور جماعت ہے جو جدید رومانیت کی علمبردار ہے ہماری قدیم غزل گوئی کے خلاف ان کا وعظ سُنیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتذال اور سوقیانہ پن کا لفظ تک سُننے کے لیئے تیار نہیں ہیں اس شاعری میں انہیں دُنیا بھر کے عیب نظر آئیں گے لیکن انشا۔ رنگین۔ جرائت۔ جان صاحب اور مرزا شوق کو متبذل اور فحش گو کہنے والے ذرا یہ تو دیکھیں کہ جس قسم کی عریاں فحاشی ان کے افسانوں اور (S o n a t e s) میں آجکل ملتی ہے اُن بے چاروں کے تصور میں بھی اس قسم کے نقشے نہ آسکتے تھے۔ وہ تو پھر ایک فرضی معشوق کی کنگھی کو ہی نمایاں کرتے تھے۔ اور آج حالت یہ ہے کہ سچ مچ عشقبازی کی جاتی ہے اور نام لے لے کر واردات قلب کے مرقع تیار کیئے جاتے ہیں جن سے اور کچھ نہیں تو ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کوشی کی لذت تو ضرور مل جاتی ہے یہ سب کچھ اس مغربی معاشرت کا نتیجہ ہے جو غیر محسوس طور پر ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ پر چھا گئی ہے اور جسکے تحت حیا سوز سفلی جذبات کے اظہار کا نام رومانیت رکھا جاتا ہے اگر آپ کو دیکھنا ہو کہ اس رومانیت سے یورپ کی اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے تو ایک اطالوی مصنف کی کتاب (The Romantic Agony) ملاحظہ فرمایئے پھر یہ بھی دیکھیئے کہ اس قسم کی افسانہ نگاری اور شاعری کا اخلاق کے علاوہ نوجوانوں کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے ایسے نوجوان کا دماغ شروع سے ہی حقایق کی دُنیا میں رہنے کے بجائے ایک افسانوی دُنیا کے تصورات و تخیلات میں محو رہتا ہے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے کہ وہ جب دُنیا کی حقیقتوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کو اپنے افسانوی معیار پر پُورا اُترتے نہیں دیکھتا اس لیئے وہ ان چیزوں سے بیزار ہو جاتا ہے، یاس و قنوطیت کا المناک فلسفہ اُسکے تمام اعمال و افکار پر چھا جاتا ہے، اور وہی نوجوان جس کی قوتِ عمل سے قوم کو زندہ ہونا تھا، خود ایک چلتا پھرتا جنازہ بن کے رہ جاتا ہے۔

ایک تیسری جماعت ادب اور وہ (art for art sake) (آرٹ محض آرٹ کی خاطر) کی قائل ہے یہ اور اسی قسم کے اور جملے ایسے مہمل گورکھ دھندے ہیں جو کبھی شرمندۂ معنے نہیں ہوتے بے معنے تراکیب۔ بے مطلب فقرے۔ نثر منظوم۔ نظم منثور۔ ٹیگوری رنگ میں مجذوبوں کی سی بڑ میں نہ جن کا سر نہ پاؤں، یا تو یہ لوگ عمداً دوسروں کو بناتے ہیں، یا خود بنتے ہیں، غالب کے تتبع میں غزلیں کہی جاتی ہیں جن میں شوکتِ الفاظ اور ندرت ترکیبات کے زور پر سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عصمتِ ناہید وکوثر نوبہارِ نغمہ ہے　　شعلۂ جوّالہ ء۔ اعتبارِ نغمہ ہے

بوئے رنگیں عنبر فشاں۔ مرمریں رنگ شباب　　کیفِ صہبائے تمنا۔ جو ئبارِ نغمہ ہے

یا مثلاً نثر میں پیازی اُردو کے چھلکے پر سے چھلکا اُتارتے جایئے۔ اندر سے کچھ بھی نہ نکلے۔

"ریحانۂ نوردسرمدی کی داستانِ شیریں منجمد افسردۂ یاسمین کا بلوریں مجسمہ گویا قدرت کا ایک حسین خواب تھا جبر رنید کی نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی سنہری راتوں میں بہارِ گلستاں بدامن کیف زانوئے رنگیں پیدا کرتی تھی۔"

مقصد اس طویل داستان سے یہ ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی اسلامی ہونا چاہیئے، بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں، کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع ایک عظیم الشان خطرہ کا سامنا ہے، یہ وقت وہ ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو اس متاع گرانمایہ کی حفاظت کے لیے گزرے۔ یہی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ طریق کار خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ہماری تمام جدوجہد کا رُخ اسی ایک نصب العین کی طرف ہونا چاہیئے۔ ادیب اپنے ادب سے، شاعر اپنے شعر سے، افسانہ نگار اپنے افسانوں سے، رسائل اپنے صفحات سے، خریدار اپنے ذوقِ ادب و شعر سے، غرض ہر مسلمان اپنے اپنے دائرۂ امکان میں اپنی ہر کوشش اسی مقصد کے حصول میں صرف کر دے، ہمارے رسائل میں "مذہبی" اور "ادبی" کی تفریق دراصل اُس تفریق پر مبنی ہے جو کلیسا اور سلطنت کی تفریق سے پیدا ہوتی ہے، اور جو یکسر غیر اسلامی

تفریق ہے، ہمارے ہر پرچہ کو اسلامی ہونا چاہیئے، اور اس کی ادبی وصحافتی خدمات اسی عنوان کی تفسیرات ہونی چاہیئں۔ ادب پسند حضرات کو بھی اس تبدیلی نصب العین سے قطعاً نہیں گھبرانا چاہیئے، کیونکہ "اسلامیات" اور "مولویات" میں درحقیقت بہت نمایاں فرق ہے، لیکن آج کل ہمارے ہاں یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی پرچہ جو اپنی پیشانی پر "علمی وادبی مجلّہ" کا عنوان لکھ لیتا ہے، اسلام اور مسلم کا لفظ بھی اس کے اندر لکھنا کفر سمجھتا ہے میں ادب وشعر کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا لیکن کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ادب وشعر ہماری عمارتِ ملی کی بنیادیں نہیں ہیں محض تزئین وآرائش کی چیزیں ہیں۔ جب کسی عمارت کی بنیادیں خطرہ میں ہوں تو کوئی صاحبِ دانش وبینش اس وقت اپنی کوششیں اس کی تحسین وتزئین میں صرف نہیں کرتا بلکہ سب سے مقدم کام خود عمارت کے استحکام کو سمجھتا ہے۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ جب ہم اس تبدیلی کا اعلان کریں گے تو اطراف وجوانب سے ہم پہ انگلیاں اٹھیں گی۔ لیکن بقول مولانا حالی" دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔

آخری گزارش

آپ نے دیکھ لیا کہ اس "تحریک آزادی" میں آپ کے لیئے کیسی کیسی خوبصورت "زنجیریں" تیار ہو رہی ہیں اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ یہ زنجیریں کیا کریں گی، تو ہندوستان کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیئے یہاں یونانی آئے، پارتھین آئے، باختری آئے، ہن آئے، اور متعدد قومیں یکے بعد دیگرے آئیں لیکن آج ذرا چراغ لے کر ڈھونڈو تو سہی کہ ان قوموں کا کہیں سراغ بھی ملتا ہے؟ یہ قومیں ہندوستان سے واپس نہیں گئیں۔ آخر کیا ہوئیں، کیوں نظر نہیں آتیں؟ اس کا جواب تاریخ یہ دیتی ہے کہ انھوں نے خود فراموشی کا جرم کیا تھا اس لیئے فنا ہو گئیں۔ جب یہ ہندوستان آئی تھیں تو اپنی الگ زبان، الگ تہذیب الگ تمدن، الگ مذہب رکھتی تھیں، مگر انھوں نے اپنے امتیازی خصائص

کی حفاظت نہ کی، اپنے آپ کو اس ملک کی عام آبادی میں جذب کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے، صرف افسانے رہ گئے۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے بجائے صرف آپ کے افسانے باقی رہ جائیں؟

اور رازِ حیات صرف اس حقیقت میں مضمر ہے کہ:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ⁂ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آپ اپنا مذہب۔ اپنا تمدن۔ اپنی تہذیب۔ اپنی زبان۔ اسی صورت میں قائم رکھ سکتے ہیں کہ آپ اپنی جماعت کو بحیثیت مستقل جماعت کے قائم رکھیں۔ وفیھا آیات لقوم یعقلون۔

(نوٹ) یہ مضمون علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ قیمت چھ پیسہ علاوہ محصولڈاک

معارف القرآن

چونکہ زیرِ نظر رسالہ میں مسئلہ زبان پر ایک اہم اور بسیط مضمون شائع ہو رہا ہے اس لیے معارف القرآن کا سلسلہ جبری طور پر روکنا پڑا۔ انشاء اللہ آئندہ نمبر میں یہ سلسلہ نظر افروز ہوگا اسی طرح جناب پرویز صاحب کا ایک خاص مضمون "پیامِ اقبال اور قرآن کریم" بھی اسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ آئندہ یہ مضمون بھی انشاء اللہ قارئین کرام کی نظر سے گزرے گا۔

(منیجر)

ضروری تصحیح

طلوعِ اسلام بابت ماہ ستمبر میں ص ۲۵ سطر ۱۸ پر عبارت "ہندو مسلمانوں کے نزدیک بدیشی حکومت کے خاتمہ کیضرورت اسلیے ہے"۔ میں لفظ "ہندو"۔ زائد ہے۔ جس سے عبارت کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، براہِ کرم ناظرین کرام اپنے اپنے پرچوں میں اس کی تصحیح فرمالیں اور اس سے لفظ "ہندو" کو قلم زد کر دیں۔

(منیجر)

سوراجی اسلام

سیاسیات حاضرہ پر مکمل اور جامع تبصرہ۔ مذہب اور سیاست کا باہمی تعلق اور اس کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر۔ اسلام میں جماعت کی اہمیت، اسلامی نظام پر مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات اور الہلال کا دور اوّل۔ کانگریس کے نزدیک مذہب کی آزادی اور کانگریسیوں کے خطرناک خیالات۔ موجودہ سیاسی ماحول میں مسلمانوں کے زندہ رہنے کا طریقہ۔ اسلامی قومیت۔ اور کانگریسی قومیت کا فرق۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات دربارہ اسلامی قومیت، اور اس پر زبردست تنقید۔

ان مضامین پر اگر آپ مطلع ہونا چاہتے ہیں تو رسالہ "سوراجی اسلام" از جناب رازی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مضمون "طلوع اسلام" بابت جون ۳۸ء میں شائع ہوا ہے مگر مضمون کی اہمیت اور احباب کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بہت سے اضافوں کے ساتھ از سرِ نو اسکو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان اُسے خود پڑھیں اور اپنے بھائیوں تک اس پیغام کو پہونچائیں۔ صفحات ۴۸ قیمت ۲ر علاوہ محصول ڈاک

ایک رسالہ کے لئے ایک آنہ محصول ارسال فرمائیے۔

منیجر رسالہ طلوع اسلام بلیماران دہلی

(نوٹ) خریداران رسالہ ہذا کو چاہئے کہ خط و کتابت کرتے وقت اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں:۔

انفاق فی سبیل اللہ

اسلام میں مسئلہ زکوٰۃ و صدقات کی اہمیت کیا ہے ؟ دنیا کے معاشی نظام پر اس نے کیا اثر ڈالا۔ اور اس فریضہ کی تعمیل، از سرِ نو مسلمانوں کو پھر کس طرح زندہ بنا سکتی ہے ؟ نیز قرآن حکیم نے پر حکمت انداز میں اُسکے مصارف اُسکے نتائج اور اُسکے فوائد پر کس طرح روشنی ڈالی ہے ؟

اگر آپ

ان تمام امور پر حادی ہونا چاہتے ہیں تو رسالہ "انفاق فی سبیل اللہ" ملاحظہ فرمایئے۔ یہ رسالہ مشہور متکلم اسلام جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے حقیقت نگار قلم سے حال ہی میں نکلا ہے اور ایک دردمند ایثار پیشہ بزرگ محترم خان محمد اکبر خاں صاحب کیمبلپوری نے اس کو چھپوا کر مفت شایع کیا ہے۔

طباعت میں تاخیر ہونے کے باعث درخواست کنندوں کو قدرے دقّت محسوس ہوئی ہوگی مگر اب رسالہ مکمل ہو گیا ہے۔

ایک آنہ کے ٹکٹ کے بھیجکر پتۂ ذیل سے طلب فرمایئے۔

خان محمد اکبر خاں صاحب ارشد منزل کیمبلپور ضلع اٹک

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات
الجہاد فی الاسلام
مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-
۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا
۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے -
۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے
۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق
اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے -
۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات -
۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیم
پر مفصل تبصرہ -
۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵ غیر مجلد
رسالہ دینیات
یہ رسالہ سرکار آصفیہ کے محکمہ تعلیمات نے میٹرک کے طلبہ کو پڑھانے کیلئے لکھوایا ہے -
علمائے دکن کی ایک مستند مجلس اسکی تالیف میں شریک مشورہ رہی ہے مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل
سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول
کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں-
طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ
نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ
قیمت ۱۱ر معہ محصول ڈاک
دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے
دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ (پنجاب)
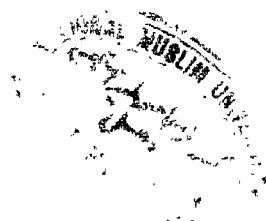
عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ
طلوع اسلام
بیاد گار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ!

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب
محمد عثمان

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ ۸ر

جلد (۱) شمارہ ۷ | رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۸ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ → مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے،

یا ایہا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا
اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم
بات مانو اللہ و رسول کی جب تمہیں ان باتوں کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لئے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار
(فرمان رسول)

لا اسلام الا بالجماعۃ
(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

رازِ مستور

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بُود
ولیکن کس نہ دانست ایں مُسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بُود

(اقبالؔ)

گہرہائے نایاب

حضرت علامہ اقبالؒ کی غیر مطبوعہ رباعی

مسلمانان کہ خود را فاش دیدند
بہ ہر دریا چوں گوہر آرمیدند
اگر از خود رمیدند اندریں دیر
بجانِ تو کہ مرگِ خود خریدند

(اقبال)

لمعات

گزشتہ مہینہ کا اہم ترین واقعہ یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست چیکوسلاویکیا کا قضیہ ہے جسنے نہ صرف "عہدِ جہالت" کے تغلب اور استبداد کی یاد تازہ کردی ہے، بلکہ موجودہ دورِ تہذیب کی سیاسیات اور آئینِ جہانبانی کے اہم ترین گوشے بھی روشن کردیئے ہیں۔

غافل دُنیا اس قلیل عرصہ میں سوتی اور جاگتی رہی، اور بہر غریب چیکوسلاویکیا کا کام ہی تمام ہوگیا۔ واقعات بتارہے تھے۔ کہ حشر برپا کرنے والی جنگ چھڑ گئی اور یورپ اپنے ہی ہاتھوں اپنی گردنیں کاٹکر رکھ دیگا مگر بھلا ہو "ثالث بالخیر" کا جسنے اپنے روایتی تدبر سے کام لے کر محض اپنے بچاؤ کے لیئے مداخلت کی اور چیکوسلاویکیا کو جرمنی کے ہاتھوں ذبح کرادیا۔ حیرت ہے کہ دُنیا اس "ثالث بالخیر" کی تعریف میں رطب اللسان ہے وہ ثالث بالخیر جس کا مذہب، مکر و دغا کرنا، جس کا مشرب دوست بنکر گلا گھوٹنا اور جس کی عادتِ شریفہ مُسکرا کر اور دل لُبھا کر سینہ میں چھُری بھونکنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے!

زیکوسلاویکیا کا انقلاب اپنے پیچھے عبرت و موعظت کی اتنی داستانیں چھوڑ گیا ہے کہ ہندوستان کی اکثریت اور اقلیت، ہندو اور مُسلمان، کانگریس اور مُسلم لیگ اور ہر قوم و جماعت کو اُسکے آئینہ میں اپنے خدوخال پُورے طور پر نظر آنے لگے ہیں، قائدِ ملت مسٹر جناح نے لیگ کانفرنس منعقدہ کراچی میں تقریر کرتے ہوئے بجا ارشاد فرمایا کہ :-

> "چیکوسلاویکیا کے سوڈیٹن جرمنوں کے واقعہ سے برطانیہ اور کانگرس ہائی کمانڈ (قیادت اعلیٰ) کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جس طرح سوڈیٹن کے جرمن بے یار و مددگار ثابت نہ ہوئے اسی طرح ہندوستان کے مُسلمان بھی بے پناہ نہیں ہیں۔" (ہندوستان ٹائمز ۸ اکتوبر)

پنڈت جواہر لال نہرو جو یورپ میں بیٹھے ہوئے بہت قریب سے اس واقعہ کا مطالعہ فرما رہے تھے، انہوں نے بھی یہی کہا کہ:۔

"چیکو سلاویکیا کے اندوہ گیں واقعہ میں ہندوستان اور اس جیسے دور کے ممالک کے لیے ایک ایسا سبق ہے جسکو وہ کبھی نہ بھولیں گے" (ہندوستان ۹ اکتوبر ۳۸ء)

حتے کہ فرینڈس ہاؤس لندن میں تقریر کرتے ہوئے آنریبل مسز وجے لکشمی پنڈت وزیر صحت حکومت یو۔پی نے یہ بھی فرمادیا کہ:۔

"چیکو سلاویکیا کی قسمت کے فیصلے نے ہمارے اس ارادہ کو اور زیادہ پختہ کر دیا ہے کہ ہم اپنا مقصد حاصل کرلیں اور ایک ایسی حکومت سے جسکا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف ہو پوری طرح پر قطع تعلق کرلیں" (ہندوستان ۹ اکتوبر ۳۸ء)

ایک ایسا واقعہ جو سراپا عبرت و موعظت ہو اسکو تفصیل کے بغیر چھوڑ دینا ناظرین کرام پر یقیناً ظلم ہوگا۔ اس واقعہ میں جو چیز ہمارے لیے سبق آموز اور نمونۂ عمل ہے، وہ مسز وجے لکشمی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "ایک ایسی حکومت سے جسکا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف ہو پوری طرح قطع تعلق کر لیا جائے۔" واقعہ یہ ہے کہ اس علاقہ میں چند قومیں سے مختلف قومیں آباد ہیں۔ چیک سلاو اور دیگر قومیں جو وطنی انتسا کے باعث اپنے آپ کو ایک دوسرے سے علیحدہ سمجھتی تھیں ان میں وطن کے سوا اور کوئی اختلاف نہ تھا۔ انکی تہذیب ایک ہے۔ تمدن ایک ہے مذہب ایک ہے۔ نظریات و افکار میں اختلاف کو بہت کم دخل ہے۔ گویا ان میں اختلاف سے زیادہ اتفاق و ائتلاف کے عناصر موجود تھے، اسی بنا پر انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد یہ تجویز کیا کہ ہم سب ملکر ایک "متحدہ قومیت" کی لڑی میں منسلک ہو جائیں چنانچہ ایسا ہوا اور انکا مجموعہ "چیکو سلاویکیا" کے نام سے ظہور میں آیا لیکن بعد کے حالات نے بتلا دیا کہ "متحدہ قومیت" کی تشکیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور اقلیت اور اکثریت کے امتزاج سے جو قومیں ایک قوم میں تحلیل ہونیکی کوشش کرتی ہیں۔ انکو اسکا خمیازہ کس طرح بھگتنا پڑتا ہے

چیکو سلاویکیا کی قوموں کا تمدن اور تہذیب ایک ہے مذہب و مشرب (عیسائیت) ایک ہے، ان میں آپس میں بیاہ شادی کا بھی رواج ہے یہاں تک کہ چیکو سلاویکیا کے کابینہ میں سوڈیٹن جرمنوں کے تین وزیر

بھی شامل تھے اسکے باوجود وہاں نہ تو "متحدہ قومیت" کی تشکیل عمل میں آئی اور نہ جرمن قوم نے اسکے ماتحت رہنا قبول کیا؟ چیکوسلاویکیا نے جرمن اقلیت کی دل داری کی اور انکو وہ تعلیمی سہولتیں بہم پہونچائیں جو خود اصلی باشندوں کو بھی حاصل نہ تھیں تاہم وہاں انقلاب ہوا اور سوڈیٹن جرمنوں نے آزاد ہوکر دم لیا یورپ نے یہ اصول تسلیم کرلیا ہے کہ جس علاقہ میں پچاس فیصدی سے زائد کسی خاص قوم کی آبادی ہو اس قوم کو اپنی حکومت قایم کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اسی اصول کی بنا پر سوڈیٹن جرمنوں کو یہ حق دیا گیا ہے اور وہ اپنی مرضی سے جرمن کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اسی طرح اسی علاقہ کے پولش باشندے پولینڈ سے ملگئے ہیں اور سلاوا قوم اس کوشش میں ہے کہ اس اصول کے ماتحت آزاد ہوجائے اور اپنی حکومت قایم کرلے!

خدا کی شان! ہندوستان کا ہندو ہمیشہ مسلمانوں کو یہ کہہ کر خاموش کردیا کرتا تھا کہ دیکھو یورپ میں اقلیتوں کو اکثریت کے ماتحت رہنا پڑتا ہے، مگر سوڈیٹن جرمنوں کی علیحدگی نے ثابت کردیا کہ جس قلعہ کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا وہ بیت عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور نکلا! بیچارے ہندوؤں کا یہ قلعہ بھی پاش پاش ہوا اب اگر اسی اصول کی بنا پر مسلمان بھی یہ مطالبہ کریں کہ چونکہ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پچاس فیصدی سے زیادہ ہے اس لیے انہیں بھی یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنا وفاق (فیڈریشن) علیحدہ قایم کرلیں اور باقی قومیں اپنا الگ، تو اس مطالبہ کو حق وانصاف کی رو سے کون ناجائز بتا سکتا ہے؟ اگر اس حل کو متفقہ طور پر تسلیم کرلیا جائے اور پچاس فیصدی سے زیادہ آبادی کو یہ حق دیدیا جائے تو تمام بین الملی جھگڑے آن کی آن میں ختم ہوسکتے ہیں مسلم فیڈریشن الگ ہو اور باقی قوموں کا الگ اور پھر ان وفاقوں میں معاہدہ بھی ہوجائے تو اقلیتوں کے مسائل کا فوراً اچھا رہ سکتا ہے۔ مسلمان اپنے صوبوں میں سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں کیونکہ سیاست کو بدلتے دیر نہیں لگتی، بلکہ مذہبی اعتبار سے اقلیتوں کے حقوق کے محافظ ہونگے۔ انکا مذہب آزاد ہوگا۔ انکے معابد آزاد ہونگے اور انکا رداں رواں آزاد ہوگا۔ اگر مسلمان ایسا نہیں کرینگے تو وہ سب سے پہلے اپنے اعمال سے اسلام کو رسوا کرینگے۔ کیونکہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ انصاف و رواداری عدل گستری اور نصفت شعاری کا حکم دیا ہے اگر ہندوؤں کے صوبوں میں مسلم اقلیت کو تکلیف پہونچے تو آبادی کے مبادلہ کی شکل عمل میں آسکتی ہے۔

خوشی کا مقام ہے کہ مسلم فیڈریشن کے قیام کی حمایت میں ایک آواز حیدرآباد دکن سے اٹھی ہے اور ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے اس نظریہ کی تائید کرتے ہوئے اسکو تمام اختلافات کا واحد حل قرار دیا ہے اسی طرح سندھ مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی اسی قسم کی ایک تجویز منظور ہوئی ہے جس میں اتنا اضافہ اور ہے کہ مسلم فیڈریشن کو یہ حق بھی دیا جائے کہ وہ باہر کی اسلامی حکومتوں کو بھی اس میں شامل کرسکیں۔ ہمیں دیگر امور سے صرف نظر کرکے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلامی فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کہاں تک صحیح ہے اور ہندی مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی مفادات کا تحفظ اسکے ذریعہ کہاں تک ہوسکتا ہے؟ ایکطرف ہماری سرزمین میں ہندو ہیں اُن کی اکثریت ہے، انکا قومی ادارہ "انڈین نیشنل کانگرس" ہے، اُن کی اسلام سوز مساعی ہیں اسلامی تہذیب و تمدن کو مٹانیوالا ولولہ ہے، اتحاد اسلامی اور اسلامی تنظیم انکے نزدیک "متحدہ قومیت" کی تشکیل میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، اُردو زبان کو مٹاکر مُردہ زبان سنسکرت کو زندہ کرنا ان کی قومی زندگی کا نصب العین بنگیا ہے۔ "جملہ مذاہب کی سچائی" کے پردہ میں گاندھی جی اسلامی عقائد کی صلابت اور ایمان کی چٹان کو نرم اور کمزور کرنے پر تُلے ہوئے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی اقلیت ہے اُنکے نظریات زندگی اکثریت سے الگ ہیں۔ انکا نصب العین الگ ہے۔ اُنکے معاشی اور معاشرتی زاویہائے نگاہ الگ ہیں اُن کے قلب و دماغ کی ساخت جُداگانہ ہے۔

ان حالات میں اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی پچاس فیصدی سے زیادہ ہے وہاں اُن کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنا علیحدہ وفاق قایم کرلیں اور ان صوبوں کے لیے بھی اسی حق کو تسلیم کریں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے تو اس میں ظلم و سازش کی کون سی بات ہے؟ مسلمان کا نصب العین ہندو کے نصب العین سے بالکل جُدا ہے، مسلمان صرف خدا کی حکومت چاہتا ہے انسانی حکومت انکے نزدیک کفر ہے۔ مسلمان کی سیاست کا مدار صرف "روٹی" نہیں ہے بلکہ وہ مکارم اخلاق اور زندگی کا وہ بلند نظریہ ہے جو ہر زمانہ میں فاروق اعظمؓ جیسا عادل و مُدبر، خالد بن ولیدؓ جیسا شجاع و بہادر اور صلاح الدین جیسا اولوالعزم اور غیرتمند پیدا کرتا رہا ہے، ہندو کا نصب العین صرف "روٹی" ہے، اقلیتوں کا خون چوس کر اپنی زندگی کو برقرار رکھنا اور قومیت کے جغرافیائی تخیل کو نشو و نما دے کر انسانیت کی عظمت کو

خاک میں ملانا ہے۔ ان حقایق کو سامنے رکھ کر اگر ہم مسز وجے لکشمی پنڈت کے الفاظ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کریں کہ

"ایک ایسی حکومت سے جس کا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف ہو پورے طور پر قطع تعلق کر لینا چاہیئے"

تو فرمائیے کہ یہ کون سا جرم عظیم ہے جس کی پاداش میں ہمیں حوالۂ دار و رسن کیے جانے کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

فلسطین میں یوں تو ۱۹۳۱ء سے انقلاب کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں مگر ۱۹۳۷ء سے اس پر جو قیامت توڑی جا رہی ہے وہ بیان سے باہر ہے اور ۱۹۳۸ء میں اب تک کے حالات تو اس قدر دردناک ہیں کہ ان کے تصور سے ہی روح کانپنے لگتی ہے۔ فلسطین کے عربوں کی تباہی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جنین جیسا تاریخی شہر اور اس شہر کا ایک ایک مکان برطانوی فوج نے ڈائنامٹ سے اڑا دیا اور اب وہاں مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کچھ باقی نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کوئٹہ کی طرح کوئی زلزلہ آیا اور پورے شہر کو زیر و زبر کر گیا۔

ان حوادث سے کون سا شریف دل ہے جو متاثر نہ ہو؟ عربوں کا ملک اور ملک میں عربوں اور مسلمانوں کے مذہبی اور تاریخی آثار، عربوں کی اکثریت اور عرب بھی وہ جنہوں نے جنگ عظیم میں برطانیہ کا ساتھ دیا۔ آج کس طرح بارود کے شعلوں سے بھسم کیے جا رہے ہیں۔ عربی ممالک ارض قدس کے حوادث سے سخت متاثر ہیں۔ دنیا کا ہر مسلمان ان پر ماتم سرا ہے۔ فلسطین کے یتیم بچے اور بیوائیں برطانیہ کی جان کو رو رہی ہیں مگر مہذب حکومت، علوم و سائنس کی حکومت، تہذیب انسانیت کا درس دینے والی حکومت زیادہ سے زیادہ سخت ہوتی ہی جا رہی ہے اور یہودیوں کی محبت میں، وہ یہودی جنہوں نے عیسائیوں کے "خداوند" کو سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا تھا۔ برطانیہ نہ صرف اپنے وعدوں کو فراموش کر رہی ہے، بلکہ عقل و نقل کی پابندی سے آزاد ہو کر اس نے بین الاقوامی اخلاق اور آئین حکمرانی کا بھی گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔

• حالات جب نازک سے نازک تر ہوتے گئے تو مصری پارلیمنٹ کے ایک رکن محمد علی علوبہ پاشا نے فلسطین کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا اور دنیا کے مسلم نمائندوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حکومت عراق، حجاز، شام، لبنان، یمن، کے علاوہ مغرب اقصیٰ چین، ہندوستان، اور دیگر ممالک کے نمائندوں نے بھی حصہ لیا۔ کانفرنس میں وہی تجاویز منظور ہوئیں جو حکومتِ

عراق برطانیہ کے سامنے پیش کر چکی ہے۔ یعنی۔

(۱) اعلان بالفور بنیادی طور پر باطل ہے اس کی تنسیخ عمل میں لائی جائے۔

(۲) فلسطین میں ہجرت الیہود کے سلسلہ کو فوراً روک دیا جائے۔

(۳) تجویز تقسیم فلسطین کو قطعی طور پر مسترد کر دیا جائے۔

(۴) فلسطین میں دستوری حکومت قائم کیجائے جسمیں عربوں اور یہودیوں کی آبادی کے تناسب سے ارکان کا انتخاب عمل میں آئے

(۵) فلسطین اور برطانیہ میں دوستانہ معاہدہ منعقد ہو تاکہ انقلاب کی لعنت ختم ہو جائے۔

(۶) سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور ملک بدر لوگوں کو واپس بلایا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ فلسطین کی موجودہ مشکلات کا حل اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ برطانیہ جلد سے جلد اپنی خطرناک پالیسی تبدیل کر کے ان تجاویز کو منظور کر لے۔ ہمیں یقین ہے کہ عربوں کا خون رائگاں نہیں جائیگا اور برطانیہ کو مجبور ہو کر ندامت کے ساتھ ان تجاویز کو منظور کرنا پڑے گا اچھا ہو کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے پہلے ہی قدم میں اسے منظور کر لے۔

مناسب ہوگا اگر ہم اس مقام پر برطانیہ کو چیکوسلاویکیا کے حالیہ انقلاب کا حوالہ دیں کیونکہ اسکے تصفیہ و فیصلہ کا سہرا برطانیہ ہی کے سر ہے۔ چیکوسلاویکیا کے سوڈٹین جرمنوں کو یہ حق دیدیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جس حکومت کے ساتھ چاہیں اپنا الحاق کر لیں۔ چنانچہ انھوں نے جرمنی کے ساتھ اپنا الحاق کر لیا۔ یہ اس لیئے کہ سوڈٹین جرمنوں کی آبادی پچاس فیصدی سے زیادہ تھی۔ اگر برطانیہ کا منہ ایک ہے، دل و دماغ ایک ہے۔ حق و سچائی کا معیار بھی اسکے نزدیک ایک ہی ہے تو عربوں کو بھی یہ حق دیدے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے ملک کا جو فیصلہ چاہیں کر لیں کیونکہ فلسطین میں اب بھی انکی آبادی ۷۵ فیصدی سے زیادہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ عربوں کے لیئے چیکوسلاویکیا کو معیار قرار نہ دیگی۔ کیونکہ سوڈٹین جرمنوں کے متعلق تو ہر ہٹلر نے خود یہ کہا تھا کہ "سوڈٹین فلسطین نیا شد۔ یہاں کے جرمنی فلسطینی عربوں کی طرح بے یار و مددگار نہیں ہیں" مگر فلسطین کے لیئے یہ الفاظ کہنے والا اب تک کوئی پیدا نہیں ہوا لیکن ہمارے نزدیک تہذیب و شائستگی کے بلند بانگ دعاوی سے بہتر یہ ہے کہ برطانیہ ہر ہٹلر کی طرح کسی "مرد غیب" کا انتظار نہ کرے، بلکہ حق و انصاف کی خاطر عربوں کے حقوق تسلیم کر لے

کیونکہ مرد غیب پیدا ہو جانے کے بعد تو نہ انجمن بماند نہ انجمنیری۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ڈاکٹر اشرف صاحب کی تجویز کا، جو ہندی اور ہندوستانی کے قضیہ کے متعلق تھی، جو حشر ہوا اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ کانگریسی ہندوؤں اور کانگریسی وزیروں کی اُردو دشمنی اور سنسکرت نوازی کے متعلق مسلمانوں میں جو شکوک پیدا ہو چکے ہیں وہ بے بنیاد اور بادہوائی نہیں ہیں، بلکہ انکا خطرہ واقعات پر مبنی ہے، ایسے واقعات جنسے کانگرس کے بعض ارکان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ ڈاکٹر اشرف کی تجویز کوئی نئی تجویز نہ تھی، بلکہ کانگرس کی اس پالیسی کا اعادہ تھا جو وہ زبان و تہذیب کے بارے میں بارہا ظاہر کر چکی ہے۔ یعنی یہ کہ "کانگرس ہندوستانی زبان کو جو اردو اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستان کی قومی زبان مانتی ہے" مگر "اشرف" کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کانگریسی ہندوؤں نے جس طرح کانگریس کی "منظور شدہ" پالیسی کی مٹی پلید کی اور جس انداز میں اسکا مذاق اُڑایا وہ نہ صرف افسوسناک ہے، بلکہ اس قابل ہے کہ ہندوستان کا ہر انسان اسپر بار بار غور کرے اور یہ دیکھے کہ کانگریسی ہندو کس طرح مسلم آزاری اور اسلام دشمنی پر تُلا ہوا ہے۔ اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے (جو اتفاق سے جلسہ کے صدر تھے) یہ اعلان بھی فرما دیا تھا کہ ہم اس تجویز سے بالکل متفق ہیں اگر ڈاکٹر اشرف صاحب اسکے دوسرے حصہ کو (جس کا تعلق ہندوستانی بورڈ کے تقرر سے تھا) واپس لیں تو ورکنگ کمیٹی کو اس قرارداد پر کوئی اعتراض نہ ہو گا تاہم کانگرس کے اجارہ داروں نے اصل تجویز کو مسترد کر دیا جسکے صاف معنی یہ ہیں کہ ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور کانگرس کی منظور شدہ پالیسی ایک وقتی چیز ہے جس کو ہندو جذبات کا سیلاب ہر وقت بدل سکتا ہے جب اصل تجویز کانگریسی ہندوؤں کے ہاتھوں ذبح کر دیگئی تو ورکنگ کمیٹی کو ہوش آیا اور اُسنے نہایت ہوشیاری سے یہ قرارداد منظور کی۔

"ورکنگ کمیٹی کو افسوس ہے کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں ہندوستانی زبان کے متعلق ڈاکٹر اشرف کی قرارداد بعض اُلجھنوں کی وجہ سے مسترد ہو گئی لیکن اس قرارداد کے مسترد ہو جانے سے کانگرس کے رویہ پر جسکی وضاحت کانگرس کے دستور العمل میں کیگئی ہے کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

گویا آل انڈیا کانگرس کمیٹی جس اصول سے انحراف کر کے بغاوت کر سکتی ہے ورکنگ کمیٹی اسکا علاج یہ

تجویز کرتی ہے کہ اسے صرف "افسوس" کا اظہار کر دے اور باغیوں سے یہ بھی نہ پوچھے کہ تم نے کانگرس کی جانی بوجھی ہوئی اسکیم سے انحراف کیوں کیا اور کانگرسی ہو کر کانگرس سے کیوں بغاوت اختیار کی ؟

۳۰ ستمبر کو سی پی اسمبلی میں مسٹر ہدایت علیخاں اور خاں صاحب آر آر خاں نے ایک تجویز پیش کی کہ اسمبلی کی منظور شدہ زبانوں میں (جو صرف ہندی اور مرہٹی تک محدود ہیں) اردو کو بھی شامل کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کراچی میں کانگرس نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی حفاظت کریگی اگر کانگرسی چاہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کریں تو انہیں کراچی کے اس ریزولیوشن کو فراموش نہ کرنا چاہئے!

اس کا جو جواب مسٹر مہتہ وزیر مالیات نے دیا، اُسے سنکر حیرت ہو گی۔ آپنے فرمایا:-

"جو لوگ کانگرس کو قومی ادارہ تسلیم نہیں کرتے انہیں کیا حق ہے کہ کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دیں۔ اور کانگرسی حکومت کو اسکی طرف توجہ دلائیں" (ہندوستان ٹائمز یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء)

اس اعلان کے بعد اب چاہئے کہ کانگرس کے اعلان آزادی اور کراچی ریزولیوشن کو اگر آپ کانگرس کے اعلان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو کانگرس کو ہندوستان کا "قومی ادارہ" تسلیم کر لیجئے اور اس میں شامل ہو جائیے اگر آپ شامل نہیں ہوتے تو کانگرس اور کانگرسی حکومتیں روز روشن میں آپکی تہذیب و زبان کو مٹائیں گی آپکے مذہب میں مداخلت کریں گی اور قدم قدم پر آپکے راستہ میں حائل ہونگی اور آپکو چپ چاپ یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑیگا! کانگرس نے کراچی کے اجلاس میں جو تاریخی اعلان کیا تھا وہ اعلان جس کا ہر موقعہ پر حوالہ دیا جاتا ہے اور خود کانگرسی مسلمان اسکے ذریعہ مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش فرمایا کرتے ہیں، وہ اس لئے نہیں تھا کہ کانگرس سے باہر کی اقلیتوں کو اطمینان دلائے کہ انکا مذہب۔ ان کی زبان اور تہذیب محفوظ رہیگی بلکہ اسلئے تھا کہ جو لوگ کانگرس کے سایہ تلے آنے رہیں ان کو یہ تحفہ دیدیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص "متحدہ قومیت" کے تصور کو لیکر کانگرس میں جائیگا اُسکے لئے یہ تحفظات کوئی قیمت نہیں رکھتے اور نہ کانگرس میں داخل ہونے کے بعد مذہب اور زبان کے سوالات کسی کے دماغ کو پریشان کرسکتے ہیں! کاش ! کانگرس بھی مسٹر مہتہ کیطرح اپنے اعلان حقوق میں اس شرط کا اضافہ کر دے تاکہ جو لوگ ابتک اسکے جال میں گرفتار ہیں انپر کانگرس کی طرف سے نہیں، بلکہ ہماری طرف سے اتمام حجت ہو جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مخفی صدر درہم اکبر میں کتنی قربے صدا

پیام اقبال اور قرآن کریم

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی اے ہوم ڈیپارٹمنٹ نئی دہلی)

تمہید:-

باوجودیکہ قرآن کریم میں باعتبار بلاغت ہر وہ حسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیے۔ متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کیگئی ہے کہ قرآن کریم شاعری نہیں۔ رسول اکرم شاعر نہیں:-

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۳۶-۱۹-۷۰

اور ہم نے اُس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی آپکے شایان شان تھی بلکہ یہ تو ایک (فطرت کے بھلائے ہوئے سبق کی) یاد دہانی ہے۔ اور کھلا کھلا قرآن (اور اس کا کام یہ ہے کہ) ہر اس شخص کو جس کے خون میں (زندگی کی تڑپ موجود ہو فطرت کے اٹل قوانین سے) آگاہ کردے اور نہ ماننے والوں پر (اُن کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر) اتمام حجت ہوجائے۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ قرآن کی رُو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایان شان نہ تھی اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ[1] خدائے حی و قیوم کا علم ازلی ہوتا ہے اُس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروق مُردہ میں خون زندگی دوڑا دے۔ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونکدے۔ یہی خصوصیت ہے جسکے لیے نوع انسانی کو قرآن کیطرف دعوت دی جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۸-۲۴

---

[1] وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

اے ماننے والو! اللہ اور اُسکے رسُول کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب وہ تمہیں اُس چیز کیطرف بُلاتا ہے، جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

شعر اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ عام شاعروں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۲۶ / ۲۲۶-۲۲۵

وہ یونہی ادہر اُدہر صحرانوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ اور اُنکے قول و فعل میں۔قلب و زبان میں، کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی

ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزل مقصود ہوگی، زندگی کا کوئی منتہیٰ ہوگا اُس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اُٹھے گا۔ اُس کا رُخ ایک خاص قبلۂ مقصود کیطرف ہوگا، برعکس اسکے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوگا۔ کوئی منزل مقصود متعین نہ ہوگی وہ شتر بے مہار کیطرح جدہر مُنہ اُٹھائے گا چل دیگا۔ کبھی تخیلات کی اس حسین و جمیل وادی میں، کبھی تصورات کے اُس ہولناک اور بھیانک صحرا میں۔ مقصد پیش نظر صرف گرمیٔ سخن ہوگا اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے۔ برعکس اسکے ایک شخص کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ وہ جو اُس قرآن کریم نے متعین کیا ہے جس پر اُسکا ایمان ہے، ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ اپنے جذبات و افکار کو اس چیز کے تابع رکھے جس پر اُسکا ایمان ہے، وہ سوچے تو اُسکی مدد سے، وہ سمجھے تو اُس کی روشنی میں۔ وہ دیکھے تو اُسکے نور سے۔ وہ حقائق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر۔ اور قبول کرے تو اس کو جو اُس کی رو سے قبول کیے جانے کے قابل ہو اور رد کرے تو اُسکو جو اسکے نزدیک مردود ہو۔ اب اگر ایسا مردِ مومن اپنے خیالات کو (جو دراصل قرآنِ پاک ہی کے خیالات ہونگے) زبانِ شعر سے ادا کرے تو یہ شعرا کے اُس زمرے میں آجائے گا۔ جس کا استثنا قرآن کریم نے اس آیت میں فرما دیا ہے جو مذکورہ صدر آیت سے متصل ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۲۶ / ۲۲۷

مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں۔ اعمال صالحہ کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں
اور اپنے آپ کی مدافعت اُسوقت کرتے ہیں جب اُن پر زیادتی کیگئی ہو[ص۱]۔

اقبالؔ اسی زمرہ میں شامل ہے۔ اور شعر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا تھا۔ اُن کی رو سے بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ عالمِ اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا شاعر پیدا نہیں کیا۔

لہٰذا اگر یہ دُرست ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان جذبات و خیالات کی تہ تک پہنچا جائے جن پر اُس کی شاعری کی اساس ہے اور اس سرچشمہ سے واقفیت حاصل کیجائے جو اُسکے تخیلات کا ماخذ ہے تو بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ اقبالؔ کا کلام کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو جو اس زاویۂ نگاہ سے پیغامِ اقبالؔ کو دیکھے گا۔ وہ جہاں ایکطرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک اُڑا کرلے جاتا ہے دوسری طرف یہ بھی دیکھے گا کہ حضرتِ علامہ قرآن کریم کے اہم حقایق اور ادق مسائل کو کس خوبصورتی اور سلاست کے ساتھ ایک شعر میں حل کرکے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی ایک عرصہ تک اقبالؔ کو محض ایک "شاعر" کی حیثیت ہی سے دیکھا اور اُنکے کلام سے محض "شاعری" ہی کا لُطف اُٹھایا لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ کلامِ اقبالؔ کا سرچشمہ کیا ہے تو اسکے بعد ان کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبالؔ کیا کہتا ہے۔ کیوں کہتا ہے، اور کیسے کہتا ہے، اور یہ راز بھی کھُل گیا، کہ وہ کون سی شاعری ہے جسکے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ ہی کرتے ہیں:۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ○ $\frac{۲۶}{۲۲۴}$

اور وہ کون سی جو اُس منزلِ مقصود کے لیئے چراغ راہ کا کام دیتی ہے جس کیطرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسا شاعر جسکے متعلق حضرتِ علامہؒ فرماتے ہیں:۔

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل ؎	ملتے بے شاعرے انبارِ گِل
سوز و مستی نقشبند عالمے است ؎	شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

ص۱ اس حصہ آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایک اسلامی شاعر کو اپنی روش کب کیوں اور کن حالات کے ماتحت بدلنا پڑتی ہے

شعر را مقصود اگر آدم گری است — شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

بہرکیف یہ ہے وہ انداز جس سے میں نے حضرت علامہؒ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے میں نے قرآنِ کریم کو جس نوعیت سے سمجھا ہے اُس کی اجمالی سی کیفیت آپ کو معارف القرآن کے اُن حصوں سے معلوم ہوگئی ہوگی جو اسوقت تک "طلوع اسلام" میں شائع ہو چکے ہیں۔ قرآن فہمی کے اس اسلوب کیطرف میری رہنمائی کرنے میں جن گرانمایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردن تشکر ہمیشہ نگوں سار رہے گی اُن میں حضرت علامہؒ کی ذاتِ گرامی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے، بارہا ایسا ہوا کہ میں قرآن کریم کے کسی مشکل مقام پر جا کر رُک گیا تو حضرت علامہ کے ایک شعر نے ذہن میں ایک ایسی بجلی کی سی چمک پیدا کر دی۔ جس سے صحیح راستہ فوراً نگاہ کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف ایسا بھی اکثر ہوا کہ حضرت علامہ کے کسی شعر کے متعلق کچھ اُلجھاؤ سا پیدا ہوا تو کسی آیتِ قرآنی نے اپنے "بسم" کے اعجاز سے قفل ابہام کو کھول دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ علامہؒ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انھوں نے اس دَور میں جب کہ مسلمان قرآن کریم سے بہت دُور ہو چکے تھے۔ اُنکے سامنے قرآنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعید روحیں اپنے بربطِ ہستی کے تاروں اور اس سازِ الست کے پردوں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگ گئیں، جیسے دامنِ کوہسار کی چاند رات میں دُور سے بانسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ قوم کے نوجوانوں کو مذہب سے چڑھ سی ہو چکی تھی۔ اور مذہب پرست طبقہ اُنکے کھلے ہوئے الحاد اور دہریت کیوجہ سے اُن کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا، حضرتِ علامہؒ نے مذہب کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی رُوح پھر سے اُنکے خون کے ذرّوں میں جذب ہوگئی۔ اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآن کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیے گئے میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو مذہب سے بیگانہ ہی نہیں، بلکہ متنفر ہو چکا ہو لیکن کلامِ اقبالؒ سے اسے کچھ ذوق ہو، اسکے سامنے اگر قرآن کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیا جائے تو وہ اسے ایک جانی پہنچانی ہوئی چیز محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے اس چیز کا نمایاں طور پر تجربہ یومِ اقبال

کی تقریب پر ہوا، جہاں میں نے اپنے مقالہ کا موضوع "پیام اقبال اور قرآن کریم" رکھا تھا۔ میر
تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اجتماع میں یہ خشک موضوع شاید ہی درخورِ التفات سمجھا جائے، لیکن
اُسنے جو فوری اثر وہاں پیدا کیا اور اسکے بعد جو نقوش باقی چھوڑے اس سے مجھ پر یہ حقیقت
گئی کہ حضرت علامہؒ غیر محسوس طور پر نوجوانوں کے طبقہ کو کس قدر قرآن کریم کے قریب لا چکے ہ
صرف اتنا کرنا باقی ہے کہ انہیں یہ بتایا جائے کہ حضرت علامہؒ نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ قرآن ک
ہی کی ترجمانی ہے، اِسی مقصد کے پیش نظر میں نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے، یوم اقبال کی تقریب پر جو
میں نے پڑھا تھا۔ وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اسکے بعد اور عنوانات بھی سامنے آتے جائیں
اس موضوع پر بہت کچھ میں نے لکھ لیا ہے اور ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ سردست یہ "طلوع اس
کے صفحات پر بالاقساط شائع ہوگا۔ اسکے بعد جو اللہ کو منظور۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

مرکزیت
اسلامی نظام کا عروۃ الوثقیٰ

(چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی اے)

طلوع اسلام بابت ماہ اکتوبر میں حضرت مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری مدظلہ کا مضمون "اسلامی نظام" شائع ہوا ہے، وہ صاحبِ نظر مسلمان جو موجودہ عصبیت اسلامیہ میں کوئی کمی محسوس کرتے تھے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ کمی کیا ہے، وہ کون سا عنصر ہے جسکے گم ہو جانے سے ملتِ اسلامیہ ایک جسدِ بے روح بن چکی ہے؟ اُن پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ وہ جس متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں تھے اسکا سراغ حضرت مولانا نے دیدیا ہے۔ چونکہ اسلامی نظام کا جو تصور انہوں نے پیش کیا ہے وہ مسلمانوں کی نگاہوں سے عرصہ بعید سے اوجھل ہو چکا ہے اس لیے شروع شروع میں سطح بین مسلمان اس تصور میں اجنبیت سی محسوس کریں گے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ اس موضوع پر مختلف گوشوں سے اس قدر روشنی ڈالی جائے کہ وہ ایک حقیقت ثابتہ بنکر نگاہوں کے سامنے آجائے اور اس طرح یقین محکم کی شکل میں دل میں جاگزیں ہو جائے، کہ جب تک مسلمان اس بھولی ہوئی داستان کو پھر سے از بر نہیں کر لیتے انکا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، بہتر ہو گا کہ اس سلسلہ میں میرا وہ مضمون بھی پیش نظر رکھ لیا جائے جو جولائی کے پرچہ میں "اجتماعی زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ان تمام مضامین کو ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں سمجھنا چاہیئے۔

معتقدات انسان کی گراں بہا متاع عزیز ہوتے ہیں۔ اور جب وہ ایک مرتبہ دل کی گہرائیوں میں اُتر جائیں تو انکا استیصال بہت مشکل ہو جاتا ہے، خواہ وہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ جب

انسان انہیں اعماقِ قلب سے جدا ہوتے دیکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میری دنیا لٹ رہی ہے، میری عاقبت خراب ہو رہی ہے، حالانکہ ہو سکتا ہے کہ وہی رفقائے محترم جنہیں اس نے دل کے نازک ترین گوشوں میں جانِ مدعا بنا کر بڑی محبت اور تپاک سے چھپا رکھا ہے، بجائے خویش غارتگرِ ایمان و دین اور رہزنِ علم و بصیرت ہوں، پھر چونکہ انسان اپنے معتقدات کو بالعموم وراثت میں پاتا ہے، اس لیے انکا تقدس کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے، وہ بغیر کسی قسم کی تنقیدی نگاہ ڈالنا اپنے آبا و اجداد کی شان میں سوءِ ادبی سمجھتا ہے اور ہر بزرگوں کی اس لاہوتی امانت کو اپنی خوش عقیدگی کے حسین غلاف میں لپیٹ کر آگے منتقل کر دیتا ہے، یونہی غلاف پر غلاف چڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس امانت کی عظمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے کوئی شخص اپنے اندر اتنی جراًت نہیں پاتا کہ ان غلافوں کو اتار کر اپنی آنکھوں سے تو دیکھ لے کہ انکے اندر کیا ہے حتے کہ اگر کوئی "متاعِ ملفوف" کے متعلق اتنا ہی کہہ دے کہ کسی کے سامنے نہ سہی، تنہائی میں کبھی اطمینان تو کر لو کہ یہ ہے کیا! تو اس بات کا تصور اس کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے، لرزشِ قلب سے اسکے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوتا ہے، اسکے پاؤں لڑکھڑانے لگ جاتے ہیں، وہ ڈرتا ہے، کانپتا ہے، اور اس وسوسۂ شیطانی پر اپنے بزرگوں کی روحوں سے معافی مانگتا ہے، انکے سامنے گڑگڑاتا ہے، اور اس گناہ کے کفارہ کے طور پر اس مقدس امانت پر عقیدت کا ایک اور غلاف چڑھا دیتا ہے، جب کوئی پوچھنے والا اسکے اس طرزِ عمل کی صحت کی دلیل طلب کرتا ہے تو اسکے جواب میں وہ صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا، اور انہی کے نقوشِ قدم پر خود چلتے جا رہے ہیں، اور یہ کہہ کر سمجھ لیتا ہے کہ میں نے اپنے برسرِ حق ہونے کی ایک مسکت دلیل پیش کر دی ہے۔ حالانکہ یہ ایک فریب ہوتا ہے، جس میں وہ اپنے آپکو مبتلا رکھتا ہے قرآنِ کریم اس روشِ زندگی کو اندھی تقلید کہتا ہے، کھلی ہوئی گمراہی قرار دیتا ہے اولٰئک کالانعام کہہ کر انسانیت سے گری ہوئی یعنی حیوانیت کی ذہنیت بتاتا ہے، بلکہ بل هم اضل کے اضافہ سے ایسے انسانوں کو حیوانوں سے بھی زیادہ راہ گم کردہ قرار دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی راہ ہے، جو سہولت پسند ہو جاتے ہیں۔ آرام طلب بنجاتے ہیں (مُترفین ۝) اس لیے کہ جس راہ پر آبا و اجداد کو چلتے

دیکھا، اسیر آنکھ بند کر کے چلتے جانا نہایت تن آسانی کا راستہ ہوتا ہے، راہِ تحقیق توڑی جانگدازی اور جگر کاوی کی راہ ہوتی ہے، لیکن قرآنِ کریم اِس کو راہِ تقلید کے برعکس حق واعتدال کی راہ کہہ اور بتاتا ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی بصیرت سے کام لے، دیدۂ اعتبار اور گوش ہوش کو واکرے اور ان کی مدد سے قرآن کریم کی روشنی میں صحیح اور غلط۔ حق، اور باطل، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرتا جائے، اور یوں قلب سلیم کو ایمان خالص اور معتقداتِ صحیحہ کا محفوظ خزانہ بنائے، یہ وہ صراط مستقیم ہے جسکے متعلق قرآن کریم میں بلسان نبوت ارشاد ہے۔ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ۔ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ

(میں اور میری اتباع کرنیوالے خدا کیطرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں)

ان دونوں راستوں کو سامنے رکھیے، اور پھر کبھی رات کی تنہائیوں میں، نیند سے کچھ وقت پہلے، محض خالصتاً لِلّٰہ سوچیے کہ آپ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ کون سی راہ ہے، غالباً آپ یہی کہیں گے کہ ہمیں تو ہمارے دل نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو، وہی حق وعدل کا صراط مستقیم ہے لیکن میں گزارش کروں گا کہ اگر اسکے بعد آپنے کبھی اپنے دل سے اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت محسوس کی، تو اِن اُمور کو پیش نظر رکھ کر سوال کیجئے، جو آئندہ سطور میں آپ کو ملیں۔ وفیھا ایات لقوم یعقلون ٭

آپ تاریخِ اسلام کے اوراق کو قریب ساڑھے تیرہ سو برس پیچھے اُلٹیے، اور دیکھئے کہ وہاں آپ کو کیا نظر آتا ہے، آپ کو ایک اور صرف ایک چیز نظر آئے گی۔ اور وہ یہ کہ نبی اکرم صلعم نے ایک دین پیش کیا جو خدائے واحد کیطرف سے دینِ واحد تھا، جس میں کوئی تضاد نہ تھا، تباین نہ تھا، تخالف نہ تھا، اور اس دین پر عامل ایک جماعت تیار کی جو اُمتِ واحدہ تھی، باہم متحد تھی، اس میں کہیں تشتت نہ تھا، انتشار نہ تھا۔ افتراق نہ تھا تشیع نہ تھا تحزب نہ تھا، ایک گروہ تھا۔ کوئی دوسرا گروہ نہ تھا۔ ایک فرقہ تھا، کوئی دوسرا فرقہ نہ تھا، ایک مسلک تھا، کوئی دوسرا مسلک نہ تھا، ایک راستہ تھا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، ہر ایک کا قدم ایک منزل کیطرف اُٹھتا تھا، اور ہر ایک کا رُخ ایک قبلۂ مقصود کیطرف

رہتا تھا۔ آپ اس منظر کو بنظرِ غائر دیکھئے۔ ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفٰوت۔ اللہ کے اس دینِ فطرت میں کہیں کوئی شکن نظر نہیں آئے گی۔ پھر دیکھئے۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور۔ کیا کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ نہیں! بار بار دیکھئے۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئًا وھو حسیر۔ نگاہ تھک کر آتشیانۂ چشم میں واپس آجائے گی لیکن اس وحدتِ دین اور وحدتِ ملّت میں تفرقہ و اختلاف کا کوئی شائبہ نہیں پائے گی۔ یہ وحدت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں، حتیٰ کہ غیر مسلموں تک کو انکار نہیں، آپ کسی شیعہ سے پوچھئے یا سُنّی سے، مقلد سے پوچھئے یا غیر مقلد سے، حنفی سے پوچھئے یا شافعی سے، ان سب کا ایک اور صرف ایک جواب ہوگا کہ جب نبی اکرمؐ تشریف لے گئے ہیں تو مسلمان ایک فرقہ تھے، اُن کا ایک دین تھا۔ نہ اصول میں کوئی دوسری راہ تھی، نہ فروع میں کوئی دوسرا مسلک تھا۔ نبی اکرمؐ نے ایک ایسی جماعت چھوڑی اور اس جماعت سے تاکیداً کہہ دیا بار بار کہہ دیا کہ دیکھنا! اس وحدت کو شرک میں نہ بدل دینا۔

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔	دیکھنا! کہیں مشرکین میں سے نہ ہوجانا یعنی ان لوگوں میں سے جو (وحدتِ) دین میں تفرقہ اندازی کرتے ہیں اور خود جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے فرقے بناتے ہیں پھر ہر ایک فرقہ اپنے اپنے معتقدات کو صحیح سمجھ کر مطمئن بیٹھا رہتا ہے۔

اب جتنے ورق آپ نے پیچھے اُلٹے تھے اُتنے ہی آگے بڑھ آیئے اور اپنے موجودہ دَور میں پہنچ جایئے پھر نگاہ ڈالیئے اور ڈھونڈیئے، تلاش کیجئے اُس وحدتِ دین کو۔ اس وحدتِ ملت کو۔ اُس ایک مسلک کو اور اُس مسلک پر چلنے والی ایک جماعت کو کہیں اُس کا نشان بھی ملتا ہے؟ چھوڑیئے اس حدیث الم کو کہ اس تیرہ سو برس میں یہ کیسے ہوگیا لیکن دیکھئے صرف اس کو کہ یہ کیا ہوگیا؟ کیا دین اپنی موجودہ شکل میں وہی دین ہے، جو نبی اکرمؐ نے چھوڑا تھا؟ کیا ملتِ اسلامیہ، اپنی موجودہ صورت میں وہی ملت ہے، جس کی تشکیل حضورؐ نے فرمائی تھی؟ کیا وہ قوم جس کو وَلَا تکونوا من المشرکین

دیکھنا مشرکین میں سے نہ ہو جانا، کی تنبیہ کی گئی ہے، اُس کی یہی ہیئت ہونی چاہیئے تھی! کہاں ہے وہ دین جس کو نبی اکرمؐ نے ھٰذا صراطی مستقیما قرار دیکر فاتبعوہ کا حکم دیا تھا، (یعنی یہ ہے میرا سیدھا راستہ، بس اسی ایک راستہ کی اتباع کرنا) اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۱۵۴/۶ کے انتباہ سے یہ بتادیا کہ اگر بہت سے راستے اختیار کرلوگے تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دینگے۔

ایک چیز تو واضح ہے کہ جب دین ایک تھا، راستہ ایک تھا۔ جماعت ایک تھی، تو آج کہنے کو بہتر، لیکن حقیقت کے اعتبار سے بہتر سو راستوں میں سے ہر ایک راستہ تو سیدھا راستہ نہیں ہوسکتا۔

آپ کا دل شاید آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرادے کہ جس راستے پر میں ہوں، یہ وہ راستہ ہے جو نبی اکرمؐ نے بتایا تھا اور اسکے علاوہ باقی راستے وہ ہیں جو بعد کی پیداوار ہیں۔ ہاں! یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیجئے لیکن اس کا کیا علاج کہ عین اسی وقت آپ کے کمرہ سے ملحق دوسرے کمرہ میں آپکے مسلک سے جداگانہ مسلک کا حامل، ایک دوسرا مسلمان (مثلاً آپ مقلد ہیں تو غیر مقلد) یہی کچھ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے رہا ہے، کہ جس راستہ پر میں ہوں، وہی راستہ حق واعتدال کا ہے دوسروں کی راہ نجات وسعادت کی راہ نہیں ہے، آپ کہہ دینگے کہ وہ غلط کہتا ہے، وہ کہہ دے گا کہ آپ غلط کہتے ہیں۔ اور کہہ دیگا "کیا ہر دفعہ یہی ہوتا ہے"، اور یہ وہی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون ہر فرقہ اپنے آپ کو صراط مستقیم پر سمجھ کر مگن ہو رہتا ہے۔

تو کیا اس کو مان لیا جائے کہ آپ بھی صحیح کہتے ہیں اور وہ بھی صحیح کہتا ہے! اور اس طرح ان سینکڑوں مختلف سمتوں کی طرف جانیوالے راستے سب صراط مستقیم ہیں، اس کو تو نہ آپ تسلیم کریں گے نہ کوئی اور۔

اس سوال کو ذرا اور آگے بڑھایئے اور مسئلہ کو من حیث الاسلام دیکھیے۔ یعنی دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان ایک مذہب سے منسلک ہیں، جسے اسلام کہتے ہیں، اس مذہب کی حالت یہ ہے کہ اسکے اندر سینکڑوں فرقے موجود ہیں۔ کیا یہ مذہب وہی ہوسکتا ہے، جو نبی اکرمؐ نے اُمت کو دیا تھا، کہ جسکے اندر کہیں اختلاف نہ تھا، کوئی فرقہ نہ تھا۔

یعنی ایسا مذہب جس میں کوئی اختلاف نہ ہو، کوئی فرقہ نہ ہو، بلکہ فرقہ سازی شرک ہو۔ وہ بھی اسلام

اور

ایسا مذہب جس میں سینکڑوں فرقے اور ہزاروں اختلافات ہوں — وہ بھی اسلام۔

اس تعددِ فرق کے خلفشار کا شاید آپ صحیح اندازہ نہ لگا سکیں، اس کے متعلق کسی نو مسلم سے پوچھیے۔ ایک شخص مثلاً ہندو ہے، وہ کفر پر ہے، اس راستہ پر ہے جو جہنم کیطرف لے جانیوالا ہے، اُسے آپ اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے، لامحالہ وہ مسلمانوں کے اس فرقہ میں داخل ہوگا جو آپ کا ہوگا۔ لیکن یہاں پہنچکر وہ دیکھتا ہے کہ ایک دوسرے فرقہ کا مسلمان اُسے کہتا ہے کہ ناجی فرقہ تو ہمارا ہے، یہ تم کہاں آپھنسے؟ یہیں تک نہیں، بلکہ وہ اِس فرقہ کے خلاف تکفیر کے فتاویٰ بھی دکھا دیتا ہے، وہ نو مسلم حیران ہے کہ کفر کو چھوڑ کر اسلام لایا، جہنم سے بچنے کے لیے آباء و اجداد کا مسلک چھوڑا، لیکن بایں ہمہ وہ کفر کا لیبل اب بھی میرے ساتھ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہنم سے بھی نجات نہیں ملیگی۔ وہ دوسرے فرقہ میں جاتا ہے تو یہی کچھ آپ کہنے لگتے ہیں۔

کہیے! وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟

آپ کہیں گے کہ اسلام تو نام ہے اطاعت خدا اور رسول کا، لہٰذا جب میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر رہا ہوں تو صحیح مذہب پر ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کے کمرے سے ملحقہ کمرے والا مسلمان جو دوسرے فرقے سے متعلق ہے بعینہٖ یہی کچھ کر رہا ہے اور کون سا فرقہ ایسا ہے کہ "خدا اور رسول کی اطاعت" اُس کا دعویٰ نہیں آپ کہہ دینگے کہ اس کا فیصلہ کچھ زیادہ مشکل نہیں، خدا اور رسول کی اطاعت کا معیار ہمارے پاس کتاب اللہ اور احادیثِ مقدسہ موجود ہیں اُن پر پرکھ کر دیکھ لیا جائیگا کہ کس کا دعویٰ صحیح ہے لیکن آپ کے مدِمقابل فریقِ ثانی کا بھی تو یہی دعویٰ ہے! اگر اس مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ دیا جائے، جسے منکرینِ حدیث یا چکڑالوی کہا جاتا ہے تو باقی سب مسلمان تو یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ اطاعتِ خدا اور رسول کے دعوے کو کتاب و سنت پر پرکھ کر دیکھ لو۔ لیکن ان دعاوی کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑے اختلافات کو چھوڑیے آپ صدیوں سے اس معمولی سے اختلاف کا بھی فیصلہ نہیں کر سکے، کہ نماز میں آمین بلند آواز سے کہنی چاہیئے یا

آہستہ، حالانکہ فریقین کے علماء کے سامنے قرآن کریم بھی ہوتا ہے اور احادیثِ مقدسہ بھی۔ اور اگر اس کے ساتھ اجماع کے معیار کو بھی شامل کرنا چاہیں تو دونوں فریق مختلف تاویلات سے اس امر کے بھی مدعی ہوتے ہیں کہ اجماع اُنکے ساتھ ہے۔

جب حالت یہ ہے تو پوچھئے اپنے دل سے کہ اس کا فیصلہ کس طرح سے کیا جائے کہ کون سا مسلک "اطاعتِ خدا و رسول" کے مطابق ہے یہاں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ سمجھ لیجئے کہ آپ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان نہ دے لیں کہ جس مسلک سے آپ متمسک ہیں، وہی مسلک درست ہے اور اس لیئے درست ہے کہ آپ کو آبا و اجداد سے وراثت میں ملا ہے، کیا وہی بصیرت جس پر قرآن کریم نے دعوت الی اللہ کی بنیاد رکھی تھی، اس کا تقاضا نہیں کہ آپ علم و ایقان کے ساتھ مطمئن ہو جائیں کہ وہ کون سی راہ تھی جو نبی اکرمؐ امت کو دیکر گئے تھے اگر آپ اس قسم کے اطمینان کی ضرورت سمجھتے ہیں تو پھر سلسلۂ سخن یوں آگے بڑھے گا کہ یہ معلوم کیجیے ہو کہ وہ راہ کون سی تھی اور گاڑی کہاں سے اپنی صحیح پٹڑی چھوڑ کر دوسرے رخ پر چل پڑی تھی۔

ایک چیز تو مسلمانوں میں آج بھی ایسی موجود ہے جسکے متفقہ علیہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں، اور وہ ہے قرآنِ کریم، ہر مسلمان اس کا قائل ہے، غیر مسلم قائل ہیں، خود خدا اسکا شاہد ہے کہ قرآن کریم حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبی اکرمؐ کی وساطت سے امت کو ملا تھا۔ اور یہ وہی قرآنِ کریم ہے جو "اطاعتِ خدا و رسول" کے دعوے کو پرکھنے کے لیئے ہمارے مختلف فرقوں کے پاس موجود ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کے باوجود ہمارے اختلافات نہیں مٹتے تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کا ہونا بھی ضروری ہے، جس کی مدد سے امت کو وہ راستہ مل سکتا ہے، جو انکے لیئے قرآن کریم متعین کرتا ہے اور جسے نبی اکرمؐ قرآن کریم کے ساتھ چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے، اور جو آج موجود نہیں ہے اور جسکے فقدان سے ہماری حالت یہ ہو رہی ہے۔

وہ چیز کیا تھی؟ بس یہی گم گشتہ کڑی جسکے مل جانے سے یہ بکھری ہوئی زنجیر پھر سے حبل المتین بن جائے گی۔

یہ گم گشتہ کڑی ہے وہ جماعت جسے نبی اکرمؐ مرتب فرما کر تشریف لے گئے تھے، جو کتاب اللہ کی

وارثؔ تھی جو قوانینِ الٰہیہ کو اِس دُنیا میں نافذ کرنے والی تھی جو کنتم خیر امۃ کی مخاطب تھی۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر جسکا فریضہ تھا، جسے اُمۃ وسطیٰ کا لقب دیا گیا تھا، جسکے تمکن فی الارض سے دین کا قیام تھا، یہ وہ جماعت تھی جو چلتی پھرتی قرآن تھی جیتی جاگتی قرآن تھی۔ کتاب اللہ حروف ونقوش میں لکھی ہوئی تعلیم تھی، یہ جماعت اس تعلیم کی پیکرِ ناطق تھی، یہ عین مشیتِ ایزدی کے ماتحت خود رسالتمآب کے مقدس ہاتھوں سے تیار ہوئی تھی اور تیار اس لیے کی گئی تھی کہ دُنیا کو بتا دیا جائے کہ معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم اسے کہتے ہیں، بابِ نبوت کو اس لیے بند کر دیا گیا تھا کہ خدا کا آخری پیغام۔ اپنی مکمل اور محفوظ شکل میں دنیا کے پاس موجود تھا اور اس پیغام کی حامل ایک ایسی جماعت تھی جو ہر مشکل مقام پر اِس نورِ مبین کی روشنی میں نوعِ انسانی کی راہ نمائی کرسکے اس جماعت میں جو اتقیٰ (سب سے زیادہ متقی) ہوتا تھا وہ اکرم (سب سے زیادہ قابلِ عزت) ہونے کی حیثیت سے مرکز ہوتا تھا اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (اُن کے معاملات باہمی مشوروں سے طے پائیں گے) کے ماتحت اس جماعت کے منتخب افراد اس مرکز کے اعیان و ارکان ہوتے تھے، اور اس نظام کے ماتحت یہ مرکز اس امر کا فیصلہ کرتا تھا کہ "خدا و رسول کی اطاعت" کسے کہتے ہیں۔ چونکہ مرکز ایک تھا۔ اس لیے اسکا فیصلہ بھی ایک ہوتا تھا، لہٰذا دین کی حامل جماعت ایک تھی جماعت کا مسلک ایک تھا۔

زیادہ وضاحت سے اسے یوں سمجھیے کہ مسلمانوں کے لیے خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت جائز نہیں (ان الحکم الا للہ۔ حکومت صرف اللہ ہی کے لیے ہے)، لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شخص سے براہِ راست باتیں نہیں کرتا، اس لئے یہ بتانے کیلئے کہ اللہ کی اطاعت کس طرح کی جاتی ہے اُسنے رسولِ اکرمؐ کی وساطت سے اپنی کتاب نازل فرما دی۔ لہٰذا کتاب اللہ کی اطاعت عینِ اطاعتِ خدا ہوگئی (اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ؕ جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اُس کی پیروی کرو اور اُسکے سوا کسی کو کارساز اطاعت نہ کرو) لیکن کتاب پھر ایک حد تک غیر محسوس راہ ہدایت ہوتی ہے اس لئے

ؔ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا ۳۵/۳۲ پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے (اس مقصد کے لیے) منتخب کرلیا۔

اطاعتِ خداوندی کے مفہوم کو محسوس شکل میں پیش کرنے کے لئے رسول کی وساطت سے کتاب بھیجی جاتی ہے جو اپنے اعمال طیبہ سے دکہاتا ہے کہ اطاعتِ کتاب یعنی اطاعتِ خدا کا صحیح مفہوم کیا ہے لہذا رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہوجاتی ہے ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ ؕ جنے رسول کی اطاعت کی اُسنے اللہ کی اطاعت کی، رسول اللہ ؐ کے بعد کتاب تو موجود رہی لیکن کتاب کی تعلیم کو محسوس و مرئی شکل میں پیش کرنیوالا کون تہا؟ یہ تھے خلیفۃ الرسول (رسول کے جانشین) خدا اور رسول کی اطاعت اب خلیفۃ الرسول کی اطاعت میں منتقل ہوگئی، مرکز ملت کی اطاعت ہوگئی، نبی اکرم ؐ کی تشریف بری کے بعد حضرت صدیق اکبر ؓ کے فیصلوں کی اطاعت، خدا و رسول کی اطاعت تھی۔ اور ان سے انحراف خدا و رسول کی اطاعت سے انحراف تہا. یہ تہا صحیح مفہوم "اطاعت خدا و رسول" کا کہ جس مفہوم کے بعد کسی تفرقہ اندازی، افتراق انگیزی کی گنجائش نہ تھی، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت صدیق اکبر ؓ کے عہد میں جب مسلمانوں کے ایک قبیلہ نے زکوٰۃ کے مسلک میں مرکز کے مسلک سے اختلاف کیا تو آپ نے انکے خلاف جہاد کا اعلان کردیا، اور صحابہ کبار نے اس فیصلہ کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کی طرح کی۔ جب تک یہ شکل قایم رہی خدا اور رسول کی صحیح اطاعت ہوتی رہی، دین کی وحدت قایم رہی، جماعت کی یکجہتی قایم رہی لیکن یہ دَور سعادت جلد ختم ہوگیا، خلافت ملوکیت میں بدل گئی حکومت نے اپنا فریضہ انتظام سلطنت سمجھ لیا حالانکہ سلطنت ان کو ملی ہی اس لیئے تھی کہ وہ قوانین الٰہیہ نفاذ کرتے رہیں اور یوں خدا اور رسول کی اطاعت کا سلسلہ آگے بڑہاتے رہیں، شروع شروع میں تو اتنا ہوا کہ امورِ سلطنت کے متعلق معاملات حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے لیکن امورِ دین کے متعلق معاملات افراد پر چھوڑ دیئے۔ یہ وہ منحوس دن تہا جب سب سے پہلے اسلام میں دین اور دُنیا (Church and State) کی تفریق شروع ہوئی، جب اجتماعیت کی جگہ یوں انفرادیت آگئی تو اطاعتِ خدا و رسول کا مفہوم بھی بدل گیا، ایک نے کسی معاملہ کو ایک طرح سمجھا اُسنے اسی کو اطاعتِ خدا و رسول قرار دے دیا۔ دوسرے نے اس سے مختلف سمجھا، وہ بھی اطاعت خدا اور رسول سمجھا گیا۔ کچھ لوگ اسکے ہم خیال ہوگئے کچھ اُسکے، یوں فرقہ بندی کی ابتدا ہوئی، جب تک سلطنت باقی تھی۔ امورِ دُنیا کے متعلق ہی سہی۔ کچھ نہ کچھ اجتماعیت کی شکل باقی تھی۔ جب سلطنت مٹ گئی تو

یہ رہی سہی اجتماعیت بھی ختم ہوگئی۔ اب ہر شئے میں انفرادیت آگئی اور یوں خدا و رسول کی اطاعت کا مفہوم مختلف دماغوں کے قالب میں ڈہل کر مختلف شکلیں اختیار کرگیا۔ مرکز ٹوٹا، جماعت منتشر ہوگئی، دین افراد کی آراء کے تابع چلنے لگا، اور کثرتِ تعبیرات خواب پریشاں تر ہوتا چلا گیا جب تک مرکز قائم تہا اور صحیح شکل میں قائم تہا تو وہی ایک ٹکسال تھی جہاں کے مضروب سکہ کا چلن بازار میں ہوتا تھا وہ ٹکسال ٹوٹ گئی تو گھر گھر ٹکسال بن گئی اور ہر ٹکسال والوں کا یہ دعوے ہوگیا کہ ہمارا سکہ اصلی ہے۔ دوسروں کا جعلی ہے، یہ کام مرکز کا تھا کہ وہ متعین کرے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کی تفسیر کیا ہے، حدیث کون سی صحیح ہے اور کون سی ضعیف، فقہ کا فلاں مسئلہ کس وقت تک نافذ العمل رہے گا، یہی وجہ ہے کہ اس دورِ سعادت میں نہ کوئی تفسیر لکھی گئی نہ احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے۔ نہ فقہ کی تدوین ہوئی، جب مرکزیت ٹوٹ گئی یا اپنے فریضۂ الٰہی سے غافل ہوگئی تو امت پریشان تھی کہ اب کس طرح معلوم کرے کہ فلاں معاملہ میں ارشادِ خداوندی کا منشا کیا ہے اور اس منشائے ایزدی پر عمل کس طرح سے ہوگا۔ اس ضرورت کے ماتحت انفرادی طور پر قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئیں، احادیث کے صحیح و ضعیف ہونے کے معیار تجویز ہوئے فقہی مسائل کی ترجیح و تنسیخ کے متعلق بحثیں چھڑ گئیں، خدانخواستہ ہمارا مقصد اس سے یہ نہیں کہ ان حضرات نے فرقہ بندی کے خیال سے ایسا کیا۔ نہیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ جماعت کے انتشار اور مرکز کے فنا ہوجانے کے بعد جب انفرادیت آگئی تو اس انفرادیت کا فطری نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تہا۔ اس میں کسی کی نیت کا کوئی دخل نہ تہا، نیتیں کتنی ہی نیک ہوں۔ مقاصد کتنے ہی پاکیزہ ہوں، وحدتِ مرکز کے ٹوٹ جانے سے اطاعت خدا و رسولؐ کے یہ مختلف مفہوم پیدا ہوجانے ضروری تھے، کتاب اللہ موجود تھی، سیرتِ مقدسہؐ کے آثار و نظائر بھی موجود تھے۔ لیکن وہ جماعت اور جماعت کا وہ مرکز موجود نہ تہا جو کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلہ کیا کرتا تہا کہ فلاں معاملہ میں مسلمانوں کے لیے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح ہوگی یا فلاں اختلافی مسئلہ میں نقطۂ اعتدال کون سا ہے، جب وہاں سے فیصلہ مل جاتا تو کسی شخص کو یہ حق نہ رہتا کہ وہ اپنے طور پر جس طرح جی چاہے، "خدا و رسول کی اطاعت" کرے۔ تھے کہ اس باب میں وہ اس قدر محتاط ہوتے تھے کہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالتے تھے جو اس مفہوم اطاعت

کے خلاف ہو جو مرکز نے متعین کیا ہے حضرت امام اعظمؒ کی عظمت سے کون واقف نہیں اور فقہی امور میں
ان کے اجتہاد سے کسے انکار ہے لیکن حالت یہ تھی کہ چونکہ شہر میں مفتی ایک اور صاحب تھے جو سلطنت کی طرف سے
متعین تھے۔ اسلیئے لوگ انفرادی طور پر بھی دریافت کرتے تو آپ کبھی فتوےٰ نہ دیتے حتیٰ کہ ایک دن گھر
میں بیٹھے تھے، لڑکی نے پوچھا کہ ابا جان میں روزہ سے ہوں اور دانتوں سے خون نکل کر حلق میں چلا
گیا ہے، روزہ ٹوٹ گیا یا نہیں؟ آپنے فرمایا کہ "بیٹا! میں نہیں بتانا چاہتا، کیونکہ میں گورنر کی طرف سے
فتوےٰ دینے کا مجاز نہیں ٹھیرا گیا" لیکن امام کے نہ رہنے سے جو حالت پیدا ہوگئی اس کا اندازہ آپ خود
لگا لیجیئے کہ آج کوئی بھی اپنے آپ کو "امام اعظم" سے کم نہیں سمجھتا۔ اس مرکزِ ثقل کے نہ ہونے سے تمام ذرے
منتشر ہو رہے ہیں، اس شیرازہ کے ٹوٹ جانے سے کتابِ ملتِ بیضا کے تمام اوراق بکھرے پڑے ہیں
قرآن کریم، احادیث مقدسہ، فقہ، تفسیر، تاریخ کی تمام کتابیں موجود ہیں لیکن اُمت کا ایک ادنےٰ سا اختلاف
بھی نہیں مٹ سکتا، اس لیئے کہ اگر صرف کتابوں سے رستے متعین ہو جایا کرتے تو کتابوں کے احکام کو نافذ
کرنے والے رسولوں کی ضرورت ہی نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسول بھیجنے کی ضرورت خود اس پر دلالت کرتی
ہے کہ جب تک کتاب نافذ العمل ہے اس وقت تک رسولؐ کے جانشین کی بھی ضرورت ہے، اور چونکہ قرآن کریم
قیامت تک کے لیئے نافذ العمل ہے اس لیئے قیامت تک کے لیئے رسولؐ کے جانشین یعنی مرکزِ ملت، امامِ
قوم کی ضرورت ہے، کوئی زمانہ اس سے خالی نہیں رہ سکتا قرنِ اولیٰ میں "خلافتِ رسولؐ" کا جیتا جاگتا
تصور اس درخشندگی اور تابناکی سے نگاہوں کے سامنے تھا کہ ہر چند مرکز کو گم ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں
لیکن اس کے دُھندلے نقوش ابھی تک دلوں میں باقی ہیں، نماز کا امام ابھی تک "جانشینِ رسولؐ" کہلاتا ہے
خطبہ کے منبر کو ابھی تک منبرِ رسولؐ کہتے ہیں، کل تک ترکوں کی ملوکیت اپنی مسخ شدہ صورت میں بھی "خلافت"
ہی کہلاتی تھی لیکن چونکہ یہ صرف الفاظ تھے جو ایک مدت سے اپنے اصلی معنی کھو چکے تھے۔ لاشیں تھیں
جن سے ایک عرصہ ہوا روحیں پرواز کر چکی تھیں اس لیئے مضطرب قلوب کو ان میں کہیں سکونِ طمانیت
کے سامان نہیں ملتے تھے۔ اس صحیح نظام کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے سے مسلمان اسلام
کے مستقبل سے کس طرح مایوس ہونے شروع ہوگئے، اس کا اندازہ آپ کو بہائیت اور مرزائیت کی

تحریکوں سے لگ سکتا ہے۔ ایک نے یہ اعلان کر دیا کہ قرآنِ کریم قیامت تک کے لیے نافذ العمل نہیں ہو سکتا کیونکہ اب وہ (نعوذ باللہ) ایک ایسا درخت ہو چکا ہے جو مزید پھل نہیں دے سکتا۔ دوسرے نے دعوے کر دیا کہ نبوتِ محمدیہ قیامت تک کے لیے جاری نہیں رہ سکتی کیونکہ اس سراجِ منیر کی روشنی (نعوذ باللہ) اب ایک اور قندیل کی محتاج ہو چکی ہے۔ آپ کبھی تصور میں بھی لا سکتے ہیں، اگر یہ آواز اس عہدِ سعادت میں جس میں صحیح اسلامی نظام قائم تھا کہیں تحت الثریٰ کے نیچے سے بھی پیدا ہوتی تو مسلمان اس کو برداشت کر لیتا؟ اس لیے نہیں کہ ان کا "تعصب" (نعوذ باللہ) انہیں اجازت نہ دیتا کہ وہ اسے سُن لیں، بلکہ اس لیے کہ وہ شجرِ طیب جس کی جڑیں قلبِ زمین سے نم کش تھیں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی تھیں، جس کا مبارک بیج عالمِ ملکوت سے آیا تھا اور جو اس ذاتِ گرامیؐ کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا جو وجۂ شادابی کائنات ہے اور جسے قدوسیوں کی اس جماعت نے اپنے خون سے سینچا تھا، جنکے گھوڑوں کی سموں کی گرد کو خدائے بزرگ و برتر انسانیت کی چشمِ بصیرت کے لیے شہادتِ ایقانی کا نورانی سرمہ قرار دیتا ہے وہ مبارک درخت جو انہیں جھولیاں بھر بھر کر تر و تازہ پھل دیتا تھا، ایسے پھل کہ جن سے وہ قوت پیدا ہوتی تھی، جس سے زمانے کی تقدیریں ان کے ہاتھ میں آگئی تھیں، وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا تصور کر سکتے تھے کہ یہ مقدس درخت کبھی خشک بھی ہو سکتا ہے؟ آج مسلمان کے سامنے چونکہ وہ نظام موجود نہیں، جو یہ بتاتا کہ پیغامِ قرآنی اور نبوتِ محمدیؐ کس طرح ابدیت سے ہمکنار ہے، اس لیے وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو لفظی مناظروں اور نظری مباحثوں سے قائل کرنا چاہتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح اُن سے پہلے اور اختلافات نہیں مٹ سکے، یہ اختلافات بھی بڑھتے جاتے ہیں ان کو بھی چھوڑیئے آج دوسرے مسلمان جو کبھی اس دروازے پر جھولی پھیلائے نظر آتے ہیں کبھی اُس سنگِ آستان پر جبہ سائی کرتے۔ آج ایک کی اقتدار میں فلاح و بہبود کا راز مضمر سمجھتے ہیں۔ کل دوسرے کی۔ یہ سب مسلمان وہ ہیں جو گو زبان سے اقرار نہ کریں لیکن دل سے اسلام کے مستقبل سے (معاذ اللہ) مایوس ہو چکے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کو وہی کچھ سمجھے ہوئے ہیں، جیسا کچھ وہ انہیں اس دورِ تشتت و افتراق میں دکھائی دیتا ہے ان کی نگاہوں کے سامنے اسلام کا صحیح نظام اجتماعیت اور مرکزیت اجاگر ہو جائے، تو پھر دیکھیے کہ یہ مایوسیاں

کس طرح اُمیدوں میں بدل جاتی ہیں۔ اور تذبذب کس طرح ایمانِ محکم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ نظام اس درجہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے کہ سرسری نگاہ سے سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ پھر اگر کوئی سمجھاتا ہے تو "ستر فیس" کا گروہ اُس کی مخالفت شروع کر دیتا ہے کوئی سمجھتا بھی ہے، تو چونکہ اس کو فوراً عمل میں لانے کے لئے راستے میں مشکلات دیکھتا ہے اس لئے اس کی تن آسانیاں اُسے پھر آرام طلبی کے راستے کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ بغرضیکہ مسلمان ایک ایسے گرداب میں گھرا ہوا ہے کہ ہزار ہاتھ پاؤں مارے وہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ ان مصائب سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے کہ بلاخوف لومۃ لائم، قرآن کریم کے اس اسلامی نظام کو، اطاعت خدا و رسول کے اس صحیح مفہوم کو مسلمانوں کے سامنے بے نقاب کر دیا جائے اس شدت اور تکرار سے اُسے بار بار سامنے لایا جائے کہ اُس کی کہربائی شعاعوں سے انفرادیت کے شرانگیز جراثیم فنا ہو جائیں۔ اور جن حضرات کے سامنے یہ تصور اپنی صحیح شکل میں آ جائے۔ وہ اسکے عملی قیام میں تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں، پھر دیکھیں کہ اللہ کی نصرت کس طرح انکے شاملِ حال ہوتی ہے۔ یہ نظام قائم ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ بات بہائیوں اور مرزائیوں کی سمجھ میں خود بخود آ جاتی ہے کہ واقعی بیام خداوندی اور نبوتِ محمدیؐ قیامت تک کے لیے زندہ رہ دو ہیں، پھر دیکھئے کہ مارکس اور لینن کس طرح اس نظریہ کو بغیر سمجھائے سمجھ لیتے ہیں کہ ایمان کی بنیادوں پر قائم شدہ مساوات۔ روٹی کی مساوات سے کس درجہ بلند و بالاتر ہے۔ پھر دیکھئے کہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر عالمگیر سچائیاں ماننے والے کس طرح اس سچائی کے قائل ہوتے ہیں کہ سچائیاں اب صرف قرآن کریم کے ہی اندر ہیں پھر سمجھ میں آ جائے گا کہ نوعِ انسانی کی نجات وسعادت کیوں اپنی اعمال کے اندر پوشیدہ ہے۔ جو شریعت محمدیہ نے متعین کیے ہیں۔ پھر معلوم ہو گا کہ اعمال کے نتائج ہونے کے لیے کیوں اُس قسم کے ایمان کی ضرورت ہے جو کتاب اللہ نے تجویز کیا ہے! یہ وہ نظام ہو گا جو اسلام کی حقانیت کی زندہ دلیل ہو گا اور یہ وہ جماعت ہو گی جس کا وجود خدا کی ہستی کی برہانِ نیرہ ہو گی۔ اُسوقت سمجھ میں آ جائے گا کہ حضرت علامہؒ نے یہ کیوں کہا تھا کہ۔

انا الحق جز مقام کبریا نیست | سزائے او چلیپا ہست یا نیست ؟
اگر فردے بگویش سرزنش بہ | اگر قومے بگوید ، ناروا نیست

اب یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دین کی وحدت کس طرح سے عمل میں آئی تھی۔ اور کس طرح اُسے قایم رہنا تھا۔ لہٰذا اگر ہم آج بھی چاہیں کہ وہ متاعِ گم گشتہ ہمیں پھر سے ملجائے، وہ لُٹی ہوئی دولتیں وہ چھنی ہوئی عظمتیں پھر لوٹ آئیں، تو اُسکے لیے نظری بحثیں اور لفظی مناظرے کوئی کام نہ دینگے، ہم جہاں سے بھٹوے تھے اور بھول کر اصل راستہ چھوڑا تھا، پھر وہیں پہنچنا ہوگا (کہ توبہ کے یہی معنی ہیں) اور وہاں سے پھر وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ جو سیدھا راستہ تھا جو صراطِ مستقیم تھا، اگر آپ چاہیں کہ جس غلط راستے پر ایک دفعہ چل نکلے ہیں، کوئی صورت ایسی پیدا ہوجائے کہ اُسی پر چلتے جائیں اور منزل پر پہنچ جائیں تو یہ فریبِ نفس ہے، دہوکا ہے۔ جھوٹا اطمنان ہے۔ غلط اقدام سے آپ چلتے ضرور رہینگے لیکن ہر قدم آپ کو منزل سے دُور لے جائے گا، اولٰئک حبطت اعمالھم ایسے ہی مقامات کے لیئے آیا ہے۔ کہ کام کیا جاتا ہے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ قدم اُٹھتے ہیں لیکن مسافت طے نہیں ہوتی، لہٰذا اس طویل مدت میں جو کچھ ہوچکا اُسے بھول جایئے، گاڑی کو پھر وہیں لے جایئے، جہاں سے اس کا کانٹا بدل گیا تھا اور یہ دوسری پٹڑی پر چل نکلی تھی، وہاں پہنچکر آپ کو معلوم ہوگا کہ سیدھا راستہ کونسا ہے۔ قرآن کریم تو آپ کے پاس محفوظ و مصئون شکل میں موجود ہے۔ دوسری چیز اُسکے ساتھ جماعت اور جماعت میں نصبِ امامت، قیامِ مرکزیت پھر وہ پیدا ہوجائے، تو تمہاری خاک کے ذروں میں نمودِ حیات محسوس ہونے لگے۔ یہ اُجڑے ہوئے کاشانے پھر سے آباد ہوجائیں، بھولے ہوئے مسافر پھر سے منزل کیطرف رُخ کرلیں، پھر سے ہماری نمازیں اور ہمارے روزے، ہمارے حج، اور ہماری زکوٰۃ اللہ کے لیئے ہوجائیں، اور پھر اُن سے وہ نتائج پیدا ہونے لگ جائیں جو قرنِ اُولٰی میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ یاد رکھیئے ایمان اور اعمالِ صالحہ اگر صحیح اسلامی نظام کے ماتحت وجود پذیر ہوں تو ان کا فطری نتیجہ قوت اور اقتدار ہے، جس سے تمکن فی الارض حاصل ہوتا ہے اور یہی تمکن اس جماعتِ الٰہیہ کے استحکام و استقرار کا موجب اور اُسکے مرکزی فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ بنتا ہے۔ آپ شاید کہہ دیں کہ آج جب کہ ملّتِ اسلامیہ میں اس قدر اختلافات پیدا ہوچکے

ہیں۔ وہ جماعت اور اس کا مرکز کس طرح سے فیصلہ کرے گا کہ وہ دین حقیقی کون سا تھا جو نبی اکرمؐ امت کو دیکر گئے تھے لیکن یہ مشکل صرف آج حوصلہ شکن نظر آتی ہے، جماعت کا وجود عمل میں آجائے تو یہ مشکل، مشکل رہتی ہی نہیں۔ اندھیرے کی تو فطرت ہے کہ چراغ آجائے تو وہ خود بخود مٹ جائے۔ دین کی بنیاد قرآن پر ہے اور وہ ہمارے پاس موجود ہے، فروعات کی ترتیب کے لیے ایک عظیم القدر علمی سرمایہ ہمارے پاس وراثتاً چلا آرہا ہے۔ جس سے اگر استنادًا فائدہ اٹھایا جائے تو اس میں بہت سی کام کی چیزیں مل جائیں گی۔ آج اس ڈھیر سے غث وثمین کا الگ کرنا دشوار ہے۔ کہ الگ کرنے والے پہلے ہی ایک خاص چشمہ لگا کر تلاش شروع کرتے ہیں، جب جماعت روحِ قرآنی سے واقف ہو جائے تو اُسکے لیے ڈھیرے کام کی چیزوں کا چن لینا دشوار نہیں ہوتا تفسیرِ قرآن۔ تعدیلِ احادیث۔ تدوینِ فقہ اس جماعت کا کام ہوگا نہ کہ افراد کا، اس جماعت کے فیصلے مرکزِ ملت کی مُہر سے مصدق ہو کر نافذ ہونگے جو اُمت کے لیے واجب العمل ہونگے اور اُن کی اطاعت "خدا اور رسول کی اطاعت" ہوگی۔ جن فیصلوں پر مرکز کی مہر نہ ہوگی ان کی دینی حیثیت کچھ نہیں ہوگی۔ اس طرح تفریق۔ جو انفرادیت کے شجرِ ممنوعہ کا تلخ ترین ثمر ہے۔ مٹ جائے گی۔ اور اس کی جگہ وحدتِ جو اجتماعیت کے نخلِ طیب کا برِ شیریں ہے پیدا ہو جائے گی اور وہی دین جو اللہ تعالےٰ نے نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک باقی رہنے کے لیے پسند فرمایا تھا اپنی عملی شکل میں رائج ہو جائے گا۔ اور لیظہرہ علی الدین کلّہٖ تمام ادیان پر غلبہ کی بشارت کے ماتحت تمام کائنات کو محیط ہو جائے گا کہ اسلام کا شجرِ طیب شرق وغرب کے امتیازات سے ناآشنا اور اس کا بحرِ مواج کوہ ودمن کے جغرافیائی حدود وقیود سے آزاد ہے۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب نبی اکرمؐ کے تشریف لے جانے کے بعد خدا اور رسول کی اطاعت آپؐ کے جانشین (یعنی مرکزِ ملت) کی اطاعت میں منتقل ہوگئی تو کیا اس مرکزِ ملت کو یہ اختیارات حاصل ہونگے کہ وہ اپنے وقتی مصالح کے پیشِ نظر تمام معاملات میں ردّ و بدل کر سکے، یا ایسے اُمور بھی ہونگے جن میں وہ تغیر وتبدل کا مجاز نہ ہوگا؟

یہ سوال بھی اس لیئے پیدا ہوتا ہے کہ ہماری نگاہوں سے اسلامی نظام اوجھل ہو چکا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور کے جانشین، دین کے ان معاملات میں جو ناقابلِ تغیر ہیں کسی قسم کے ردّ و بدل کرنے کا خیال تک بھی دل میں لا سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بیعت خلافت کے بعد، سب سے پہلے خطبہ میں اپنی پوزیشن کو ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ "انی متبع ولست بمبتدع" میں تو اتباع کرنے والا ہوں نہ کہ دین کے معاملہ میں نئی نئی باتیں پیدا کرنے والا۔ اور اسی طرح بعد کے خلفائے راشدینؓ اپنے پیشرو خلفا کی متابعت کا اعلان کرتے رہے لیکن اس چیز کا فیصلہ کہ کن اُمور میں اتباع واجب ہے اور کن اُمور میں مرکزِ ملت تبدیلی کا مجاز ہے مرکزِ ملت ہی کر سکتا ہے۔ مگر افرادِ ملت، افراد کے لیئے تو مرکز کی اطاعت ہی خدا و رسول کی اطاعت ہو گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا تو یہی فرمایا تھا کہ جب تک ہر وہ شے جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں بیت المال میں داخل کی جاتی تھی، داخل نہ کی جائے گی اس وقت تک میں جہاد سے باز نہ آؤں گا۔ چنانچہ اس وقت اس فیصلہ کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت تھی لیکن اس کے بعد جب حضرت عثمانؓ نے اجازت فرما دی کہ زکوٰۃ کا روپیہ مرکزی بیت المال میں جمع کرنے کے بجائے اپنی مقامی ضروریات کے صرف میں بھی لایا جا سکتا ہے تو ہر چند یہ طریقِ عمل نبی اکرمؐ اور حضراتِ شیخین کے زمانہ کے طریقِ عمل کے خلاف تھا۔ لیکن افرادِ ملت کے لیئے اس کی اطاعت بھی خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔ اس لیئے کہ جب صحیح اسلامی نظام قائم ہو۔ امامت کے بہترین منتخبہ افراد کے اجتماع سے مجلسِ مشاورت عمل میں آئی ہو۔ اور ان میں سے بہترین تقویٰ شعار مومنِ قانت انکا امام ہو، قرآن کریم کا حضر راہ اور نبی اکرمؐ سے لے کر اپنے وقت تک کے تمام پیش رو خلفا کے فیصلے اُنکے سامنے ہوں تو انکے لیئے اس امر کا فیصلہ کچھ مشکل نہیں ہو گا کہ کون سا مسئلہ ایسا ہے جس میں وہ کسی تغیر و تبدل کے مجاز نہیں اور کونسے ایسے امور ہیں جن میں وہ تبدیلی کر سکتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ طوافِ کعبہ اور سعی بین الصفا والمروہ میں مسلمانوں کو اکڑ کر چلنا چاہیئے۔ حضور کے بعد حضرت عمرؓ نے اس حکم کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ وہ مصالح جنکے ماتحت وہ حکم دیا گیا تھا اب باقی نہیں رہے۔ اس لیئے اس حکم کی تعمیل بھی ضروری نہیں رہی۔ اسی طرح نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں نمازِ جمعہ کے لیئے صرف ایک اذان دی جاتی تھی،

لیکن حضرت عثمانؓ نے ایک اذان اور بڑھا دی مختصراً یہ کہ جب جماعت روحِ دین سے واقف اور غوامض شریعت کی مزاج شناس ہوجائے تو وہ آسانی سے فیصلہ کرسکتی ہے کہ کہاں رُکنا ہے اور کہاں بڑھنا ہے یہ فریضہ تمام مرکزِ ملت کا، لیکن جب سے اس قسم کے فیصلے افراد کے ہاتھ میں آگئے، دین کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ اور اب باوجود ادعائے اطاعتِ خدا و رسول یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ "اطاعتِ خدا و رسول" ٹھیک ٹھیک کہاں ہورہی ہے۔ اس کا تعین مرکزِ ملت کا کام ہوگا۔

میں جانتا ہوں کہ کورانہ تقلید کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں آپ کو اس طرف آنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی، عقیدتمندی کا غلط مفہوم بھی عناں گیر ہوگا۔ گوناگوں وساوس کے کانٹے بھی دامن سے اُلجھیں گے، جمود اور تعطل کے سنگ گراں راستہ کو روکیں گے لیکن میں آپ سے اتنی گزارش کرونگا کہ آپ ایک مرتبہ ان چیزوں سے خالی الذہن ہوکر سوچیں کہ جس افتراق و انتشار میں مسلمان آج مبتلا ہیں۔ کیا اسلام کا منشا یہی تھا؟ اگر نہیں! تو کیا آپ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا کہ اسلام کو پھر سے اُس کی اصلی شکل میں رائج کرنے کی کوشش کریں۔ آج جتنی کوششیں ہورہی ہیں، اپنے اپنے فرقہ کو "اصلی اسلام" قرار دے کر اسی فرقہ کی ترویج و اشاعت میں ہورہی ہیں اور یوں مختلف فرقوں کی دیواریں مضبوط ہوکر وحدتِ اسلامی کے ٹکڑے کررہی ہیں، یہ دیواریں گرجائیں تو دشتِ حجاز سے اُٹھے ہوئے دین کی وحدت پھر سے قایم ہوجائے۔ ان دیواروں کی تخریب سے آپ کے لیئے گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں۔ اِس لیئے کہ ہوسکتا ہے کہ جس فرقہ سے آپ منسک ہیں، جماعت کی تشکیل کے بعد یہ متحقق ہوجائے کہ اسی فرقہ کا مسلک اصلی اسلام ہے۔ اُس صورت میں آپ کی موجودہ روش کو مرکز کی سند حاصل ہوجائیگی۔ اور اگر وہ مسلک غلط ثابت ہوگیا تو آپ ضلالت کی راہ سے بچکر صراطِ مستقیم پر آجائیں گے، وہ وقت ایسا ہوگا لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ جو زندہ رکھنے کے قابل ہوگا، وہ علیٰ وجہ البصیرت رکھا جائیگا اور جو مٹا دینے کے قابل ہوگا وہ علےٰ البصیرت مٹا دیا جائے گا۔ اور کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ جس راستہ پر آپ چل رہے ہیں اُسے نہایت دیانتداری سے دین کا صراطِ مستقیم سمجھ رہے ہیں، حقیقت کھل جانے پر معلوم ہو کہ وہی راستہ آپکی ہلاکت اور بربادی کے ص

حقایق و عبر

(راآزی)

(۱) الکفر ملۃ واحدۃ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ط وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ ط

اے جماعت مسلمین! اپنے لوگوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ہمراز (دوست) نہ بناؤ، وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے جس بات سے تمہیں نقصان پہونچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ ان کی دشمنی دیکھو تو انکے مُنہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیکن جو کچھ انکے دل میں چھپا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

ہمارے قومیت پرست حضرات کا عروۃ الوثقےٰ یہ دلیل ہوتی ہے کہ ہم تمام باتوں کو بالائے طاق رکھ کر ہندی قومیت کی تعمیر میں اس لیے منہمک ہیں کہ اس طرح انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا اور جب ہندوستان اسکے ہاتھ سے چھن جائے گا تو اسلامی ممالک سے اسکی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اسکے متعلق ہم شروع سے کہہ رہے ہیں کہ اول تو ہندو کسی صورت میں انگریز کو ہندوستان سے نکالنا نہیں چاہتا وہ اپنے دھن اور دولت کی چوکیداری کے لیئے اس کا یہاں رکھنا نہایت ضروری سمجھتا ہے اور اگر انگریز ہندوستان سے چلا بھی جائے تو ہندو خارجی تعلقات میں انگریز جیسی قوت سے کبھی بگاڑ پیدا نہیں کرے گا۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت یعنی اکثریت اپنی خارجی پالیسی کو ہمیشہ انگریز کی پالیسی کے ساتھ وابستہ رکھے گی۔ ہمارے اس خیال کو تنگ نظری، تعصب، ٹوڈیت، رجعت پسندی اور خدا واسطے کی بدظنی پر محمول کیا جاتا تھا

اور یہ کہہ کر فریب دینے کی کوشش کی جاتی تھی کہ ہندو انگریز کا دشمن اور مسلمان کا دوست ہے لیکن اس دعوے سے ہنوز فضا کی لہریں متحرک ہیں کہ پراگ (Prague) سے پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک بیان شائع ہو گیا جسکے دوران میں انھوں نے کہا کہ "انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ٹربیون ۱۹) اسپر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہمارے قومیت پرست مسلم حضرات کیطرف سے اس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا اور وہ کہہ بھی کس طرح سکتے ہیں کہ متحدہ قومیت کے جزو مغلوب ہونے کی حیثیت سے انکا مسلک وہی ہوگا جو شریک غالب کا ہوگا، ہم پوچھتے ہیں ان حضرات سے کہ کیا اسلام بھی اس مسلک کی اجازت دیتا ہے، اگر متوقع جنگ میں۔ جسکے بادل یورپ کی سیاسی فضا کو یوں تاریک کیے ہوئے ہیں، کوئی اسلامی سلطنت انگلستان کے خلاف ہوئی تو کیا آپ بھی اس اسلامی حکومت کے خلاف ہونگے۔ کیا کفار سے دوستی اور مسلمانوں سے دشمنی کے بعد بھی کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کا مستحق سمجھتا ہے؟ کفار سے دوستی کے متعلق کیا قرآن کریم کا ارشاد گرامی کسی کی نگاہ سے نہیں گزرا کہ:۔ من یتولھم منکم فانہٗ منھم۔ ۵/۵۱ جو تم میں سے ان کی دوستی اختیار کرے گا، تو وہ انہی میں سے ہو جائے گا۔" اور ایسا کرنے والوں میں سے خدا کے اس غضب اور عتاب سے کسی کے قلب میں لرزش پیدا نہیں ہوئی، جو قرآن کریم کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ومن یفعل ذٰلک فلیس من اللہ فی شئ۔ ۳/۲۸ کہ جو ایسا کریگا اس کا اللہ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا!

یہ ہیں متحدہ قومیت کے ثمرات!! یہ حضرات قرآن کریم کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور نہیں ڈرتے لیکن قرآن کریم اپنی صداقت کا اقرار خود کفار کے منہ سے کرا لیتا ہے۔ فبای حدیث بعدہٗ یومنون۔

---

(۲) وہی مرجی وہی عنتری

فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا وَيَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ۔ ۲۸/۴

فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی ہے، اور اہل ملک کو جماعتوں میں تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، اور اس طرح ایک جماعت کو کمزور بنا دیا ہے

استبدادی حکومتوں کے پاس اپنے استحکام کے لیے سب سے زیادہ مؤثر حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعتِ مخالف کو کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیتیں، ان میں پارٹی بازی، گروہ سازی کے جراثیم غیر محسوس طور پر داخل کر دیے جاتے ہیں اور ان کی اجتماعی قوت کو حوالۂ گرد و باد کر دیا جاتا ہے۔ انگریز کو ہندوستان میں مسلمان سے خطرہ تھا اس لیے کہ یہی قوم مائدۂ حکومت کی لذت چشیدہ تھی، ہندو تو غلامی کا خوگر ہو چکا تھا اس لیے انگریز نے ہمیشہ بساطِ سیاست پر ایسی چالیں چلیں جن سے مسلمان ایک نقطہ پر مجتمع نہ ہو سکیں، اب حکومت ہندوؤں کے ہاتھیں منتقل ہو رہی ہے اور اُنکے سامنے بھی وہی حکمت عملی ہے جو انھوں نے انگریز سے سیکھی ہے، انھوں نے شروع سے ہی ایسا طریق عمل اختیار کر رکھا ہے کہ مسلمان ایک جماعت نبکر نہ رہیں، جو مسلمان اپنی جداگانہ تنظیم کا خیال اپنے دل میں لیے ہو، وہ ہندوؤں کے نزدیک گردن زدنی ہے چنانچہ انھوں نے اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے "متحدہ قومیت" کا نظر فریب حربہ تیار کیا ہے، ان کے پاس ابھی اتنی قوت تو نہیں کہ جو مسلمان اس دامِ فریب میں نہ آسکے اُسے حوالۂ دار و رسن کر دیں لیکن وہ اسے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے، اُنھوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ آزادی پسند، حریت پرست۔ صرف وہی ہو سکتا ہے جو اپنی تنظیم کے خیال کو حماقت سمجھے اور متحدہ قومیت کا جزو نبکر رہے، اپنی تنظیم کرنے والوں کو وہ ٹوڈی، رجعت پسند، سامراج پرست، آزادی کے دشمن، غلامی کے خوگر، انگریز کے کاسہ لیس اور نہ معلوم کون کون سے ذلیل القابوں سے مشہور کرتے ہیں، پھر جس طرح انگریز نے خود محکوم قوم سے کچھ لوگ اپنے ساتھ ملا رکھے تھے اسی طرح ہندو بھی اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب ہو رہے ہیں، اور چند مسلمانوں کو اپنے ہم نوا بنا کر بھائی کو بھائی سے لڑا رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ جس طرح شروع شروع میں بعض مسلمان نیک نیتی سے "برکاتِ عہدِ انگلشیہ" کے قصائد پڑھتے تھے، آج بھی کچھ مسلمان نیک نیتی سے ہی حصول آزادی کے دامِ ہمرنگ زمیں میں گرفتار ہوئے ہوں، لیکن قوم کے حق میں نتیجہ دونوں کا ایک ہے، انھوں نے انگریز کی غلامی کی زنجیریں مضبوط کیں، یہ ہندوؤں کی غلامی کے جال

ے حلقے کس رہے ہیں، پھر جس طرح انگریز نے یہ خیال عام کر دیا تھا کہ جو لوگ اُسکے مقرب ہوں وہی اپنو
ں معزز اور مکرم ہوتے ہیں۔ اسی طرح آج ہندوؤں نے بھی پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ جو ہندو قومیت
اجزو بنکے رہے، وہی باعزت اور "رئیس الاحرار" ہے، انگریز سے الگ رہنے والا اُسوقت معتوب اور
قہور تھا۔ ہندو سے الگ رہنے والا آج ذلیل و خوار سمجھا جاتا ہے۔

---

(۳) مسلمان کا نصب العین

کانگریس سے الگ رہ کر اپنی تنظیم کرنے والے مسلمانوں کو انگریز پرست کہا جاتا ہے، کیا ہم دریافت
سکتے ہیں کہ حصولِ آزادی کا دعوے اور شرکت کانگرس لازم و ملزوم کیوں ہیں۔ کیا کسی جماعت کے لیے
ندوؤں سے الگ رہ کر حصولِ آزادی کی تمنا کرنا جرم ہے! کیا مسلمان اپنی تنظیم کرکے من حیث الجماعت
ندوؤں کے ساتھ حصولِ آزادی میں اشتراکِ عمل نہیں کرسکتے؟ مسلمان تو کرسکتے ہیں اور ہر وقت کرنے پر
ادہ ہیں، لیکن ہندو اس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ مسلمان کسی طرح بھی منظم ہو جائیں، وہ اپنی
رست کی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہیں آیئے ہم بتائیں کہ حصولِ آزادی
متعلق کتاب و سُنت کی رُو سے مسلمانوں کا مسلک کیا ہو سکتا ہے یہ وہ مسلک ہے جسکے ہم مُدعی ہیں۔ اور
وجہ البصیرت مُدعی ہیں کہ:۔

(۱) غلامی خدا کا عذاب ہے، اس کی لعنت ہے مسلمان اور غلام دو متضاد چیزیں ہیں

(۲) مسلمان کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ وہ اس حکومتِ الٰہیہ کو قائم کرے جو قرآن کریم
کے ضابطۂ خداوندی نے متشکل کی ہے۔

(۳) اگر وہ ایسی حکومت قایم نہیں کرسکتا تو وہ غلام کا غلام ہے، خواہ وہ انگریز کی دستوری
ملوکیت ہو، یا ہندوستان کی جمہوریت۔

لہٰذا سیاست ہند میں مسلمانوں کے سامنے ایک اور صرف ایک نصب العین ہوسکتا ہے اور وہ یہ
ان کو یہاں اسلامی حکومت قایم کرنی ہے کم از کم ان صوبوں میں جہاں اُن کی اکثریت ہے کہ

ان کے نزدیک حکومت صرف خدا کے لئے زیبا ہے کسی انسان کو حکومت کا حق نہیں پہنچتا۔ اور خدا کی حکومت قرآن کریم کے ذریعہ سے ایسی قوم کے ہاتھوں سے نصب ہو سکتی ہے جو قرآن کریم کی وارث ہے یہ نہ "ہماری" حکومت ہوگی نہ کسی اور کی بلکہ حکومت صرف خدا کی ہوگی۔ اس حکومتِ خداوندی کے اندر جس قدر غیر مسلم باشندے ہونگے مسلمان خدا کا سپاہی، انکے جان، مال، عزت، مذہب ہر شے کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔ اور ان کے ساتھ انسانیت کا اعلیٰ ترین سلوک کیا جائیگا۔

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور ہماری نگاہ ان متبسم چہروں پر ہے جو اس ادعا کو "جنون" قرار دیکر ایک حقارت آمیز ہنسی سے اس کا استقبال کر رہے ہیں، یہ بے شک ایک "جنون" ہے۔ لیکن وہی جنون جسے کہیں عشق کہا گیا ہے اور کہیں اس کا نام ایمان رکھا گیا ہے۔ اس جنون کی اصل وہی جذبہ ہے جسنے کبھی کلدانیوں کی آتشِ تمرد کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو لالہ زار بنا کر دکھایا تھا۔ اور کبھی قید خانہ کی تیرہ و تار کوٹھری کو عزیزِ مصر کے قصرِ شاہی سے زیادہ راحت بخش بنایا تھا۔ اسکے خلاف استحقار اور استخفاف کی جس ہنسی کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، وہ اس قبیل کی ہنسی ہے جو ان چہروں پر نمایاں ہوا کرتی ہے جن کی نگاہیں اپنے ماحول اور اسکے پیش پا افتادہ مادی اسباب و ذرائع سے آگے نہیں بڑھ سکتیں چشمِ فلک اس قسم کی ہنسی اور ہنسنے والوں کا انجام ہزاروں مرتبہ دیکھ چکی ہے۔ یہ وہی ہنسی ہے جو اس وقت پیدا ہوئی تھی، جب ایک کمزور اور شکستہ کشتی کو بسم اللہ مجریہا و مرسہا کہہ کر طوفانِ بلاانگیز کے سپرد کیا گیا تھا اور بڑے بڑے مادی اسباب والوں کو للکارا گیا تھا کہ تمہارے سامان کسی کام نہیں آئیں گے ساحلِ مقصود پر یہی چند شکستہ تختے پہونچیں گے۔ یہ وہی ہنسی ہے جو نیل کی وادیوں میں قومِ مغلوب کے ایک بکریاں چرانے والے[ع] کے اس الٹی میٹم پر فرعون اور ہامان کے چہروں پر نمودار ہوئی تھی۔ جس میں اسنے کہا تھا کہ یہ تمام لشکر اور اس کا ساز و سامان غرق ہو جائیگا اور اس حکومت و سلطنت کی وارث یہ بیکس و ناتواں قوم ہوگی۔ یہ وہی ہنسی ہے جو ناصریہ کی گلیوں میں چیتھڑے پہنے ہوئے، محکوم قوم کے، بظاہر بے یار و مددگار انسان[ع] کے اس دعوے پر پیدا ہوئی کہ وہ زمین و آسمان کی بادشاہت قائم کرنے کے لئے آیا ہے۔ ہاں! اور یہ وہی ہنسی ہے جو دامن فاران کے اُن جبابرہ کا برکے چہرے پر زہرخند بکر

چمکی تھی، جو یہ سنتے تھے کہ ایک نادار، تیمم بادیہ نشین، قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں اپنے ان مغلوک الحال فاقہ زدہ ساتھیوں کے قدموں میں بتاتا ہے جن کی گزران کھجوروں کی گٹھلیوں پر ہوتی ہے یہی ہنسی ہے جو آج ہراس آواز کا استقبال کرتی ہے جو یہ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین، اپنے صوبوں میں حکومتِ الٰہیہ کا قایم کرنا ہے، وہ ہنستے ہیں کہ :۔

ذرّۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

لیکن یہ ہنسی صرف انہی چہروں پر ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں اور اس لیے کبھی خداوندان لنڈن کے خوانِ کرم کی زلہ چینی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی آنندبھون کے دیوتاؤں سے بھکشا مانگتے نظر آتے ہیں، یہ وہ ہیں جنہیں نہ اپنے خدا پر بھروسہ باقی ہے نہ اُسکے آخری پیغام کے وعدوں پر، یہ وہ ہیں جو اس حقیقت سے ناآشنا ہو چکے ہیں کہ ۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ وہ ہیں جن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ تین سو تیرہ نفوس پر مشتمل ایک مٹھی بھر جماعت، اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں ہاتھ میں لیکر کفارِ عرب کی متحدہ قوتوں کو ریگِ بیاباں کی طرح منتشر کرسکتی ہے، ان ہنسنے والے مسلمان حضرات سے اتنا پوچھنا چاہیے کہ جو نصب العین ہم نے پیش کیا ہے وہ صحیح اسلامی نصب العین ہے یا نہیں! اگر ہے تو کیا انہیں خدا کے اس وعدے پر بھی یقین ہے یا نہیں کہ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ "یاد رکھو کامیابی صرف خدا کی جماعت کے لیے ہے،، اور اگر اس پر بھی ان کا ایمان ہے تو پھر اس حزب اللہ کی تشکیل و تعمیر میں تمام قوتیں صرف کرنا صحیح مسلک ہوگا جو حکومتِ الٰہیہ کے نصب و قیام کا ذریعہ ہو، یا کفر و اسلام کے باہمی امتزاج سے ایک ایسی جماعت کی تخلیق جس کا تصور تک غیر قرآنی ہے اور جس کا مطمح نظر ایک ایسی جمہوریت قایم کرنا ہے جس میں اکثریت بہر حیث غیر مسلموں کی ہوگی۔ اور اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریگے، سوچیے کہ مسلمانوں کے لیے وہ کونسی راہ ہے جو خدا و رسول کی تجویز فرمودہ ہے اور وہ کون سی جو ہندوں نے اپنی مصلحت کی خاطر انکے لیے تجویز کر رکھی ہے۔

کہیے ان قومیت پرست مسلم حضرات سے کہ وہ اس اسلامی نصب العین کا اعلان کر دیں اور پھر دیکھیں کہ وہ شمعِ آزادی کے پروانے ہوتے ہوئے ہندوؤں کے نزدیک "محب الوطن اور حریت پسند" قرار پاتے ہیں یا ایسے ہی "ٹوڈی اور انگریز پرست" جیسے آج وہ مسلمان ہیں جو اپنی تنظیم کو مقدم سمجھتے ہیں ۔ ان فیھا بصائر لقوم یعقلون ۔

---

(۴) سیاست مغرب

جب جاپان نے چین پر بمباری شروع کی تو انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین نے ۲۱ جون ۱۹۳۸ء کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

یقین مانیے کہ اگر چین کا ملک ہم سے اتنی دُور نہ ہوتا اور جو واقعات وہاں رونما ہو رہے ہیں وہ اس بُعد کی وجہ سے یوں ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہ ہوتے۔ تو میرا خیال ہے کہ ان ہولناک مناظر کے احساس سے ہمدردی، خوف اور نفرت کے جو جذبات ہماری قوم کے دل میں موجزن ہوتے وہ ہمیں ایک ایسی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے جو ابھی تک ہمارے تصور میں نہیں آئی...... بین الاقوامی قوانین کی رُو سے ہوائی جنگ کے لیے کم از کم تین اصول ایسے ہیں جن کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا سب سے پہلے یہ کہ شہری (Civil) آبادی پر بمباری کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا دوسرے یہ کہ جن چیزوں پر بم پھینکے جائیں انکے متعلق حتمی طور پر معلوم ہو کہ وہ فوجی (حربی) شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے یہ کہ اُن پر بمباری کرنے میں بھی غایت احتیاط سے کام لیا جائے"

یہ نظریہ اُسوقت پیدا ہوتا ہے جب بم پھینکنے والی قوم سے سیاسی مخالفت ہو، اور اس قوم کے خلاف نفرت پیدا کرنا اپنے لیے مفید مطلب ۔لیکن جب بم پھینکنے والا خود انگریز ہو اور بمباری سرحدی قبائل کی آبادی پر کیجائے ۔ اور محولہ صدر بین الاقوامی قوانین کو توڑ کر تھوڑے سے عرصہ میں سات ہزار بم گرائے جا چکے ہوں (تقریر مسٹر عبدالقیوم ، لیجسلیٹو اسمبلی ، مورخہ ۱۶ فروری) تو کسی چیمبرلین کے سینہ میں مظلوم

سے ہمدردی، اور ظالم سے نفرت کے جذبات موجزن نہیں ہوتے۔

یہ ہے سیاستِ مغرب کا وہ اصولِ عدل و انصاف جسے آج دُنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔

---

(۵) ہاتھی کے دانت . . . .

(۱) پنڈت جواہرلال نہرو نے نواب محمد اسمٰعیل خاں کو اپنی چٹھی مؤرخہ ۲۸/۳ میں لکھا تھا:۔

"آپ نے کہا ہے کہ کانگریس نے مسلم رابطۂ عمومی (Mass Contact) کی تحریک کو مسلم لیگ کے خلاف چلنج کے طور پر جاری کیا ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے"

آپنے تردید ملاحظہ فرمالی۔ اب حقیقت ملاحظہ فرمایئے بمبئی صوبہ کانگریس کمیٹی میں مسٹر موسانی نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں انہوں نے کہا:

"مسٹر جناح نے اپنی خط وکتابت میں جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم لیگ کے توسط سے ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کرنا بالکل بیکار ہے کیونکہ ہر ایسا معاہدہ جو مسلم لیگ کے نزدیک قابل قبول ہوگا، یقیناً قومیت پرستی، اور جمہوریت کے اصول کے منافی ہوگا بمبئی صوبائی کانگریس کمیٹی اُمید کرتی ہے کہ کانگریس صلح کی گفت وشنید کے سلسلہ کو بند کر کے مسلمانوں کے عوام کو کانگریس کے حلقہ بگوش بنانے میں اپنی کوششوں کو دوچند کر دے گی" (ہندوستان ٹائمز۔ مؤرخہ ۲۸/۸/۲)

اور اس پر پنڈت جی اعلان فرما رہے ہیں کہ یہ خیال باطل ہے کہ کانگریس نے مسلم رابطۂ عمومی کی تحریک کو مسلم لیگ کے علی الرغم جاری کیا ہے، گلہ پنڈت جی پر نہیں کہ جس سیاست میں خدا کا تصور نہ ہو وہاں اس قسم کے تضاد سب جائز ہیں۔ گلہ تو ان "خدا پرستوں" پر ہے، جو قوم کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہندو کے کسی طرزِ عمل کو شبہ کی نگاہ سے نہ دیکھو۔

(ب) اسی قسم کے تضاد کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

پنڈت جی نواب صاحب موصوف کو اپنی چٹھی مورخہ ۱۲/۳ ۲۶ میں تحریر فرماتے ہیں

"یہ بات کسی کے لئے زیبا نہیں کہ وہ یہ کہے کہ وہ مسلمان جو کانگریس کی حمایت کرتے ہیں انہیں کانگریس کسی قسم کی مالی امداد دیتی ہے" (ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۷/۳۸ ۴)

یہ دعوے تھا، اب اس کی حقیقت ملاحظہ فرمائیے:-

"سٹی کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس زیر صدارت پنڈت بال کرشن شرما منعقد ہوا جس میں کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کا اخبار "انصاف" چونکہ کانگریس کی پالیسی یعنی مسلم رابطۂ عمومی کی تحریک کی حمایت کرتا ہے، اس لئے اسے دس روپیہ فی ہفتہ کے حساب سے مدد دی جائے"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۹/۳۸ ۱۲)

معلوم نہیں کانگریس نے اس خبر کی اشاعت پر اس سٹی کانگریس کمیٹی کا کیا حشر کیا ہوگا؟ کہ اس قسم کے راز بول طشت از بام کرنے کے لئے تھوڑے ہوتے ہیں!!

(۲) مذہب اور سیاست

ہم شروع سے اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ کانگریس کی منظم سازش یہ ہے کہ کسی طرح یہ بات مسلمان نوجوانوں کے ذہن نشین کرا دی جائے کہ سیاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ مذہب ہمیشہ انسانی ترقی کے راستے میں مزاحم ہوتا ہے اس لئے انسانیت کی فلاح ہر اس تحریک میں ہے جس سے مذہب کو الگ رکھا جائے، سابقہ پرچہ میں آپ مسٹر ولابھائی ڈیسائی کی تقریر کے اقتباسات ملاحظہ فرما چکے ہیں اس دفعہ دو ایک مثالیں اور دیکھئے۔ آنریبل مسٹر کے ایم منشی ہوم منسٹر حکومت بمبئی نے طلباء کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"جس قدر رجحانات، مذہب یا زبان یا ایسے ہی چھوٹے چھوٹے مسائل کی بنا پر قومیت پرستی کے خلاف پیدا ہوتے ہیں، کانگریس ان رجحانات کی مخالفت میں ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے، من حیث القوم ہماری کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض

لوگوں کیطرف سے ایک واہمہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب یا زبان کا رشتہ، قومیت کے رشتہ کی جگہ وجۂ جامعیت ہوسکتا ہے، یہ ایک بڑا مُہلک دھوکا ہے، یاد رکھیئے مذہب یا زبان کا رشتہ ہمیشہ قومیت کے بلند ترین رشتہ کے ماتحت رہنا چاہیئے' یہ تصور ہی ہندوستان کو محکم اور آزاد بنا سکے گا'' (نیشنل کال مورخہ ۹/۳ ۲۰)

معلوم نہیں مسٹر منشی اس باب میں مولانا حسین احمد صاحب کے نظریۂ قومیت (قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے) سے متاثر ہوئے ہیں، یا ان ہر دو حضرات کا سرچشمۂ ہدایت ایک ہی ''آسمان'' ہے

ڈاکٹر بی، پتا بھی، سیتا رامیا۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک رُکن نے، سودیشی نمائش پٹنہ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا۔

''ہمارا معاشرتی نظام، جو ہزاروں برس ہوئے وجود میں آیا تھا۔ اس کی رُو سے افلاس کا ناطہ علم اور عظمت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا، لیکن اب زندگی کی متضاد قوتوں میں توازن پیدا ہو چکا ہے، اشتراکیت (کمیونزم) اور اشتمالیت (سوشلزم) دورِ حاضرہ کے نظریۂ حیات (ISMS) ہیں اور ہندوازم، اور اسلام ازم، عہدِ کہن کی یادگاریں ہیں چاہیئے کہ ہم اُن کی بُنیاد دنیا از سرِنو امتحان کریں'' (ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۹/۳ ۱۹)

ڈاکٹر سیتا رامیا صاحب۔ ہندو مذہب کے ناقص اور ساطیر الاولین ہونے کے متعلق جو جی میں آئے کہیں۔ ہمیں اس سے تعرض نہیں لیکن انہیں اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں کے مذہب کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اعلان کریں۔ انہیں کیا معلوم کہ اسلام کیا ہے ؟ ہمارے قومیت پرست علماء ان تمام خرافات کو بگوشِ ہوش سُنتے ہیں، اور نہ معلوم کون سے مصالح گلوگیر ہوجاتے ہیں کہ اُنکے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہہ سکتے، دوسروں کی جراتوں اور ان کی خاموشیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مُسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اسلام سے متنفر ہو چکا ہے، شعائر اسلامی کی علانیہ تضحیک کی جاتی ہے دینداری انکے نزدیک انتہائی حماقت اور جہالت کے مرادف قرار پا چکی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیئے کہ مہاتما گاندھی کے متعلق بڑے فخر و مباہات سے اعلان ہوتا ہے کہ ''باوجودیکہ تکان کی وجہ سے وہ بہت مضمحل

ہو رہے تھے، لیکن انھوں نے شام کی پرارتھنا کا ناغہ نہیں کیا۔" (ہندوستان ٹائمز۔ مورخہ ۹/۳۸-۲۲) اور انھوں نے "۲۵ ستمبر کی صبح ہریجن آبادی میں ایک پرارتھنا استھان کا سنگِ بنیاد رکھا" (ایضاً) اور وہی ہندو جو مذہب کو ہندوستان کی آزادی کے راستے میں خطرناک چٹان قرار دیتے ہیں، انہیں ایسے کاموں پر مبارک باد کے تار بھیجتے ہیں، لیکن مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہزارہ پولیٹیکل کانفرنس میں جب ایک مسلم خاتون تقریر کے لیے سٹیج پر آئیں تو کسی مسلمان نے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو اس پر یہ کانگریسی مسلم خاتون سخت برافروختہ ہوئیں اور کہا کہ کانگریس کے جلسوں میں نعرۂ تکبیر کے بجائے کانگریس کے نعرے لگانے چاہئیں ۔

پھر اور دیکھئے، مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاست کو اپنے مذہب "اہنسا" سے ایک سیکنڈ کے لیے جدا کرنا نہیں چاہتے، اور سب کے نزدیک قابلِ پرستش قرار پاتے ہیں، لیکن اگر کوئی مسلمان سیاسی تحریک میں مذہب کا نام لے لیتا ہے تو ایک ہنگامہ برپا کر دیا جاتا ہے، چنانچہ "ڈاکٹر اشرف صاحب" کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے انچارج، ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"جن طریقوں سے مسلم لیگ پروپیگنڈا کرتی ہے، ان کی بابت کم از کم اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیر شریفانہ اور بعض اوقات صاف طور پر ذلت آمیز اور عموماً اشتعال انگیز ہوتے ہیں۔ اُن کی اپیل مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصبات ہی تک محدود رہتی ہے اور اس کو بہت کم امن پسندی سے تعلق ہوتا ہے، اقتصادی اور سیاسی مسائل کا تذکرہ تک نہیں کیا جاتا۔ ان حالات کے ماتحت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ایک مرتبہ صدر کانگرس کو مجبوراً "ان طریقوں کو "ایامِ جہالت کی سیاست" سے تعبیر کرنا پڑا۔"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۴/۸/۳۸)

آپ کو یاد ہے کہ صدر کانگریس نے کس موقع پر یہ عنبر افشانی فرمائی تھی؟ بجنور کے انتخاب کے موقع پر کسی شخص نے لیگ کے اُمیدوار کی حمایت میں ایک اشتہار شائع کیا تھا جس میں مسلمانوں سے مذہب کے نام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ایسے اُمیدوار کے حق میں رائے دیں جو ایسی جماعت کی نمائندگی کر رہا

ہے جو خالص مُسلمانوں پر مشتمل ہے نہ کہ ایسی جماعت کی جو مسلم و غیر مسلم کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی مدعی ہے اس پر پنڈت جواہر لال نہرو اپنے غصہ کو ضبط نہ کرسکے۔ اور فرمایا کہ الیکشن جیسے خالص "سیاسی" معاملہ میں خدا کو ساتھ بلا لینا "ایّام جہالت کی سیاست" ہے، پنڈت جواہر لال جیسے خدا کے منکر، دہریہ کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا کوئی تعجب انگیز بات نہ تھی لیکن ڈاکٹر محمد اشرف صاحب کو ملاحظہ فرمائیے کہ مُسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں، مسلمانوں جیسا نام بھی رکھتے ہیں، ماشاء اللہ کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے معتمد بھی ہیں، لیکن "سیاست" میں خدا اور رسول کا نام اِنکے نزدیک بھی انتہائی جہالت ہے!

سچ ہے ؎

اگر شاہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین!

---

(۷) مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْهُمْ

قرآن کریم نے مُسلمانوں کو غیر مسلموں کی دوستی سے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے، اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ جو ایسا کرے گا وہ انہی میں سے ہو جائے گا، ایسا کرنے والوں کا خدا کے ہاں کس طرح غیر مسلموں کی فہرست میں اندراج ہو جاتا ہے، وہ تو الگ چیز ہے لیکن ایسے لوگوں کی ذہنیت کس طرح غیر مسلموں کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔ اسکے مظاہرے تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے رہتے ہیں، کہیں ارادی طور پر، کہیں غیر ارادی طور پر، ڈاکٹر اشرف صاحب جن کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے، لامحالہ مسلمان ہیں، لیکن اُن کی ذہنیت کس قسم کی ہو چکی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ جب مُسلمانوں کو مخاطب کرتے ہیں تو اس اسلوب سے کہ اپنے آپ کو ان میں شامل نہیں کرتے بلکہ ان سے اس طرح باتیں کرتے ہیں، گویا یہ کسی اور قوم کے فرد ہیں اور مسلمان کسی مختلف قوم کے افراد فرماتے ہیں کہ:-

"یہ کوئی نئی بات نہیں کہ کانگریس مُسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہی ہے

مسلمانوں سے ہمارا میل جول اتنا ہی پُرانا ہے، جتنی پُرانی کانگریس ہے۔ اب سے بہت پہلے، ۱۸۸۷ء میں بدرالدین طیب جی نے مدراس میں کانگریس اجلاس کی صدارت کی، اور اس کے بعد بھی بہت سے مشہور مسلمانوں نے ہماری جماعت میں ذمہ دار عہدے لیے۔ اور مسلمانوں تک کانگریس کا پیغام پہنچانے میں ہماری مدد کی .... ہمارے کام کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگرچہ ابھی تک ہم نے کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں کی، لیکن پھر بھی ہر جگہ مسلمان ہماری اس تحریک کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔" (ہندوستان، ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء)

یعنی جب ڈاکٹر صاحب ہم یا ہماری جماعت کہتے ہیں تو اس سے مراد مسلمان یا مسلمانوں کی جماعت نہیں ہوتی وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ تصور کرتے ہیں، جب متحدہ قومیت کا تخیل ذہن پر مسلط ہو جائے تو اس کا فطری نتیجہ یہی ہونا چاہیئے، جس کا مظاہرہ ڈاکٹر صاحب کی ذہنیت کر رہی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے کبھی کسی ہندو کو ایسا کہتے سنا ہے؟ کبھی نہیں سنا ہوگا؟ یہ کیوں! اس لیے کہ متحدہ قومیت نام ہی اکثریت کی قومیت کا ہے، برعکس اسکے جب کوئی اقلیت کسی متحدہ قومیت کا جزو بنتی ہے اُسے اپنے آپ کو اس کُل کا جزو بنا کر اپنے جداگانہ قومی تشخص کو متحدہ قومیت کے اندر جذب کر دینا پڑتا ہے، یہ ہے تفسیر فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کی، کہ وہ انہی میں سے ہو جاتا ہے — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

---

(۸) نشۂ حکومت کی بدمستیاں

مسٹر جناح نے ایک مرتبہ کہیں یہ کہہ دیا کہ کانگریس کو نشۂ حکومت نے بدمست کر دیا ہے اور وہ عدل اور راستی کی روش کو چھوڑ رہی ہے، اس پر تمام کانگریسی رسائل و جرائد، ہندو مسلمان قومیت پر لیڈر اُن پر یوں برس پڑے، گویا انکے مُنہ سے کلماتِ کفر نکل گئے ہیں، لیکن جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے، مہاتما گاندھی نے اخبار "ہریجن" میں ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"گزشتہ اشاعت میں میں نے لکھا تھا کہ کانگریس میں تشدد زور پکڑ رہا ہے، اسکے بعد جو مراسلے

اور اطلاعیں موصول ہوئی ہیں، ان سے پایا جاتا ہے کہ واقعی اب کانگریسی لوگ راستی اور عدم تشدد چھوڑ کر تشدد پر اتر آئے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کو جو تھوڑی بہت طاقت حاصل ہوئی ہے، وہ کانگریسیوں کو ہضم نہیں ہو سکی" (بحوالہ انقلاب ۹/۳۸ء)

نشۂ حکومت کا فطری نتیجہ اس قسم کی سرکشی اور تمرد ہے، اور اس سے انگریز بچ سکتا ہے، نہ ہندو، اسی لیئے قرآن کریم نے کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں دیا۔ اور ان الحکم الا للہ، کے عدیم النظیر فلسفۂ حکمت وسیاست سے اعلان فرمایا کہ:-

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے، حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری!

(۹) کانگریسی وزرا کے اخراجات

کانگریس کا دعوے یہ ہے کہ غریبوں کے مصائب اور فاقہ زدوں کی مشکلات نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ ایک ایسا نظام حکومت قایم کرے جس کی رو سے ملک کا افلاس دور ہو جائے، چنانچہ اس مقصد عظمےٰ کی پہلی کڑی یہ تھی کہ کانگریسی وزرا کی تنخواہ پانصد روپیہ ماہوار تک محدود کر دی گئی لیکن یو، پی کونسل کے اجلاس میں بعض سوالات کے جواب میں بڑی دلچسپ حقیقتوں کا انکشاف ہوا ہے، وہاں بتایا گیا کہ کانگریسی وزیر مسز پنڈت کی تنخواہ تو پانچ ہی سو روپیہ ہے۔ لیکن انکے خانگی ملازموں کا بل ان کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور انکے مکان کا کرایہ/۱۸۴ روپیہ ماہوار کے حساب سے ادا کیا گیا ہے، (انقلاب مورخہ ۹/۳۸) ان تین موٹی موٹی شقوں کی میزان قریب ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار ہو گئی۔ اور ابھی موٹر کا خرچ، سفر خرچ اور نہ معلوم کون کون سی مدات کے خرچ خزانۂ عامرہ سے ادا ہوتے ہیں، یہ ہے نمونہ "غریبوں کی حکومت" کا، اور پھر اس وزیر کا جو ایک سوشلسٹ گھرانے کی چشم و چراغ ہیں۔

اسکے برعکس جب دنیا میں "خدا کی حکومت" قایم تھی، اس خدا کی جس کا تصور سوشلسٹوں کے نزدیک، (نعوذ باللہ) اسلیئے پیدا کیا گیا ہے۔ کہ اس سے سرمایہ داری کی حفاظت ہو سکے، اس میں وزیر سلطنت نہیں بلکہ صدر حکومت خلیفۃ المسلمین کے اخراجات کیا تھے، انکی تفصیل خود حضرت عمرؓ

کے الفاظ میں سنیئے، فرمایا:۔

اخبرکم بما یستحل لی منہ۔ حلتان۔ حلۃ فی الشتاء و حلۃ فی القیظ۔ وما احج علیہ واعتمر من الظہر، و قوتی و قوت اھلی کقوت رجل من قریش باغناھم ولا بافقرھم، ثم انا بعد رجل من المسلمین یصیبنی ما اصابھم

(ابن سعد۔ جلد ۳ ص ۱۹۵)

میں خود بتاتا ہوں کہ بیت المال سے مجھے کتنا لینا جائز ہے؟ دو جوڑے کپڑے، ایک جاڑے کا، اور ایک گرمی کا، ایک سواری جس پر حج اور عمرہ ادا کروں، اور قریش کے ایک متوسط الحال آدمی کے اخراجاتِ طعام کے برابر اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اخراجاتِ طعام۔ اس کے بعد میں ایک ادنیٰ مسلمان ہوں، جو اُنکا حال ہے وہی میرا حال ہے۔

یہ تو تھی بارِ مصارف کی تفصیل، اب احساسِ ذمہ داری ملاحظہ ہو کہ اپنے آخری وقت میں بیٹے کو بلایا اور کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے جس قدر مسلمانوں کے بیت المال سے اپنے اخراجات کے لیے لیا ہے اسکے بدلے اُن کی اتنی خدمت بھی کرسکا ہوں یا نہیں! چھوٹا سا مکان ذاتی ملکیت کا ہے، اسے فروخت کرکے زرِ ثمن سے بیت المال کا حساب ادا کردو تاکہ خدا کے حضور کم ازکم اس ایک بار سے تو سبکدوش ہو جاؤں!!

یہ تھی "خدا کی حکومت" حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اپنے بنائے ہوئے قوانین و نظریات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، مزدور کی حکومت ہو یا سرمایہ دار کی، نوعِ انسانی کے لیے نتیجہ ایک ہے! تھوڑے سے وقت کے لیے ایک دھوکا ہوتا ہے جس میں کبھی انسان اپنے آپ کو مبتلا رکھتا ہے کبھی دوسروں کو، لیکن اس کی فطرت جس زندگی کی تلاش میں بےقرار ہوتی ہے، وہ اُسے کبھی نہیں مل سکتی یہ صرف اسوقت مل سکے گی، جب مزدور ہو یا سرمایہ دار، سب اپنے آپ کو خدا کے احکام کے تابع کردیں گے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ، اور برضا و رغبت، بخلوصِ نیت اُس کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیں گے، یہ وہ نظامِ زندگی ہوگا، جس میں انسان صحیح معنوں میں آزادی کا سانس لے سکے گا، اور یاد رکھیئے قرار و ثبات صرف اسی ایک نظام کے لیے ہے، انسان کے وضع کردہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہو سکتے +

گرجہاں واند حرامش را حرام! تا قیامت پختہ ماند ایں نظام!
حکمتش از عدل است و تسلیم و رضاست بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰ است

———(•:•)———

ملّت بے امام

(اسد ملتانی)

ہر آں ملت کہ محروم امام است — چو انبوہِ بہائم بے نظام است

امامے گیر بہرِ حفظِ آئین — کہ ملت را ز آئین انتظام است

بر آئینے است رفتارِ کواکب — ازاں ایں کارواں گردوں خرام است

دلے پیدا کُن اندر جسم ورنہ — بہ چشم و گوش تفریق دوام است

نیابی تازہ ابروے اشارت — اگر قرباں شوی مرگِ حرام است

جماعت توسنِ تُند است و سرکش — ندانم شہسوارِ آں کدام است

بگو آخر زمامش در کفِ کیست — گرفتم ناقہ، ما تیز گام است

نگاراں بے شمار اما نہ بینم — بُتے کو دلبرِ ہر خاص و عام است

ہزار انجم نیفروزند شب را — کُجا یک جلوۂ ماہِ تمام است،

بہ مسجد بیں صلواتِ بے اماماں! — "یکے در سجدہ دیگر در قیام است"

اگر در بزم شمعے نیست روشن، — دلِ پروانگاں در سوز خام است

اگر کشتی رود بے ناخدائے، — بآخر زیرِ دریا یش مقام است

اگر در انجمن ساقی نباشد، — چہ سُود از بادہ و مینا و جام است

بر آں لشکر کہ سرلشکر ندارد، — بہ میدانِ وغا رفتن حرام است

نباشی تا غلامِ پختہ کارے — خیالِ سروری سودائے خام است

ہر آں ملت کہ آقائے ندارد — غلام است و غلام است و غلامِ غلام است

بمیرم از خجالت چوں بپرسند

اسد میرِ مسلماناں کدام است

(۱۹۳۱ء میں لکھی گئی)

مسلمانوں کا سیاسی مسلک

(حضرت مولانا ابوالکلام آزاد)

۱۹۱۲ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو کسی صاحب نے ایک خط لکھا تھا جس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ پولٹیکل مباحث مذہب سے الگ ہونے چاہئیں اور یہ دریافت کیا تھا کہ ہندوستان میں جتنے پولٹیکل گروہ موجود ہیں، الہلال ان میں سے کس کا ساتھ دیتا ہے؟ مولانا نے اس خط کا جو جواب شرح و بسط سے لکھا تھا، اس میں سے متعلقہ اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، "طلوع اسلام"

"آپ فرماتے ہیں کہ پولٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے۔ لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے، ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں ہم انہیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں، ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایک کفر صریح ہے اور پالٹیکس بھی اسی میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا۔ ماقدروا اللہ حق قدرہ۔ ورنہ اپنی پولٹیکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدا کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحیدِ تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی حاکمانہ ہو یا محکومانہ،

وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دُنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہوسکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اُس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقۂ درس ہے۔ جنے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں ،امام مبین حق الیقین، نُور، وکتابٌ مبین، تبیاناً لکل شیٔ، بصائر للناس، ہادی وا ہدیٰ الی السبیل، جامع احزاب وامثال، بلاغ للناس، حاوی بحر دبرا اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے، اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دُور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو خواہ سیاسی .... ہماری پولٹیکل گمراہیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دستِ رہنما کو اب تک اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا، ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی ...... پس یہ کیونکر ممکن ہے کہ اسکے پیرو اپنی زندگی کے ایک ضروری شعبے یعنی سیاسی اعمال کے لئے دوسروں کے دروازے کے سائل نہیں۔ حالانکہ خود قرآن انکے پاس ایک حکم اور ایک امام مبین ہے"۔ ...... پس اگر آپ کو یہ ضجان پریشان کیے ہوئے ہے، تو افسوس ہے کہ ہم اُسے دُور نہیں کر سکتے، اگر ہم کو اپنے مقاصد کے بالتفصیل بیان کرنے کی مہلت نہیں ملی تو مضائقہ نہیں، وہ نہایت مختصر لفظوں میں بھی آج سنائے جاسکتے ہیں، ہم بالاختصار عرض کر دیتے ہیں کہ الہلال کا مقصدِ اصلی اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اُنکے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی، سیاسی ہوں، خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے"۔

"آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولٹیکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے۔ پھر آپ نے اُن کو گنوا بھی دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ ایک چوتھی راہ بالکل بھول گئے۔ یہ تین راستے تو آج آپ کے سامنے نمودار ہوئے ہیں مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جسپر چلکر ہزاروں ہستیاں منزل مقصود تک پہونچ چکی ہیں۔ آسمان وزمین کے فاطر نے جسوقت انسانوں کو آنکھیں دیکھنے کے لئے عطا فرمائیں اُسی وقت اُسکے سامنے یہ راہ بھی کھول دی

تھی۔ آدمؑ نے اسی پر قدم رکھا اور نوحؑ نے پتھروں کی بارش میں اسی کا وعظ کہا ابراہیمؑ نے اسی کی نشانی کے لیے قربانگاہ بنائی اور اسمٰعیلؑ نے اسکے لیے اینٹیں چنیں۔ یوسفؑ سے مصر کے قیدخانے میں جب ایک ساتھی نے پوچھا تو اسی راہ کی اُسنے رہنمائی کی اور موسےؑ جب وادیٔ ایمن میں روشنی کے لیۓ بے قرار ہوا تو اسی راہ کی تجلی ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی۔ گلیلی کا اسرائیلی واعظ جب یروشلم کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اس کی نظر اسی راہ پر تھی اور پھر جب خداوند سعیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اُسنے دنیا کو دعوت دی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور جس کی نسبت داعیٔ اسلامؑ کو حکم ہوا تھا کہ کہہ دے :۔

ھٰذہٖ سَبِیْلِیْ ادعوا الی اللہ علےٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی ۱۲/۸

میرا راستہ یہ ہے۔ تم سب کو اللہ کیطرف بلاتا ہوں میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں

سب عقل و بصیرت کے ساتھ اسی دین کے راستے پر ہیں۔

الحمدللہ کہ ہم "ومن اتبعنی" کے زمرے میں داخل ہیں۔ اور اسی لیۓ جناب کی قرار دی ہوئی ان تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے بلکہ اسی چوتھی راہِ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ قرآن کی بتلائی ہوئی راہ صراط المستقیم ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل واعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے۔ وہ مسلم نہیں، بلکہ شرک فی صفات اللہ کیطرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اسلیے مشرک ہے۔ وَالحمد للہ الذی ھدانا لھذا وماکنّا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ ۷/۴۲ ۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ آج کل ہندوؤں کے دو پولیٹکل گروہ موجود ہیں۔ ان میں سے آپ کس کے ساتھ ہیں؟ گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے کہ اسکے پیرو دں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قایم کرنے کے لیۓ ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کے لیۓ اِس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی

ضرورت نہیں، وہ خود دُنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنیوالے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں، وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دُنیا اُنکے آگے کھڑی ہو جائیگی انکا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں، خدا ان کو سر بلند کرتا ہے تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں، وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت رو الغیرۃ من شان حضرۃ الربوبیۃ) اس کو کبھی گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں۔ ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہٖ ویغفر ما دون ذٰلک لمن یشآء" (۴: ۱۱۷) ... ... پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوئیے۔ صرف اس راہ پر چلیئے جو کہ اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے۔ ... ... قرآن انتظام عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استبداد واقتدار کی مخالفت کرے اُس کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی نہیں جو انسانوں کو محض اپنی رائے اور خواہش کے بنائے ہوئے احکام کی تعمیل پر مجبور کرنیکا حق رکھتا ہو

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکمۃ والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ۔ (۳: ۷۹)

یہ حق کسی بشر کو نہیں پہنچا کہ اللہ تعالیٰ اُسے کتاب اور عقل اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو

جس چیز کا اختیار انبیاء کرام کو نہیں اس کا حق کسی دنیوی طاقت و حکومت کو کبھی نہیں مل سکتا البتہ وہ ملت اور جماعت کے اندر اپنی عقل کو مخفی بتلاتا اور رکھتا ہے کہ۔ ید اللہ علی الجماعۃ اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ پس اسکے نزدیک وہی حکومت جائز ہوسکتی ہے جو شخصی نہ ہو، بلکہ ملت اور قوم کے ہاتھ میں ہو اسی بنا پر اُسے مشورے کا حکم دیا۔

وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲: ۳۸)

اور ان کو حکم دیا کہ آپس میں مشورہ کرکے تمام کام انجام دیں۔

وشاورھم فی الامر (۳۳/۲۹)

اے پیغمبر تمام اُمور ومعاملات کو مشورے کے ساتھ انجام دیا کرو۔

...... "یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں۔ یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں، اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع وتقلید ہے، بلکہ اس رب العلمین نے جسنے کتاب حکمت اور عدل ومیزان کے ساتھ اپنے رسولوں کو دُنیا میں بھیجا، یہ راہ ہمارے سامنے کھول دی ہے، وہ اگر توفیق بخشے تو اُس کی دی ہوئی زندگی کو اسی دعوتِ حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں نہ کسی سے جنگ ہے نہ کسی سے مناقشہ نہ ملکی توقع اور نہ داد کی اُمید۔ اِس راہ کے داعی کریم کو جو حکم دیا گیا تھا وہ ہمارے سامنے موجود ہے"۔ ..... "اگر مسلم لیگ مسلمانوں کی پولٹیکل راہ نمائی کرنا چاہتی ہے تو اس کو یہی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط المستقیم"۔

(مضامین آزاد، حصہ دوم)

اس کی توضیح میں مولانا فرماتے ہیں "ہم تو خود اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ انہوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے، یا گورنمنٹ پر اعتماد اور یا ہندؤں اور کانگریس کی شرکت، یعنی ہمیشہ آزادی سیاسی (؟) کو ہندؤں کا مرادف سمجھا مگر خود اپنے تئیں بھولے رہے اور اسلیئے بھولے رہے کہ خدا کو بھلا دیا۔

ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم (۵۹:۲۰)

(ان لوگوں کیطرح گمراہ نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے ہی کو بھول گئے)

اسی لیئے ہماری تمام سعی و جہد کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یاد دلا دیں کہ دُنیا میں رہنے کے لیے جتنی چیزیں مطلوب ہیں وہ خود اُنکے پاس موجود ہیں، اوروں کے دروازوں کو دریوزہ گری کے لیئے کیوں تک رہے ہیں"۔ (الہلال ۲۹ ستمبر ۱۹۱۲ء)

یہ ۱۹۱۲ء کی باتیں ہیں۔ ان دنوں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد قرآن کی روشنی میں ببانگ دُہل اعلان

فرماتے تھے کہ کانگریس میں شرکت سب سے بڑی ضلالت کی راہ ہے سیاست میں ہندؤں کی اتباع و اقتدا کفر و شرک ہے، مسلمانوں کو غیر کی کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ دُنیا کو خود اپنی جماعت میں شامل کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں لیکن آج وہی مولانا آزاد سابقہ دلائل میں کوئی سقم بتائے بغیر کانگریس میں بنفس نفیس شامل ہیں، کانگریس کی اعلیٰ کمان کے اہم رُکن ہیں۔ ہندؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کے زبردست حامی ہیں اور مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دینے سے نہیں تھکتے یہی نہیں بلکہ جن صوبوں میں زمام حکومت مسلمان اکثریت کے ہاتھ میں ہے، وہاں اسلامی وزارت توڑکر کانگریسی وزارت قایم کرنے میں پیش پیش ہیں ؎

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

حالات کے بدلنے سے "سیاسی" مسلک میں تبدیلی چنداں تعجب انگیز نہیں ہوسکتی لیکن کفر کا اسلام اور شرک کا توحید بنجانا وہ انقلابِ عظیم ہے جس کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا تحمل صرف حضرت مولانا کا سکوت ہی ہوسکتا ہے اور جب تک یہ سکوت قایم ہے ہم مجبور ہیں کہ اس انقلاب کو "عالم کی لغزش" سمجھیں جو اُمت کے حق میں تین خطرناک چیزوں میں سے ایک ہے اور جو دُنیا کو بگاڑنے میں ایک تہائی کی ذمہ دار ہے۔

کیا حضرت مولانا سے کوئی آج اتنا پوچھ سکتا ہے کہ سیاسی مسلک میں ہندؤں کی اتباع و اقتدار جو کبھی "کفر و شرک" تھی اب قرآن کریم کی کس آیت کی رُو سے عین اسلام اور توحید ہوگئی ؟ وہ قرآن فہمی کس کی نذر ہوگئی جو یہ بصیرت پیدا کرتی تھی کہ مسلمانوں کو دوسروں کی کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ دُنیا کو خود اپنی جماعت میں شامل کرنے کے لیے پیدا کئے گئے ہیں ؟ وہ کون ہے جو کبھی سجہ بکف "من اتبعنی" کے زمرہ میں داخل تھا لیکن آج زنار بدوش ہندؤں کے حلقہ درس میں شریک ہے، وہ کون ہے جسنے ید اللہ علی الجماعۃ سے مُنہ موڑکر اپنا ہاتھ خدا کے ہاتھ سے اُٹھالیا اور انسانی دستگیری کا محتاج ہوگیا ؟ اس لرزشِ قلب کو آج کیا ہوگیا جو کسی انسانی دماغ کی اقتدا، یا انسانی گروہ کی اتباع میں غیرت رب العزت کی بجلیاں پوشیدہ دیکھ کر روح میں کپکپی پیدا کردیتی تھی ؟ اس غیرتِ ایمانی کو کس کی نظر کھا گئی جو اوروں کی چوکھٹ کے سائل بننے اور دوسروں کے دروازوں کی دریوزہ گری کرنے کو

مسلمان کے لیے سب سے بڑی شرم انگیز بات قرار دیتی تھی ؟ کانگریس کی شرکت جو کبھی سب سے بڑی ضلالت کی راہ تھی، آج کن مصالح کی بنا پر عین صراط مستقیم ہوگئی! اور مسلم لیگ نے جب اسی راستہ کیطرف رُخ کرلیا جو اسوقت عین صراط مستقیم تھا تو وہ آج کس "امام مبین" کے فیصلے کے ماتحت شر الدواب قرار پاگئی؟

کہا جاسکتا ہے کہ حالات کے بدلنے سے مسلک بدل سکتا ہے لیکن کیا حالات کے بدلجانے سے کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کفر۔ اسلام بنجائے۔ اور شرک توحید ہوجائے۔

عالم کی یہی وہ لغزش ہے جسکے متعلق حضور مخبر صادق نے فرمایا تھا کہ:-

اِن اشد ما اتخوف علےٰ امتی ثلاث۔ زلة عالم۔ وجدال منافق بالقران

ودنیا تقطع اعناقکم......

میں اپنی اُمت کے حق میں سب سے زیادہ جن چیزوں سے ڈرتا ہوں وہ تین ہیں، عالم کی لغزش، اور منافق کا قرآن سے استدلال اور دُنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگ

شعبی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "دُنیا کو بگاڑنے والی تین چیزیں ہیں۔ عالم کی لغزش، منافق کا قرآن سے استدلال اور گمراہ کرنے والے سردار (لیڈر)

اس لیے کہ سالار کارواں کی لغزش سارے قافلے کا رُخ کعبہ سے پھیر کر "ترکستان" کیطرف کرسکتی ہے

اس لغزش کے متعلق ہم تو اتنا ہی سمجھ سکے ہیں کہ:-

شیخ ملت با حدیثِ دلنشیں ! بر مرادِ اُو کند تجدید دیں !

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

یہ پمفلٹ مسلمانوں کو تعلیمی اور مذہبی خطرات سے آگاہ کرنے والا ہے واردھا کی تعلیمی اسکیم پر جناب راز کا تبصرہ اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہا ہے بہت تھوڑے نسخے رہ گئے ہیں۔ قیمت فی نسخہ ۱ر محصول ۱ر

منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی

قرآن اور قرآنی دلائل!

(گزشتہ سے پیوستہ)

کیا وہ آسمان اور زمین کی مملکت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں انہیں غور وفکر نہیں کرتے

یعنی اگر کائنات کی پیدائش پر اور صانع کی صنعت وکاریگری پر انسان غور کرے تو اس سے ایک قادر مطلق خدا کا وجود خود بخود ثابت ہو جاتا ہے جب بغیر کسی فاعل اور صانع کے کوئی چیز خود بخود نہیں بن سکتی تو اتنی بڑی کائنات بغیر خدا کے کس طرح بنگئی۔

(۵) افی اللہ شك فاطر السمٰوٰت والارض

کیا اُس خُدا کے وجود میں شک ہے جسنے زمین آسمان کو پیدا کر دیا

(۶) فلینظر الانسان مم خلق۔ خلق من ماء دافق ۔

انسان یہ تو دیکھے کہ اس کی پیدائش کس چیز سے ہوئی ہے اُس کی پیدائش اُچھلتے ہوئے پانی سے ہوئی ہے۔

(۷) ام خلقوا من غیر شئی ام ھم الخالقون ٥

کیا وہ بغیر کسی پیدا کرنے والے کے پیدا ہو گئے یا وہ اپنے وجود کے آپ ہی خالق ہیں؟

سوم:- کبھی وہ عالم کی ترتیب اور تناسب سے خدا کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔

(۸) ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت

کیا تمہیں رحمٰن ورحیم خدا کی مخلوق میں کوئی تفاوت ابتری اور غیر موزونیت کہائی دیتی ہو؟

(۹) صنع اللہ الذی اتقن کل شئ

یہ اللہ کی صنعت ہے کہ ہر چیز میں اتقان اور تناسب موجود ہے۔

(۱۰) والارض مددنٰھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل شئ موزون

اور ہم نے زمین کو کشادہ بنایا اور اس میں رکشش ثقل کی میخیں ٹھونک دیں اور اس میں سے ہر چیز کو موزوں اور مناسب طریقے پر نکالا

توحید پر قرآنی دلائل

صانع عالم کے وجود کے بعد قرآن حکیم نے خدا کی وحدانیت پر فلسفیانہ اصطلاحات اور مغلق مقدمات کے بغیر ایسے دلنشیں دلائل قایم کیے ہیں جو انسانی قلب کو یقین وطمانیت سے معمور کر دیتے ہیں اور ہر عامی سے عامی بھی جو دلائل ومقدمات کی ترتیب سے ناواقف ہے اُس سے تسلی حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

(۱) لو کان فیہما الہۃ الا اللہ لفسدتا ۔

اگر زمین وآسمان میں کوئی دوسرا خدا ہوتا تو یہ نظام سارا کا سارا درہم برہم ہو جاتا

(۲) ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الہ اذاً لذھب کل الہ بما خلق ولعلا بعضہم علیٰ بعضٍ سبحان اللہ عمّا یصفون ۝

خدا نے نہ توکسی کو اپنی اولاد بنایا ہے اور نہ کوئی دوسرا خدا اُسکا شریک ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق جُدا پیدا کرتا (یعنی وہ مختلف الافعال ہوتے اور اس کشمکش میں کسی ایک فعل کا بھی صدور نہ ہوتا) اور ایک خدا دوسرے خدا پر غلبہ پانے کی کوشش کرتا، بے شک اللہ ان تمام الزاموں سے پاک ہے۔

(۳) قل لو کان معہ آلہۃ کما یقولون اذا لابتغوا الیٰ ذی العرش سبیلاً

اگر خدا کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی شریک ہوتا جیسا کہ مشرکین کہتے ہیں تو وہ صاحب عرش (مالک ومختار) خدا کیطرف راستہ نکالتا (یعنی بادشاہوں کیطرح ایک خدا دوسرے خدا کو مغلوب اور حکومت سے محروم کرنے کی کوشش کرتا۔)

یہی نہیں کہ قرآن حکیم نے توحید الٰہی پر دلائل قایم کیے بلکہ جو مشرک تعدد الٰہ کے قائل ہیں قرآن ان سے بھی اس باطل دعوے پر دلیل طلب کرتا ہے۔

(۴) ام اتخذوا من دونہ الہۃ قل ھاتوا برھانکم

کیا انھوں نے خدا کے سوا دوسروں کو بھی اسکا شریک ٹھیرا لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر اسپر

دلیل رکھتے ہو تو پیش کرو!

پھر فرمایا:-

امن یبدؤا الخلق ثم یعیدہ ومن یرزقکم من السمآء والارض
ء الٰہ مع اللہ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ۝

کون ہے جو پیدائش کا آغاز کرتا ہے پھر اُس کو لوٹا دیتا ہے اور کون ہے جو تم کو
زمین و آسمان سے رزق پہونچاتا ہے کیا اسکے بعد بھی تم کسی اور خدا کے متلاشی
ہو؟ کہہ دو اگر یہ بات ہے اور تم سچے ہو تو دوسرے خدا کے وجود پر دلیل پیش کرو!

بعثت پر قرآنی دلائل

اسلام میں حیات بعد الموت کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے یہ مسئلہ درحقیقت مذہب کا ستون
عقائد و اعمال کی اساس اور ایمان باللہ کا لزومی نتیجہ ہے اگر اسکو ایک لحہ کے لیئے بھی دل سے نکالدو
تو مذہب کی عمارت فوراً منہدم ہو جائے گی اور ایمان کے لیئے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہ رہے گی +
مگر یہ مسئلہ جہاں مذہب کی بُنیاد ہے وہاں وہ اُن لوگوں کے لیئے مشکل بھی ہے جو نبوت کی ضرورت
محسوس نہیں کرتے اور ہر اس بات کا انکار کرنے کے عادی ہیں جو عقل سے ما فوق اور تجربہ سے بالا ہو
مگر دیکھو قرآن حکیم اس مشکل مرحلہ سے انسانوں کو کس آسانی سے گزارتا ہے اور حشر و نشر کو اس لطیف
پیرا یہ میں سمجھاتا ہے کہ منطقی و فلسفی اور دانش فروش دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور فطرت اور ضمیر
کی آواز پر کان لگانے والے اطمینان اور یقین کی دولت حاصل کر لیتے ہیں۔
دیکھو قرآن کریم فلسفہ کی تمام راہوں سے بچ کر انسانی ضمیر اور وجدان سے کس طرح سرگوشیاں
کرتا ہے:-

ایحسب الانسان ان یترک سدی۔ الم یک نطفۃ من منی یمنی
ثم کان علقۃ فخلق فسوی۔ فجعل منہ الزوجین الذکر والانثی۔ الیس
ذالک بقادر علی ان یحیی الموتی

کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ اُس کو بے لگام چھوڑ دیا جائیگا ؟ اس کی حقیقت اسکے سوا کچھ اور بھی ہے کہ وہ بے جان قطرہ تھا۔ پھر وہ گوشت کا لوتھڑا بنا پھر اُس کی تخلیق اور تسویہ عمل میں آیا اور پھر اس قطرہ سے عورت اور مرد کا جوڑا بنا دیا۔ جب خدا نے یہ سب کچھ کر دیا تو کیا اُسکے لئے مُردوں کو زندہ کر دینا مشکل ہے ؟

یعنی تم روزانہ مُردہ اشیاء کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہو خود تم بھی قطرہ کی صورت میں مُردہ اور بے جان تھے تم کو زندگی کے لئے کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑا اور پھر کیسے جاگتے انسان بنگئے۔ اس مشاہدہ کے بعد پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ مرنے کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ؟ کیا جس خدا نے پہلی بار تم کو زندگی بخشی اور بے جان سے جاندار بنایا وہ دوبارہ زندگی عطا کرنے سے قاصر ہو جائیگا۔

پھر فرمایا :-

وتری الارض ھامدۃ فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت وانبتت من کل زوج بھیج ذالک بان اللہ ھو الحق وانہ یحی الموتیٰ وانہ علے کل شئ قدیر۔ وان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور

تم دیکھتے ہو کہ زمین کس قدر خشک (مُردہ) ہو جاتی ہے مگر جب ہم اُس پر پانی نازل کرتے ہیں تو وہ نرم ہو جاتی ہے اور اس سے ہر قسم کی نباتات پیدا ہونے لگتی ہیں یہ اسلئے کہ اللہ جو سرتاسر حق ہے مُردوں کو زندگی عطا فرماتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے (جب یہ تمہارا مشاہدہ ہے کہ مُردہ زمین زندہ ہو کر سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے تو اب اسکا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ) بلاشبہ قیامت آئے گی۔ اور اللہ قبروں سے مُردوں کو زندہ کر کے اُٹھائے گا۔

یہ آیات نمونے کے طور پر نقل کیگئی ہیں ورنہ عقائد کے باب میں قرآن حکیم دلائل سے بھرا پڑا ہے اب دیکھو قرآن کریم کے دلائل کتنے آسان، عام فہم اور فطرت ضمیر کے قریب ہیں اور عوام و خواص دونوں کو کس طرح ان سے تسلی ہوتی ہے، نہ تو قرآنی دلائل کے مقدمات مغلق اور مرکب ہیں

اور نہ قرآن کا استدلال غیر فطری ہے وہ جو کچھ کہتا ہے ضمیر و وجدان سے کہتا ہے اور اس طرح کہتا ہے کہ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ اسکے مقابلہ میں فلاسفہ متکلمین اور حکما راسلام کے دلائل پر نظر کرو اور فیصلہ کرو کہ ہدایت کا طریقہ کون سا ہے اور اذعان و ایقان کا نور کس سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک قرآن کی مشکلات کو قرآن ہی سے حل نہ کیا جائے گا۔ اور فلسفیانہ طرز استدلال سے آنکھیں بند نہ کیجائیں گی اسوقت تک قرآن کی عظمت آشکارا نہ ہوسکے گی اور ہم اجنبیوں کی طرح قرآن تک پہونچنے میں ٹھوکریں ہی کھاتے رہینگے حکما راور متکلمین کی موشگافیاں تو ان متعدد پردوں میں سے ایک پردہ ہیں جو قرآن کریم پر ڈالے گئے۔ اور ان مشکلات میں سے ایک مشکل ہیں جو کتاب الہی کے قریب جانے والوں کے راستہ میں حائل کی گئیں۔ انکے علاوہ اور بھی بہت سی جھاڑیاں ہیں جو ہر جویائے حقیقت کے راستے میں آتی ہیں اور جنسے دامن بچاکر نکل جانا صرف اسیکا کام ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے سمجھنے کا وہ طریق بتادے جو خود اس کتاب نے بیان فرمایا ہے اور جسکے متعلق ہم شروع میں عرض کرچکے ہیں کہ انسان اپنے ہر سوال کو قرآن کے سامنے پیش کرے۔ اور اسی سے اسکا حل طلب کرے ۔

متکلمین اور حکما کون ہیں؟

ہم نے بتایا ہے کہ عقائد کے اثبات میں جو طریق استدلال خود قرآن پاک نے اختیار کیا ہے وہ سراسر عقلی ہے مگر پیچیدہ اور غامض نہیں ہے۔ اس لیئے قلوب پر اُس کا اثر ہوتا ہے۔ اور ضمیر ایقان واذعان کی دولت سے مالا مال ہوجاتا ہے۔ بخلاف متکلمین اور حکمار اسلام کے کہ وہ ہمیشہ پیچیدہ اور پیٹر طار استہ اختیار کرتے ہیں اور قرآن کے فطری استدلال کو چھوڑ کر محض فرضی اور امکانی باتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں ۔

ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ بدگمانی پیدا ہو کہ ہم نے نعوذ باللہ حکما راسلام اور متکلمین عظام کی توہین کی ہے یا ہم اسلاف کی کوششوں اور علمی خدمتوں کو نظر حقارت دیکھتے ہیں، اس لیئے ہم یہاں یہ حقیقت واضح کردینا چاہتے ہیں کہ اس شبہ میں وہی شخص مبتلا ہوسکتا ہے جو "متکلمین اسلام" اور حکمار اسلام کی

اصطلاحوں سے نا واقف ہو اور علم کلام کی بنیادی چیزوں پر اُس کی نظر نہ ہو۔ اس بدگمانی کے ازالہ کے لیے صرف اتنا کیے دیتے ہیں کہ حکما، اسلام اور متکلمین اسلام کی حقیقت بتا دیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور خود انہوں نے علم کلام کی وادی میں قدم رکھ کر اور ناکامی کا مُنہ دیکھ کر کس طرح علم کلام سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

حکمارِ اسلام سے عموماً یعقوب کندی (معاصر مامون الرشید) فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) بوعلی ابن سینا۔ ابن مسکویہ (متوفی ۴۲۱ھ) اور رسائل اخوان الصفا کے مصنف مراد لیے جاتے ہیں۔ اب ذرا ان کا حال ملاحظہ ہو۔ امام غزالی نے بوعلی سینا کو اس بنا پر کافر کہا کہ وہ جسمانی معاد کے منکر تھے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ "الملاحدۃ الباطنیۃ" کا ذکر کرتے ہوئے بوعلی سینا کی نسبت فرماتے ہیں۔

وکان ابن سینا واھل بیتہ من اھل دعوتھم (ابن سینا اور اس کا خاندان باطنی فرقہ کا داعی تھا)[۲]

رسائل اخوان الصفا کے مصنف تو مسلمہ طور پر باطنی فرقہ کے پیرو تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنا نام تک ظاہر نہ کیا شیخ الاسلام نے اپنی تصنیفات میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ رسائل کے مصنف باطنی تھے اور باطنی فرقہ مسلمانوں میں سے زیادہ گمراہ اور باطل فرقہ ہے[۳] اخوان الصفا کے مصنفین کے بعض نام وزیر قفطی نے اپنی کتاب "اخبار الحکما" میں نقل کیے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کون بزرگ تھے۔ علاّمہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اپنی کتاب "عمر خیام" میں حکمارِ اسلام کے چہرہ کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے، بہتر ہے کہ اصل بحث کو عمر خیام میں بھی دیکھ لیا جائے۔

اب رہے متکلمین اسلام سو اس گروہ میں علامہ اسفرائنی۔ ابوبکر باقلانی۔ ابن فورک۔ امام الحرمین امام غزالی، امام رازی، شہرستانی وغیرہ حضرات شامل ہیں اور جو اسلام کے اچھے وکیل گزرے ہیں مگر ہمیں عقائد کے بارے میں طریق استدلال سے اختلاف ہے، ان میں سے اکثر ارسطو اور افلاطون کے طریق

---

[۱] دیکھو علامہ شبلی مرحوم کی کتاب علم الکلام ص۲۳ ۱۲

[۲] رسائل کبریٰ لابن تیمیہ ص۱۳۵ ۱۲

[۳] کتاب النبوات لابن تیمیہ ۱۲ [۴] تاریخ الحکما قفطی ذکر رسائل اخوان الصفا ۱۲

استدلال کے شیدا تھے جسکے باعث عقائد کے اثبات میں وہ قرآن سے دُور جا پڑے، علامہ شبلی مرحوم خدا کے وجود پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان تمام تقریروں سے تم کو معلوم ہوا ہو گا کہ افلاطون اور ارسطو اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے اور متکلمین بھی چونکہ ان ہی کے نقش قدم پر چلے تھے۔ اسلیئے وہ بھی ناکام رہے[1]"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے علم و فضل سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ وہ کتاب النبوات میں متکلمین کو "اولٰئک المتکلمین المبتدعین" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور ایک مقام پر تو صاف لکھتے ہیں کہ:-

ان کثیراً مما یتکلم المتکلمون باطل (متکلمین کی اکثر باتیں غلط اور باطل ہیں[2])۔

علاوہ ازیں اسلام میں اگرچہ امام غزالیؒ اور امام رازی کا پایہ بہت بلند ہے اور انکی خدمات علمی و تفسیری سے مسلمان قیامت تک بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے تاہم خود انہیں سے پوچھو کہ انکے نزدیک علم کلام کا کیا درجہ ہے۔ امام غزالیؒ تمام منازل طے کرنے کے بعد علم کلام کی بحثوں سے توبہ کر لیتے ہیں اور نہ صرف توبہ بلکہ اس کی سخت مذمت بھی فرماتے ہیں[3]۔ امام رازی جو متکلمین میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ انکا اپنی آخری عمر میں یہ اعتراف سننے کے قابل ہے۔

قد تاملت طرق الکلامیۃ ومناھج الفلسفیۃ فما رأیتھا تشفی علیلاً ولا تروی غلیلاً ورأیت اقرب الطرق طریقۃ القرآن۔

(میں نے علم کلام اور فلسفہ پر خوب غور کیا مگر میں نے دیکھا کہ ان سے نہ تو کسی مرض کا ازالہ ہوتا ہے اور نہ قلب کو اطمینان، میں نے تو یہ دیکھا کہ قرآن حکیم ہی کا طریقہ (عقل و ضمیر سے) قریب تر ہے[4]

---

[1] الکلام صفحہ ۲۳ ۱۲ [2] الرد علی المنطق لابن تیمیہ بحوالہ علم الکلام شبلیؒ صفحہ ۱۵۴ ۱۲

[3] اسکے لیئے امام صاحب کی کتاب "التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" اور "المنقذ من الضلال" کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ۱۲

[4] الفرقان لابن تیمیہ مشمولہ رسائل کبریٰ صفحہ ۱۱ ۱۲

گویا جس علمی سمندر میں انہوں نے ساری عمر شناوری کی اس کا آخر نتیجہ خود ان ہی کے الفاظ میں یہ نکلا کہ اس سمندر سے کسی کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔

(نوٹ: دورثانی کے الہلال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے "حجت ابراہیمی" کے زیرعنوان مضمون کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا جو کسی طالب قرآن کے شکوک کے جواب میں تھا اس میں مولانا آزاد نے امام رازیؒ کے طریق استدلال پر جس طرح ماتم کیا ہے اور اس کو جن الفاظ میں غیر قرآنی اور قرآن سے دور کر دینے والا بتایا ہے وہ الہلال دورثانی کو سامنے رکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

امید ہے کہ جو لوگ علم کلام سے واقف نہیں ہیں، وہ حکماء اسلام اور متکلمین اسلام کی اصطلاحوں سے مرعوب ہو کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جو شخص انکے طریق استدلال پر تنقید کرتا ہے وہ (نعوذ باللہ) انکی تحقیر کرتا ہے۔ ان کو شبہات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ سطور کافی ہونگی۔

ہم اسلافؒ میں سے کسی کی تحقیر و تذلیل کے خیال تک کو جائز نہیں سمجھتے لیکن ان میں سے کسی کے ذاتی خیال کو تنقید سے بالاتر قرار نہیں دیتے کہ ایسا کرنا شخصیت پرستی ہے۔ جس کی قرآن کریم اجازت نہیں دیتا والعصر للہ۔

خط وکتابت

کرتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوش خط لکھیے!

تفسیر اسرار خودی مبحث ششم

(در رسالہ محمد یوسف خاں سلیم چشتی)

(گزشتہ سے پیوستہ)

جواب اول

اگرچہ کے معنی اطاعت اور اختیار کے معنی حکومت کے لیے جائیں تو اس سوال کا جواب یہ ہوگا کہ حکومت کے لیے صلاحیت شرط اولین ہے اور یہ صلاحیت ایک زبردست ڈسپلن سے پیدا ہوتی ہے اور ڈسپلن اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے +

حکومت وہ قوم کرسکتی ہے جسنے قومی اور انفرادی سیرت (اخلاق) کی تکمیل کرلی ہو۔ اور کیرکٹر کی تکمیل اسوقت تک ناممکن ہے جب تک ان اصولوں کی پابندی نہ کی جائے، جو انسانی کریکٹر (سیرت) کو پختہ اور استوار کرتے ہیں اور اصولوں کی پابندی کا دوسرا نام اطاعت ہے۔

انگریزوں کو دیکھیے وہ ربع مسکوں پر حکمراں ہیں لیکن کیوں؟ کیا اس لیے وہ ابناء اللہ ہیں؟ ہرگز نہیں کیا اس لیے کہ وہ سفید فام ہیں؟ ہرگز نہیں محض اس لیے کہ انھوں نے ایک (RIGID DISCIPLINE) شدید پابندیٔ نظام کو اپنا شعار حیات بنا رکھا ہے اور صدیوں سے وہ اسکے پابند چلے آرہے ہیں جس کی بنا پر ان کی قومی سیرت کی تکمیل ہوگئی ہے اور اطاعت کا رنگ انکے رگ و پے میں سرایت کرگیا ہے۔

اطاعت کی روح :۔ اطاعت کی روح قربانی ہے اسی لیے اسلام کی بنیاد بھی قربانی پر رکھی گئی ہے۔

حسین و سادہ و رنگین ہے داستان حرم　　نہایت اسکی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

(نہایت یعنی انتہا)

قربانی کے کیا معنی؟ اور کس کی قربانی؟ دنبوں اور بکریوں کی قربانی جو مسلمان صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں؟ نہیں بلکہ انفرادی خواہشات اور قلبی آرزوں کی قربانی، ذاتی اور شخصی راحت اور آرام کی قربانی، اور اولاد کی قربانی +

دنبوں کی قربانی کیسی قوم کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے لیکن قومی سیرت

کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اسکے لیۓ اپنی قربانی درکار ہے، اطاعت کے معنی ہیں دوسروں کے احکام کو اپنی خواہشات پر مقدم کرنا مثلاً میرا دل چاہتا ہے کہ عیش کروں لیکن قوم حکم دیتی ہے کہ نہیں ساری زندگی سمندروں کی گہرائی معلوم کرنے میں صرف کرو۔ تو مجھے اپنی خواہشات کو بالاۓ طاق رکھ دینا چاہیۓ۔ اطاعت کے معنی ہیں، افراد کو قوم کی بہبود کے لیۓ قربان کر دینا مثلاً جب ۱۸۵۷ء میں انگریز لفٹنٹ ولوبی (WILLONG H B) نے جو دلی میگزین کا انچارج تھا، یہ دیکھا کہ میگزین عنقریب ہمارے دشمنوں کے قبضہ میں آنے والا ہے تو وہ اسکے ساتھ بارہ سپاہی سب کے سب، بارود کو آگ لگا کر، بھک سے اُڑ گئے اور اُڑتے اُڑتے، حکومت ہند کا منشور اپنی قوم کے نام لکھ گئے۔

اطاعت سے کیا پیدا ہوتا ہے

اطاعت سے افراد میں، یکسانیت کا رنگ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ ہر فرد، ایک ہی مقصد کے حصول کے لیۓ، ایک ہی ضابطہ کی پابندی کرتا ہے اور اس کا رنگ یکسانیت سے "یک نگاہی" پیدا ہوتی ہے یک نگاہی کیا چیز ہے؟ جملہ افراد کا ایک ہی مقصد کے درپے ہونا

مردہ؟ از یک نگاہی زندہ شو!

بگزر از بے مرکزی پائندہ شو!

اور جب کوئی قوم زندہ ہو جاتی ہے تو پھر حکمرانی کیا دشوار ہے؟

آج اگر مسلمانوں کو حکومت حاصل ہو جائے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ ایک عالم دوسرے عالم کے خون کا پیاسا، ایک مذہبی جماعت دوسری جماعت سے برسرپیکار، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا کو فنا کرنے پر آمادہ نظر آئے گا، یہی تو وجہ ہے کہ اس قوم سے حکومت چھین لی گئی۔

الغرض اختیار، تکمیل اخلاق حسنہ پر موقوف ہے اور اخلاق کی تکمیل، دستور العمل کی پابندی پر منحصر ہے اور اسی پابندی کا دوسرا نام اطاعت ہے

جواب ثانی

اگر جبر و اختیار کو مصطلحاتِ فلسفہ قرار دیا جائے تو پھر اُسکے یہ معنیٰ ہونگے کہ فرض کر لیجئے انسان مجبور ہے، جیسا کہ وہ بعض اُمور میں نظر آتا ہے، تو اب قدرتی طور سے ہر مجبور، مختاری کا طالب ہے، پس حصُولِ اختیار کی صُورت یہ ہے کہ حالتِ صبر پر سرِ تسلیم خم کر دو۔

انسان کی عادت یہ ہے کہ وہ سرِ تسلیم خم کرنا نہیں چاہتا۔ ہر لحظہ طغیان اور سرکشی پر آمادہ رہتا ہے نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ آخر دم تک اس میں شانِ اختیار پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر انسان ایک مرتبہ اِس عقیدہ پر جم جائے کہ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرونگا کیونکہ اسکے علاوہ کسی میں نفع یا نقصان پہونچانے کی طاقت نہیں ہے، تو اس استقامت کی بدولت اس میں ایک بات یہ پیدا ہو جائے گی۔

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

یعنی یہ صفت اسکو بے خوف اور نڈر بنا دے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہ ہو سکیگا اسکے اندر (WILL TO CONQUER) تسخیرِ کائنات کا ایک جذبۂ بے پناہ پیدا ہو جائے گا، اور یہ جذبہ اسکے جبر کو اختیار میں تبدیل کر دیگا۔ یعنی اگرچہ خدا نے انسان کو مجبور بنایا ہے لیکن جب وہ انسان مسلکِ جبر پر عامل ہو کر اپنے اندر شانِ اختیار پیدا کرے گا تو خدا بھی اُسے مختار بنا دیگا۔ اور اگرچہ بظاہر وہ مجبور ہی نظر آئے گا لیکن بباطن اس کی تلوار اقوامِ عالم کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرے گی +

جبرِ خالد عالمے برہم زند +
جبرِ ما بیخ و بنِ ما برکند +

حضرت خالدؓ بھی ہماری طرح مجبور پیدا ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے غیر اللہ کا خوف دل سے نکالدیا، اور سوائے خدا کے ساری کائنات کو ہیچ یقین کیا اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غزوہ موتہ

میں تو تلواریں اُن کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔ اوران ٹکڑوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

ہم بھی خالدرضؓ کیطرح مجبور پیدا ہوئے ہیں لیکن ہم نے اللہ تعالےٰ کے بجائے قوت فرمانرواکو اپنا معبود قرار دیا اور غیر اللہ کے خوف سے اپنی خودی کو مُردہ کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری پیشانیوں پر غلامی کا داغ لگا ہوا ہے۔ اور تلوار کے ٹکڑوں کی جگہ ہماری جھولیوں میں بھیک کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں ؞

الغرض حضرت خالد بھی مجبور تھے، اور ہم بھی مجبور ہیں یعنی جہاں تک عقیدۂ جبر و اختیار کا سوال ہے ہمارے عُلمائے اہلسنت یہی کہیں گے کہ دونوں مجبور ہیں لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ خالدرضؓ نے مجبوری کے باوجود سلطنتوں کے تختے اُلٹ کر رکھ دیئے اور ہم اپنی غلامی کی زنجیروں کو بھی نہیں توڑ سکتے ؟

اسکی وجہ یہی ہے کہ خالدرضؓ کا طریق حیات کچھ اور تھا۔ ہمارا طریق حیات کچھ اور ہے خالدرضؓ کا مسلک تھا اطاعت، ہمارا مسلک ہے بغاوت، جب طریق حیات مختلف ہے تو نتائج حیات بھی لازمی طور سے مختلف ہونگے۔

خالدرضؓ دستور الہٰی کی اطاعت کرتے تھے ہم دستور الہٰی کی خلاف ورزی کرتے ہیں پھر غلط کیا ہے جو اکبر لکھتے ہیں ؎

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

مشاہدۂ فطرت

کارگاہ فطرت پر نظر ڈالو ہر جگہ قانون کی پابندی یعنی اطاعت کا رنگ نظر آئے گا۔ ع

ذرّہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے

کارگاہِ فطرت میں جو چیز اطاعت نہیں کرتی وہ زندہ نہیں رہ سکتی (باقی آئندہ)

علامہ اقبالؒ کے مسلک سے اختلاف؟

(از جناب خواجہ عبدالحفیظ صاحب بی اے)

عیب من کم جوئے وا زجام م عیارِ خویش گیر
لذّتِ تلخابِ من بے جانِ غم فرسودئے (اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ کی وفاتِ حسرت آیات کے فوراً بعد آپ کے کلامِ بلاغت التزام پر ملک کے ہر گوشہ سے تنقید و تبصرہ کا لامتناہی سلسلہ جاری ہوگیا۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اکثریت اُن اصحاب کی ہے جنہیں علامہ کی بیش بہا خدمات پر خراجِ تحسین ادا کرنا مقصود ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو آپکے کلام میں بے بصری کی بنا پر کمزوریاں پاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ علامہؒ کا کلام اپنے ابتدائی مراحل میں بہ نسبتاً اپنے آخری حصّہ کے زیادہ بلند اور وسیع تھا، اسکے ثبوت میں بانگِ درا سے چند نظمیں مثلاً ہمالہ، ترانہ ہندی، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ جب علامہؒ نے دیکھا کہ اس ملک کے بسنے والے آپکے ان وطنی "ترانوں" سے یکجا نہیں ہوتے، اور آپ کا "نیا شوالہ" تعمیر ہونے میں نہیں آتا تو آپ نے ناامید ہوکر مذہب کی جانب رجوع کیا تاکہ اپنی قوم کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ آپ نے "ترانہ ہندی" کے بعد "ترانہ ملی" لکھا اور ازاں بعد آپ کی تمام تر کوشش اپنی قوم کی اصلاح و بہبود میں صرف ہوئی اس قسم کا ایک اعتراض یہ ہے :-

"ہر چند مجھے اس (اقبالؒ) کے مسلک خیالات سے شدید اختلاف تھا۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود مجھے اسکے شاعرانہ کمال اور اس کی مفکرانہ عظمت سے کب انکار ہے . . . .

ابتدا میں ہر عظیم شاعر کی طرح اقبال کی شاعری بھی وسیع اور آفاقی شاعری تھی اس کی نظر دُور رَس اور اس کا سینہ چوڑا تھا مگر اسکے بعد بعض وجوہ کی بنا پر اس کی شاعری کا دائرہ تنگ

ہونے لگا۔ اور آخر کار یہاں تک تنگ ہوگیا کہ اسکی تمام تر شاعری مذہب تک محدود ہوکر رہ گئی"

سمجھ میں نہیں آتا کہ علامہؒ کے سینہ نے جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہ تھی، یہ ترقیٔ معکوس کب اور کیونکر کی۔ اگر علامہؒ کے سینہ کی کشادگی آپ کی وطنی شاعری ہی پر منحصر ہے تو ہمارا دعوےٰ ہے کہ ہر عظیم شاعر کی طرح علامہؒ کے جذبات اور تخیل کی پرواز آپ کے کلام کے آخری حصے میں پہلے سے کہیں بالاتر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معترض نے یا تو علامہ کا کلام پڑھا نہیں یا اس پر صرف ایک کورانہ نگاہ ڈال کر ایسی بے سروپا تنقید کی ہے ورنہ اگر علامہؒ نے "بانگ درا" میں جو کہ آپکے کلام کا اولیں مجموعہ ہے "وطن" کے متعلق علاوہ مذکورہ بالا نظموں کے یہ بھی لکھ دیا ہے

۱۔ رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں!
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو ۔۔۔ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
(۲) سمجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں ۔۔۔ عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا
(۳) جو گھر سے اقبال دور رہوں میں تو ہوں نہ محزون عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا،

تو دیکھئے آپنے اپنے تازہ کلام میں وطن کے متعلق کس قدر کشادگی، وسعت اور فراخدلی سے کام لیا ہے۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
(ضرب کلیم)

علامہ اقبالؒ اپنی تازہ ترین تصنیف "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں بعنوان "اشکے چند برافتراق ہندیاں" بدیں الفاظ خون کے آنسو بہاتے ہیں:۔

ہندیاں بایکدگر آویختند ۔۔۔ فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں ۔۔۔ ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں

کس نداند جلوۂ آب از سراب   انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!!!

اے ترا ہر لحظہ فکر آب و گِل   از حضورِ حق طلب یک زندہ دل

اے جواں[1] دامانِ او محکم بگیر   در غلامی زادہ، آزاد میر ؎

پس نہ تو یہ درست ہے کہ اقبالؒ کی تمامتر شاعری مذہب کے تنگ دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئی اور نہ یہ سچ ہے کہ اقبالؒ کی آخری شاعری میں وہ وسعت نہ رہی جو آپ کی ابتدائی (وطنی) شاعری میں تھی جہاں تک حب الوطنی کا تعلق ہے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ امر واضح ہے کہ وطن کے متعلق جو نظریہ حضرت علامہؒ نے برسوں ہوئے "بانگ درا" میں پیش کیا تھا وہ آپکے آخری مجموعہ کلام میں کس قدر بلند، وسیع اور دلکشا ہے:۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ صرف مسلمانوں ہی کا خیر خواہ نہیں بلکہ اُسکے دل میں تمام مشرق کا درد تھا حب الوطنی کے جذبہ نے علامہؒ کی شاعری کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ آپ کے تخیل کی وسعت تمام براعظم ایشیا پر چھا گئی۔ "ضربِ کلیم" کے صفحۂ اول پر ہے۔

زمانہ با اُمم ایشیا چہ کرد و کُند ؎

کسے نبود کہ ایں داستاں فرو خواند

اسی کتاب کے صفحہ ۲ پر پہلا شعر ہے۔

عطا ہوا خس و خاشاکِ ایشیا مجھ کو

کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بیباکی

گویا اقبالؒ پنجابی اور ہندوستانی کی حدود سے نکل کر تمام اقوامِ مشرق سے (جن میں چینی، جاپانی، ایرانی وافغانی بھی شامل ہیں) یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق!   باز روشن می شود ایّامِ شرق

اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر   چرب دستیہائے یورپ درنگر

قالی از ابریشم تو ساختند ؎   باز او را پیش تو انداختند ؎

---

[1] یہاں جوان سے مراد مسلمان نہیں بلکہ ہر ہندی غلام

چشم تو از ظاہرش افسوں خورد — رنگ و آب او ترا از جا برد
وائے آں دریا کہ موجش کم تپید — گوہر خود را ز غواصاں خرید

"جاوید نامہ" میں ایک اور نکتہ پیش کرتے ہیں جس کی وسعت کے سامنے مشرق و مغرب کی حدیں "قاب قوسین" کے مصداق نظر آتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔

آں کف خاکے کہ نامیدی وطن — ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہل وطن را نسبتے است — زانکہ از خاکش طلوع ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر — نکتۂ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب — با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز درون — تا ز قید شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست — تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است — گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

یہ چند اقتباسات شاہد ہیں کہ علامہؒ کے دل میں "وطن" کی محبت کسی سے کم نہیں وہاں یہ بھی ظاہر ہے کہ اُنکے نزدیک مرد حُر کا کوئی وطن نہیں، یہ تمام کرۂ ارضی مردان مجاہد کی "میراث" ہے لیکن اس بلند پایہ اور وسیع جذبہ کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا خون ہے کہ۔۔

ہر ملک ملک ماست کہ مُلک خدائے ماست

ہندوستان کے غلام اس جذبہ کو کیا سمجھیں گے جن کی "حُب الوطنی" صرف ہندوستان تک محدود ہے

اقبال اور مذہب

یہ اعتراض کہ اقبالؒ کی شاعری مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی کیسا عظیم الشان دہوکہ ہے حالانکہ اقبالؒ کی شاعری کی تمام وسعت محض مذہب ہی کی بدولت ہے۔ اقبالؒ مذہب کا دلدادہ تہا۔

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانہ میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
مرے سبو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب — نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

ہندوستان کے مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے مرض کے متعلق ارشاد ہے۔

مسلم ایں کشور از خود ناامید ٭ عمرہا شد با خدا مردے ندید ٭
لاجرم از قوتِ دیں بدظن[1] است ٭ کاروانِ خویش را خود رہزن است
از سہ قرن ایں امتِ خوار و زبوں ٭ زندہ بے سوز و سرور و اندروں
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق ٭ مکتب و ملائے او محروم شوق ٭
سستیٔ اندیشہ او را خوار کرد ٭ افتراق او را ز خود بیزار کرد ٭
تا نداند از مقام و منزلش ٭ مُرد ذوقِ انقلاب اندر دلش
جمع او بے صحبتِ مردِ فقیر ٭ خستہ و افسردہ و حق ناپذیر ٭
بندۂ ردکردۂ مولا ست او ٭ مفلس و قلاش و بے پرواست او
نے بکف مالے کہ سلطانے خرد ٭ نے بدل نورے کہ شیطانے برد

شیخ او لُرد[2] فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید ٭

اسلام پر ایسے انحطاط کے دور کئی آئے اور گزر گئے۔ عہدِ عباسیہ کے آخری ایام میں مسلمانوں کی حالت ہندوستان کی موجودہ حالت سے کم نہ تھی لیکن یہ حقیقت وضاحت طلب نہیں کہ آج کل ہم ایسے مرض میں مبتلا ہیں جو عہدِ عباسیہ یا اسلام کے کسی اور دورِ انحطاط میں ناپید تھا اور وہ غلامی ہے بقول علامہؒ

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد ٭ گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تر است ٭ من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

غلامی مذہبی روح کے گم ہونے ہی سے پیدا ہوتی ہے، علامہؒ کے نزدیک مذہب کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن !
اے مسلماں مردن است ایں زیستن

---

[1] اس لیے کہ دین اُسے محض ایک ذہنی لباس نظر آتا ہے [2] انگریزی لفظ لارڈ کا مفرس ہے

مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے غیر متعصب اصحاب کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اور اسی وجہ سے عالمگیر مذہب ہے۔ اسلام دنیا بھر کے مذاہب میں ایک خصوصیت کا مالک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام "خدا کے ساتھ انسان کے انفرادی طور پر ذاتی عقیدہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیاتِ اجتماعی کا نام ہے":-

ہست دین مصطفٰی دین حیات
شرعِ او تفسیر آئین حیات!

اور مسلمان کا کوئی فعل مذہب کی روح سے خالی نہیں ہو سکتا۔

۱۔ اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری،
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی،

۲۔ قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں — جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں

۳۔ ملتِ ما را اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است،
("دیگر است" یعنے اور اقوام کی طرح خاک و خون پر منحصر نہیں بلکہ ایمان پر ہے جو دل میں مضمر ہے)

۴۔ از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود — پختہ چوں وحدت شود ملت شود

علامہؒ کا مذہب قدامت پسند ملّاؤں کی طرح نہیں ہے جو طہارت کے مسائل ہی میں ختم ہو جاتا ہے اقبالؒ کا مذہب اپنی پریشاں خاطر اور مُردہ قوم میں اسلام کے صحیح جذبات یعنی اخوت، اتحاد اور خودداری کا پیدا کرنا ہے، ترکانِ احرار کو جو شومیٔ قسمت سے دورِ زماں کی لپیٹ میں آگئے تھے علامہؒ انکے اصلی مقام سے یوں آگاہ کرتے ہیں:-

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جنکے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

ترکان کمال بھی ہمارے معترض کی طرح اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں کہ دین اور سیاست میں کوئی رابطہ نہیں، چنانچہ دیکھئے اسپر علامہؒ فرماتے ہیں :-

خرد را با دلِ خود ہمسفر کن ٭ دمے بر ملّتِ ترکاں نظر کن ٭

بہ تقلیدِ فرنگ از خود رمیدند میانِ مُلک و دیں ربطے ندیدند

علامہ اقبالؒ کے مندرجہ ذیل اشعار میں دُنیائے اسلام کی ارتقا اور وسعتیں ملاحظہ ہوں۔

1- یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ٭ کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

2- رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

3- پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مُسلماں کی ستارے جسکی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

4- عجب کیا گر مہ و پرویں ترے نخچیر ہو جائیں "کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را"

5- مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے اس کا وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

6- غلامِ ہمتِ بیدارِ آں سوارانم ٭ ستارہ را بسنانِ سُفتہ در گرہ بستند ٭

7- فرشتہ را دگر آں فرصتِ سجود کجاست کہ نوریاں بتماشائے خاکیاں مستند

8- درمعرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت اے بندۂ مومن تو کجائی؟ تو کجائی؟

9- اگر عنانِ تو جبریلِ و حور می گیرند کرشمہ بردلِ شاں ریز و محرمانہ گزر

10- یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں! (ق) ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں زیرِ پر آگیا تو یہی آسماں زمیں

یہ اشعار علامہؒ کے تخیل کی محض پرواز نہیں، بلکہ تاریخی شواہد ہیں۔ اقبالؒ کے مذہب کی وسعتوں کے سامنے بحر و بر تو کجا دو جہاں کی وسعتیں تنگ نظر آتی ہیں۔

چہ عجب اگر دو سلطاں بولائتے نگنجند ٭

عجب اینکہ می نگنجد بدو عالمے فقیرے

اقبال اور قومیت :- وطنیت اور مذہب کی طرح قومیت کے متعلق بھی علامہؒ کی رائے عالمگیر تھی۔ اس

غلام آباد میں جہاں کے باشندے مختلف ادیان، مختلف زبانوں اور مختلف فرقوں کے پیرو کار ہیں ان کے لئے قومیت سے متعلق ایسے بلند اور ہمہ گیر نظریہ کی ضرورت تھی جو سب پر حاوی ہو جائے۔ علامہؒ نے جو خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد کے سیشن میں دسمبر ۱۹۳۰ء میں دیا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مشرق خصوصاً ہندوستان کی بہبودی کے لئے کس قسم کی قومیت درکار ہے آپ کے خطبہ کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ اسلام دیگر مذاہب کی طرح ایک ذاتی عقیدہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو نسل انسانی کے سیاسی، معاشرتی و تمدنی تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور جس کا نظام الہامی آئین سے وابستہ ہے

۲۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب ملک و نسب پر مبنی ہیں اور روحانی اور دنیوی زندگی کو الگ الگ سمجھتے ہیں اس تخیل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی سیاست مذہبی روح سے بالکل خالی ہے اور دنیا کے ممالک مثلاً یورپ زمین کے غیر مرتب اور بے شمار ٹکڑوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مقصد محض محدود قومی اور وطنی مفاد ہے نہ کہ نسل انسانی کی بہتری۔ یہ جماعتی خود غرضی ہے، انفرادی خود غرضی کو سب خود غرضی کہتے ہیں مگر جماعتی خود غرضی کو اسلام کے سوا کوئی خود غرضی نہیں سمجھتا۔ اتحاد نسل انسانی اسلام اور صرف اسلام کا مقصد ہے۔

۳۔ رینان کا قول ہے کہ انسان نہ تو اپنی قوم کا حلقہ بگوش ہے اور نہ اپنے مذہب کا اور نہ ہی دریاؤں کے رخ اور سلسلہ ہائے کوہ کا غلام ہے، قوم ایک سلیم العقل اور زندہ دل گروہ عظیم کے اخلاقی رو سے متحد ہونے کا نام ہے علامہؒ کے نزدیک قومیت کی اس قسم کی تعریف ہندوستان پر اسی وقت صادق آ سکتی تھی جب اس میں کبیر کی تعلیم یا اکبر اعظم کا دین الٰہی برسر اقتدار رہتا، مگر یہ ملک مختلف ذاتوں، مذہبوں اور زبانوں کا گہوارہ ہے اور ان مختلف فرقوں میں سے کوئی ایک بھی کسی بڑے اور مکمل فرقے میں مجموعی طور پر جذب ہونے کے لئے کسی حالت میں بھی طیار نہیں اور اپنا وجود ہر حالت میں علیحدہ قائم رکھنا چاہتا ہے جب صورت حال یہ ہو تو ہندوستان میں ایک عالمگیر قوم کا قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر چھوٹی اور بڑی جماعت کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنے مذہب اور تمدن پر کاربند رہکر باقی اقوام کے ساتھ مجموعی حیثیت سے تعاون کرے۔

۴۔ اقبالؒ کا قول ہے کہ اگر ایک فرقہ دوسرے فرقہ یا فرقوں کا بدخواہ ہو تو وہ یقیناً کم ظرف اور قابل نفرت ہے۔ میں دوسری اقوام کی رسومات اُنکے آئین وقوانین اور مذہبی و معاشرتی درسگاہوں کا دل سے احترام کرتا ہوں اور یہی قرآنی تعلیم ہے، چنانچہ اگر ضرورت پڑے تو اغیار کے معابد کی حفاظت کرنا بھی میرا فرض ہے۔ لیکن باوجود اس بات کے میں اس فرقہ پسند گروہ کو دل سے چاہتا ہوں جو میری زندگی اور وضع کا معیار ہے اور جس نے مجھے اپنا مذہب، علم، خیال، تمدن دیکر اپنے تمام ماضی سے میری موجودہ حالت کو از سر نو تازہ کر کے مجھے وہ کچھ بنایا جو کچھ کہ میں ہوں۔"

یہ وہ بنیادی تخیل ہے جسنے علامہؒ کی شاعری کو "مذہب" میں محدود کر دیا۔ اور ہر معترض نے یہی کہیں ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ٭ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ ٭

اقبالؒ کے اسی نظریہ کو "ڈیلی ہیرالڈ" نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۳۸ء میں ان الفاظ میں سراہا ہے:-

" آپکی یاد میں ہر دوست و دشمن نے خراج تحسین ادا کیا۔ سر محمد اقبالؒ کی شہرت صرف شاعری کے خداداد عطیہ ہی کیوجہ سے نہ تھی بلکہ آپکی سیاستدانی کا بھی اس میں زبردست حصہ ہے لیکن آپ کی خدمات بحیثیت ایک فلاسفر کے آیندہ نسلوں کے لئے یادگار ہیں۔ سر محمد اقبالؒ اپنی زندگی خصوصاً اپنی آخری ایام میں غلطی سے فرقہ پسند سمجھے گئے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپکی فرقہ پسندی بھی "بین الاقوامیت" پر مبنی تھی یعنی نسل انسانی کی خدمت اور اتحاد آپکا ایمان تھا، اسلام کے ذریعے سے خالق حقیقی اور مخلوق خدا دونوں کی خدمت بھی آپ کے ایمان میں شامل تھی، پان اسلامزم آپکے نزدیک سیاسی عقیدہ نہ تھا۔ بلکہ بنی نوع انسان میں روحانی طریق سے اتحاد پیدا کرنا تھا سر اقبالؒ کے نزدیک مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہ تھا۔[1]

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

آپ کا مذہب تمام چیزوں پر محیط تھا۔ بحیثیت ایک صوفی کے آپکا ایمان تھا کہ تمام مذاہب حق پر ہیں، لیکن اسلام آپ کے نزدیک تمام مذاہب کے بہترین اصولوں کا مجموعہ ہے۔ زندگی کے آغاز میں آپ صرف ایک سیاست داں اور محب وطن تھے۔ لیکن محض حب وطن آپکے جذبہ

---

[1] علامہ کا مصرعہ ہے ۱۲

خدمت" اور قربانی کے لیے کافی نہ تھی یہ چیز ہے جو آپ کے شدید مذہبی جذبہ اور پان اسلامزم کے عقیدہ کی شرح کرتی ہے"[1]

قومیت کا یہ بلند ترین معیار اقبالؒ کے مذہب نے سکھا جیسا کہ مذکورۃ الصدر خطبۂ صدارت کے شروع میں وہ خود فرماتے ہیں "میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اسلام کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس کے قوانین نظامِ حکومت، تہذیب و تمدن، تاریخ و ادبیات سے پوری واقفیت بہم پہونچائی ہے۔"

اقبالؒ غلامی کے سخت دشمن تھے، یہ مسلّم ہے کہ اس شیدائی مذہب نے آزادی (ضدّ غلامی) کا سبق دیگر امور کی طرح مذہب (اسلام) ہی سے سیکھا جسے وہ انسانیت کبریٰ کے نام سے نامزد کرتے ہیں اگر یہ مان لیا جائے کہ اقبالؒ کی شاعری مذہب تک محدود ہے تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ آپکی محدود تعلیم (تعلیم خودی و آزادی) بھی مسلمان کے لیے ہے دوسری اقوام کے لیے نہیں ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ آپ ایشیا بھر کی غلام اقوام کی آزادی کے خواہشمند ہیں۔ع پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

مقامِ حیرت ہے کہ باوجود اُن تصریحات کے جن کا اظہار علامہؒ نے اپنے کلام میں جا بجا کیا ہے معترض کو علامہؒ کے مسلک سے "شدید اختلاف" ہے شاید علامہؒ نے ایسے ہی معترضین کی شان میں کہا تھا۔ کہ:۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

اقبالؒ کی بے تعصبی

اقبالؒ مذہب کے شیدائی تھے لیکن آپکا مذہب نہ تو "تنگ" اور "محدود" تھا اور نہ اس میں تعصب کے لیے گنجائش تھی اُنکے مذہب کی "تنگی" کی وضاحت اوپر کیجا چکی ہے۔ لیکن تعصب کی بنا پر اُنکے "تنگ نظر" ہونے کا الزام اگرچہ اعتراض میں واضح نہیں ہے لیکن چونکہ لامذہبوں کی یہ عادت ہوگئی ہے کہ جہاں مذہب کا نام آیا اور انہوں نے متعصب کہنا شروع کر دیا اسلیے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ علامہؒ تعصب کے سخت دشمن تھے۔ اور دُنیا کو اس سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ "بانگِ درا" میں اپنی مشہور نظم "تصویرِ درد" میں فرماتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جنکو سمجھا ہے بُرا تو نے

---

[1] اس اقتباس میں بعض باتیں غلط فہمی پر مبنی ہیں اور بعض ایسی جن کو زبردستی حضرت علامہؒ کیطرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ (طلوع اسلام)

سبحان اللہ! تمام نسلِ انسانی کو اپنا سمجھنے اور تعصب دُور کرنے کی کیا لطیف دلیل ارشاد فرمائی ہے اقبالؒ کو کسی مذہب سے پرخاش نہ تھی ہاں دوسرے مذاہب پر اپنے مذہب کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے جوہرانسان کی خصوصیت ہے کیا آپ مذہب دیگر انکے نزدیک تو مذہب کوئی اہم چیز ہی نہیں محض ایک لباس ہے جو بدل لیا جا سکتا ہے) یا اپنے اصول اور نظریہ کو غیروں کے اصولوں پر ترجیح نہیں دیتے ؟ ہاں اقبالؒ کے پاس اس ترجیح کے لئے معقول دلائل ہیں اور وہ یہ کہ اسلام کی بنیاد محبت اور عالمگیر اخوت پر ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہ اسلام ہی کی عالمگیر اُخوت کا نتیجہ تھا کہ آپ تعصب کی زہر کے لیے تریاق ثابت ہوئے آپکے کلام میں تہذیب فرنگ سے متعلق ایک بڑا حصہ ہے لیکن یہ اس لیے نہیں کہ آپکو حضرت مسیح علیہ السلام کے مذہب سے یا دیگر مذاہبِ مغرب سے عداوت تھی ہرگز نہیں، بلکہ اس لیے کہ آپکے نزدیک تہذیب فرنگ کے کُند خنجر سے "انسانیت" کی شاہ رگ کاٹی جا رہی ہے اور اس کے مقابلے میں اقبالؒ کا مذہب یعنی اسلام "عالمگیر اُخوت" اور "انسانیتِ کبریٰ" کا حامل ہے ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
مشکلاتِ حضرتِ آدم از وست — آدمیت راغمِ پنہاں از وست
درنگاہش آدمی آب و گل است — کاروانِ زندگی بے منزل است

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
درہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

اسلامی عالمگیر اخوت کو یاد دلاتے ہوئے، اقبالؒ مسلمانوں کو "انسانیتِ کبریٰ" کو برسرِ اقتدار لانے کی دعوت دیتے ہیں جس میں بنی نوع انسان کی اجتماعی طور پر بھلائی ہوتی ہے۔

فریاد از افرنگ و دلآویزی افرنگ ٭ فریاد زشیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزی افرنگ ٭ معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

مذہب اور وطنیت ایک اور نکتہ کیطرف اشارہ کرکے ہم اس مضمون کو ختم کرنا چاہتے ہیں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معترض نے اقبالؒ کا مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا لیکن اگر کیا ہے تو اقبالؒ کے مسلک سے "شدید اختلاف" کی وجہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ علامہؒ اور معترض کے نظریوں میں اصولی اختلاف ہیں معترض نے مذہب، قومیت اور وطنیت کے متعلق اپنا نظریہ کسی وقت بدیں الفاظ پیش کیا تھا۔

اس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے، مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی چادر ہے بدن کی جلد کیسی قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے ایسا کیوں ہے؟ اس لیئے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کردینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔

اس کے متعلق ہم جناب راؔزی (طلوع اسلام) کا قول نقل کرنے پر اکتفا کریں گے یعنی "کل تک اہل برما ہندوستانی تھے اور آج سیاسی مدبرین کی ایک جنبش قلم سے "برمی" ہوگئے" جس سے ظاہر ہے کہ وطنیت اور قومیت بدلی جا سکتی ہے۔

اس کے بالمقابل مذہب اور ملک کے متعلق جس میں قومیت اور وطنیت دونوں شامل ہیں۔ حضرت علامہ کا نظریہ یہ ہے کہ

ملک است تنِ خاکی و دیں روح رواں است

دونوں نظریوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جہاں علامہؒ کا نظریہ ٹھیٹ صداقت کی بنا پر ہندوستان کے غلاموں کی زندگی میں ایک عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہاں جناب معترض کا نظریہ واقعات کی کسوٹی پر پرکھے جانے کی تاب نہیں لا سکتا۔

(کتاب مسلسل) # معارف القرآن (سلسلہ کیلئے دیکھو طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۳۸ء)

(پرویز)

اور آگے بڑھیے تو تین خداؤں کا عقیدہ آجاتا ہے۔ عیسائیوں کا باپ، بیٹا، روح القدس، تین میں ایک، ایک میں تین کا عقیدۂ تثلیث۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (۵۔۷۳)

بلاشبہ ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ بجز ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں یونان کے اقنوم ثلاثہ کا عقیدہ جو آریہ ورت میں آکر روح مادہ اور خدا کا عقیدہ بن گیا وہ بھی تبعاً اس میں شامل ہے[1]

عرب کے بعض قبائل فرشتوں کو معبود سمجھتے تھے۔ اس کی تردید بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔ کہ فرشتوں میں یہ جرأت کہاں کہ وہ اپنے آپ کو معبود کہلائیں وہ تو خدا کے مکرم بندے ہیں اور خدا کے احکام کی اتباع کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِنْ دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ (۲۱۔۲۹)

اور ان میں سے جو یوں کہے کہ میں خدا کے سوا معبود ہوں تو ہم اس کو سزائے جہنم دیں گے اسی طرح ہم ظالمین کو سزا دیا کرتے ہیں

اور پھر اس الوہیت کیطرف آیئے جو انسانی عظمت و تقدس کا نقاب پہن کر عقیدت و ارادت کے راستے یوں غیر محسوس طور پر رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے کہ جب تک پھر جسم سے سارا خون نہ نکال دیا جائے اپنی جگہ نہیں چھوڑتی۔ یہ مذہبی احبار و رہبان علماء و مشائخ کو خدا بنا لینا ہے، حالانکہ اُن کی عبودیت اختیار کرنیکا کہیں حکم نہ تھا۔

---

[1] ہندوؤں کے ہاں یہ عقیدہ بھی تثلیث ہی کی طرح ہے۔ یہ برہما (خدا) پراکرتی (مادہ) اور آتما (روح) کو قدیم مان کر ایک میں تین اور تین میں ایک کے قائل ہیں مشہور فلاسفر رامانج اسی عقیدہ کا پرچارک ہے اور یہی عقیدہ اس کے فلسفہ میں ملتا ہے۔

DOCTRINE OF QUALIFIED NON-DUALISM

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۹ / ۳۱)

انھوں نے اللہ سے ورے ہی اپنے احبار و رہبان کو خدا بنا لیا اور مسیح ابن مریمؑ کو بھی۔ حالانکہ اُن کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ اسی ایک الٰہ کی پرستش کریں جسکے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ وہ انکے شرک سے پاک ہے۔

اس قسم کا شرک چونکہ اہل کتاب نے اختیار کر رکھا تھا اس لیئے ان کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ انبیاء، رسل۔ احبار و رہبان کو خدا بنا لینے کی تعلیم تو خدا کیطرف سے نہ تھی۔ آؤ تمہیں وہ سچائی بتائیں جو تمہاری تحریفات سے پہلے تمہاری آسمانی کتابوں میں موجود تھی نجران کے عیسائیوں کو جو حضورؐ نے دعوتِ مباہلہ دی تو اسکے بعد فرمایا:-

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (۳ / ۶۲)

اور اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ یقیناً وہی زبردست حکمت والا ہے۔

اور جملہ اہل کتاب کے متعلق فرمایا:-

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۲۹ / ۴۶)

اور اہل کتاب سے بہترین طریق سے بحث و مجادلہ کرو۔ سوائے انکے جو ان میں سے زیادتی کریں اور یوں کہو کہ ہم اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو تم پر نازل ہوا تھا اور تمہارا اور ہمارا الٰہ تو ایک ہی ہے اور ہم سب اُسکے حضور جھکنے والے ہیں۔

یہ حصّہ تو وہ ہے جہاں لوگوں نے محسوسات کو الٰہ بنا رکھا ہے۔ کسی نے پتھر کے بُت کی شکل میں، کسی نے گائے اور بچھڑے کی صورت میں، کسی نے اپنے انبیاء، رسل اور راونتاروں کے لباس میں۔ کسی نے احبار و رہبان کے نقاب میں۔ کسی نے روح اور مادّہ کو قدیم تسلیم کر کے۔ کسی نے اہرمن و یزداں کی الگ الگ صفات کے اعتبار سے لیکن قرآن کریم ان سب سے ایک قدم آگے جاتا ہے اور شرک کی

ایک ایسی شکل بیان کرتا ہے۔ جسے کسی انسان کی آنکھ بھانپ نہیں سکتی تھی۔ اس غیر محسوس شئے کو مشرک قرار دینا صرف خدائے علیم و بصیر ہی کا کام تھا۔ وہ خدا جو دل کی گہرائیوں میں گزرنیوالے خیالات سے بھی واقف ہے۔ سُنیئے کہ یہ شرک کی کون سی غیر مرئی صورت ہے اور غور فرمایئے کہ اتنی گہرائی تک پہونچنا دین کے اکمل ہونے کی شہادت ہے یا نہیں فرمایا:۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ۝ ۲۵

کیا تونے اس کو بھی دیکھا جنے اپنی خواہشات کو ہی اپنا الہ بنا لیا۔ تو کیا تو اُسکی نگرانی کر سکتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ۲۵

کیا تونے اس کو بھی دیکھا جسنے اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ اور اسے اللہ نے باوجود علم کے گمراہ کر دیا۔ اسکے کانوں پر اور قلب پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اس کو کون ھدایت دے سکتا ہے؟ کیا تم پھر بھی نصیحت نہ حاصل کرو گے۔

اس آیت مقدسہ کو سامنے رکھیئے اور پھر کبھی آج کی تمام مہذب دُنیا پر ایک نگاہ ڈالیئے اور کبھی اپنے دل کے نرم ترین گوشوں کو ٹٹولیئے اور دیکھئے کہ حقائق و بصائر کی کتنی دُنیا میں اس ایک ٹکڑے کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ ایک سے زیادہ الٰہ مقرر کر لینے سے فساد پیدا ہو جاتا ہے، غور کیجئے کہ آج جب کہ چاروں طرف خشکی اور تری میں فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے (ظہر الفساد فی البر والبحر) اسکی وجہ یہی نہیں کہ ہر ایک قلب صنم کدہ بن رہا ہے۔ ہر فرد اور افراد کا مجموعہ۔ ہر قوم۔ اپنی اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنائے بیٹھے ہیں اور اس خدا (یعنے خواہشات و جذبات) کے تغلب و تسلط میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھتے

جائز، بقول لینن۔ اور میکیاولی۔ وہ جس سے مقصد حاصل ہو جائے، ناجائز وہ جو حصول مقاصد میں مخل ہو۔" یہ ہیں وہ بت جنہوں نے آج اس دنیا کو جہنم زار بنا رکھا ہے، وہ بت جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی بلکہ یہ خود ذہنِ انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ اُن کا مسکن کوئی مسند نہیں بلکہ قلبِ انسانی ہوتا ہے۔ مال اور اولاد کا بت۔ عزت وجاہ کا بت۔ دولت و ثروت کا بت، حکومت و سلطنت کا بت، ملک و نسب کا بت اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزیٰ ہیں جو اسکے جملہ دماغ میں ہر آن تراشتے رہتے ہیں جنکے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے۔ لرزتا ہے گڑگڑاتا ہے۔ سجدے کرتا ہے ماتھے رگڑتا ہے۔ وہ بت جنکے متعلق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں :-

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو باوجود علم کے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ کیطرف راہ نمائی نہیں کر سکتے یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر انسان کے کان خطرات کی گھنٹیوں کیطرف سے بند ہو جاتے ہیں اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج و عواقب نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا قلب زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ بقول برنارڈ شا "یورپ جذبات کے دھارے پر بہے چلا جا رہا ہے' اور نہیں سوچتا کہ اسکا دہانہ کون سی ہلاکتوں کا سمندر ہے" یورپ میں علم کی کیا کمی ہے لیکن سارا علم کیا اسی تگ و دو میں صرف نہیں ہو رہا کہ ہمارے تغلب اور دوسروں کی ہلاکت کے لیئے کون کون سے طریق سب سے زیادہ مؤثر اور سریع النفوذ ہو سکتے ہیں کیا آج نوعِ انسانی پر جو خدا کی زمین اس درجہ تنگ ہو رہی ہے تو اس کی یہی وجہ نہیں کہ علم جذبات کے تابع چل رہا ہے! انسان نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا

معبود بنا رکھا ہے!! ان بتوں کو توڑ دیجیے اور انسان کے علم کو ایک الہٰ حقیقی۔ اس خدائے رب العٰلمین کی رضا جوئی کے ماتحت جہانبانی کرنے دیجیے پھر دیکھیے یہی دوزخ جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے یا نہیں علم کو اسوقت بھی اجازت ہو گی کہ وہ توپ اور بارود بنانے کی تراکیب سوچے لیکن توپ بنجانے کے بعد اس بات کی اجازت علم و عقل کو نہ ہو گی کہ اسکا رخ بھی اپنی مصلحتوں کے ماتحت متعین کر سکیں یہ چیز کوئی اور متعین کریگا کہ اس توپ کے گولے کی زد کہاں پڑنی چاہیئے یہ ظالم کا ظلم روکنے کے لیے استعمال کی جائیگی یا اسکا نشانہ کمزور و ضعیف کا سینہ ہو گا محض اِس جُرم کی بنا پر کہ وہ کمزور کیوں ہے!! اسکا فیصلہ توپ بنانے والا نہیں کریگا۔ بلکہ کوئی اور قوت کرے گی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر وحی کی ضرورت پڑتی ہے جہاں انسان آسمانی ہدایت کا محتاج ہوتا ہے جب انسان اپنے علم کے ماحصل کو خدا کے قوانین کے سپرد کر دیگا تو پھر یہی علم جو آج یوں انسانیت سوز بن رہا ہے۔ انسانیت ساز بنجائیگا۔ اور اسوقت سمجھ میں آجائیگا کہ لا الٰہ۔ اِلّا اللّٰہ کے معنی کیا ہیں۔
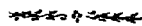
خلاصۂ بحث

عنوان زیر نظر سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ ایک بلند و بالا قوت کا احساس فطرتِ انسانی کے اندر وجدانی طور پر موجود ہے۔ اسی قوت کو الہٰ کہتے ہیں۔ فطرتِ صحیحہ کا تقاضا ہے کہ الہٰ حقیقی کا تصور اُسکے سامنے ہو لیکن جب فطرت خارجی اثرات سے زنگ آمیز ہو جائے تو حقیقی الہٰ کے بجائے باطل خداؤں کا تصور اُسکے سامنے آجاتا ہے۔ اسی باطل تصور کو مٹانے اور حقیقی الہٰ کی ذات کو اجاگر کرنے کے لیے خدا کیطرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے آسمانی ہدایت آتی رہی اور خدا کا یہ پیغام ازلی شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا۔ یہی پیغام اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر موجود ہے اور اسکے باہر کہیں نہیں۔ اس باطل عقیدہ کی جسقدر شکلیں انسانوں میں رائج ہو چکی تھیں، قرآن کریم ان سب کی تردید کرتا ہے، اور عقل و بصیرت کو اپیل کرکے حقیقی الہٰ کے ایمان کی صداقت پر دلائل پیش کرتا ہے اُسکے نزدیک یہ نظامِ کائنات ایک مربوط اور باہمدگر پیوستہ مشینری ہے۔ اور اس کارگہ حیات میں ایک شے

کی حرکت کا اثر دوسری شے پر پڑتا ہے حتے کہ یہ اثرات ایک علت العلل ایک آخری قوت پر اختتام پذیر ہوجاتے ہیں، اور وہ ذات الٰہ حقیقی ہے، نظام کائنات کی یک جہتی اور یگانگت اس بات پر دال ہے کہ اسکے پیچھے اسکے چلانے والی مشیت بھی ایک ہی ہو پھر اُس ایک مشیت کو تمام صفات حسنے کی حامل ہونا بھی ضروری ہے اسلیئے قرآن کریم مختلف گوشوں سے اسکی صفات کو واضح طور پہ سامنے لاتا ہے دوسری طرف وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ نظام کائنات کی ہر شئے اسکے تابع فرمان ہے اسلیئے اس کا کسی شئے کے سامنے جھکنا خود اسکی خودی ۔اس کی عزتِ نفس کے منافی ہے، لہذا جھکنا صرف اُسکے سامنے زیبا ہے جو اس سے بلند وبرتر ہو اور وہ صرف خدا کی ذات ہے حتے کہ انسان کو خود اپنی خواہشات کے سامنے بھی نہیں جھکنا چاہیئے بلکہ اپنی خواہشات کو ہمیشہ قوانین الٰہی کے تابع رکھنا چاہیئے اِسی سے دُنیا کا نظام امن قایم رہ سکتا ہے ۔

اللہ اسم ذات ہے!

لفظ اِلٰہ کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہر معبود کے لیے استعمال ہو سکتا ہے لیکن وہ معبود حقیقی کہ جسکے سوا کوئی اور ہستی پرستش کے قابل نہیں ۔ وہ ذات ہے جسکا نام اللہ ہے ۔ اِلٰہ کا ہمزہ حذف کرکے اسپر الف ۔ لام داخل کیا گیا ہے اور اسطرح یہ لفظ صرف اس ذات باری تعالےٰ کے لئے مختص ہو چکا ہے اسکے سوا کسی اور کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ صفات کے اعتبار سے تو خدا کے کئی نام ہیں لیکن ذات رب العلمین کے لیے صرف یہی ایک نام ہے ۔

حقیقت ذات کا ادراک

اللہ کیا ہے !! اس کی ہستی کیسی ہے !! یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب عقل انسانی کے احاطہ سے باہر ہے عقل درحقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے علم و مشاہدات سے حاصل کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ ذرائع جنکے توسط سے انسان اپنے علم و مشاہدات کو اکتساب کرتا ہے بالکل محدود ہیں ۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع سے جو کچھ حاصل کیا جائے گا وہ لامحدود کس طرح ہو سکے گا، وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا ہے کہ وہ خود کیا ہے وہ یہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے، وہ شخص جو مشینری کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز ہے وہ اس مشینری بنانے والے دماغ کی کنہ و حقیقت کا کس طرح احاطہ کر سکتا ہے ذات خداوندی کی ماہیت کا علم، انسان کی سرحد ادراک سے ماورا رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم عرفان (خدا کے پہچاننے) کا تقاضا نہیں کرتا، وہ صرف ایمان (مان لینے) کا تقاضا کرتا ہے (یہ ایمان کیوں ضروری ہے اس کی تفصیل

ایمان، عرفان

اپنی جگہ آئے گی) پھر جس چیز کو انسان براہِ راست نہ سمجھ سکے اس کے سمجھنے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اُس جیسی کسی دوسری شے سے اس کے متعلق اندازہ لگالیا جائے لیکن وہ ذات بے ہمتا وہ ہے جو وہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ :-

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۲۴/۱۱ ، اُس کی مثل کوئی شے نہیں

لہٰذا خدا کی ماہیت انسان کے ذہن میں کیسے آسکتی ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کے متعلق ایک مثال بیان فرمائی ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ کَمِشْکٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّهَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَکَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّکَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ، ۳۶-۳۵/۲۴

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا اُسکے نور کی مثال ایک طاق کی مانند ہے جس میں ایک چراغ ہو۔ وہ چراغ ایک قندیل میں ہو، وہ قندیل ایسا (صاف و شفاف) ہو گویا چمکتا ہوا تارہ ہے۔ وہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ اس کا تیل (ایسا ہے کہ) اگر اس کو آگ نہ بھی چھوئے تو بھی معلوم ہوتا ہے کہ (خودبخود) روشن ہوجائے گا۔ نور علےٰ نور جس کو چاہتا ہے۔ اللہ اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے (یہ طاق) ایسے گھروں میں ہے جن کی نسبت اللہ نے اجازت دے رکھی ہے کہ بلند کیے جائیں اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور صبح و شام (یہ لوگ) اُن میں اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں

اللہ

محسوسات کا خوگر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ بسیط سے بسیط حقیقت بھی لباس مجاز میں آ کے سامنے جلوہ بار ہو یا کم از کم اِس حقیقت مجردہ کو بیان اس انداز سے کیا جائے کہ وہ اسکے ذہن میں ایک محسوس پیکر کا تصور قایم کر سکے، یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے انسان نے بت پرستی اختیار کی۔ اسلام چونکہ علم و بصیرت کا مذہب ہے اسلیئے اُسنے وہ تمام دروازے بند کر دیئے جنکے راستے اس قسم کی توہم پرستی داخل ہو سکتی تھی، اُسنے ذات باری تعالےٰ کے متعلق کوئی مثال بھی ایسی بیان نہیں کی جس کی بنا پر ذہن کسی محسوس و مشہود پیکر کیطرف منتقل ہو جائے۔ وہ حقیقت کو حقیقت رکھنا چاہتا ہے تو ذہن انسانی کے تقاضا کو پورا کرنے کے لیئے اُسے کسی مجسمہ میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔ مذکور صدر مثال میں جو لطیف و بسیط اشارات ہیں۔ انہیں انسان اپنی سمجھ کیمطابق خواہ کچھ ہی معنی کیوں نہ پہنائے لیکن وہ خدا کی ماہیت بیان نہیں کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اُسنے اس مثال کو یوں سمجھا ہے۔ تفاسیر میں اسکے متعلق بہت کچھ مذکور ہے۔ لیکن مجھے وہ مفہوم اصل سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے جو مولانا اسلم جیراجپوری نے اپنی کتاب تعلیمات القرآن کے حاشیہ میں لکھا ہے وہ فرماتے ہیں :-

> اس مثال کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ عبادتخانہ سے مراد ہے دین۔ طاق سے مومن شیشہ سے اس کا آئینہ دل، چراغ سے ایمان۔ اور مبارک درخت زیتون کے تیل سے وہ ہدایت جو کلام الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی

میں نے اسے اصل سے قریب اسلیئے کہا ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر دین فطرت آسمانی ہدایات اور خود قرآن کریم کو نور کہا گیا ہے (اس کی تفصیل نور کے عنوان میں ملے گی) اور یہاں بھی یہ لکھا ہے کہ اللہ اپنے نور سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ لہذا یہ روشنی خود کلام الٰہی ہے، اب باقی مثال کو اس سے واضح کیا جا سکتا ہے لیکن بایں‌ہمہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس مثال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر شئے جو حق ہے وہ نور یزدی ہے اس کائنات کے جملہ حقایق اسی کے آئینہ جمال کے پرتو ہیں +

غلام احمد پرویز

صفاتِ الٰہی

خدا کا تصور کیونکر ممکن ہے

ذات خداوندی کے متعلق تو ہم بتا چکے ہیں کہ اس کی حقیقت و ماہیت سرحدِ ادراک سے ما درارہے۔ لیکن جن چیزوں سے خدا کا تصور ذہن میں مرتسم ہو سکتا ہے وہ اس کی صفات ہیں یعنی وہ خدا کیسا ہے، کون کون سی قوتوں کا مالک ہے، نظام کائنات میں اسکے جلوے کس کس انداز سے کار فرما ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دُنیا میں چند ملحدین کے سوا خدا کی ذات کا تو کوئی منکر نہیں اور ملحدین کا انکار بھی دراصل ایک نام بدل دینے کے مرادف ہے۔ وہ قوت جو نظم و نسقِ عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ماننے والوں کے نزدیک خدا ہے۔ اور نہ ماننے والوں کے نزدیک فطرت (NATURE) نہ انکا ذہن ذاتِ خداوندی کی ماہیت کا احاطہ کر سکتا ہے نہ یہ فطرت کی حقیقت بتا سکتے ہیں ذہنِ انسانی کی رسائی زیادہ سے زیادہ علت و معلول کے سلسلہ تک ہو سکتی ہے لیکن علت العلل کی حقیقت تک تو کوئی ذہن نہیں پہونچ سکتا۔ زمین قایم ہے نظامِ شمسی کے کُروں کی باہمدگر کشش سے، اور نظامِ شمسی قایم ہے دیگر ستارے کی مرکزی جاذبیت سے اور دیگر ستارہ قایم ہے ——— ماننے والوں کے نزدیک مشیتِ خداوندی سے، اور نہ ماننے والوں کے نزدیک اصولِ فطرت کے ماتحت کہ جو سمجھ میں نہیں آسکتا وقس علیٰ ھٰذا۔

علت العلل

ہاں۔ تو کہنا یہ تھا کہ دُنیا میں ذاتِ خداوندی سے تو کسی کو انکار نہیں جس چیز میں فرق پڑتا ہے وہ صفاتِ خداوندی ہیں۔ انہی صفات کے صحیح تصور سے خدائے حقیقی کا صحیح ایمان قلبِ انسانی میں آسکتا ہے اور انہی کے غلط تعین سے انسان باطل پرست ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ اسنے صفاتِ خداوندی اس شرح و بسط اور اس صحت و صواب کے ساتھ بیان کی ہیں کہ انکے ذریعے سے انسان خدا کے متعلق ایک حقیقت ثابتہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس لئے کہ خدا کے متعلق کسی صحیح تصور تک صرف آسمانی کتابیں ہی پہنچا سکتی ہیں لیکن ادیانِ عالم میں۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب ایسا نہیں جو حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ جو آسمانی کتاب انکے پاس ہے وہ تحریف و الحاق سے پاکیزہ ہے اس میں ذہنِ انسانی کی آمیزش نہیں ہو چکی۔ اب ظاہر ہے کہ جس قسم کے خدا کا تصور ذہنِ انسانی پیدا کریگا۔ وہ انسانی تخیلات ہی کا پیکر ہوگا۔ اس کی صفات انسانی

بلا تحریف کتب سماوی

صفات کا ہی عکس ہوں گی، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُس کی قوتیں مقدار و شمار میں بڑھا دی جائیں گی، انسان کے دو ہاتھ ہیں تو اُس خدا کے چار ہاتھ بنا دیئے جائیں گے۔ انسان ایک پتھر اُٹھا سکتا ہے تو وہ خدا ایک پہاڑ اُٹھائے گا، انسان کا قد پانچ چھ فٹ ہوتا ہے۔ خدا کا قد پچاس ساٹھ فٹ ہو جائے گا۔ ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اصنام مباتِ یونان کے مقدس مجسمے اسی غلط تصور کے مظاہرات ہیں، انسان کا ذہن، انسان سے الگ ہو کر کوئی خدا بنا ہی نہیں سکتا اور یہ سب سے بڑی داخلی دلیل ہے اس امر کی کہ ان "آسمانی کتابوں" میں (اگر یہ آسمانی تھیں تو) ذہنِ انسانی کی آمیزش ہو چکی ہے مثلاً ویدوں کا خدا خالص انسانی قالب میں ڈھلا ہوا ہے۔ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۰ منتر ۱۳-۱۲ یا یجر وید ادھیائے ۳۱ منتر ۱۲-۱۱ میں ہے:-

"برہمن اس کے منہ سے (پیدا) ہوئے۔ اور اس کے بازوؤں سے کشتری ذات کے لوگ پیدا ہوئے۔ جو ویش ہیں، وہ اسکی ٹانگوں سے پیدا ہوئے۔ اور پرمیشور کے دونوں پاؤں سے بے چارے شودر پیدا ہوئے۔ ۱۲ چاند اُسکے منہ سے پیدا ہوا آنکھوں سے سورج پیدا ہوا۔ منہ سے اندرا اور اگنی دیوتا پیدا ہوئے اور نفوس سے ہوا پیدا ہوئی۔"

یا مثلاً یجر وید ادھیائے ۳۱ منتر ۱۳ میں لکھا ہے۔

"پرمیشور کی ناف سے طبقۂ وسطیٰ (پیدا) ہوا سر سے طبقۂ علوی پیدا ہوا۔ پرمیشور کے دونوں پاؤں سے زمین اور کانوں سے اطراف اور کُرّے پیدا ہوئے۔"

اتھروید کانڈ ۱۱ سوکت ۲ منتر ۵-۷ میں ایشور کا سروپ (حلیہ) یوں بیان کیا گیا ہے

"اے پشوپتے۔ جیوں کے سوامی! ہم ماتھن! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار ہے۔ ہے بھو! سروا تیا دک ایشور! تیری جو چکشوئیں (آنکھیں) ہیں اُن کو بھی نمسکار ہے۔ تیری توچا (چمڑی) کو نمسکار ہے ..... ہے پرمیشور! تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے اُدر بھاگ (پیٹ) کو نمسکار ہے۔ تیرے جیبھ کو نمسکار ہے۔ تیرے آسیہ مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے (دانتوں کی) گندھ (بو)

اللہ

کو نسکار ہے“ (ترجمہ پنڈت جے دیو شرما صاحب)

اگر وہ انسان سے الگ ہو جاتا تو وہ مظاہر فطرت جن سے انسان اپنے عہد طفولیت میں ڈرتا تھا۔ انہیں خدا تصور کر لیتا تھا۔ مثلاً یجروید ادھیائے ۱۳ منتر ۶ میں ہے۔

”زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ (قبول) ہو۔ اور جو سانپ ہوا میں یا آسمان پر ہیں۔ ان کو ہمارا سجدہ ہے۔ جو سانپ یا تو دہانوں کے بیتروں کے ساتھ آتے ہیں، یا نباتات ہیں۔ اور جو سانپ اپنے بلوں میں لیٹے ہیں۔ اُن کو ہمارا سجدہ قبول ہو جو سانپ درمیول میں یا سورج کی کرنوں میں اور پانیوں میں رہتے ہیں، ان کو ہمارا سجدہ قبول ہو“ (انگریزی ترجمہ کے لیے پرنسپل گرفتھ ایم اے کا ترجمہ دیکھئے۔)

سے کہ یجروید ادھیائے ۳ منتر ۲۳ میں سر منڈاتے وقت حجام کے اُسترے کو سجدہ کر لینے کا حکم لکھا ہے جس کا ترجمہ پنڈت رام گوپال صاحب ودیا النکار نے سنسکار پرکاش میں یوں کیا ہے۔

”اے اُسترے! تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوا ہے تجھے نمسکار (سجدہ) ہو تو اس بالک کو ہانی (تکلیف) مت پہنچانا“

اتھروید کانڈ ۱ سوکت ۲۵ منتر ۴ میں بخار کو سجدہ کرنے کو لکھا ہے

”سردی والے بخار کو سجدہ قبول ہو۔ گرمی والے اور نامی بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں روزانہ۔ دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو“

مطلب اس سے ہمارا یہ ہے کہ جو قابل پرستش شے ذہن انسانی کی تخلیق ہوتی ہے، وہ انسانی تخیلات سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور پھر جیسا کہ کانٹ نے لکھا ہے جس قسم کا معبود کوئی قوم اپنی پرستش کے لیے تجویز کر لیتی ہے، وہ معبود اس قوم کے تمدن وتہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے اسلئے کہ معبود کی عظمت اور تقدس کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان سے بہترین لباس میں پیش کرے، لہٰذا کسی قوم کا تجویز کردہ معبود اس قوم کے ذہنی ارتقا کے آخری نقطہ کو ظاہر کریگا (یعنی وہ معبود جو ذہن انسانی کی پیداوار ہو) اوتار کا عقیدہ بھی انسان کے اسی رجحان کا آئینہ دار ہے وہ جس انسان

اللہ

میں کوئی ایسا جوہر دیکھتا جو اوسط درجہ کے انسانوں سے ذرا زیادہ ہوا سے فوق البشر تسلیم کر لیتا اور اسے خدا بشکل انسان تصور کرتا۔ اوتار کا یہی عقیدہ ہے جسے بعد میں عیسائیت نے اپنایا اور الوہیت مسیح کے قالب میں ڈھال لیا۔ ڈاکٹر براؤن نے اپنی کتاب (RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY) میں اس چیز کو بڑی تحقیق و کاوش سے ثابت کیا ہے کہ الوہیت مسیح عقیدۂ اوتار کی ہی صدائے بازگشت ہے حتے کہ اکثر عیسائی محققین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مسیحیت کی موجودہ تعلیم کا بیشتر حصہ بدھ مت کی قدیم تعلیم سے ہی لیا گیا ہے مشہور مستشرق (MAX MULLER) اپنی کتاب (SCIENCE OF RELIGION) میں لکھتا ہے کہ :-

"مہاتما بدھ اور انکے شاگردوں کی زبان اور حضرت عیسیٰ اور انکے حواریوں کی زبان میں عجیب تطابق پایا جاتا ہے بدھ مت کے اکثر افسانے اور تمثیلات سے یوں معلوم ہوتا ہے گویا انجیل کے عہد جدید سے اخذ کیے گئے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ سنِ عیسوی کے شروع ہونے سے بہت پہلے سے دنیا میں موجود ہیں"

(BUNSEN) اپنی کتاب (ANGEL-MESSIAH) میں لکھتا ہے :-

بدھ مت کے متعلق جو قدیم ترین ریکارڈ ملتے ہیں ان میں مہاتما بدھ کی زندگی اور تعلیم سے متعلق جو کچھ نظر آتا ہے عجیب بات ہے کہ وہ نمایاں طور پر ان روایات سے ملتا ہے جو حضرت مسیح کے متعلق الانجیل میں پایا جاتا ہے یہ تو ممکن ہے کہ اُسے محض ایک اتفاقی امر کہہ لیا جائے اور یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ یہ روایات صرف صحیفۂ پولوس اور کتاب چہارم میں پائی جاتی ہیں (ان سے پہلی کتابوں میں انکا ذکر نہیں)

مقصد اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ جہاں انسان نے اپنے ذہن سے خدا کی تخلیق کی ہے۔ وہ خدا، انسان ہو کے رہ جاتا ہے قرآن کریم نے خدائے بلند و برتر کی جو صفات بیان کی ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسانی تخیلات اور ایک ایسی تعلیم میں جس کا سرچشمہ ذہن انسانی سے ماورا

بدھ مت اور عیسائیت

ہو کیا فرق ہوتا ہے۔ یہی بنیادی فرق ہے جس کی رو سے (علاوہ دیگر شہادات کے) اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس سے پیشتر جس قدر آسمانی پیغامات انسان کو ملے تھے وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہیں اور آج صفحۂ ہستی پر قرآن کریم ہی صرف ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو حوادث ارضی و سماوی کی دستبرد سے محفوظ اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزّہ ہے۔

---

(۱) توحید

(۱) اللہ

ذات باری تعالیٰ کے متعلق اسلام کا بنیادی عقیدہ لا اِلٰہ الا اللہ ہے۔ دیکھنے میں تو یہ چار لفظ ہیں لیکن حقیقت میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر ان کے اندر آگئے ہیں تفصیل اس کی آ(۱) اللہ کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں مطلب اس سے یہ ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر اپنی ذات اور اپنی صفات دونوں میں واحد ہے۔ ایک ہے۔ لاشریک ہے۔ قرآن کریم نے ایک مختصر سی سورت میں خدا کی توحید کو اس جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے قرآنی اعجاز پر تصدیق ہوتی جاتی ہے فرمایا:۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [۱۱۲] کہہ دو اللہ ایک ہے۔

مجوسیوں کے عقیدہ کا بطلان

یعنی وہ اپنی ذات میں ایک ہے۔ یہاں سے اوّلاً مجوسیوں کے اس عقیدہ کا بطلان ہوگیا۔ جس کی رو سے اہرمن و یزداں کو دو مستقل بالذات خدا مانتے ہیں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ [۱۶]

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو خدا مت بناؤ معبود تو صرف ایک وہی ہے۔ سو صرف مجھ ہی سے ڈرو۔

اور عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کی بھی تردید ہوگئی جس کی رو سے وہ باپ بیٹا روح القدس۔ ایک میں تین۔ تین میں ایک خدا کے قائل ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ

اللہ

عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوا بِاللهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ إِنَّمَا اللهُ إِلَٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللهِ وَكِيلًا ۝ ۴/۱۷۱

اے اہل کتاب۔ تم اپنے دین میں حد سے مت باہر نکلو۔ اور خدا کی شان میں حق کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ اللہ کا رسول اور اسکا کلمہ ہے۔ جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور اس کی طرف سے روح ہے۔ سو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اور یوں مت کہو کہ (خدا) تین ہیں۔ باز آجاؤ۔ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے۔ وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے اور اللہ کارساز ہونے میں کافی ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَّاحِدٌ وَإِن لَّمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ۵/۷۳

یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالانکہ بجز ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں۔ اور اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز نہ آئے تو جو لوگ ان میں کافر رہیں گے۔ انپر دردناک عذاب واقع ہوگا۔

یہ تو شرک کی پہلی قسم ہے کہ خدا کی ذات میں دوسروں کو شریک ٹھیرایا جائے یعنی ایک سے زیادہ خدا مانے جائیں۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اُسکے کاروبار میں۔ اُسکے حکم و ارادہ میں۔ دوسری قوتوں کو شریک کار سمجھ لیا جائے۔ ہندؤں کے عقیدہ کے مطابق برہما خدا کا نام ہے جو پیدا کرنیوالا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وشنو صفت ربوبیت کا مالک ہے اور شو فنا اور ہلاکت کا خدا ہے۔ ان کے علاوہ تمام دیوی دیوتا مختلف شعبہ جات قضا و قدر کے مختار ہیں۔ قرآن کریم اسکی بھی تردید کرتا ہے۔

الله

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ ۱۸/۲۶

لوگوں کے لیے اسکے سوا کوئی کارساز نہیں۔ اور وہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا

جب کوئی اُسکے حکم و ارادہ میں شریک نہیں ہوسکتا تو پھر کارساز کیسے بن سکتا ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۶/۱۴

(حاشیہ: دیوتاؤں کی پرستش)

کہیے کہ کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنیوالا ہے اور وہ (سب کو) کھانے کو دیتا ہے اور اُسے کوئی نہیں کھلاتا کسی اور کو کارساز بنالوں کہیے کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام قبول کروں۔ اور تم مشرکین میں سے مت ہو جانا"

دیوی دیوتاؤں کے بعد انسانوں نے خدا کے رسولوں کو ہی خدا بنالیا یہ وہ خطرناک گھاٹی ہے جہاں سے دُنیا کے کسی سابقہ مذہب کے پیرو بچ کر نہیں نکل سکے حتیٰ کہ بدھ مت اور جین مت جن کی تعلیم میں خدا کا تصور ہی کہیں نہیں۔ اُن کی بھی یہ حالت ہوگئی کہ مہاتما بدھ اور مہاویر کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اُنکے بُت تراش لیے گئے اور اُن کی عام پرستش ہونے لگی چین میں کنفیوشس نے دیوتاؤں کی پرستش کی مذمت کی تھی لیکن آج چین کے مندروں میں انہی کے مجسموں کی پوجا کیجاتی ہے

(حاشیہ: بانیان مذاہب کی پرستش)

اہل چین کا دوسرا مذہب TAOISM ہے اسکا بانی ایک لاؤ-تزے LAO-TZE تھا جسنے بھی کہیں بُت پرستی کی تعلیم نہیں دی۔ لیکن گزشتہ دو ہزار سال سے اُسکے بُت کی بھی پرستش ہوتی چلی آرہی ہے، جاپان میں مہاتما بدھ کے مجسمات کے ساتھ ساتھ خدا کے مظاہر یعنی اس تلوار اور آئینہ کی پرستش بھی کی جاتی ہے جو اُنکے قدیم مذہب (SHINTO) کے مطابق سورج کی دیوی نے اپنے پوتے یعنی جاپان کے پہلے شاہنشاہ کے حوالہ کیے تھے۔ مسیحیت میں حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے ساتھ ساتھ انکے اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش کیجاتی ہے، ہندوؤں میں اوتار کا عقیدہ بھی اسی "رسول پرستی" کی جھلک ہے۔ قرآن کریم نے اس دروازہ کو اس مضبوطی سے بند کردیا کہ ذہنِ انسانی کی کوئی خوش عقیدگی اسے کھول نہ سکے۔ اسکی تفصیل آپکو رسالت کے عنوان میں ملیگی یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے فرمایا۔

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

اسلامی زندگی

اگر آپ کو معلوم کرنا ہے کہ اسلامی زندگی کیا ہے اور قرآن کریم انسانی زندگی
کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے تو کتاب "اسلامی معاشرت" کا مطالعہ فرمایئے اسکے مطالعہ سے
نہ صرف آپکے ذہن کو جلا اور قلب کو بصیرت حاصل ہوگی بلکہ زندگی کا نصب العین آپ
پر روشن ہوجائیگا اور عمل و کردار کی زندگی آپکو نصیب ہوجائیگی کتاب کے مصنف مشہور متکلم
اسلام چودھری غلام احمد صاحب پرویز ہیں جنکی قرآنی بصیرت کے بارہا ثبوت مل چکے ہیں۔

قیمت چار آنہ (۴) محصول ۱ر دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

گفتگوئے مصالحت

قرآن کریم کی روشنی میں مسلمانوں کو سیاسیات حاضرہ میں کس طرح حصہ لینا چاہیے
مولانا ابوالکلام کا ایک دلچسپ مضمون بھی شاہراہِ مقصود کے نام سے رسالہ میں شامل ہے

قیمت ۱ر محصول تین پیسے

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi. Published by Z. A. K from Tolue Islam Office, Delhi
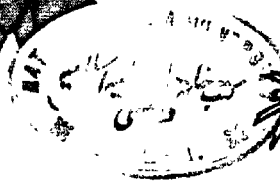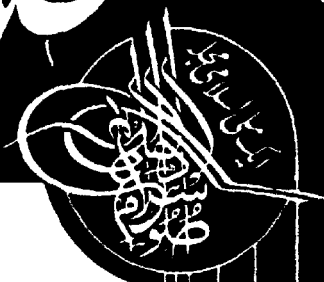
عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم
طلوعِ اسلام
بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دور جدید)

مرتب
محمد عثمان

بدل اشتراک
-/5
پانچ روپیہ سالانہ
فی پرچہ ۸ ر

جلد (۱) شمارہ ۸

بابت ماہ شوال ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

مرکز ملت ← لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ → مرکز ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فی ما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما ۝

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایھا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا — اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم — بات مانو اللہ و رسول کی جب تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا — جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!

علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار (فرمان رسول) — لا اسلام الا بالجماعۃ (قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت ای کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

میلادِ آدم

از تاکِ بادہ گیرم　و　در ساغر افگنم

۱۔ نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

۱۔ عشق چیخ اُٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا
حسن کانپ اُٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا

۲۔ خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں! پردہ درے پیدا شد

۲۔ پہنچی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر
پردہ دارو ہوشیار! اک پردہ در پیدا ہوا

۳۔ فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

۳۔ فطرت آشفتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے
ایک خودگر، خود شکن اور خود نگر پیدا ہوا

۴۔ آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

۴۔ آرزو تھی زندگی کی گود میں سوئی ہوئی
آنکھ کھولی اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

۵۔ زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

۵۔ زندگی بولی کہ تھی بیتاب و گِل میں مضطر
بارے آخر اس گنبد بے در میں در پیدا ہوا

(حضرت علامہ اقبال)

(ترجمہ حضرت مولانا اسلم صاحب مدظلہ)

اضافہ ۶۔ مسکرا کر یہ ملائک نے کہا ابلیس سے
لو تمہارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا

۷۔ چرخ سے آئی ندا اے ساکنانِ بحر و بر
اک جہاں آشوب، ظالم، فتنہ گر پیدا ہوا

۸۔ جس کی خاطر یہ زمین و آسماں چکر میں تھے
مادرِ فطرت کا وہ نورِ نظر پیدا ہوا

۹۔ تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش
آخر اس سازِ کہن کا زخمہ ور پیدا ہوا

(مولانا اسلم جیراجپوری)

غازی مصطفیٰ کمال علیہ الرحمۃ

(اسد ملتانی)

آہی گیا وقوع میں آخر وہ حادثہ
سو بار روح و قلب تھا جس کا خیال بھی

اسلامیوں کے حق میں قیامت ہے یہ وفات
اس وقت جبکہ ان میں ہے قحط الرجال بھی

وہ مصطفیٰ کمال کہ جس کے وجود میں
تھی ہیبت جلال تو شانِ جمال بھی

وقتِ جہاد غازی باطل شکن بھی تھا
امن و اماں میں قائدِ صاحب کمال بھی

ثابت کیا یہ قوم کو دے کر حیات نو
ہمت کرے کوئی تو ہے ممکن محال بھی

اے غم رسیدہ ملتِ اسلامیہ بتا
اب تیرے پاس ہے کوئی اسکی مثال بھی؟

مرنے سے اسکے دل ہے سمرنا کا بھی دو نیم
ہے دیدہ پر آب درہ دانیال بھی

منحوس تھا ہمارے لیے کسقدر یہ سال!
اقبال بھی ہمارا گیا اور کمال بھی

تکیہ جو چاہیے تو اسی ذات پر اسد
جو منبعِ کمال ہے اور لایزال بھی

لمعات

گزشتہ وسط نومبر میں عالم اسلامی کے لیے سب سے بڑا حادثہ سب سے بڑا اندوہناک واقعہ اور قلب و جگر کو افسردہ کرنے والا سب سے بڑا جانگسل صدمہ اتاترک غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی وفات تھی۔ ایسی وفات جس سے نہ صرف بیدار بخت اور نوجوان ترکوں پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے بلکہ تمام عالم اسلامی دفعۃً ماتمکدہ بنگیا اور ان مسلمانوں کی شعاع امید بجھ کر رہ گئی جو اپنی غلامی اور محکومی میں مرحوم کمال پاشا کا نام سُنکر اپنے آپ کو اطمینان دے لیا کرتے تھے کہ ہندوستان میں نہیں تو ترکی میں وہ عظیم و جلیل ہستی موجود ہے جسنے اپنی تلوار خارا شگاف سے نہ صرف اپنے مُلک اور اپنی قوم کی عزت بچائی بلکہ تمام عالم اسلامی کی آبرو رکھ لی اور اپنے کارناموں سے دُنیا کو مسلمانوں کی زندگی، اسلام کی بقا کا یقین دلا دیا!

غازی کمال پاشا مدت مدید سے جگر کی جاں ستاں بیماری میں مبتلا تھے۔ جب تک جسم میں حرارت اور قوت باقی رہی بیماری سر نہ اٹھا سکی، مگر رفتہ رفتہ قوت نے جواب دیا اور بیماری کے ایک ہی حملے نے انکو اس دُنیا سے اُس دُنیا میں پہونچا دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ہندوستان میں علامہ اقبال قرآن کریم کے مزاج شناس تھے اور ہندوستان سے باہر غازی کمال پاشا اسلامی قوت و سطوت کے نمائندہ تھے۔ اوّل الذکر کی وفات سے اسلام کے ایمانی و ایقانی نظام میں تزلزل پیدا ہوگیا اور ثانی الذکر کے انتقال نے اسلام کی قوت و فرمانروائی کے ایک روشن نمونہ کو ہم سے چھین لیا۔ مسلمانوں کو کیا خبر تھی کہ انہیں چند ہی دنوں میں یہ دو المناک حادثے برداشت کرنے پڑیں گے اور انہیں اپنے دلِ دردمند اور زبانِ ماتم سرا کو اقبالؒ و کمالؒ کے لیے وقف کرنا پڑے گا!

کمال پاشاؒ دورِ حاضرہ میں تاریخی عظمت کے مالک تھے جو اپنے بے شمار کارنامے تاریخ کے سپرد کر گئے

وہ سپہ سالار تھے۔ فاتح اعظم تھے۔ ترکی جمہوریت کے صدر تھے اور ایک سچے مجاہد مسلمان تھے یہ آخری چیز یعنی انکا سچا مجاہد ہونا یورپ اور استعماری قوتوں کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ یہ ایسا رشتہ تھا جو الغاے خلافت کے بعد بھی عالم اسلامی کے لیے عقیدت کی تکیہ گاہ بنا رہا اور اس رشتہ کو منقطع کرنے کے لیے تمام دُنیا میں اُن کے الحاد و دہریت کا ڈھول پیٹا گیا تھا۔ اللہ اکبر! یورپ کا پروپیگنڈہ اور وہ بھی ایک مجاہد کے خلاف! نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کو یقین آچلا کہ غازی موصوف اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کرچکے ہیں حالانکہ اُن کے مفروضہ الحاد اور انحراف عن الاسلام کا زبردست پروپیگنڈہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ غازی کمال پاشا ایک سچے مسلمان ایک مجاہد مسلمان اور اسلام کے ایک سچے خادم تھے ورنہ یورپ کو کیا غرض پڑی تھی کہ وہ ایک "بے دین" کی بے دینی کو اس زور و قوت سے طشت از بام کریں اور اسلام کا انکار اُسکی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کردے۔ بالشویک روس نے خدا کا انکار کیا اور اسکا اظہار بھی کردیا۔ اگر غازی مغفور بھی دہریت کے دلدادہ اور اسلام سے متنفر ہوچکے تھے تو اُس کے اظہار اور اعلان میں اُن کو کس مفتی اعظم، کس تلوار اور کس قوت کا ڈر تھا؟

غازی مغفور پر بیماری کے دورے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر زندگی سے مایوس ہوچکے تھے۔ ڈاکٹر توفیق رشدی آراس فرط غم سے اشکبار تھے کہ غازی نے آنکھیں کھولکر فرمایا

"میں راضی برضائے مولا ہوں۔ اگر خدا کو مجھ سے کام لینا منظور ہے اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا میری قسمت میں ہے تو میں ہرگز نہیں مرونگا، اور اگر میرا وقت آگیا ہے تو میں بخوشی اس کا استقبال کرتا ہوں اگر میں مرجاؤں تو دنیائے اسلام کو میرا پیغام پہونچا دینا کہ زندگی حرکت کا نام ہے اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو رسول عربی کے نقش قدم پر چلیں"

یہ اُس خادم کا بیان ہے جو ہر وقت غازی مغفور کے پاس رہتا تھا اور جس کو اخبار البلاد نے شائع کیا ہے۔ اگر یہ وہی الحاد ہے جسکی تشہیر یورپ کا مقدس فریضہ رہا ہے تو اسی کا دوسرا نام اسلام ہے۔

غازی موصوف کی ولادت ۱۸۸۰ء میں سلانیک میں ہوئی تھی۔ انکے والد یونانی شہر لاریسا کے ایک

تجارت پیشہ خاندان سے تھے جو انکے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد یہ اپنے ماموں کے پاس رہے جو کاشتکار تھے کچھ دنوں کے بعد مدرسہ رشدیہ عسکری میں نام لکھوایا۔ اسکے نصاب سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مدرسہ ارکان حرب میں بھیج دیئے گئے جہاں سے ۱۹۰۴ء میں یوزباشی کی سند حاصل کی۔

مزاج میں حریت تھی۔ سلطان عبدالحمید کے استبداد کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے تھے اسوجہ سے ایک بار چند مہینے قید میں بھی رہنا پڑا۔ پھر وطن سے دُور دمشق میں اپنے عہدہ پر بھیجدیئے گئے۔ سہ ۱۳۲۸ء میں جبوقت محمود شوکت پاشا نے سلطان عبدالحمید کو قسطنطنیہ میں تخت سے اُتارا اُسوقت یہ ادرنہ میں تھے اور وہاں سے اپنی فوج لے کر پاشائے موصوف کی حمایت کے لیئے آئے تھے

سہ ۱۳۳۰ھ میں جنگ طرابلس میں بھیس بدلکر مصر کی راہ سے بنی غازی پہونچے۔ وہاں اطالیہ کے مقابلہ کے لیئے عربوں کی فوج مُرتب کی اور ایک عرصہ تک جہاد میں شریک رہے +

جنگ عمومی میں درہ دانیال کی مدافعت انکے سپرد تھی جو سب سے اہم جنگی نقطہ تہا۔ یہاں اتحادی بیڑہ کو ہمیشہ نقصان دیکر پسپا کرتے رہے جسکے صلہ میں امیرلوا اور پاشا کے لقب سے ممتاز ہوئے۔

سہ ۱۹۱۸ء میں معاہدہ سیورے میں جب اتحادیوں نے ترکی سلطنت کے "مرد بیمار" پر موت کا فتوٰی صادر کیا۔ اور اُن کی فوجوں نے قسطنطنیہ میں آکر حکومت کے صیغوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اسوقت اپنی قومی سلطنت کو فنا ہوتے ہوئے دیکھ کر غازی موصوف کے دل پر چوٹ لگی۔ فوراً اناطولیہ پہونچکر ترکوں کی قومی عصبیت کو اُبھارا اور حزب وطنی قایم کی جس کی مدد سے ستمبر سہ ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کو جو انگریزوں کی امداد سے سمرنا پر قبضہ کرکے اناطولیہ کے بڑے حصہ پر قابض ہوچکے تھے ایسی زبردست شکست دی جو تاریخ میں قیامت تک یادگار رہے گی۔ اس عظیم الشان فتح سے مری ہوئی اور حصوں میں بٹی ہوئی، ترکی سلطنت نئے سرے سے زندہ ہوگئی۔ اور ترکوں کا مٹا ہوا وقار پھر واپس ملگیا۔ وہ جملہ مراعات جو دول یورپ کو ترکی میں حاصل تھیں جن کے بوجہ سے وہ سر نہیں اٹھا سکتی تھیں یک قلم منسوخ ہوئیں اور ترک ایسے آزاد ہو گئے جیسے کہ اپنے عروج کے زمانہ میں تھے۔ سلطنت کو جمہوری کرکے مصطفٰے کمال نے اس کے ان تمام امراض کا

بھی علاج کیا جو اس کی ہلاکت کا موجب ہوئے تھے۔ امراء کی غداریوں اور اُن کے مظالم و استبداد کو، علماء کی مذہبی مکاریوں اور احمقانہ تعصبات کو، صوفیوں اور درویشوں کی ریاکاریوں اور مفت خواریوں کو عوام الناس کی جہالتوں اور توہم پرستیوں کو مٹا کر تمام قوم کو علم و عمل کے صحیح راستہ پر لگایا جس کی بدولت آج ترکی کی سلطنت اقتصادی، علمی، فوجی اور ہر لحاظ سے ترقی کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے یہ خدمات صرف ترکی کی نہیں ہیں۔ بلکہ تمام عالمِ اسلامی کی ہیں اسلیئے اُنکی ذات نہ صرف ترکوں کے لیے بلکہ دُنیا بھر کے مسلمانوں کے لیئے ایک عظیم الشان خداداد نعمت تھی جو صدیوں کے بعد ملی تھی۔ آنے والے مؤرخ جب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ لکھنے بیٹھیں گے اسوقت غازی موصوف کی صحیح قدر پہچان سکیں گے کہ اُن کی بدولت مسلمانوں میں کیا انقلابِ عظیم پیدا ہوا جسنے موت سے انکا رُخ زندگی کیطرف پھیر دیا۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اُن کی تاریخ وفات بھی "المغفور" ہے

جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جو بلوے اور مظاہرے ہوئے "اسیرِ معصوم" انگلستان میں بھی نفرت کا اظہار کیا گیا ہے! حالانکہ اس معاملہ میں جرمنی اور انگلستان کا ملیہ تقریباً برابر ہے اگر مہذب ہیں تو دونوں ہیں، وحشت و بربریت کے پیکر ہیں تو دونوں ہیں۔ جرمنی میں یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے اور فلسطین میں انگریز کے ہاتھوں عربوں کا قتل عام ہو رہا ہے اسپر لطف یہ ہے کہ اپنی اپنی جگہ دونوں تہذیب کے اُستاد خود کو معصوم تصور کر رہے ہیں۔ ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون پانی کی طرح بہہ جائے۔ مگر یورپ کی ملعون تہذیب پر کوئی داغ نہیں پڑتا۔ اور داغ پڑے کیونکر؟ جس چیز کو مشرق میں داغ کہا جاتا ہے وہ تو یورپ کے نزدیک حسن کی گلکاری اور تہذیب کا نقش و نگار ہے بہرحال جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ دُہرا رہی ہے، یہودی قوم دُنیا میں سب سے زیادہ سرمایہ دار قوم ہے۔ مگر سب سے زیادہ ذلیل و خوار بھی وہی ہے یہ بدبخت قوم اپنی سیہ کاریوں کے باعث خدا کی رحمت سے محروم ہو چکی ہے۔ بابل کی اسیری اس کی قسمت میں لکھی تھی ہیکل سلیمان کی تباہی دراصل خود اس کی تباہی تھی اور آج تک یہ قوم اسی ذلت و خواری میں زندگی

بسر کر رہی ہے قرآن کریم کا دعوی کس قدر حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا جا رہا ہے جسنے فرمایا تھا۔
ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباء و بغضب من اللہ

تاہم جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ انتہائی ظالمانہ۔ انسانیت سوز اور وحشیانہ ہے اور اتنا درد انگیز ہے کہ انسان کا قلب اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ انگلستان میں جب اسکے خلاف اظہار نفرت و ملامت کیا گیا تو جرمنی اخبارات اسکے جواب میں فرماتے ہیں چپ رہو! اس حمام میں ہم اور تم دونوں ہی ننگے ہیں یعنی ارشاد ہوتا ہے۔

"یہودیوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اُسے انسانیت سوز قرار دینے والوں سے دریافت کیجئے کہ برطانی تہذیب کے نام پر فلسطین کے عربوں کا قتل عام اور اُن کی آبادیوں کو ویران بنادینا کیا عین تقاضائے انسانیت ہے؟ (اسٹیسمین ۱۳ نومبر ۳۸ء)

اس بات کا کہ جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جو بلوے ہوئے اُن پر برطانی پارلیمنٹ میں بحث ہوگی، یہ پُرلطف جواب دیا گیا ہے کہ:۔

"اگر برطانیہ نے اس مسئلہ پر بحث کی تو پھر جرمن پارلیمنٹ میں اس برطانی پالیسی پر بحث ہوگی جو اُسنے فلسطین میں اختیار کر رکھی ہے" (ایضاً)

گو جرمنی اخبارات کا یہ جواب ہماری نظر میں کوئی وقعت نہ رکھتا ہو مگر پوچھئے برطانیہ سے کہ اسکے زخموں پر اس جواب نے کیسے چرکے لگائے ہیں! جرمنی اگر یہودیوں کے خلاف اقدام کر رہا ہے تو برطانیہ یہودیوں کی خاطر عربوں کا قتل عام کر رہی ہے مجرم دونوں ہیں۔ بھلا انگلستان کو زبان کھولنے کا کیا حق اور برطانیہ کو انسانیت کی ہمدردی میں آنسو بہانے سے کیا حاصل؟ ہمارے نزدیک چونکہ دونوں مجرم ہیں، دونوں ظالم ہیں دونوں دشمنِ انسانیت ہیں۔ اسلئے عربوں کے قتل عام کے باعث جہاں برطانیہ مستحق لعنت و ملامت ہے وہاں یہودیوں کی تباہی کی بنا پر جرمنی بھی لعنت و نفرین کا مستحق ہے۔ اور ہمارا ایمان ہے کہ ان دونوں قوتوں پر خدا کا غضب بھڑکے گا اور قدرت ان سے کسی نہ کسی طرح

انتقام لے گی۔

کون کہتا ہے کہ مسلمان فنا ہو جائیں گے ؟ اسلام کی تباہی کا مرثیہ پڑھنے والوں کو فلسطین کے مجاہد عربوں نے اپنا خون بہا کر موثر جواب دیدیا ہے۔ اللہ اکبر! اس گئے گزرے زمانہ میں کس کو خیال ہو سکتا تھا کہ امت اسلامیہ کا ایک حصہ دنیا کی سب سے بڑی قوت کو یوں چیلنج دیگا اور برطانیہ کا سر غرور چند ایک بے بس عربوں کے ہاتھوں نیچا ہوگا؟ مشہور تو یہ ہے کہ تاریخ اپنے آپکو دہراتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تاریخ ابھی بہت کچھ اضافہ کی محتاج ہے۔ فلسطین کے مجاہد عرب جس نوعیت کے ساتھ سروں کو ہتھیلیوں پر رکھ کر میدان میں نکلے ہیں اور جس انداز میں انہوں نے برطانی عسکری قوت کا رد عمل کیا ہے اس کی نظیر گزشتہ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے!

ایک طرف عربوں کی زمین کو یہودیوں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ عربوں کے قتل عام کے لیے یہودیوں کو مسلح کر دیا گیا ہے۔ عربوں کے تاریخی شہروں اور آبادیوں کو ڈائنامیٹ سے اڑا کر قیامت کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سینکڑوں مجاہدین کو پھانسی کے تختوں پر لٹکایا جا رہا ہے، ہوائی جہازوں سے غیر مصافی آبادی پر بمباری کیجا رہی ہے اور دوسری طرف مجاہدین کے چہروں پر مسکراہٹ ہے انکا عزم ہے۔ استقلال ہے۔ صبر جامد ہے اور صرف اللہ پر توکل۔ مجاہدوں کے سردار سید عارف عبدالرزاق نے صدر انجمن خواتین مصر کے نام جو مکتوب ارسال کیا ہے اسکا یہ فقرہ اسلامی عزیمت کا کتنا روشن ثبوت ہے کہ:-

> "ہم نے اللہ کے توکل پر تلوار کے قبضوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اب یا تو ہم کامیاب ہونگے یا ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔ میں خوشخبری سناتا ہوں کہ ارض مقدس اپنی پہلی عظمت کو دوبارہ حاصل کریگا اور وہ اور اسکے باشندے آزاد ہو کر رہیں گے"
>
> (اخبار السلاغ)

برطانی حکومت جو ضد اور اقتدار کی پیکر ہے اسنے صرف اتنا کیا کہ فلسطین کو تقسیم کرنیکے ظالمانہ عمل سے ہاتھ اٹھا لیا، اب وہ جو کچھ کرے گی اسکا انحصار مجاہدین کی حرکت پر ہے اور اس ایمان اور ایقانی قوت

جنے کسی وقت اکاسرہ وقیاصرہ کے ایوانوں کو متزلزل کر دیا تھا۔

گاندھی جی کا سرحدی دَورہ اور وہ بھی دوسری بار جرأت آمیز اور حیرت انگیز بھی ہے اور قابل ہمدردی بھی! پہلی بار اہنسا کے اس دیوتا کی جو پرستش صوبہ سرحد میں ہوئی۔ دوسری بار اس کا اعادہ نہ ہوسکا اور انہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے دَورہ کو ختم فرمایا!

سوال یہ ہے کہ گاندھی جی "خونخوار" پٹھانوں سے اتنا ربط کیوں پیدا کر رہے ہیں۔ اور سرحد کا بار بار طواف کر کے پٹھان دوستی کا ثبوت کیوں مہیا فرما رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ان کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ قومی حکومت، پٹھانوں کے حملوں سے محفوظ رہے گی۔ اسلیے وہ سرحد کا طواف کر کے اہنسا کی برف کی سلوں سے پٹھانوں کے خونِ گرم کی حرارت سلب کر لینا چاہتے ہیں تاکہ قومی حکومت کے قیام تک سرحدی پٹھان ولولہ جہاد سے ہی قلب ہوکر اہنسا کی دیوی کے سامنے سرنگوں ہو جائیں اور گاندھی اینڈ کمپنی مطمئن ہوکر ہندوستان میں ہندو راج قایم کرلے۔

سرحد کا پٹھان اگر حقیقت میں مسلمان ہے، تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اہنسا اور عدم تشدد کے فلسفہ کا قائل نہیں ہوسکتا اہنسا اُنکے حق میں خودکشی اور گاندھی جی کے نزدیک شدھی کے مرادف ہے۔ اعاذنا اللہ منھا۔ طلوع اسلام میں اس "یاترا" کے متعلق قریبی فرصت میں تفصیل سے لکھا جائیگا۔ انشاءاللہ۔

جو حضرات مسلم قومیت پرست جرائد اور رسائل کا مطالعہ فرماتے ہیں اُنہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ لوگ جو اس سے پہلے پکے کانگرسی تھے۔ اور ہندوؤں کی ذہنیت کے خلاف ایک حرفِ شکایت سننے کے متحمل نہیں ہوا کرتے تھے۔ انکی اب خود یہ حالت ہے کہ کانگرس سے مایوس، ہندو ذہنیت سے بیزار اور اُنکے سرکردہ لیڈروں کے طرزِ عمل سے متنفر ہو رہے ہیں کہیں کانگرس پر بہ حیثیت مجموعی ان الفاظ میں تبصرہ ہو رہا ہے کہ:۔

> اُب رہی کانگرس۔ سو موجودہ صورتِ حالات پر نظر کرتے ہوئے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس جماعت کی ہندو اکثریت بھی در پردہ مہاسبھائی ذہنیت سے آلودہ نظر

نظر آرہی ہے" (کلیم - نومبر ۳۸ء)

کہیں زبان کے مسئلہ پر ہندو ذہنیت سے تنگ آکر لکھا جاتا ہے کہ۔

لیکن سمپورنانند صاحب اور زبان کے مسئلہ میں انکے پشت و پناہ مہاتما گاندھی۔ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ اب زیادہ دن تک دھوکا نہیں دے سکتے اور اب سب کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ وہ ملک میں مرحومہ سنسکرت کو اس کی قبر سے کھود کر نکالنا چاہتے ہیں"

(کلیم نومبر ۳۸ء)

یہاں تک بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ:۔

اصل یہ ہے کہ گاندھی جی نے اپنے دماغ میں ہندوستان کے آئندہ نظام کا جو خاکہ تیار کر لیا ہے وہ انہیں مسلمانوں کی اس قسم کی شکایات کے ازالہ کیطرف متوجہ نہیں ہونے دیتا"

(مدینہ - ۲۸ اکتوبر ۳۸ء)

یہ اقتباسات یونہی مثال کے طور پر درج کر دیئے گئے ہیں ورنہ آجکل تو یہ رسائل واخبارات بالعموم اسی روش پر آگئے ہیں جو اس سے پیشتر ٹوڈیوں اور رجعت پسندوں کی روش قرار دی جاتی تھی۔ بایں ہمہ چونکہ یہ حضرات ایک عرصہ سے مسلمانوں کو شمولیت کانگرس کی دعوت دیتے آرہے ہیں اسلئے اس نظریہ سے پیچھے ہٹ جانے میں ابھی ذرا جھجک سی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ سب کچھ لکھنے کے بعد مسلمانوں کو مشورہ یہ دیتے ہیں کہ ہندوؤں کی اس تنگ نظری کا علاج یہ ہے کہ تم جوق درجوق اور کارروائی کارواں کانگرس میں شامل ہو کر اسپر چھا جاؤ۔ ہندو خود بخود دب جائے گا۔ ہمیں اس "طریق علاج" پر حیرت بھی آتی ہے اور ہنسی بھی یعنی ان حضرات کا خیال ہے کہ ۹ کروڑ آبادی والا مسلمان جب جوق درجوق کانگرس میں شریک ہونا شروع ہو جائے گا تو ۲۴ کروڑ والا ہندو چپکے بیٹھا دیکھتا رہے گا اور جب کانگرس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی تو سب کچھ انکے حوالے کر کے خود انکا سلوک بنجائیگا اور اپنی ذہنیت بدلنے پر مجبور ہو جائے گا۔

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم ان حضرات سے گزارش کرینگے کہ جب اللہ نے انکی نگاہ میں اتنی بصیرت پیدا کر دی ہے کہ وہ ہندوں

کے منصوبوں سے باخبر ہونے لگ گئے ہیں تو اپنے اندر اتنی جرأت بھی پیدا کریں کہ اپنے مسلک کی غلطی کا اعتراف کرلیں۔ انکشافِ حقیقت کے بعد غلطی کا اعتراف عزت کو بڑھاتا ہے۔ کم نہیں کرتا۔ یہ نفسِ وسیسہ کار کا فریب ہے تاہم جو ایسے وقت میں یہ صلاح دیتا ہے کہ اپنی بات پر اڑے رہو ورنہ بڑی سُبکی ہوگی۔ جتنی جلدی یہ حضرات اپنے اندر یہ جرأت پیدا کرلیں اتنا ہی انکے لیے اور قوم کے لیے اچھا ہے، ورنہ مسلمان کا کانگرس میں کار رواں در کار رواں شریک ہونا تو ایک طرف، واقعات کی رفتار تو بتا رہی ہے کہ خود اُنکے الفاظ میں:-

"اگر یہی لیل و نہار ہے تو اندیشہ ہے اور سخت اندیشہ کہ کانگرس میں تازہ مسلمانوں کا داخلہ تو کیا، پُرانے کانگرسی مسلمان بھی کانگرس سے باہر آجانے پر مجبور ہو جائیں گے" (کلیم نومبر ۳۸ء)

قضیہ امامت مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اگرچہ ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے لیکن ہم نے قصداً اسکے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اس لیے کہ اس مسئلہ پر اگر اصولی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو یہ اتنا مختصر سا مسئلہ نہیں رہ جاتا جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ اسکے ضمن میں امامت و سیاست سے متعلق اس قدر گوناگوں مباحث آجاتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک عنوان، بجائے خویش ایک موضوع بنجاتا ہے جسپر کتاب و سنت اور تاریخ و آثار کی روشنی میں اگر کچھ لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے جسکیلئے نہ سردست وقت ہے نہ گنجائش لیکن کلکتہ کی نماز عید نے ایک ایسی حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے کہ جسکا اجمالی تذکرہ ناگزیر ہوگیا ہے۔ قومیت پرست مسلم حضرات کا یہ عام مسلک ہو چکا ہے کہ جہاں کسی جماعت نے ان کی کسی روش کی مخالفت کی تو انہوں نے شور مچانا شروع کردیا کہ یہ چند فتنہ پرداز مفسد لوگوں کی شرارت ہے جو کسی گنتی شمار میں نہیں ہیں۔ ورنہ ملتِ اسلامیہ تو ہمارے ساتھ ہے۔ یہی طریق عمل انہوں نے قضیہ امامت میں بھی اختیار کیا اور عام مشہور کردیا کہ کلکتہ کے چند شوریدہ سر لوگوں نے خواہ مخواہ ایک شاخسانہ کھڑا کردیا ہے ورنہ مسلمانوں کی اکثریت مولانا آزاد کی امامت کے حق میں ہے۔ مسئلہ امامت کے دوسرے گوشوں سے کسی کو اختلاف ہو تو ہو لیکن یہ امر تو مسلمہ ہے کہ جماعت کا امام وہی ہوسکتا ہے جس کی امامت پر جماعت رضامند ہو۔ عید کے دن یہ معاملہ یوں نکھر کر سامنے آگیا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ قریب ڈیڑھ لاکھ مسلمان اس میدان میں جمع ہوئے جہاں مولانا آزاد کی امامت کی مخالفت کرنے والوں نے نماز پڑھی۔ اور صرف دس ہزار کے قریب اس مقام پر جمع

ہوئے جہاں مولانا کے مؤیدین نے نماز ادا کی۔ اب اس سے اندازہ فرمالیجئے کہ جماعت کی اکثریت مولانا صاحب کی امامت کی حامی تھی یا مخالف۔ اور قومیت پرست حضرات کا یہ پروپیگنڈا کہ یہ فتنہ محض چند مفسدین نے برپا کر رکھا ہے۔ کس قدر صداقت پر مبنی تھا!

یہ واقعہ جہاں مولانا آزاد کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہاں کانگرسی ہندوؤں کو بھی اس سے بہت کچھ سبق حاصل ہو سکتا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے بہترین ترجمان اور صحیح نمائندے ان کے ساتھ ہیں۔ مولانا آزاد ان "صحیح نمائندگان" کے سرخیل ہیں جو ہندوؤں کے ہمنوا ہیں آپ خود ہی موازنہ فرمالیجئے کہ مسلمانوں کے صحیح نمائندہ مولانا صاحب ہیں یا وہ جماعت جس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کی جمعیت تھی کانگرسی ہندو ہمیشہ انگریزوں کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ گورنمنٹ گول میز کانفرنس وغیرہ میں ان لوگوں کو ہندوستانیوں کا نمائندہ بنا کرلے جاتی ہے جنکے پیچھے ہندوستانیوں کی اکثریت نہیں ہوتی اگر وہ لوگ جنکے پیچھے ملک کی اکثریت نہیں ہوتی۔ ملک کے صحیح ترجمان نہیں ہو سکتے تو وہ مسلمان جنکے پیچھے مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے وہ کیسے مسلمانوں کے صحیح نمائندہ ہو سکتے ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار

واقعۂ نمازِ عید میں سب سے زیادہ دلخراش اور جگر سوز حصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے اپنی نماز الگ جاکر پڑھی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ جب مولانا آزاد خود ہی امامت سے دست بردار ہو گئے تھے تو بات صاف ہو چکی تھی۔ اس کے بعد پھر یہ دوسری جگہ الگ نماز کیوں !!

اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح مولانا آزاد سے سیاسی اختلاف رکھنے والے مسلمان ان کی اقتدا میں نماز پڑھنا نہیں چاہتے تھے اسی طرح اُن کے ہم مسلک مسلمان اس جماعت کے ساتھ ملکر نماز نہیں پڑھنا چاہتے تھے جو مولانا صاحب کی امامت کی مخالفت کر رہی تھی تو ہم اتنا دریافت کریں گے کہ قومیت پرست حضرات نے سیاسی اختلاف کی بنا پر مولانا آزاد کی امامت کی مخالفت کرنے والی جماعت کو جس طرح ہدفِ سب و شتم بنا رکھا تھا کیا اب انصاف کا تقاضا نہیں کہ وہ اپنی پارٹی کو بھی مطعون کریں کہ انہوں نے بھی وہی گناہ کیا ہے جو انکے مخالفین کر رہے تھے۔

اگر یہ کچھ مولانا آزاد کی مرضی سے ہوا ہے تو اس "مسجد ضرار" کی تعمیر پر جس قدر بھی خون کے آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ اور اگر ان کی مرضی کے خلاف ہوا ہے تو حیرت ہے کہ انکا اپنے متبعین پر اتنا اثر بھی نہیں ہے

کہ وہ انہیں اس حرکت سے روک سکے!

طلوع اسلام کے اجرا کے وقت سے آج تک ہم اسی کشمکش میں گرفتار ہیں کہ۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

وقت کی نزاکت، واقعات کی اہمیت۔ زمانہ کی برق رفتاری۔ اور اسکے ساتھ قارئین کا اصرار پیہم اس امر کا متقاضی رہتا ہے کہ وہ سیاسی مباحث جنکا تعلق ملت اسلامیہ کی عملی زندگی سے ہے اور جن سے غفلت برتنا گویا قومی خودکشی کرنا ہے بہ تمام وکمال طلوع اسلام کے صفحات پر لائے جائیں اور قرآن کریم کی روشنی میں مسلمانوں کی صحیح راہ نمائی کیجائے۔ دوسری طرف ایک ماہوار مجلہ اور اسکے محدود صفحات اس چیز کی اجازت نہیں دیتے کہ ان اہم امور پر شرح وبسط سے لکھا جاسکے۔ چہ جائیکہ ان علمی مضامین کو شائع کیا جائے جن کی اشاعت رسالہ کے اجراء کے وقت پیش نظر تھی اور جن میں سے اکثر و بیشتر ایک عرصہ سے لکھے رکھے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ایسے وقت میں ہونا تو یہی چاہیئے کہ

جو ہو چمن میں وفور گل کا تو اور دامن دراز ہو جا

لیکن پاؤں چادر کے مطابق ہی پھیلائے جائیں تو اچھا ہے' ورنہ احباب کا تو ابھی سے یہ تقاضا ہے کہ پرچہ کو ہفتہ وار کر دینا چاہیئے۔ بہرحال نتیجہ اس کشمکش کا یہ ہے کہ جہاں ہر ماہ کئی اہم سیاسی مباحث کا تذکرہ مجبوراً چھوڑ دینا پڑتا ہے وہاں ایسے مضامین کی اشاعت بھی روک دینی پڑتی ہے جو مسلسل شائع ہو رہے ہیں، آپ اندازہ نہیں فرما سکتے کہ ہمیں بالخصوص معارف القرآن کی قسط کس طرح چھاتی پر پتھر رکھ کر روکنی پڑتی ہے جسکے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ رسالہ کا پہلا سال تو اس کش مکش میں گزر جانے دیجئے۔ انشاءاللہ دوسرے سال میں قدم رکھتے وقت ہم پورا پورا اندازہ کر سکیں گے کہ "وفور گل" اور "درازئ داماں" میں صحیح تناسب کیا ہونا چاہیئے۔

طلوع اسلام بعونہ تعالےٰ نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ اور خدا کے مخلص بندوں کی وہ جماعت جسنے اسکا خسارہ پورا کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ نہایت خندہ پیشانی اور ثابت قدمی سے حوصلہ دلاتی ہے کہ

اسے جتنا بڑھنا چاہیئے۔ بڑھتا جائے۔ ہم انشاء اللہ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے اور انکے ارادوں میں استقامت اور برکات عطا فرمائے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایک متعینہ پیمانہ کے مطابق ہی آگے بڑھیں۔ ورنہ

ہم کسی کو کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے!

بہرحال۔ اللہ تعالےٰ کی عنایات شامل حال رہیں تو طلوع اسلام کا ہر قدم آگے ہی بڑھے گا۔ اور یوں رفتہ رفتہ یہ اس مقام تک پہنچ جائے گا۔ جہاں اسے دیکھنے کے لیئے آنکھیں متمنی ہیں وما توفیقی الّا باللہ العلی العظیم۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔

کمال اتاترک

(از حضرت اخگر مرادآبادی)

جب قوم کی عزت کا سوال آہی گیا		اسلامی حمیت کو جلال آہی گیا

ترکوں کے کمالات دکھانے کیلئے		دنیا میں اتاترک کمال آہی گیا

یہ پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ ناگاہ مجاہدِ ملت، خالدِ اسلام، شیر بیشۂ حریت و بسالت، ضیغم نیستانِ شجاعت و جسارت، حضرت مولانا شوکت علی علی اللہ مقامہ کے انتقال کی خبر وحشت اثر موصول ہوئی!

ملتِ اسلامیہ کی آستینیں ہنوز علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے غم کے آنسوؤں سے خشک نہ ہونے پائی تھیں کہ غازی کمال اتاترک رحمۃ اللہ علیہ کی بیوقت موت کی اطلاع ملی۔ اور ابھی اُن کے ماتم میں آنکھوں کو خونابہ فشانی سے سکون نہ حاصل ہوا تھا کہ یہ قیامت خیز حادثہ فاجعہ مسلمانوں کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ اس وقت کہ دلِ حزیں کے ٹکڑے ہو رہے ہیں جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ رہا ہے، افکار منتشر ہیں، دماغ پریشان ہے ہم نہیں سمجھتے کہ کن الفاظ میں اس حدیثِ الم کا ذکر کریں۔ شبِ تاریک۔ موجِ بیم۔ و گردابِ فنا ایکطرف اور کشتیٔ ملت کے تجربہ کار ناخداؤں کا یکے بعد دیگرے یوں ایک ایک کر کے ہم سے چھن جانا۔ دوسری طرف

غالب دگر مپرس کہ برما چہ بگذرد

ہندوستان میں سب سے پہلی منظم سیاسی تحریک۔ تحریکِ خلافت تھی۔ اور وہی ایک ایسی تحریک تھی جس میں مسلمانوں کے تمام قلوبِ درد آشنا بلا تشتت و افتراق۔ اور بلا انتشار و اختلاف۔ ایک مقصدِ مشترک اور ایک نصب العینِ متحدہ کے ماتحت متحرک تھے۔ ایسی منظم اور متحدہ تحریک کی کامیابی ہندوستان کی تاریخ آزادی میں درخشندہ حروف سے لکھی جانے کے قابل ہے اور اسکا سہرا مجاہد مرحوم کے ہی سر ہے۔ پھر اسکے بعد اور اس سے پیشتر اسلام کے اس سچے جاں نثار سپاہی نے جس گرمجوشی۔ صداقت۔ استقلال، جواں ہمتی اور عزم و خلوص کے ساتھ ملت اسلامیہ کی گراں بہا خدمات سر انجام دی ہیں۔ ان کی صحیح صحیح قدر آنے والی اسلامی نسلیں ہی کر سکیں گی۔ دو لفظوں میں یوں کہیے کہ مولانائے مرحوم اسلام کے ایک ایسے سچے جانفروش جرنیل تھے۔ جن کی زندگی بھی میدانِ جہاد میں بسر ہوئی اور جن کی موت بھی صفِ جنگاہ میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس مردِ مجاہد کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ اور امتِ مرحومہ کی بیکسی پر ترس کھا کر کوئی ایسا مردِ حق آگاہ پیدا کر دے جو اس منتشر فوج کی عسکری قیادت کر سکے۔ آمین۔

امارت شرعیہ بہار اور وارد ہا اسکیم

(وارد ہا کی تعلیمی اسکیم جو اوّل سے آخر تک گاندھی جی کے دماغ کی اختراع اور جامعہ ملیہ کے محترم امیر کی کاوشوں کا نتیجہ ہے مسلمانوں کے لیے جس قدر تباہ کن ہے اُس کا احساس ابتدا میں بہت کم لوگوں کو ہوا، خدا کا شکر ہے کہ "طلوع اسلام" نے سب سے پہلے اُس کے بنیادی اور تخریبی اُصولوں پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ تنقیدی نگاہ ڈالی اور اسکے ترکیبی عناصر کو تحلیل کرکے دلائل اور واقعات کی روشنی میں بتا دیا کہ یہ تعلیمی اسکیم اسلامی نظریات و افکار سے کس قدر مختلف ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے کیا کیا مضرتیں پوشیدہ ہیں ہمیں فخر ہے کہ "طلوع اسلام" کی یہ دلیرانہ تنقید کامیاب ہوئی اور اس کی تائید میں ملک کے گوشہ گوشہ سے صدائیں بلند ہونے لگیں[1]۔

امارت شرعیہ صوبہ بہار "ٹوڈیوں" اور "رجعت پسندوں" کی جماعت نہیں ہے بلکہ وہ مذہبی ادارہ ہے جسنے کانگریس کی ہمیشہ حمایت کی ہے اور اسکے دوش بدوش کام کیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے بھی اس اہم مسئلہ کیجانب توجہ کی اور وارد ہا کی تعلیمی اسکیم پر صحیح زاویہ نگاہ سے ایک مبسوط تبصرہ شائع کیا جسے ہم بکمال مسرت ذیل میں درج کرتے ہیں۔)

(طلوع اسلام)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمان قوم کی بنیاد قرآن کریم اور احادیث کی تعلیمات پر مبنی ہے کوئی شخص جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے اُسکے لیے ضروری ہے کہ وہ اس امر کو جانے کہ اسلام کن بنیادی اُصولوں کو ماننے اور کن اعمال کے کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

انگریزوں نے جب یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز اُنکے مذہبی علم اور عمل پر مبنی ہے تو انکی

---

[1] چنانچہ پمفلٹ "وارد ہا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" تقریباً دس ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے پشتو اور گجراتی میں اسکے تراجم شائع ہو چکے ہیں اور سندھی میں اسکا ترجمہ ہو رہا ہے۔ (طلوع اسلام)

مذہبیت کو فنا کرنے کے لیے سب سے پہلا ہتھیار جو تیار ہوا وہ یہ تھا کہ مذہب اسلام کی تعلیم کو تعلیمگاہوں سے خارج کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اسلامی روح سلب ہو گئی اور آج جو کچھ آپکو نظر آرہا ہے وہ قوم کا جسد بے روح ہے اکبر مرحوم نے سچ کہا ہے ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے!
تو خوشی پھر اُس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

مسلمان انقلاب ہند کے لیے جو کوشش کرتے رہے ہیں، اسکے دو مقاصد انکے سامنے رہے ہیں مذہب کی آزادی اور ملک کی آزادی، موجودہ اصلاحات نے ناقص طریقہ پر تعمیر قومی کا کسی حد تک موقع دیا ہے، اسی بنا پر جب سے کانگرس نے صوبوں کی حکومتوں کے چلانیکی ذمہ داری لی ہے وہ اس کوشش میں مصروف ہے کہ ابتدائی تعلیم کو عام اور جبری کیا جائے اور اس کو تعمیر قومیت کا ذریعہ بنایا جائے اس موقع پر مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ انکے بچوں کی تعلیم کا سامان اس طرح کیا جائے کہ انکی متاع گم گشتہ پھر واپس آئے یعنی مسلمان پھر مسلمان ہوں۔

مذہبی لزوم کے لیے امارت شرعیہ کی سعی

نمائندہ حکومت کی بنا کے بعد مسلمانوں کو یہ سمجھنے کا فطری حق حاصل ہے کہ موجودہ حکومتیں قومی حکومتیں ہیں، اور انکا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں ان کے جذبات اور حسیات کا لحاظ رکھیں اسی بنا پر امارت شرعیہ صوبہ بہار نے جب ان تیاریوں کا حال سُنا جو قومی تعلیم کے اجراء کے متعلق کانگرس کے روح رواں یعنی گاندھی جی نے شروع کی تو امارتِ شرعیہ نے حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت کی راہ نمائی اور ہدایت میں ذمہ دار حضرات کو اس طرف توجہ دلائی کہ ابتدائی تعلیم میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم بھی لزوماً داخل کیجائے۔

وارد ہا تعلیمی کمیٹی کے صدر کے نام خط

اس سلسلہ میں جب ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء مطابق ۱۷ شعبان ۱۳۵۶ھ کو وارد ہا تعلیمی کمیٹی بنی اور اُسکے صدر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب قرار پائے تو ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء مطابق ۲۵ شعبان ۱۳۵۶ھ کو ڈاکٹر

ذاکر حسین صاحب کو حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے ایک خط لکھا کہ "ابتدائی اور جبری تعلیم کا جو خاکہ آپ کو تیار کرنا ہے اُس میں ابتدا ہی سے مذہبی تعلیم کے لیے کافی گھنٹے رکھنے چاہئیں، اُمید ہے کہ اس پر آپکی نظر ہوگی لیکن بطور یاددہانی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرادوں کمیٹی کو یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو جائیگی"۔ اسی مضمون کا ایک خط حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کو بھی لکھا کہ آپ بھی ڈاکٹر صاحب کو توجہ دلائیں۔

وزیر تعلیم سے گفتگو

رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ میں آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم صوبہ بہار سے ایک نجی صحبت میں ابتدائی تعلیم میں مذہبی تعلیم کے لزوم کے متعلق گفتگو ہوئی اور قرار پایا کہ چند روز کے بعد پھر ملکر اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ گفتگو کیجائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب سے اس موضوع پر پھر گفتگو ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ حکومت ایک قومی اور نمائندہ حکومت ہے اس کا فرض ہے کہ وہ قوم کے جذبات اور حسیات کے مطابق چلے اور اب مسلمان اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حکومت مذہبی تعلیم دینے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی جس کی بنا پر حکومت ابتدائی تعلیم کی ذمہ دار بنتی ہے۔ وہی دلیل مذہبی تعلیم کے لیے بھی ہے البتہ حکومت کو جو انتظامی اور مالی دقتیں اس کام کے اجرا میں ہیں ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں حکومت کی مالی اور انتظامی دقتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابتدائی تعلیم میں مذہبی تعلیم کے لزوم کے متعلق جو باتیں سرسری طور پر ذہن میں آئیں اُن کو پیش کیا گیا ہے تاکہ ماہرین کے سامنے آجائیں اور وہ اس پر غور کر سکیں +

وزیر تعلیم کے نام خط

چنانچہ گفتگو کے ختم پر وزیر تعلیم سے کہا گیا کہ اسی کو قلم بند کر کے خط کی صورت میں بھیجدیا جائیگا تاکہ غور وفکر کی بنیاد کے طور پر کام آوے اور ۱۹ رمضان المبارک مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم صوبہ بہار کو خط لکھا گیا +

واردھا تعلیمی اسکیم کے صدر اور دوسرے حضرات سے گفتگو

اسی سلسلہ میں ۱۲ رمارچ ۱۹۳۶ء مطابق ۸ محرم ۱۳۵۵ھ کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب سے بانکی پور میں اُن کی قیام گاہ پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے ملاقات کی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ڈاکٹر عابد حسین صاحب، ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے باتیں ہوئیں +

۲۲ رمارچ کو دفتر امارت شرعیہ سے اس خط کی نقل جو وزیر تعلیم صوبہ بہار کو بھیجی گئی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے ملاحظہ کے لیے بھیجی گئی تاکہ اُنکے علم میں بھی یہ امر آجائے اور جب موقع آئے یہ بات اُنکے پیش نظر ہے +

امارت شرعیہ کی سعی کا دوسرا قدم

۲۲ رمارچ کو دفتر امارت شرعیہ سے نقیب (جو امارت شرعیہ کا ترجمان ہے) ایک نوٹ مذہبی تعلیم کا لزوم (جو ۸ رمارچ ۱۹۳۶ء کو شائع ہوا تھا) کا تراشہ وزیر تعلیم صوبہ بہار اور وزیر اعظم بہار بابو راجندر پرشاد اور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی خدمات میں روانہ کیا گیا، ۸ رمارچ سے اسوقت تک جریدۂ نقیب کی کوئی اشاعت ایسی نہیں ہوئی جس میں ابتدائی تعلیم میں مذہبی تعلیم کے متعلق کوئی تحریر نہ ہو۔

اسکے علاوہ ایک تحریر اس مضمون کی مشاہیر کے پاس بھیجی گئی کہ مسلمانوں کی تمام تر تہذیب، تمدن اور معاشرت کی بنا ر مذہب پر ہے اب تک انگریزوں نے مسلمانوں کے تمدن کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے نظریئے پیدا کیئے اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ حکومت مذہبی تعلیم کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی اب کہ نئی اصلاحات نے صوبوں میں قومی حکومت کی ایک شکل پیدا کر دی ہے، یہ حکومتیں جیسی کچھ بھی ہوں. بہر حال قومی حکومتیں ہیں تو ان کو مسلمانوں کے واجبی مطالبہ کے (کہ تعلیم کے ہر درجہ میں مذہبی تعلیم کا نظم کیا جائے) بے اعتنائی نہ برتنی چاہیئے مسلمانوں کے لیئے یہ مسئلہ وقت کے تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے اسلیے حکومت اور قوم کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ مسلمانوں کی ہر اجتماعی اور انفرادی اخلاق کی کمزوری کی بنا ر اُنکی مذہبی معلومات اور تربیت کی کمی ہی کی وجہ سے ہے اور اس ایک اصلاح سے اُنکی بہت سی کمزوریوں کی اصلاح بیک وقت ہو جائیگی، جو حکومت، قوم اور ملک سب کے لیئے یکساں مفید ہوگی۔

امارت شرعیہ کی سعی کا پہلا نتیجہ

اِن تمام کوششوں کا نتیجہ الحمدللہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی توجہ اسطرف منعطف ہو گئی خصوصیت سے جمعیتہ علماء صوبہ بہار کے اجلاس منعقدہ چھپرہ نے ۲۸، ۲۹ مئی کو ایک تجویز واردھا تعلیمی اسکیم کے متعلق منظور کی جس میں مذہبی تعلیم لازمی رکھنے پر زور دیا اور اسکیم پر تنقید کی اور ایک مستقل کمیٹی بنائی اور تجویزوں کی نقلیں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کے خط کے ساتھ وزیر اعظم اور وزیر تعلیم کو بھیجی گئیں اور مجلس عاملہ جمعیتہ علمائے ہند منعقدہ ۳ اگست ۱۹۳۸ء نے بھی اس مقصد کے لیے کمیٹی بنائی ان جلسوں میں خود حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب موجود تھے۔ اس مقصد میں امارت شرعیہ خصوصیت سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ممنون ہے جنے مذہبی تعلیم کے لزوم پر خصوصیت سے توجہ کی۔ چنانچہ جناب سید الطاف علی صاحب ہیڈ اسسٹنٹ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا خط جو ۲۲ رجب ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء کو موصول ہوا ہے اسمیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔ بجواب گرامی نامہ نمبر ۶۹ مورخہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ واردھا تعلیمی اسکیم کے متعلق آپ کے استفسارات کا جواب جلد نہ جا سکا۔ جس کا دلی افسوس ہے تاخیر کیوجہ یہ تھی کہ کانفرنس آپ کو سرسری طور پر کچھ لکھنا نہیں چاہتی تھی اب کہ پوری واردھا اسکیم کے بارے میں ہماری تجاویز کافی غور و خوص کے بعد تیار ہوگئی ہیں ان کی نقل مرسل خدمت ہے......

اور کانفرنس کی جس کمیٹی میں یہ تجاویز مرتب ہوئی تھیں ان میں مذہبی تعلیم کے بارے میں آپکا ایک مضمون بھی پیش ہوا تھا۔ اور غالبًا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی رائے پر اس مضمون نے کافی اثراندازی کی، دکانفرنس کی تجاویز نقیب یکم ستمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکی ہیں ملک کے اور اخباروں نے بھی اس پر مستقل مضامین لکھے۔ جناب ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب نے مسلمانوں کے مذہبی تعلیم کے لزوم کے متعلق ایک مضمون بھی شائع کیا جو انکے تعلیمی ماہر ہونے کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے۔ دیکھو نقیب ۷ اگست ۳۸ء

گاندھی جی کا رویہ

اس سلسلہ میں یہ عجیب افسوسناک بات دیکھنے میں آئی کہ مذہبی تعلیم کے لزوم کے متعلق مسلمانوں کا جس قدر اصرار بڑھتا گیا گاندھی جی اسکے انکار میں سخت تر ہوتے گئے اور طرح طرح کے بے معنی دلائل بھی انہوں نے دیئے جس کی مہذب اور معقول تردید نقیب میں مسلسل ہوتی رہی ہے۔

ایک طرف ہماری طرف سے ابتدائی تعلیم کے لزوم کے متعلق پیہم کوشش جاری رہی دوسری طرف حکومت نے خاموشی سے تمام مطالبات کو اس طرح ٹالا کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے جو خطوط لکھے تھے انکا کوئی جواب بھی نہیں دیا۔

وزیر تعلیم کا بیان

یہاں تک کہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو واردھا تعلیمی اسکیم کے افتتاحی جلسہ میں ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بہار کا خطبہ پڑھا گیا جس میں انھوں نے مذہبی تعلیم کے متعلق اپنی پالیسی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ بلاشبہ مذہبی تعلیم کا ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق اور ماحول کے بنانے میں کافی حصہ ہے لیکن اسکے بعد آپنے مذہبی تعلیم کے دو حصے کر دیئے (۱) اخلاقی تعلیم اور (۲) مذہبی اصول یا عقائد کی تعلیم پھر آپنے فرمایا کہ جہاں تک پہلی قسم کی تعلیم کا تعلق ہے واردھا اسکیم میں اسکا پورا نصاب موجود ہے۔ جس میں پیغمبروں، مذہبی مفکروں اور رہبروں کی سوانح اور اُن کی تعلیمات درج ہیں اور دوسری قسم کی تعلیم یعنی عقائد کی تعلیم سے وزیر تعلیم نے صاف انکار کر دیا۔ وزیر تعلیم کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ اخلاق کی بنیاد عقائد کی سطح پر قائم ہے اسلیئے اخلاق کی تعلیم بغیر عقائد کے لغو اور بے معنی ہے اور اُسکی مثال ایسی ہو کہ بغیر بنیاد کے عمارت کی تعمیر کی ناکام کوشش کیجائے۔

محض اخلاقی تعلیم کی ناکامی

اسموقع پر وزیر تعلیم کی واقفیت کے لیئے ہم یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت ہند نے ۱۹۱۲ء میں ایک مخصوص کانفرنس اس غرض سے منعقد کی تھی کہ مذہبی تعلیم کی جگہ اخلاقی تعلیم رائج کرنے کے مسئلہ پر غور کیا جائے اور اسمیں یہ طے ہوا کہ اخلاقی تعلیم بلا مذہبی تعلیم محض ایک ڈھکوسلہ ہے اور اس فیصلہ کی مزید توثیق اس تجربہ سے ہوتی ہے جو فرانس میں کیا گیا (بیان ڈاکٹر ضیاالدین صاحب مطبوعہ نقیب ۱۷ اگست ۱۹۳۸ء ص۱۲)

وزیر تعلیم کا مغالطہ

وزیر تعلیم کا اسکے بعد ارشاد ہے "لیکن جہاں تک دوسری قسم کی مذہبی تعلیم کا تعلق ہے یہ ناقابل عمل ہے کہ حکومت کے پرائمری اسکولوں میں جس میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو اُستاد ہونگے اور اُن پر بھی کاموں کا بار ہو گا کہ

صحیح مذہبی تعلیم دیجا سکے، ہر اسکول میں ضروری ہوگا کہ ہر مذہبی جماعت کے لوگوں کے لیے ایسے استاد رکھے جائیں جو ہر مذہب کے عقیدہ و اصول کے مستند واقف کار ہوں۔ مثلاً سُنیوں کے لیے سُنی استاد رکھے جائیں شیعوں کے لیے شیعہ استاد سناتن دہرمیوں کے لیے سناتن دہرمی استاد، آریہ سماجیوں کے لیے آریہ سماجی استاد جین اور وشنیوں کے لیے جین اور وشنو استاد، تمام اسکولوں میں ایسا انتظام حکومت کے اخراجات سے بعید ہے۔" ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے دفترامارت شرعیہ سے جو خط بھیجا ہے اُسے انہوں نے یا تو پڑہا نہیں اور اگر پڑہا ہے تو سمجھنے کی کوشش نہیں کی یا پھر وہ جان بُوجھ کر مذہبی تعلیم کو سرکاری تعلیم گاہوں میں ناقابل عمل ثابت کرنے کے لیے ایسا فرمارہے ہیں ان میں سے جو بات بھی ہوئے حد افسوسناک ہے۔

اس تقریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر تعلیم مذاہب کے فرق کو بھی نہیں جانتے یا دانستہ دوسروں کو مغالطہ دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہندو دہرم کا کوئی مخصوص عقیدہ و عمل نہیں ہے جس کی تعلیم کا سوال پیش آسکتا ہے اسکے علاوہ واردہا اسکیم میں سناتن دہرمی تعلیم تو اصولاً موجود ہی ہے۔ اسپر مزید اضافہ کیا ہوسکتا ہے رہا شیعوں اور سُنیوں کا معاملہ تو صوبۂ بہار میں چند ہی گاؤں ایسے ہیں جس میں شیعہ آباد ہیں اسکے ماسوا اسلام کے اصولی عقاید توحید، رسالت حشر و نشر وغیرہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے مذہب کا ایک حصہ فرائض واعمال بھی ہیں جنکے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا اور ظاہر ہے کہ تعلیمی اسکیم سے بھی خارج ہے، حالانکہ بچوں کی ابتدائی تعلیم میں اسکی شمولیت کی بھی ش۔ بدضرورت ہے اور فرائض واعمال میں بھی شیعہ، وسنی میں کوئی اصولی فرق نہیں اور ابتدائی تعلیم میں کوئی چیز ہی ایسی نہیں جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف کا سبب ہو۔

اختلاف جو کچھ ہے، وہ ان کی تفصیل و تشریح میں ہے جن کا ابتدائی درجوں کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِس لیئے ڈاکٹر صاحب نے شیعوں اور سُنیوں کی تعلیم کے لیئے علیحدہ علیحدہ اُستاد رکھنے کی جو خوفناک مصیبت بیان کی ہے وہ محض فرضی اور خیالی ہے اگر وزیر تعلیم مذہبی تعلیم کے لازم کرنے کا وعدہ کریں تو ہم ایسا نصاب تعلیم تیار کرنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں جو شیعہ وسنی دونوں کو قبول ہوا ور اسکو دونوں

فرقے کے علما منظور کرلیں۔

گاندھی جی کی خواہش کی تکمیل

جو اُستاد پیغمبروں کی سیرت پڑھا سکتا ہے وہ دوسری مذہبی کتابیں کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کا اِنکار محض اس لیئے ہے کہ مسلمان بچوں کو اگر مذہبی تعلیم دی جائیگی تو پھر ناچنے گانے اور گاندھی جی کی مخصوص تعلیمات سے جو ملحدانہ اثرات پیدا کرنا مقصود ہے وہ باطل ہو جائے گا۔ اور گاندھی جی جب ہندو تمدن کے احیاء کے خواہش مند ہیں وہ زندہ نہ ہوسکے گا۔ ورنہ مذہبی تعلیم کا اجراء نا قابل عمل کیا معنی دشوار بھی نہیں ہے۔ دو استاد ہونگے صُورتیں تو بالکل سہل ہے کہ ہندو طلبہ کے ناچنے گانے کے وقت میں مُسلمان اُستاد مسلمان طلبہ کو مذہبی تعلیم دیگا۔

مسلمان بچوں کے لیئے مذہبی تعلیم کی ضرورت

مُسلمان بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کی ضرورت اسلیئے ہے کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کو ایک نہ سمجھے اُسکے رسولوں پر کتابوں وغیرہ پر ایمان نہ لائے تو وہ مُسلمان ہی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح نماز روزہ، حج زکوٰۃ جہاد وغیرہ کو فرض نہ سمجھے تو مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔

اسلام کی حلال کی ہوئی اشیاء کو حلال اور حرام کی ہوئی اشیاء کو حرام نہ سمجھے تو مسلمان نہ رہے گا ہندو اور مسلمان مذہب میں یہ عظیم الشان فرق ہے کہ اسلام میں مخصوص عقیدہ وعمل ہے جو تعلیم کا محتاج ہے اور ہندو دھرم میں ہر وہ امر داخل ہے جو کوئی شخص اپنے کو ہندو کہتا ہوا عمل میں لائے یا قابل عمل سمجھے اسلیئے اسکی مخصوص تعلیم کی ضرورت ہی نہیں ہے یہ تمام باتیں ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر ہوں گی لیکن اسکے باوجود وہ مسلمانوں کے لیئے مذہبی تعلیم کے اجراء کے مطالبہ کو غیر اہم ثابت کرنے کی افسوسناک کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اپنی تقریر میں ڈاکٹر صاحب خود فرماتے ہیں کہ پیغمبروں، مذہبی مفکروں اور رہبروں کی سوانح اور ان کی تعلیمات وسیع ہوں گی اگر ان تعلیمات میں اُنکے عقائد اور اعمال واخلاق درج کر دیئے جاتے اور خصوصیت کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں وہ اُمور بقدر ضرورت لکھ دیئے جائیں، تو یہ بھی کافی ہو جائے گا لیکن اسکی توقع نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوسکتا تو وزیر تعلیم مذہبی تعلیم کے لزوم کا اقرار

کرلینے -

مذہبی تعلیم سے انکار کی وجہ

لیکن اصل خطرہ یہی ہے کہ اسلامی تعلیمات سے واقفیت کے بعد مسلمان بچہ گاندھی ازم اور ہندوازم کا شکار نہیں ہوگا اور کانگریسی حکومتیں گاندھی ازم کی اشاعت کے لیے جو گمراہیاں پھیلانے کا ارادہ کرچکی ہیں ان کا اسلامی تعلیمات سے خود بخود ازالہ ہو جائیگا

امارت شرعیہ کی سعی کا دوسرا نتیجہ

اس سلسلہ میں جو خدمت ممکن تھی امارت شرعیہ نے انجام دی ۔ چنانچہ اس کی سعی وجہد کا نتیجہ ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب صدر وار دہا تعلیمی کمیٹی نے مذہبی تعلیم کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا کہ ان جماعتوں کو جو بچوں کو مذہبی تعلیم دلانا چاہتی ہیں اُنکے لیے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ۔ اور اسی وجہ سے آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم نے جو کچھ فرمایا اُسی کی روشنی میں فرمایا ۔ مگر ہمارے اصلی مطالبہ کے ماننے سے گریز کیا ۔

وزیر تعلیم فرماتے ہیں کہ لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو جماعت اپنے مذہبی اصولوں کی تعلیم دلانا چاہے اس کو اس کی اجازت ہوگی کہ وار دہا اسکولوں میں ضمنی طور پر بذات خود اسکا انتظام کرلے ، مذہبی تعلیم کے لیے یہ عنایت بے معنی ہے اسلیئے کہ اگر افراد محض ہدایت کردینے سے ہر امر کا انتظام دنیا میں کرسکتے تو حکومت کو ابتدائی تعلیم کے لیئے اتنے انتظام کی ضرورت نہ تھی ۔ وزیر تعلیم کا ایک اعلان کافی تھا کہ لوگ بچوں کی تعلیم کا انتظام کرلیں در اصل وزیر تعلیم کا یہ اعلان صریح دھوکہ ہے جو وہ مسلمان قوم کو دے رہے ہیں ، بہرکیف ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر تعلیم نے بالفاظ صریح مذہبی تعلیم کے لزوم سے انکار کردیا ہے حالانکہ مسلمانوں کی خواہش یہ ہے کہ مذہبی تعلیم ہر درجہ میں لازمی قرار دیجائے ۔

مسلمانوں کو دعوت عمل

ان حالات کی بنا پر ہم نے ضرورت محسوس کی کہ تمام باتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کردیں کیونکہ اب قوم کی اجتماعی اعانت کے بغیر حصول مقصد ناممکن ہے اس صوبہ کے تمام مسلمانوں اور تمام مقتدر حضرات اور انجمنوں سے التماس ہے کہ وہ اپنی رائے سے جلد اطلاع دیں کہ وہ اس راہ میں کس حد تک ہماری اعانت کو

قومیت متحدہ

قرآن عزیز کی روشنی میں

(از جناب مولانا سید محتشم حسینی صاحب بلیاوی فاضل دیوبند)

قومیت متحدہ کی بابت ہم کو قرآن سے کیا سبق ملتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ آپ پہلے قومیت متحدہ کی حقیقت کو سمجھ لیں۔

قومیت متحدہ کا لفظ کانگرس تحریک کا پیدا کردہ ہے۔ اس کا واضح لفظوں میں یہ مطلب ہے کہ ہندوؤں کا مذہب اُن کی تہذیب، اُن کا تمدن، انکا کلچر مسلمانوں کی قومی تہذیب و تمدن سے جُدا گانہ ہے، ہندو اگر گائے کو اپنا معبود سمجھتا ہے، تو مسلمان اُس کو انسان کا خادم تصور کرتا ہے وہاں حلال وحرام کی تمیز کا فقدان ہے تو یہاں اسکا مکمل ضابطہ وہاں سوسائٹی ہے یہاں مذہب ہے، وہاں سب کچھ ہندوستان کے لیے ہے اور صرف ہندوستان کے لیے اور یہاں

مُسلم ہیں، ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کانگرس چاہتی ہے کہ ہندو مسلم کا یہ اختلاف مٹ جائے اور ہندوستان میں صرف ایک ہی مذہب کے ماننے والے ہوں اور سب ایک ہی تہذیب میں رنگے ہوئے ہوں وہ مذہب جو سارے ہندوستان پر حکمراں ہو ـــ ہندو مت ـــ ہونا چاہیئے، وہ فلسفہ جو سارے ہندوستان کے بسنے والوں کے دماغوں پر چھایا ہوا ہو وہ ـــ ہندو ازم ـــ ہو۔ وہ تہذیب جو سارے ہندوستانیوں کو محیط ہو ـــ ہندو تہذیب ـــ ہونی چاہیئے۔

ہر پڑھے لکھے سمجھ دار ہندو کی یہی مذہبی تمنا ہے اور یہی سیاسی آرزو، خواہ وہ مہاسبھائی ہو یا کانگریسی، دونوں کی یہی خواہش اور دونوں کی یہی کوشش ہے اور دونوں ہی چاہتے ہیں کہ ہندوستان

سے یہ بدیشی دھرم (اسلام) دُور ہو اور بھارت ماتا ـــــ ملکشوں کی "حجازی" تہذیب سے پاک ہو جائے +

ڈاکٹر رادھا مکرجی نائب صدر آل انڈیا ہندو مہا سبھا مشہور آدمی ہیں آپ ہندو مہا سبھا کے نائب صدر بھی ہیں اور بنگال کونسل میں کانگریس پارٹی کے لیڈر بھی ہیں۔ آپنے آل انڈیا ہندو ویدک (یوتھ) کانفرنس لاہور کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

"ہندوستان کو تھیوری (عقیدۃً) اور پریکٹس (عملاً) دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے۔ جس کا کلچر ہندو اور جس کا مذہب ہندوازم ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو"۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے بیان سے یہ امر واضح طور پر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں "ہندوازم" کا فرما رہے گا اور کسی دوسرے مذہب کے لیئے ہندوستان میں گنجایش نہ ہوگی، آزاد ہندوستان کا یہی نقشہ ہو گا رہ گئے مسلمان اور اُنکا مذہب اور اُنکے قومی حقوق اور اُن کی تہذیب و معاشرت کا کیا حشر ہو گا؟ اسکے متعلق بھی فیصلہ سن لیجیئے لالہ ہردیال ایم اے کو تو آپ جانتے ہونگے آپ کسی زمانہ میں بڑے زبردست انقلابی لیڈر تھے۔ چودہ برس کی جلا وطنی کے بعد ابھی حال ہی میں آپ پھر ہندوستان تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ایک بیان دیا تھا:۔

"انگریز ہندوؤں سے عہد و پیمان کے بعد ۵ے فیصدی سوراجیہ دیدے یا آزاد ہندو ریاست قایم ہو جائے یا جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے سوراجیہ ملنے کا وقت قریب آجائے تو ہماری پالیسی جو انگریزوں اور مسلمانوں کے ساتھ ہوگی اس کا اعلان کر دیا جائے گا اسوقت باہمی سمجھوتہ کی کوئی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ ہندو مہا سبھا صرف اپنے فیصلہ کا اعلان کردے گی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے کیا کیا فرائض ہیں" (ملاپ مورخہ ۵ مئی ۱۹۲۵ء)

یہ ہمارے برادرانِ وطن کے منصوبے اور ارادے ہیں کہ وہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کو کسی حالت میں برداشت نہیں کر سکتے اور وہ جو اٹھارہویں صدی کے آخر میں "بندے ماترم کے گیت" کے مصنف بنکم چندر چیٹرجی نے اپنی کتاب "آنند مٹھ" میں ہندوؤں کو اشتعال دلاتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

دہ مسلمان ملچھوں کے مقابلہ میں برطانیہ کی حکومت کو تسلیم کرلیں، ہندوؤں کا فرض ہونا
چاہیئے کہ ہندوستان کی پاک سرزمین کو ان ناپاک ملچھوں یعنی مسلمانوں سے پاک و صاف
کردیں، ان کی مسجدوں کو مٹا دینا چاہیئے، اور ان کو زبردستی ہندو بنالینا چاہیئے"۔
آج پچاس برس کے بعد بھی اسی کی صدائے بازگشت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں گونج رہی ہے،

مسئلہ اقلیت

اسی خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ہمارے حقوق کا تصفیہ ہوجانا چاہیئے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہمارے قومی وجود کو بہ زور حکومت مٹا دیا جائے اور ہماری حالت بھی اچھوتوں کی سی ہوجائے۔ مسئلہ اقلیت کی پیداوار اسی خطرہ کے ماتحت ہوئی لیکن برادران وطن کے تو منصوبے کچھ اور ہی تھے، جہاں "رام راجیہ" کی دھن لگی ہو وہاں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کا کیا سوال؟ لہٰذا سرے سے مسئلہ اقلیت ہی کا انکار کردیا گیا۔ گول میز کانفرنس میں بہت کوشش کی گئی کہ اقلیتوں کا مسئلہ آپس ہی میں طے ہو جائے، لیکن گاندھی جی نے اقلیتوں کے مسئلہ کا بالکل انکار کردیا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے جس پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے کہا تھا کہ:۔

"ہمت کے ساتھ حقائق کا مقابلہ کیجئے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ ایک مسلمہ حقیقت ہے"۔

پھر بہ جبر و قہر اقلیتوں کا مسئلہ پیش ہوا۔ انگریز نے ثالثی کرتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق کا فیصلہ صادر کردیا لیکن تماشا تو دیکھئے کہ فرقہ وارانہ حقوق کی تقسیم و تعیین کے لیے مسٹر ریمزے کو ثالث بنانیوالے خود مسٹر گاندھی مہاراجہ دربھنگہ، مسز سروجنی نائیڈو، راجہ نریندرناتھ، سیٹھ برلا، مسٹر آئنگر وغیرہ ہندو لیڈران ہی تھے اور ثالث بھی اُس کو بنایا جو فطرتاً ہندونواز واقع ہوا ہے، جس کی ہندونوازی کے باعث مسلمان اسے بجائے ریمزے میکڈانلڈ کہنے کے "رام جی مکندامل" کہا کرتے تھے۔ اسی ثالث نے اقلیتوں کے مسئلہ کا تصفیہ یا بالفاظ دیگر فرقہ وارانہ حقوق کا فیصلہ کیا لیکن فیصلے کے بعد فیصلہ سے اظہار بیزاری و ناراضی بھی خود ہندو بھائیوں نے ہی فرمائی اس لیئے کہ اُس فیصلہ کی رُو سے کچھ تھوڑے بہت حقوق مسلمانوں کو مل گئے تھے اور حتےٰ کہ کانگرس نے گزشتہ الیکشن مینی فسٹو میں صاف صاف لفظوں میں اعلان کردیا کہ:۔

"کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ حقوق کا فیصلہ) قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کو منظور کیا جائے کانگرس کی یہ لاپرواہی اور غیر جانبداری کی نہیں ہے وہ شدت سے فرقہ وارانہ فیصلہ کو نامنظور کرتی ہے اور اس کو ختم کر دینا چاہتی ہے"۔

صرف یہی نہیں کہ کانگریس نے یہ کاغذی تجویز پاس کر لی بلکہ اقلیتوں کے حقوق سے متعلق فیصلہ کو منسوخ کرانے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا یا گیا، سوباش چندر بوس صدر کانگریس کے بھائی سرت چندر بوس کی سرکردگی میں اور ڈاکٹر ستیہ پال صدر کانگریس کمیٹی صوبہ پنجاب کی زیر حمایت لاکھوں ہندوں سے دستخط کرا کے وزیر ہند کے پاس میموریل بھیجا گیا کہ یہ فیصلہ ناقابل قبول ہے۔

یہ بے انصافیاں کیوں کیجارہی ہیں؟ صرف اسلئے کہ برادرانِ وطن کے دلوں میں یہ بات رچی ہوئی ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا نہ قومی وجود باقی رہنا چاہیئے نہ انکے حقوق کا کوئی سوال ہونا چاہیے، اسی لیئے وہ اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ کو دیدہ ودانستہ نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ پنڈت جواہرلعل نہرو نے پنجاب میں تقریر کرتے ہوئے ایک موقع پر صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا

"میں سوسال تک مسلمانوں کا انتظار کر سکتا ہوں کہ وہ کانگریس میں آئیں بہ نسبت اسکے کہ ان کو رشوت دیجائے"۔

رشوت؟ ـــــ یعنی قومی حقوق

مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں ٹھیک یہی نقطۂ نظر ہندومہا سبھا کا بھی ہے۔ بھائی پرمانند سابق صدر ہندومہاسبھا نے پنڈت جواہرلال کو ایک تحریر بھیجی تھی جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج کانگریس بھی ہندومہاسبھا کے اس اصول کا اقرار کر رہی ہے کہ نہ کوئی مسئلہ اقلیات (مناریٹیز) ہے نہ اسکے حل کرنے کی ضرورت، نہ کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ ہے نہ معاہدہ اور مفاہمت کی حاجت" (خطبہ صدارت سید راغب احسن ۲۶ ستمبر ۳۸ء)

اور پھر طرّہ یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی بے انصافی کانگریس اس زمانہ میں کر رہی ہے جب کہ وہ کراچی کے جلسہ میں تجویز پاس کر چکی ہے کہ اقلیتوں کے جملہ حقوق محفوظ رہینگے۔ لیکن حقوق کے مسئلہ میں کانگریس کی

پالیسی کو دیکھتے ہوئے تو اس کراچی والی تجویز کا یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ :-

"اقلیتوں کے جملہ حقوق تحت حکومت ہند محفوظ رہیں گے"

دوسرا فریب

ایک طرف تو کانگرس جنگ آزادی کے دوران میں مسلمانوں کے حقوق تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے بلکہ اسے قطعی انکار ہے اسلئے کہ وہ دلیں ٹھان ہوئے بیٹھے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہوجانے کے بعد مسلمانوں کے حقوق تو کیسے ہم انکے قومی وجود ہی کو حکومت کے زور سے مٹا دینگے، لیکن سردست اگر مسلمان شور مچائیں کہ ہمارے حقوق کا تصفیہ کرو تو نہایت نرمی کے ساتھ خیرخواہانہ انداز میں "کراچی والی تجویز" کا حوالہ دیکر انھیں خاموش اور مطمئن کردیا جائے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ کانگریس اپنی اس شاطرانہ چال میں کامیاب نکلی، اس لیے کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان ـــــ عوام نہیں ـــــ بلکہ لیڈر ـــــ اس فریب میں مبتلا ہوکر "کراچی والی تجویز" کی صداقت پر ایمان لائے ہوئے بیٹھے ہیں اور صرف یہی نہیں ـــــ وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اسکا یقین دلاتے رہتے ہیں کہ کانگریس اقلیتوں کے حقوق کی محافظ ہے

کانگریس نے دوسری شاطرانہ چال یہ اختیار کی کہ مسلمانوں میں "وعظ" کہنا شروع کیا :-

مسلمانو! دیکھو! انگریز ہم سے بڑھکر تمہارا دشمن ہے، تمہارے تمام ممالک مقدسہ پر اُسکا اقتدار قایم ہے، سارا عالم اسلام انگریز کی غلامی کے پھندے میں گرفتار ہے، ملوکیت کی جال میں پھنسا ہوا ہے اور یہ صرف اسوجہ سے کہ ہندوستان پر انگریز کا قبضہ ہے، ہندوستان سے انگریز نکل جائیں تمام ممالک مقدسہ آزاد ہوجائینگے، لہذا تم اپنی تمامتر توجہ "ہندوستان کی آزادی" پر مرکوز رکھو، تمہارا پورا دھیان صرف ہندوستان سے انگریز کے نکالنے پر صرف ہونا چاہیے۔

اور سنو! یہ اُردو ہندی کا قضیہ، گائے باجہ کا مسئلہ، نشستوں کی بحث، یہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہندوستان کی جنگ آزادی میں سنگ گراں ثابت ہورہے ہیں، چھوڑدو ان فرقہ وارانہ مسئلوں کو، یہ اقلیتوں کے حقوق پر کیسی بحث وتکرار، یہ سب انگریزوں کی پیدا کردہ

بحثیں ہیں تاکہ آزادی کی راہ میں روڑے اٹکیں، اِن سے قطع نظر کرلو، انگریز کو نکالو حقوق
کا تصفیہ بعد میں ہوتا رہے گا، ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں، تم بھی ہندوستانی ہو ہم بھی
ہندوستانی ہیں، دونوں ایک ہی قوم کے ہیں، آپس میں میل جول سے رہنا چاہیئے،
رہ گئے یہ مذہبی جھگڑے ، تو بھائی کچھ تم نیچے اُترو کچھ ہم اُترتے ہیں ایک نقطہ پر ہم دونوں
متفق ہو جائیں۔ اور کیوں نہ ہم لوگ ایک ایسی تہذیب اختیار کرلیں جس میں اِس "مذہب"
کا جھگڑا نہ ہو، نہ ہندو کا سوال باقی رہے نہ مسلمان کا، پھر دیکھو ہندوستان کتنی جلدی
آزاد ہو جاتا ہے، بس ہمارے سامنے قوم کا سوال ہو، فرقہ وارانہ مسئلہ نہ اُٹھنے پائے۔ یہ
فرقہ پرستی تو بڑی لعنتی چیز ہے، جنگِ آزادی میں خلل ڈالتی ہے"۔

مسلمانوں نے یہ "مقدس وعظ" سنا۔ انگریز کا نام سنتے ہی شعلوں کی طرح بھڑک اُٹھے، آزادی کے لفظ نے
انکے دلوں کو جوش و حرارت سے بھر دیا، انھوں نے کہا ـــ بات معقول ہے ـــ ہم کو صرف جنگِ
آزادی لڑنی ہے، یہ فرقہ وارانہ باتیں درحقیقت بڑی لعنت کی چیزیں ہیں۔

مسلمانوں پر اِس وعظ کا جادو چل گیا ـــ ہندو نے ـــ میدان جیت لیا اور کامیاب ہو گیا۔
آپ سمجھتے ہونگے کہ یہ وعظ میں نے اپنی طبیعت سے اختراع کرلیا ہے ـــ نہیں بندہ نواز! یہ وعظ برابر
مسلمانوں کو سنایا جارہا ہے ـــ یو۔پی اسمبلی میں خان بہادر فصیح الدین صاحب (جواب قضا کرچکے)
نے مسلمانوں کی تعلیم کی بابت ایک سوال کیا تھا جسکے جواب میں مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات نے ایک مبسوط
تقریر فرمائی چند جملے آپ ملاحظہ فرمائیں۔

ذاتی طور پر "ہندوازم" اور "اسلام" دو مختلف مذاہب ہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ شخص
جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اسکو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی
طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں
یہ چیز مفقود ہونی چاہیئے۔ ہم ایک "ہندوستانی تہذیب" چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور
مسلمانوں اور دوسروں کے لیئے جو یہاں آئے ہیں اور اپنا گھر بنا لیا ہے سب کے

لیے بالکل ایک ہے، ..... ایسے امور جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی ہے۔ اس لیے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ جو لوگ مدارس میں ہندو اور اسلامی تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں زور نہ دیں گے"۔

(مدینہ بجنور، مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء)

سُنا آپ نے وعظ؟ ــــ مگر یہ نہیں سمجھے کہ اس میں کتنے زہرآلود نشتر پنہاں ہیں جو رگ گلو کے ذریعہ ہمارے دلوں میں اُتارے جا رہے ہیں۔

تحلیل و تجزیہ

جب ہم اس "مقدس وعظ" کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں ہندوؤں کے دیرینہ مقاصد آئینہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ بلا قید و تخصیص ہر ہندو یہ چاہتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود نہ رہے لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ نہ یک لخت سارے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالا جا سکتا ہے اور نہ سارے کے سارے تہ تیغ کیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی ترکیب کرنی چاہیے کہ مسلمان ہمارے اندر جذب ہو جائیں یعنی اگر مسلمان نہیں مٹتے تو کم از کم اُن کی مسلمانیت ہی مٹا دی جائے پھر تو رام راج قائم ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

اس مقصد کی خاطر ــــ کہ مسلمان ہمارے اندر جذب ہو جائیں ــــ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یوں تو اُن کو جذب کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ مسلمانوں کے سر میں ایک نہایت ہی تیز نوکدار سینگ ــــ مذہب کی ــــ موجود ہے اگر اسکے ہوتے ہوئے ہم اُن کو ہضم کرینگے تو خود اپنا پیٹ پھٹ جائے گا اور آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جائیں گے، لہٰذا سب سے پہلے اسکے مذہبی سینگ کو کسی ترکیب سے نیست و نابود کر دینا چاہیے لیکن اگر وہ سینگ حکومت کے ہتھوڑے سے توڑنے کی کوشش کی گئی تو نقصان اُٹھانا پڑے گا، بہتر یہ کہ کوئی ایسا "تیزاب" استعمال کیا جائے جسکے اثر سے آہستہ آہستہ وہ سینگ خود بخود پگھل کر ختم ہو جائے پھر تو مسلمان ایک لقمۂ نرم و تر ہو کر رہ جائے گا۔

رائے یہ طے پائی کہ پُر امن نفوذ (پیس فل پینٹ ریشن) کے ذرائع استعمال کر کے تھوڑے عرصہ میں

مسلمان قوم کو تحلیل کر دیا جائے۔

ہندو — اٹھ ہزار برس مسلمانوں کے ساتھ رہ کر یہ سمجھ چکا تھا کہ مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لیے اُن کو مذہب سے بیگانہ بنانا ضروری ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی قومیت مذہب ہی کی بنیاد پر قایم ہے۔ نسلی اور وطنی رجحانات کو اس میں دخل نہیں ہے۔ محمد رصلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے وطن کے بسنے والے اپنے رشتہ کے چچا ابوجہل وابولہب — نسل و وطن — کی خصوصیت رکھنے والوں کو دوزخ کی خاک بنا دیا۔ پھر بھی نہ سمجھا اور فارس کے سلمان اور حبش کے بلال کلمہ پڑھتے ہوئے آئے تو انہیں اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ مسلمانوں کی قومیت کا تو یہ معیار ہے۔ ان کو سبق پڑھایا گیا ہے کہ:۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

لہذا اُسکے قومی وجود کو مٹانے کے لیے اُسکے مذہب کو مٹانا از بسکہ لازمی ولابدی ہے، مگر مذہب کو وہ آسانی کے ساتھ چھوڑ نہیں سکتا ہے۔ اس لیے یہ کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے مذہبی تصور ہی کا نقشہ بدل جائے، اسکے تخیل میں فساد پیدا کر دو۔ اس کی ضمیر کی روشنی کو بجھا دو۔ اُسکے مذہبی تصور کا رُخ تبدیل کر دو۔ اُسکے دل میں — خدا پرستی — کے جذبات میں، قوم پرستی، وطن پرستی کے جذبات شامل کر دو۔ حاصل یہ کہ:۔

اُسکے بدن سے "روحِ محمد" نکال دو

ہمارا مذہبی تصور

ہمارے مذہبی تصور کی حیثیت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے، ہمارا مذہب کی بابت پختہ اعتقاد ہے کہ وہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر حکمراں ہے، مذہب ایک طرف تو "انسان با خدا" کے تعلقات پر کنٹرول رکھتا ہے تو دوسری طرف وہ "انسان با انسان" کے تعلقات کی بھی نگہداشت و نگرانی کرتا ہے وہ ہمارے لیے زندگی کے ہر راستہ میں روشنی رکھتا ہے، وہ جہاں ہم کو نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کی بابت خاص ہدایات دیتا ہے، وہیں وہ ہمارے رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، غرض روزمرہ کی زندگی کے آداب سکھاتا ہے۔

یعنی ہمارے مذہب کے دو حصے ہیں ایک عقائد دو اعمال۔

عقائد وہ جو ایمان مجمل و مفصل کے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں اور اعمال وہ جنہیں ہم نماز، روزہ زکوٰۃ، حج سے تعبیر کرتے ہیں، مذہب کا یہ حصہ "انسان با خدا" کے تعلقات کے دائرہ میں داخل ہے۔

دوسرا حصہ مذہب کا وہ ہے جو ہماری پوری دنیاوی زندگی پر حاوی ہے یہ حصہ بھی ہمارے اوپر تھیوری اور پریکٹس دونوں لحاظ سے حکمرانی کرتا ہے اس میں سارے اخلاقی نظریات، اخوت، ہمدردی نرمی و آشتی، صلح و صفائی، مساوات و رواداری وغیرہ شامل ہیں جن سے ہماری روزمرہ کی زندگی مرتب ہوتی ہے اور یہ حصہ "انسان با انسان" کے تعلقات کے تحت میں داخل ہے بغرض عقائد و اعمال کے ساتھ ہی ساتھ ہماری تہذیب، طرز معاشرت، انداز معیشت، ہمارا تمدن، ہمارا کلچر بھی کچھ مذہب کی روشنی میں تعمیر پذیر ہوتے ہیں۔ مذہب ہی وہ نقطہ یا محور ہے جس پر ہماری زندگی کی ہر سکون و حرکت گردش کرتی رہتی ہے۔

"حریفانہ کمندیں"

عیار حریفوں نے مختلف کمین گاہوں سے کمندیں پھینکنی شروع کر دیں اور وہ جو ہم نے ابھی اُن کے ارادے بتائے کہ مسلمانوں کے مذہبی تصورہی کو غلط راستہ پر ڈال دینا چاہیے اسکے لیے انھوں نے مسلمانوں کو یہ سکھانا شروع کیا کہ مذہب تو صرف "انسان با خدا" کے تعلقات کا نام ہے جو ایک پرائیویٹ اور انفرادی چیز ہے، "انسان با انسان" کے تعلقات کا نام "تہذیب" ہے اور تہذیب کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اسلیے اُس میں ہندو مسلمان سب ہی آزاد ہیں جیسی تہذیب چاہیں اختیار کرلیں، اور ہندو مسلم اتحاد، جو آزادی ہند کے لیے ضروری ہے، کی خاطر ہم کو ایک مشترکہ تہذیب کی ضرورت ہے لہذا ہندو مسلمان اپنے اپنے مذہب سے قطع نظر کرکے ایک ایسی تہذیب اختیار کرلیں جو خالص قومی بنیادوں پر قائم کی گئی ہو اور وہ تہذیب "ہندوستانی" تہذیب کہلائے۔

یو۔پی کے وزیر تعلیمات مسٹر سمپورنانند کی جو تقریر میں پہلے نقل کر چکا ہوں اُس کو پھر ایک بار ملاحظہ کیجیے۔ اس میں ہندوستانی تہذیب کے تصورات اس میں بہت نمایاں طور پر موجود ہیں۔ تقریر کا آخری فقرہ اخبار مدینہ نے کسی مصلحت کی وجہ سے نہیں نقل کیا ہے، وہ فقرہ کانگریسی اخبار "ٹریبون" کی ۵ اپریل

۱۹۳۸ء کی اشاعت میں موجود ہے، سمپورنانندجی "ہندوستانی تہذیب" کے وجود و بقا کیلئے ہندومسلم تہذیبوں کا مٹ جانا یا بہ لفظ دیگر مٹا دینا ضروری قرار دیتے ہیں۔ بہت سادگی کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں :-

جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی "ہندوستانی تہذیب" زندہ رہ سکے گی

چنانچہ اس "ہندوستانی تہذیب" کے نمونے بھی اب ہم کو جابجا ان میں نظر آنے لگے ہیں جو خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن یہ "ہندوستانی تہذیب" کوئی جدید مرکب اور مشترک تہذیب نہیں ہے بلکہ وہی ہے جسے ہم آسانی کے ساتھ "ہندو تہذیب" کہہ سکتے ہیں، افکار و خیالات میں بھی ہندو تہذیب کے "جواہر پارے" ملتے ہیں اعمال و احوال میں بھی وہی جوہر نمایاں ہے، جناب کی جگہ شری جناب کی جگہ شریمتی۔ السلام علیکم کی جگہ ــــ نمستے اور نمسکار نے لے لی ہے۔ مسلمان مسٹر گاندھی کے مرید بھی ہونے لگے ہیں اور انہیں کی ہدایا کے پیرو ہو رہے ہیں۔ اچھے اچھے لوگ جو کبھی ہمارے "امام" تھے، جو آسمان ہدایت و "بلاغ" پر "ہلال" بنکر چمکے تھے۔ وہی اب قرآن کو مسٹر گاندھی کے خیالات کے تابع بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی نماز اور اپنا روزہ تو بھول گئے لیکن گاندھوی روزہ "خدائی خدمت گاروں" کا شعار بنتا جا رہا ہے۔ انکے لڑکے چھوڑ لڑکیاں "علیگڑھ" سے فیض حاصل کرنے کی بجائے، ٹیگور کے "شانتی نکیتن" سے روشنی حاصل کر رہی ہیں مسلمان عورتیں ــــ ہندوؤں کی زوجیت میں جا رہی ہیں۔ اور گاندھی جی انہیں مبارکباد دیتے ہیں اور اپنی خاص برکت عطا فرماتے ہیں

مسلماں ہو کے شنکر لال کے بیٹے کے گھر آئی ... دیا السٹر کی ہے "عباس طیب جی" کی پوتی پر

مسلماں کا پھٹا تہمد نہ اُسکے کچھ بھی کام آیا ... نچھاور کر دیا شرع نبی زرتار دھوتی پر

(باقی آئندہ)

ترجمان القرآن اور علماء دیوبند

"طلوع اسلام میں" مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" کا ذکر بار بار آتا رہا ہے جس میں تفسیر مذکور کی نسبت یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں دین و مذہب کی تشریح اس عنوان سے کی گئی ہے کہ دیگر مذاہب میں اسلام کو کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور مولانا آزاد کا اس سے منشا یہ ہے کہ اکبر کے دین الٰہی یا موجودہ زمانہ کے برھمو سماج کی طرح ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جائے جس میں مدار نجات" خدا پرستی اور نیک عمل" کو قرار دیا جائے اور اسلام کی مخصوص شریعت یعنی ظواہر و رسوم کو جسد بے روح قرار دیکر تمام مذاہب کی صداقت کو بنیادی طور پر ثابت کیا جائے۔

ممکن ہے کہ ہماری اس تنقید کو سیاسی اختلاف کا نتیجہ قرار دیکر اس خطرناک نظریہ کی اہمیت کو کم کرنیکی کوشش کیجائے اس لئے ہم ذیل میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی عربی کتاب "مشکلات القرآن" کے دیباچہ سے تفسیر" ترجمان القرآن" کی نسبت علماء دیوبند میں سے ایک جلیل القدر عالم اور استاذ جامعہ ڈابھیل مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی رائے نقل کرتے ہیں۔ مولانا موصوف نے اپنے تمہیدی بیان میں بعض اہل باطل کی تفاسیر کے بنیادی نقائص پر نظر انتقاد ڈالی ہے اسی ذیل میں مولانا ابوالکلام کی تفسیر کا ذکر بھی آگیا ہے جسے ہم اردو کا جامہ پہنا کر ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ ہم پر یہ الزام عائد نہ ہو کہ مولانا کی تفسیر سے ہمارا اختلاف سیاسی بنا پر ہے اور اس خطرناک رائے کے اظہار میں صرف ہم ہی متفرد ہیں۔" (طلوع اسلام)

"ترجمان القرآن" قرآن کریم کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا ابوالکلام دہلوی کے مبسوط فوائد سے مزین ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں سنت و اجماع کے خلاف جو باتیں مذکور ہیں ان کو کھولکر بیان کردیں اسکی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض اہل عصر نے مصر کے اخبار "الفتح" ۵۶۲ میں اس ترجمہ کی نسبت بہت ہی مبالغہ سے کام لیا ہے اور اس کی اس قدر تعریف کی ہے جس کا وہ مستحق نہیں ہے اور

اس کے مثالب ونقائص سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ہم نہیں چاہتے کہ ہندوستان کے ایک عالم نے ترجمہ مذکور کی جو بیجا تعریف کی ہے اس سے اہل مصر فریب میں مبتلا ہوں یہ صرف اللہ کے واسطے نصیحت ہے جو ہندوستان کے کسی عالم کی ثنا وستائش سے بالاتر ہے نہ ہمارے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ مخلوق کو خوش کرنے کے لئے خالق کے غضب کو خریدیں حالانکہ اللہ اور رسول کی خوشنودی سب پر مقدم اور سب سے زیادہ اہم ہے۔

ہم اس سے پہلے بھی اپنی کتاب "نفحۃ العنبر" میں علماء ہند اور علم دوست احباب کی خاطر محض رضائے الٰہی اور تبلیغ حق کے لئے اس تفسیر کی ہفوات پر توجہ کر چکے ہیں۔اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ اس کی وجہ سے ہم پر طعن کیا جائیگا اور تعصب وجمود اور کم عقلی کا الزام لگایا جائیگا کہ ہر زمانہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اخبار "الفتح" میں صاحب مضمون لکھتا ہے کہ

> اوران تفاسیر میں سے جو اردو زبان میں تالیف ہوئیں مولانا ابو الکلام آزاد کی تفسیر ہے جس کی نظیر ساری دنیا میں سوائے امام حجۃ الاسلام سید رشید رضا مرحوم کے کہیں نہیں ملتی الخ۔

معلوم نہیں اس جملہ سے قائل کا منشا صاحب تفسیر کی ہمنوائی ہے یا بعض مصالح کی بنا پر مداہنت ہے بہرحال کچھ ہو ہم اس سے موافقت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

واضح رہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد نہایت ہوشمند، واسع الاطلاع ہیں اور اردو زبان میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں بلکہ ملکۂ تحریر اور محاسن خطابت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو زبان کے بہت سے بدیع اسلوب آپ ہی کی ایجاد ہیں اور آج سے بیس سال پہلے اُنکی حیات بخش تحریروں نے قوم کو زندگی بخشی تھی اور موجودہ زندگی اور بیداری بعض آپ ہی کے قلمی جہاد کا نتیجہ ہے۔وطن کو اجنبی دولت اور برطانی حکومت کے چنگل سے چھڑانے کے لئے آپ نے جو کوششیں کیں وہ فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔اس سعی وجہاد میں اُن کو حکومت کے شوکت ودبدبہ نے بھی مرعوب نہیں کیا اور وہ برابر اپنا کام کرتے رہے اور اسی وجہ سے بہت سے علماء حق نے انکی نسبت

سکوت فرمایا اور انکی خود میرے دل میں بھی ان کے جہاد وطن کی بنا پر بڑی قدر و منزلت تھی۔ انھوں نے ابتدا میں بہت سے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا تھا اور اخبار "الہلال" اور "البلاغ" جاری کر کے جہاد حریت کو آگ کی طرح روشن کیا تھا اور اپنی خطابت اور تقریروں کے ذریعہ جسموں میں نئی روح پھونکی تھی۔ اس کے باوجود مولانا ابو الکلام خود پسند، خود رائے ہیں اور اکابر علماء میں جو بھی انکی رائے اور ہوا کی مخالفت کرتا ہے وہ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں اور مسلک قدیم اور علم صحیح سے نکل جاتے ہیں۔

آپ کے رسائل و جرائد میں جن خیالات کا اظہار ہوتا تھا اس کی بنا پر ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ آپ ابتدا میں صحیح الاعتقاد تھے ؟ الّا یہ کہ وہ قاضی شوکانی (یمنی) اور نواب صدیق حسن خاں صاحب آف بھوپال کی طرح فروعات میں کسی امام کے مقلد نہ تھے۔ آپ نے صرف ترک تقلید پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی کتاب "تذکرہ" میں علماء حنفیہ حتیٰ کہ امام اعظم امام ابوحنیفہ رح پر بھی زبان طعن و تشنیع دراز کی جو اکابر امت کے ساتھ یقیناً سوء ادبی ہے۔

آپ نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان آپ کو دین و دنیا کا امام تسلیم کریں اور امام الہند کے خطاب سے آپ کو مخاطب کیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں وہ علماء بھی تھے جو علم و تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھے اور ابو الکلام آزاد ان سے علم و عمل کے لحاظ سے بمراحل دور تھے چنانچہ علماء دیوبند اٹھے اور انھوں نے علی الاعلان کہا کہ یہ شخص امامت کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ انھوں نے ان کی امامت کے مقاصد کا ادراک کر لیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ بعد میں ان مفاسد کا سد باب مشکل ہو جائیگا چنانچہ ابو الکلام صاحب کی آرزوئیں پوری نہ ہوئیں۔

اس کے بعد انھوں نے تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا جس کی طرف لوگوں کی گردنیں اٹھ گئیں اور انھوں نے بے تابی سے اس کا انتظار کیا آخر وہ ترجمان القرآن کے نام سے منظر عام پر آئی جو مختصر اور مطول فوائد پر مشتمل ہے۔ سورہ فاتحہ کی تفسیر بہت طویل ہے اس لئے میں نے اس کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا اور بعض دیگر آیات کی تفسیر جستہ جستہ مقامات سے دیکھی۔ دیکھکر میرا شوق بجھ گیا اور سخت افسوس ہوا اگر یہ تفسیر شائع نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ میں نے تفسیر دیکھکر محسوس کیا کہ اس شخص کے دماغ پر

ھوائی اور خود رائی اور خود پسندی سوار ہے جس کا پہلا مرحلہ تقلید سے انکار تھا اور دوسرا یہ جس نے سیدھی راہ ان پر گم کر دی ہے۔

تفسیر کی چند ہفوات انہوں نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر میں یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ دنیا کے جملہ مذاہب خواہ وہ نصرانی اور یہودی مذہب ہوں یا مذہب صابی۔ اگر کوئی شخص مذہب کی اس صورت پر عامل رہے جسے لیکر مذہب کا شارع آیا تھا تو یہ امر اسکی نجات کے لئے کافی ہے کیونکہ ان تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہے اور وہ ہے ایمان باللہ اور عمل صالح اور خدا پرستی

اور ہر مذہب کا شارع توحید ہی لیکر آیا ہے اور اس نے عمل صالح اور خدا پرستی کی طرف ہی دعوت دی ہے۔ رہا شرک اور گناہ تو وہ مذاہب کے متبعین میں فرقہ پرستی کی بنا پر پیدا ہوگیا ہے اس پر آپ اپنی تفسیر میں مختلف اسالیب و طرق سے روشنی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن حکیم دنیا کو اسی امر کی دعوت دیتا ہے اور ان کا گمان ہے کہ انھوں نے جو کچھ سمجھا وہی قرآن کا مغز اور قرآن کا مقصد ہے اور اس پر آیت ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ الخ سے استدلال کرتے ہیں!

آپ کے نزدیک شرائع اور عمل صالح کوئی مکلف چیز نہیں ہے اور یہ عبادات اور یہ شرائع ظواہر و رسوم ہیں جو بمنزلہ جسم ہیں جن کو دین کی حقیقت اور روح سے کوئی تعلق نہیں ہے پس جو شخص اعتقادی طور پر شرائع و احکام کا انکار کر دے تو آپ کے نزدیک ایسا شخص مسلمان ہی ہے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام اور ومن یبتغ غیر الاسلام دینا الخ کی تفسیر میں آپ لکھتے ہیں کہ اسلام نام ہے تمام ادیان کی وحدت کا جو کسی خاص شریعت سے مخصوص نہیں ہے۔ پس تمام مذاہب اسی دینی وحدت کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں اور تمام مذاہب کی صداقت کے قائل ہیں اس لئے آپ کے نزدیک ملّت اسلامیہ مخصوص اعتقادات اور مخصوص عبادات کا نام نہیں ہے آپ کہتے ہیں کہ رسوم و شرائع اور مناہج کا اختلاف اور عبادات کا فرق ایک قدرتی امر ہے جس سے

مفر نہیں ہے اس لئے ان اختلافات پر ملامت نہیں کرنی چاہیئے اور دلوں کی تنگی کو دور کر دینا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص موسوی شریعت پر کاربند ہے اور اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے اور شریعت محمدیہ سے متمسک نہیں ہے اور نہ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھتا ہے اگرچہ شریعت اسلامیہ نے اکثر شرائع سابقہ پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے تو ان کے بناوٹی اصولوں کی بنا پر ایسا شخص مسلم اور ناجی ہے

ہم نے جو کچھ کہا وہ ان کی تفسیر کا صریح بیان ہے جس میں تاویل کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اگرچہ اپنے خطابت کے زور سے جو صرف آپ ہی کا مخصوص حصہ ہے مختلف عبارات میں اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے مگر صراحت کے مقابلہ میں تاویل و تسویل کام نہیں دے سکتی اکیا اس قسم کی تاویلات سے قلوب کو تشفی ہو سکتی ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ اسلام نے اہل مذاہب کو اس امر کی دعوت دی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذاہب کو جن میں باطل کی آمیزش ہو چکی ہے تسلیم کرتے رہیں اور ان پر یہ لازم نہیں کیا کہ وہ اپنے مذاہب کو چھوڑ کر کسی اور دین کو اختیار کریں۔ سو یہ سب ایسا ہی تدلیسات ہیں جو لوگوں کو گرداب ہلاکت میں پھنسانے والا ہیں۔

ندوۃ المعارف نے اس تفسیر کے بارے میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا اور بعض آیات کے ترجمہ کا مقابلہ اس ترجمہ سے کیا تھا جو بیس سال پہلے "الہلال" میں شائع ہو چکا ہے۔ اور بتایا تھا کہ ان دونوں ترجموں میں کس قدر بین اختلاف ہے۔ بہرحال تعجب ہے کہ دنیا میں یہ تفسیر لاثانی ہے۔ بے شک اپنی ہفوات و مخترعات میں لاثانی ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ مشکلات القرآن از صفحہ ۳۳ تا ۳۷

لے ندوۃ المعارف میں تفسیر ترجمان القرآن پر جو تبصرہ شائع ہوا تھا اس میں تفسیر مذکور کی بے انتہا تعریف کی گئی تھی اور اسکو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی تفسیر کے ہمپلہ قرار دیا گیا تھا مگر سب سے پہلے اس تفسیر پر اسی "معارف" میں جس بزرگ نے صحیح زاویہ نگاہ سے نظر انتقاد ڈالی وہ جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز تھے پرویز صاحب نے تفسیر کے اس زہر سے اسلامی پبلک کو روشناس کیا جو اگر جسم اسلامی میں سرایت کر جائے تو پھر اسلام اور قرآن کچھ باقی نہیں رہتے اور بیک وقت تمام مذاہب کی ضلالتوں کو رشد و ہدایت تسلیم کرنا پڑتا ہے پرویز صاحب نے معارف میں اس حقیقت کا اظہار کر کے بتایا کہ تفسیر میں اکبر کے دین الٰہی کی تجدید کی جا رہی ہے جس کے بعد علمی دنیا چونکی اور خود مدیر صاحب "معارف" نے ان کی تائید کرتے ہوئے مولانا آزاد کے خیالات سے اختلاف کیا۔ اور بہت سے علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں اور بوقت اشیوع مجلات میں توجہ فرمائی۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے یہاں معارف کے جن مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے وہ جناب پرویز صاحب کا ہی مضمون تھا۔ ۱۲
(طلوع اسلام)

گہر ہائے نایاب

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم — بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم

مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد — جہاں گردیدم و اورا ندیدم

(اقبال)

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم — تو میدانی کہ ملت بے امام است؎

(اقبال)

؎۵ بحضور سرورِ کائنات صلعم
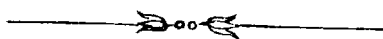
فوجی بل اور ہندو ذہنیت

(از ادارہ)

پروپیگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے کہ جس سے حرف بحرف حقیقت اور ہر حقیقت افسانہ بن جائے۔ دورِ حاضرہ میں تہذیب یورپ کی برکت سے، نظام دنیا جس نہج پر چل رہا ہے اس میں یوں تو ہر جگہ پروپیگنڈا کارفرما ہے لیکن میدانِ سیاست میں تو یہ ایسا مؤثر حربہ ہے جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا۔ اس بساط کا سب سے بڑا شاطر انگریز ہے، اور چونکہ ہندو نے اپنی سیاست اسی سے سیکھی ہے اس لئے ہندوستان میں وہ اپنے استاد فن کا صحیح جانشین بن رہا ہے۔ موجودہ تحریک آزادی کی تاریخ کا اگر آپ بغور مطالعہ فرمائیں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ ہندو نے اس حربہ سے کس قدر عظیم الشان کام لیا ہے اور اس طرح مسلمان کو کس طرح سراب دکھا کر آب حیات کا دھوکہ دیا ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے کہ مسلمان دوسرے مسلمان کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے اور کس طرح یہ ذہنیت عام کر دی ہے کہ جو ہندو کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے وہی معزز و مکرم ہے جو اس سے اختلاف رکھتا ہے وہ ٹوڈی ہے برطانیہ پرست ہے، رجعت پسند ہے غلامی کا دلدادہ ہے، آزادی کا دشمن ہے غرض کہ دنیا کے بدترین القاب کا مستحق ہے اور یہ سب کرشمہ ہے پروپیگنڈا کا۔ اس پروپیگنڈا کی روشن مثال آپ کو اس واقعہ میں ملے گی جو فوجی بل کے سلسلہ میں حال ہی میں پیش آیا اور جس کی رو سے مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ کر دیا گیا کہ مسلم لیگ فی الواقع برطانیہ پرست ہے۔ اور کانگریس مسلمانوں کی سب سے بڑی محافظ اور ہمدرد ہے۔ آیئے ہم بتائیں کہ اس افسانہ کی حقیقت کیا ہے؟

مرکزی اسمبلی میں حکومت کیطرف سے اگست ۱۹۳۸ء میں فوجی بھرتی کا بل پیش ہوا۔ ایوان میں گرما گرم بحثیں ہوئیں مختلف پارٹیوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے بل کی مخالفت اور حمایت کی اور بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ آرمی بل مخالفتوں اور مزاحمتوں کے علے الرغم منظور ہو گیا۔

فوجی بل کی حمایت میں بڑا غضب یہ ہوا کہ مسلم لیگ پارٹی نے مرکزی ایوان میں اپنی آواز بلند کی۔ وہ مسلم لیگ جس کا سیاسی نصب العین کامل آزادی ہے جس کی خواہش ہے کہ اسلامی ممالک کے خلاف ہندوستانی فوج کو استعمال نہ کیا جائے جو چاہتی ہے کہ ان افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات کا اعادہ نہ ہو جو جنگ عظیم کے دوران میں ترکوں کے خلاف ہندوستانی افواج کے ذریعہ رونما ہو چکے ہیں بلاشبہ فوجی بل کی حمایت اور وہ بھی مسلم لیگ کیطرف سے سرسری طور پر غور کرنے والوں کے لیے حیرت انگیز ہے۔

دوسری طرف مرکزی اسمبلی میں فوجی بل کے خلاف جو مؤثر آواز بلند ہوئی وہ کانگریس پارٹی کی آواز تھی، ہندوؤں نے اس خوفناک بل کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں جن میں بتایا کہ اس بل کے منظور ہو جانے سے فلسطین کے عرب تباہ ہو جائیں گے۔ وزیرستان کے مسلمان برباد کر دیئے جائیں گے تمام اسلامی ممالک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہینگے۔ ان تقریروں سے اور اخبارات کی تحریروں سے انہوں نے ایک سماں باندھ دیا جس سے معلوم ہونے لگا کہ فی الواقع ہندوؤں کے سینے مسلمانوں کی ہمدردی سے لبریز ہیں۔ اور انکا غم انہیں راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ وہ اس دکھ میں گھلے جا رہے ہیں کہ اسلامی ممالک پر انگریز کا تسلط کیوں قائم ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے خوش عقیدہ اور کسی حد تک خفیف العقل لوگوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کا مقابلہ شروع کر دیا اور مقابلہ میں علی الاعلان لیگ پر اظہار نفرت اور کانگریس اور کانگریسی ہندوؤں پر اظہار اعتماد کیا گیا اور پروپیگنڈہ کے زور سے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ آزمائش کی پہلی ہی منزل میں مسلم لیگ کے قدم متزلزل ہو گئے اور ان لوگوں کو ثبات و استقامت کی توفیق ارزانی ہوئی جو میدان سیاست کے شہسوار ملک کے سچے بہی خواہ اور انگریز کے حقیقی دشمن ہیں یعنی یہ کہ مسلم لیگ ایک سرکاری جماعت ہے اور اسکا مقصد انگریز کے ہاتھ مضبوط کرنا اور ہندوستان

کے سیاسی شعور کو کچلنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کا ثبوت خوش قسمتی سے فوجی بل کی حمایت کے ذریعہ مل گیا۔

فوجی بل کی آڑ بنا کر مسلم لیگ کے خلاف اور کانگریس کی موافقت میں اس قدر پُرزور پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ اگر "قوم پرست" حضرات کی تقریروں، اخبارات کے مقالوں، نجی گفتگوؤں اور منظور شدہ قرار دادوں کو جمع کیا جائے تو ایک فتر کا دفتر تیار ہو سکتا ہے اس کا اثر اتنا گہرا ہوا کہ اگر ہم آج یہ کہیں کہ لیگ کے مخالفوں نے گہری نظر سے واقعات کا ادراک نہیں کیا اور یہ نہیں سمجھا کہ کانگریس پارٹی کیوں اور کس لیے آرمی بل کی مخالفت کر رہی ہے تو یقیناً ہماری اس حیرت انگیز "جرأت" کا استقبال ایک حقارت آمیز ہنسی سے کیا جائے گا۔ لیکن ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم آئندہ صفحات میں جو کچھ بیان کرینگے وہ ہر صاحب بصیرت کو کم از کم اس بات پر آمادہ کردیگا کہ وہ سنجیدگی سے سوچے کہ فوجی بل کی مخالفت کے پردہ میں دراصل کانگریس گروپ اور عام ہندو ارکان کا منشا کیا تھا آیا یہ کہ واقعی وہ اسلامی ممالک سے ہمدردی رکھتے ہیں؟ کیا فی الواقع ان کو انگریزی فوج سے نفرت ہے؟ کیا سچ مچ وہ انگریز کی قوت کو توڑنا اور قومی اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں؟ اگر مقصد یہی ہے تو یہ مقصد مبارک اور قابل صد ہزار تحسین و آفرین! اگر یہ نہیں بلکہ اسلامی ممالک کی حمایت کے پردہ میں "مطلب سعدی دیگر است" کا معاملہ ہے تو ہم حق و انصاف کے ضمیر سے اپیل کریں گے کہ وہ وسعتِ نظری، فراخ حوصلگی اور نگاہِ انصاف سے ہماری معروضات پر بصیرت کی نگاہ ڈالیں اور ان چالوں کو سمجھنے کی کوشش کریں جن کو ہزاروں ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی نہیں سمجھا گیا حالانکہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ دوست نما دشمنوں اور آستین کے سانپوں کی ہر نقل و حرکت کو سمجھنے کی کوشش کیجائے۔

مخالفت کی سنہری بنیاد

مرکزی اسمبلی میں فوجی بل کی مخالفت کی بنیاد جن چیزوں کو قرار دیا گیا ہے ان کی صداقت اور واقعیت میں شبہ کی مطلقاً گنجائش نہیں۔ اے کاش کہ ایسا ہی ہوتا مگر بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اسکی بنیاد اسلام دشمنی پر مبنی ہے بلا شبہ اسلام دشمنی پر بشرطیکہ آپ ذرا صبر سے کام لیں اور پہلے ان اسباب

کا جائزہ لیں جن کی بنا پر آرمی بل کی مخالفت کیگئی۔ اِن اسباب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) کانگریس پارٹی نے بل کی مخالفت میں پہلی اور بنیادی دلیل یہ دی ہے کہ اُسکے نفاذ سے شخصی آزادی اور سول لبرٹیز (مدنی حقوق) کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔

چنانچہ ۱۶ اگست ۱۹۳۸ء کو مرکزی اسمبلی کے مباحثہ میں آرمی بل کے دوران میں مسٹر اکھل چندر دت نے کہا۔

"ضابطۂ فوجداری کا یہ ترمیمی بل آزادی رائے اور آزادی تقریر پر ایک حملہ ہے"۔

مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۳۸ء کو اسی بل پر بحث کے دوران میں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے فرمایا۔

"ہم سب سے پہلے مدنی حقوق کی حفاظت کی بنا پر اس بل کی مخالفت کرتے ہیں ملک میں جو تھوڑی بہت شخصی آزادی باقی ہے حکومتِ ہند اس ایوان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اُسے بھی قربان کر دیا جائے۔

۲۴ اگست ۱۹۳۸ء کے مباحثہ میں ایوان اسمبلی میں مسٹر آصف علی نے اعلان کیا۔

"کانگریس پارٹی کے مسلم ارکان صرف اس بنا پر اس بل کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ہم تمام لوگوں کے لیے مدنی حقوق اور شخصی آزادی کی حفاظت چاہتے ہیں"

شخصی آزادی اور کانگرس

ہم یہاں ضمنی طور پر یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ شخصی آزادی اور مدنی حقوق کی حفاظت کے معاملہ میں کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کا اب تک کیا طرزِ عمل رہا ہے اور جس چیز کی حفاظت کے لیے کانگریسی گروپ اسقدر بے چین نظر آتا ہے اسکے ساتھ خود اسکا سلوک کیا ہے۔

(۱) "مدراس اسمبلی میں مسٹر ٹی کرشنام آچاریہ نے تشددانہ قوانین کی منسوخی کے لیے ایک بل پیش کیا مگر اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے وزیرِ اعظم مسٹر راج گوپال آچاریہ کی صدارت میں ایک قرارداد منظور کی کہ اس بل کی مخالفت کیجائے"۔

(ہندوستان ٹائمز ۱۶ اگست ۱۹۳۸ء)

یہ وہی متشددانہ قوانین ہیں جن کی مخالفت ہمیشہ کانگریس نے کی۔ یہی قوانین جو شخصی آزادی اور مدنی حقوق کے لیے تیز چھری کا حکم رکھتے ہیں اور جو آزادیٔ رائے وعمل کو کچلنے کے لیے نافذ کیے گئے تھے۔ مگر وزارت کی کرسیوں کو سنبھالتے ہی کانگریس نے انکی اہمیت کو سمجھ لیا اور ذرا خیال نہ آیا کہ ان قوانین سے سول لبرٹی اور شخصی آزادی سلب ہو رہی ہے مگر آرمی بل کی مخالفت میں اسی دلیل کو پُرزور الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے!

(۲) ایک دوسری مثال جو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے ملاحظہ فرمایئے حکومتِ مدراس نے جس کی ڈور کانگریس کے ہاتھ میں ہے یہ فیصلہ کیا کہ ثانوی مدارس میں "ہندوستانی زبان" (دراصل ہندی) کو لازمی اور جبری قرار دیا جائے۔ اسکے خلاف مدراس کے ہندوؤں نے ایجی ٹیشن کیا یعنی سول نافرمانی کی، قرارداد میں منظور کیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ بلکہ احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کرکے سزائیں دی گئیں۔ یہ ایجی ٹیشن حکومت مدراس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوا۔ چنانچہ وزیر اعظم مدراس مسٹر راج گوپال آچاریہ نے تلک گھاٹ پر ایک بہت بڑے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ہندی (؟) کے خلاف ہر قسم کے ایجی ٹیشن کو ضابطہ فوجداری کے ترمیمی قانون سے دبایا جا سکتا ہے تو وہ اس ایجی ٹیشن کو آج سے پندرہ روز پہلے چھوڑ بیٹھے ہوتے، ہم نے صوبائی خود مختاری کو قبول کرکے صوبہ کی حکومت سنبھالی ہے اور ہمیں ان تمام ہتھیاروں کو استعمال کرنے کا پورا حق حاصل ہے جو ہمارے قبضہ میں ہیں"۔

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۶ اگست ۳۸ء)

(۳) آزادیٔ رائے کا احترام کانگریسی صوبوں میں جس طرح کیا جا رہا ہے اس کی تیسری مثال ملاحظہ فرمایئے۔

"ناگپور میں کانگریسیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان جلسوں میں نہ شریک ہوں اور نہ تقریریں کریں جن میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلہ کی مذمت کیجاتی ہے جو ڈاکٹر کھارے کے متعلق کیا گیا ہے"

(مرکزی اسمبلی میں نواب صادق علی خاں کی تقریر مورخہ ۲۴ اگست ۳۸ء)

آپنے ملاحظہ فرمایا کہ آرمی بل کی مخالفت میں کانگریس پارٹی کی وزنی دلیل کیا تھی ؟ یہی نا کہ اسکے نفاذ سے شخصی آزادی برقرار نہیں رہ سکتی ۔ مگر شخصی آزادی کے ساتھ خود کانگریس اور کانگریسی حکومت کا طرز عمل یہ ہے جو سطور بالا میں آپنے ملاحظہ فرمایا ۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ کانگریس کے ہاتھوں مدنی حقوق کی جس قدر مٹی پلید ہوئی ہے اسکو اگر جمع کیا جائے تو ایک انبار لگ سکتا ہے ۔ یہ صرف ایک ضمنی بحث تھی اصل حقیقت کی پردہ کشائی آپکو آگے نظر آئے گی ۔

مخالفت کی دوسری بنیاد

آرمی بل کی مخالفت جس بنیاد پر کیگئی اسکا ایک پہلو آپ ملاحظہ فرما چکے اب اُس کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے ۔ مسٹر شام لال بل کی مخالفت میں حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

تم لوگوں کو گولی سے اڑاؤ گے ۔ تم اپنی افواج کو سرحد پر بمباری کے لیے استعمال کروگے اور تم فلسطین کے عربوں کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کا مظاہرہ کروگے ۔"

(تقریر مسٹر شام لال مرکزی اسمبلی میں موجب ۱۶ راگست ۳۸ء)

آپنے نہایت پرجوش الفاظ میں یہ بھی فرمایا

"ہماری پوزیشن بالکل صاف ہے اگر تم جنگ کے بارے میں مشورہ نہیں کرتے اگر تم فوج کو ہندوستانی نہیں بناتے اگر تم شہنشاہیت کے مقاصد کو تقویت پہونچانے کے لیے جنگ کروگے اگر تم چاہتے ہو کہ دوسری طاقتوں کو کچل کر رکھ دو ۔ اگر تم سرحد پر بمباری اور فلسطین کے عربوں کو تباہ کرنا چاہتے ہو تو پھر ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے سے روکیں"

اسی دلیل کو پرزور الفاظ میں پیش کرتے ہوئے سردار منگل سنگھ نے فرمایا :-

جناب اسوال یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کو فوج کی ضرورت ہے یا نہیں ، یہ بھی سوال نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کی حفاظت عدم تشدد کے ذریعہ کریں یا دیگر ذرائع سے بلکہ ایوان کے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ کیا فوج کا استعمال ہندوستان کی حفاظت اور ملکی مفاد کے لیے کیا جائے گا یا گزشتہ کیطرح اُسکو دیگر قوموں کو زیر کرنے کے لیے ؟

ہمارے روپے اور آدمیوں کو فوج کی شکل میں عراق۔ فلسطین اور عرب کو اسلیئے تو نہیں بھیجا جائے گا کہ وہاں کے باشندوں پر گولیاں چلائیں؟ یا صاف الفاظ میں سوال یہ ہے کہ فوج کو برطانی سلطنت کے مفاد کے لیئے تو استعمال نہیں کیا جائے گا؟"

(تقریر اسمبلی میں مورخہ ۷ اراگست ۳۸ء)

نیز ایک ہندو ممبر نے از راہ ہمدردی یہی ارشاد فرمایا:۔

"جناب! تیس سال کے اندر اندر برطانیہ نے اسلامی ممالک کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اگر ہم اسپر غور کریں تو لامحالہ اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ دُنیا میں اگر کسی حکومت نے اسلامی حکومتوں کو تباہ کیا ہے تو وہ صرف برطانی حکومت ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ نے جس طرح ٹرکی حکومت کو پارہ پارہ کیا وہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے۔ آپ گزشتہ ۲۵ سال کے عرصہ پر نگاہ ڈالیے اور مسجد ایا صوفیہ سے لیکر جامع مسجد دہلی تک نظر دوڑا کر کسی اسلامی ملک کو لے لیجئے نتیجہ صرف یہی نکلے گا کہ اسلام کی قوت کو صرف برطانیہ نے تباہ کیا ہے۔"

(تقریر مسٹر گڈگل مرکزی اسمبلی میں ۱۶ اراگست ۳۸ء)

یہ ہے آرمی بل کی مخالفت کی مستحکم بنیاد اور اُسکی ظاہری سطح! ہم کہہ چکے ہیں کہ فوجی بھرتی کی مخالفت کے یہ وجوہ مسلمانوں کے لیئے قابل تسلیم ہیں مگر قیامت تو یہ ہے کہ کانگرسی ہندو زبان سے کچھ کہہ رہے تھے اور دل میں کچھ اور مخفی تہا وہ کہتے تھے کہ فوجی بھرتی کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ممالک کو تباہ کیا جائے۔ فلسطین کے عربوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جائے۔ سرحد پر بمباری کیجائے۔ عراق عرب پر آگ برسائی جائے جیسا کہ جنگِ عظیم میں ہو چکا ہے اور اسوقت سرحد اور فلسطین میں کیا جارہا ہے۔ کاش یہ دلائل مخالفین کے دلوں سے نکلتے۔ انکا ظاہر اور باطن ایک ہوتا۔ اُنکے قلب و زبان میں ہم آہنگی ہوتی پھر ناممکن تہا کہ انکی خلوص نیت کا احترام نہ کیا جاتا اور انکی آوازیں اثر پیدا نہ ہوتا مگر وہاں تو "دما مخفی صدورھم اکبر" والا معاملہ تہا جو کچھ ظاہر کیا جا رہا تہا وہ باطن کے قطعًا خلاف تہا اور ماتم صرف اس بات کا تہا کہ فوج میں مسلمانوں کی اکثریت کیوں ہے۔ صرف صوبہ پنجاب ہی سے سپاہیوں کا انتخاب کیوں کیا جاتا ہے؟

اسمبلی سے باہر ہندو دُنیا نے کانگریسی ہندوؤں کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کر دی کہ انکو فوجی بھرتی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر اعتراض ہے تو صرف اس روش پر کہ پنجاب سے ، فیصدی مسلمان کیوں منتخب کیا جاتا ہے، چنانچہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندوؤں نے اسی اسمبلی میں ملا کہا کہ اگر حکومت بھرتی کی جانبدارانہ پالیسی کو ترک کر دے اور تمام صوبوں سے آبادی کے تناسب کی بنا پر فوجی بھرتی عمل میں لائے تاکہ فوج میں ہندوؤں کو نمایاں اکثریت حاصل ہو جائے تو فوجی بھرتی پر انکو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسکی تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔

تصویر کا دوسرا رُخ

پہلے تو ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کانگرسی ہندو فوجی بھرتی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ہندوستانی فوج میں زیادہ سے زیادہ بھرتی کیجائے اور مُلک کی عسکری قوت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور پائدار بنایا جائے مگر اسی شرط کے ساتھ کہ اس میں ہندوؤں کی اکثریت ہو یعنے فوج کو ہندو بنایا جائے تمام صوبوں سے فوج میں آدمی لیئے جائیں، اور صرف پنجاب سے فوجی بھرتی کی پالیسی ترک کر دی جائے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء میں یعنی آرمی بل کی مخالفت کے ایک ماہ بعد مسٹر بدری دت پانڈے اسمبلی میں سوال کرتے ہیں کہ۔

> ڈیفنس سکریٹری براہ کرم یہ بتائینگے کہ کیا صوبائی حکومتونکو اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ ہندوستان کی حفاظت کے لیے صوبوں کی فوج میں اضافہ کریں اور اس کو مدافعت کے لیے ہر قسم کے سامان کے ساتھ تیار رکھیں۔"

گویا جنگ کا خطرہ پیدا ہوتے ہی کانگرس کو بھی آرزو ہوئی کہ صوبہ جات کو بھی فوجی امداد کرنے کی اجازت ملجائے اگر واقعی جنگ چھڑ جاتی تو کیا کانگرس اور کانگرسی حکومتیں اور گاندھی جی برطانیہ کی مدد کے لیئے کھڑے نہ ہونگے اور فوج میں بھرتی کر کر کے برطانیہ کی قوت کو مستحکم نہ کرینگے ؟ ہمیں یقین ہے کہ جنگ چھڑنے پر کانگرس ہی سب سے پہلی جماعت ہوگی جو فوجی بھرتی کے مقدس کام کے لیئے سب سے آگے آگے نظر آئیگی

اگر یہ بات نہیں اور ہندوستانی فوج کو ہندو فوج میں تبدیل کر دینا مقصد نہیں تو پھر یہ کیا ہے کہ ایک طرف فوجی بل کی مخالفت کیجا رہی ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کی فوج تیار کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے اور خود کانگرسی حکومتیں[1] شد و مد کے ساتھ فوجی کالجوں جنگی اداروں اور عسکری تنظیم کا پروگرام تیار کر رہی ہیں؟

اسمبلی کے ۱۶ اگست والے مباحثہ میں مسٹر ستیہ مورتی نے فرمایا تھا:۔

"ہمیں بے شک فوج کیضرورت ہے ایسی فوج جو خیالی دشمنوں سے لڑنے کے بجائے ہمارے ملک کی حفاظت کرے اور عالمگیر امن و امان کے قیام میں مدد دے یعنی ہمیں جارحانہ فوج کی نہیں بلکہ مدافعانہ فوج کیضرورت ہے۔"

اسکے جواب میں آنریبل مسٹر میکسویل نے کہا:۔

"میں بتانا چاہتا ہوں کہ ملک بھر میں فوجی ٹریننگ سے ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔ اسی کے ساتھ اطلاعات مظہر ہیں کہ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں فوجی تربیت کو لازمی کرنے کے لیے یو۔پی حکومت[1] ایک اسکیم پر غور کر رہی ہے، بہار[1] میں اسکولوں اور کالجوں میں فوجی تربیت کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے اور بہار کی گورنمنٹ نے اس موضوع پر ایک پمفلٹ بھی شائع کیا ہے جس میں ثانوی مدارس کے لیے تعلیم اور فوجی تربیت کا ایک مناسب نصاب تجویز کیا گیا ہے۔ صوبہ جات متوسط[1] سے بھی اسی قسم کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں ناسک میں ڈاکٹر مونجے کے فوجی کالج سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ صدر ہندو مہا سبھا نے اپنے دورہ میں ملک کی حفاظت کے لیے ہندوستانی فوج کی ضرورت ظاہر کی ہے اسی قسم کا خیال کلکتہ کارپوریشن اور مدراس سٹی کونسل کی قرارداد میں پوشیدہ ہے جس میں لڑکوں کی جسمانی تربیت کے لیے پُر زور مطالبہ کیا گیا ہے اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حکومت پر اس لیے نکتہ چینی ہو رہی ہے کہ اُسنے فوجی بھرتی کا دروازہ غیر جنگی طبقات

---

[1] یہ سب کانگرسی حکومتیں ہیں ۱۲

(NON-MARTIAL RACES) کے لیے کیوں نہیں کھولا ؟"

ایک ہی روز بعد یعنی ۶ اراگست کو ٹھرما راؤ نے اسکی تائید ذیل کے الفاظ میں کی :-

"کانگریس اس ملک کے لیے تربیت یافتہ فوج چاہتی ہے۔ خود مسٹر میکیونل نے فرمایا کہ صوبہ جات متحدہ، صوبہ جات متوسط اور بہار کی حکومتیں کالجوں میں طلبہ کو فوجی تربیت دینے کی اسکیم پر غور کر رہی ہیں اور ڈاکٹر موسنجے نے بھی لڑکوں کی فوجی تربیت کے لیے ایک فوجی اسکول جاری کیا ہے۔ اِن مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس اتنی ناسمجھ نہیں ہے کہ وہ اِس ملک کی فوجی قوت کی الف، بے سے بھی ناواقف ہو"

سطور بالا سے یہ تو واضح ہوگیا کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو فوجی بھرتی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ملک کی حفاظت کے لیے ایک تربیت یافتہ اور مضبوط فوج ہندوستان میں رہے اسکے لیے نہ صرف خود کانگریس ہی کوشش کر رہی ہے بلکہ جو لوگ نجی طور پر فوجی کالجوں کا افتتاح کر رہے ہیں (مثلاً ڈاکٹر موسنجے) وہ انکو نظر استحسان دیکھ رہی ہے اب ہمارا کام یہ رہ گیا ہے کہ ہم یہ بتا دیں کہ اسمبلی میں فوجی بل کی مخالفت کس بنا پر کی گئی آیا اس بنا پر کہ ہندوستانی فوج سے سرحدی قبائل پر بمباری کیجائے گی اور فلسطین کے عربوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جائے گا یا اس بنا پر کہ فوجی بھرتی کا موجودہ طریق کار غلط ہے، کیونکہ اُس کی رُو سے پنجاب کے باشندوں کو ہی بھرتی کیا جاتا ہے اور فوج میں مسلمانوں کا تناسب ۶۰ فیصدی ہے :-

فوج کو ہندو بنانے کی تجویز

مسٹر بدری دت پانڈے نے مرکزی اسمبلی میں مندرجہ ذیل سوالات کیے :-

"کیا ڈیفنس سکریٹری ازراہِ کرم بتائیں گے کہ (الف) اگر ہندوستان پر بحری بری اور ہوائی راستوں سے حملہ کیا گیا تو اس کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں"

(ب) ۳۷ء اور ۳۸ء کے درمیان ہندوستانی ہوائی بیڑہ میں کتنے ہندوستانیوں کو بھرتی کیا گیا ؟

(ج) اسی دوران میں کتنے ہندوستانی، برطانی ہند کے بحری بیڑہ میں بھرتی کیئے گئے؟

(د) ۱۹۳۷ء و ۱۹۳۸ء میں پیادہ اور سوار فوج کے اندر کتنے ہندوستانی افسر اور سپاہی بھرتی کیئے گئے؟ بھرتی شدہ افسروں اور سپاہیوں میں کتنے پنجابی سکھ، پٹھان، گڑھوالی، مرہٹی، مدراسی، بہاری، بنگالی، اور صوبہ جات متحدہ کے ہندوستانی اور گورکھے بھرتی ہوئے؟

(ہ) اگر صرف پنجاب کے سکھ، پٹھان اور گڑھوالی ہی بھرتی کیئے گئے تو کیا آنریبل ممبر ہندوستان کی مدافعت کے لیے تمام صوبوں سے بھرتی کرنے کے مسئلہ پر غور کرینگے؟"

(اسمبلی کی کارروائی مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء)

ان سوالات کا منشا بالکل صاف اور واضح ہے یعنی۔

(۱) فوج میں ہندوستانیوں کی بھرتی کی ضرورت واہمیت۔ آنریبل ممبر مسٹر پانڈے بے چینی کے کے ساتھ حکومت سے دریافت کررہے ہیں کہ ہندوستان کی مدافعت و حفاظت کے لیے ۱۹۳۷ء و ۱۹۳۸ء میں کس قدر ہندوستانی بھرتی کئے گئے اگر بھرتی کی رفتار مدہم اور سست ہے تو ہندوستان کی حفاظت و صیانت کا اہم ترین کام کس طرح بروئے کار آئے گا اور حکومت پر ملک کی حفاظت کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوسکے گی؟ مختصر یہ کہ کانگرسی ہندو، فوجی بھرتی کے خلاف نہیں بلکہ اسکے مؤید اور حامی ہیں۔

(۲) بھرتی کے معاملہ میں جو چیز ہندوؤں کو عام طور سے اور کانگریسیوں کو خاص طور پر کھٹکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ دیگر صوبوں کو چھوڑ کر صرف پنجاب ہی کے نوجوان کیوں منتخب کیے جاتے ہیں جس میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ آخر مدراس، بہار، بنگال، اور یو۔پی۔ سی پی کے لوگوں نے کیا بگاڑا ہے کہ ان کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا؟ اور ظاہر ہے کہ خالص ہندو صوبوں سے بھی اگر بھرتی کا کام شروع کردیا جائے تو فوج کو آسانی سے ہندو بنایا جاسکتا ہے اور عسکری دائرہ میں ہندوؤں کو نمایاں اکثریت حاصل ہوسکتی ہے ورنہ صرف پنجاب سے فوجی بھرتی کا سلسلہ یہ معنے رکھتا ہے کہ مسلمانوں کا عنصر فوج میں غالب رہے حکومت کی ملازمتوں میں یہی ایک شعبہ ہے جس میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے زیادہ ہے،

اور یہی غم ہندو کو کھائے جا رہا ہے۔ تیز یہ بھی کہ فوج جیسے محکمہ میں مسلمانوں کی اکثریت !!

قوم پرستی کے اصلی خدوخال

آنریبل مسٹر پانڈے کے سوالات کے بعد مسٹر ستیہ مورتی نے اس سلسلہ میں مرکزی اسمبلی میں جو سوالات کیے وہ اس معاملہ پر اور زیادہ روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ستیہ مورتی کے سوالات اور حکومت کے جواب ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

مسٹر ستیہ مورتی۔ حکومت نے اسوقت جو جواب دیا ہے میں اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ کیا حکومت نے ان پبلک بیانات پر اپنی توجہ مبذول کی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ فوج میں صرف پنجاب اور پنجاب میں بھی صرف ایک فرقہ کے لوگ بھرتی کیے جاتے ہیں؟ کیا حکومت نے اسکے نتائج کا بھی ادراک کیا ہے؟ اور کیا حکومت تمام صوبوں اور تمام فرقوں کے لیے بھرتی کے دائرہ کو وسیع کرکے فوج کو حقیقی معنوں میں "قومی" بنانے کے مسئلہ پر غور کرے گی۔ تاکہ وہ ان خطرات سے محفوظ ہوجائے جو اسوقت تمام ممالک میں فوجی ڈکٹیٹرشپ کے باعث سیاسی قوت پر غلبہ پانے سے پیدا ہو گئے ہیں۔"

مسٹر اوگلوی۔ مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں ہے کہ حکومت جس بنا پر فوجی بھرتی کا یقین کرتی ہے اس میں صوبائی حدود بندیوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بہترین افراد سے بہترین فوج تمام ہندوستان کے لیے منتخب کیجاتی ہے نہ کہ کسی خاص صوبہ کے لیے لہذا اس معاملہ میں قومی نقطہ کو صوبائی نقطہ نگاہ سے بالاتر رہنا چاہیئے۔ ہمیں فوج کے لیے جہاں بھی اچھے افراد ملیں گے ہم انکو حاصل کرنے کے لیے وہیں جائینگے۔ ادہر ادہر بھٹکتے نہیں پھرینگے +

مسٹر ستیہ مورتی۔ حکومت نے پنجاب سے فوجی سپاہی بھرتی کرکے میرے صوبہ (مدراس) کے ان بہادر سپاہیوں کو کیوں فراموش کردیا جنہوں نے تھوڑے ہی زمانہ ہوا ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوکر کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے؟ کیا حکومت نے فوج سے مدراس

اور دیگر بہت سے صوبوں کو خارج نہیں کیا؟

مسٹر آوگلوی۔ مدراس کو فوجی بھرتی سے بالکل علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت فوج میں مدراسیوں کی خدمات کی قدر کرتی ہے اور وہ ان مقامات سے اب بھی فوج میں بھرتی کرتی ہے جہاں تجربے سے بہتر سپاہی مل سکتے ہیں۔ فوج میں مدراسیوں کی تعداد ۴۵۰۰ ہے۔

مسٹر ستیہ مورتی یعنی ۱۲۰۰۰۰ (ایک لاکھ بیس ہزار) میں سے ۴۵۰۰ سپاہی!

مسٹر اوگلوی تقریباً اسی تعداد میں۔

مسٹر ستیہ مورتی۔ مدراس کی آبادی کا خیال کرتے ہوئے کیا یہ تعداد مناسب ہے؟ مدراس جس مقدار میں حکومت کو ٹیکس ادا کرتا ہے، اس خیال سے اور قومی فوج کی ضرورت کے پیش نظر کیا فوج میں مدراسیوں کی تعداد صرف اتنی ہی ہونی چاہیے؟

مسٹر اوگلوی۔ ہمارے خیال میں اصلی ضرورت یہ ہے کہ فوج کے لیے بہترین افراد مہیا کیے جائیں۔" (دیکھو اسمبلی کی کارروائی مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء)

مسٹر ستیہ مورتی کے اِن سوالات پر بار بار غور کرو اور سوچو کہ انکا منشا اسکے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے کہ فوج میں داخلہ کا حق ہندوستان کے تمام صوبوں کو عموماً اور مدراس کو خصوصاً حاصل ہونا چاہیے اور حکومت کا یہ رویہ سخت خطرناک ہے کہ وہ صرف پنجاب کے افراد کو فوج میں بھرتی کرتی ہے اور پنجاب میں سے بھی صرف ایک فرقہ کے لوگوں کو؟ یہ "ایک فرقہ" مسلمانوں کے سوا اور کون ہوسکتا ہے۔ جن کو کوئی کانگرسی کوئی ہندو اور کوئی قوم پرست فوج میں دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ کیا ان سوالات میں اس بات کا کوئی شائبہ بھی ہے کہ کانگرسی ہندوؤں کے نزدیک فوجی بھرتی ملکی مفاد۔ مدنی حقوق اور آزادی کے لیے مضر ہے۔ اسمبلی میں تو ان قوم پرست حضرات نے یہی رونا رویا ہے کہ :-

(۱) ہندوستانی فوج کی تعداد کم کیوں ہے۔ ہندوستان کی قلیل فوج ملک کی حفاظت کس طرح کرسکے گی ضرورت ہے کہ حکومت فوج کی تعداد بڑھائے تاکہ ہندوستان کی حفاظت ہوسکے۔

(۲) چونکہ قوم پرست حضرات اور کانگرسی ہندوؤں کے خیال میں ہندوستان کی فوج تعداد میں کم ہے اس لیے کانگرسی صوبوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جنگ چھڑ جانے پر اُن کو بھی فوجی بھرتی کرنے اور حکومت کی فوج سے امداد کرنیکی اجازت دی جائے۔ اسکے لیے اسمبلی میں سوالات کرکے راستہ صاف کیا جا رہا ہے۔

(۳) یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ فوجی بھرتی ملکی مفاد کے خلاف ہے بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ صرف صوبہ پنجاب ہی کو فوج کے لیے کیوں منتخب کرلیا گیا ہے اور پنجاب سے صرف ایک فرقہ کے لوگوں پر فوجی بھرتی کا دروازہ کیوں کھول دیا گیا ہے؟

(۴) مسٹر ستیہ مورتی کے سوالات سے صاف عیاں ہے کہ وہ ایک قومی فوج کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور اسکے لیے ضرورت ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں سے بہترین افراد فوج میں بھرتی کیے جائیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب اُن صوبوں سے جہاں خالص ہندوؤں کی اکثریت ہے فوج کے لئے آدمی لیے جائینگے تو ہندوستانی فوج میں بھی آبادی کے تناسب سے ہندوؤں کو اکثریت حاصل رہیگی اور جب فوج میں ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہو جائے گی تو اُس وقت وہ فوج قومی یا ہندوستانی فوج کہلائے جانیکی مستحق ٹھہریگی گویا کانگرسی ہندوؤں کا منشا یہ نہیں ہے کہ فوجی بھرتی نہ کیجائے بلکہ یہ ہے کہ اس میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے (۷۶ فیصدی) ہندو لیے جائیں تاکہ زندگی کے تمام شعبوں کے بعد فوج پر بھی انکو غلبہ حاصل رہے اور آبادی کے بہانہ سے فوج کو آسانی سے ہندو بنا لیا جائے!

دیکھا آپنے کہ جنکی آنکھیں اسلامی ممالک کے غم میں خونبار نظر آتی تھیں اُن کے دل میں کیا تھا؟ یا نہمہ یہ تمام حضرات حریت پسند اور مسلمانوں کے بہی خواہ اور مسٹر جناح یا مسلم لیگ پارٹی گردن زدنی، غدار، انگریز کی پٹھو۔ اسلامی ممالک کو تباہ کرنیوالی اور اسلامی مفاد کے گلہ پر چھری پھیرنیوالی ہے! پہلے یہ تو سمجھو کہ فوجی بل کی مخالفت سے ہندوؤں کا منشا کیا تھا اور پھر مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے اس "جرم عظیم" کا جائزہ لو اور انصاف سے فیصلہ کرو کہ خود غرض کون ہے۔ غدار کون ہے۔ قوم پرستی کا جامہ زیب تن کرکے فوج پر کنٹرول کرنا اور مسلمانوں کو تباہ کرنا کون چاہتا ہے؟

مسٹر آصف علی کی فریب خوردگی

آپ نے دیکھا کہ اسمبلی میں آرمی بل کی مخالفت کی حقیقی بنیاد کیا ہے اور کس بنا پر ہے کانگریس گروپ اور عام ہندو ارکان نے اس کی مخالفت کی؟ کہا یہ گیا تھا کہ فوجی بل کی مخالفت اسلیے ضروری ہے کہ اس سے آزادی رائے کو کچلنے کا کام لیا جائے گا اور فوج کو سرحد اور فلسطین بھیج کر اسلام کی سیاسی قوت کو توڑا جائے گا۔ مگر کریدنے اور چھیلنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کی مخالفت کیوجہ صرف یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف پنجاب سے اور پنجاب میں صرف ایک فرقہ کے (یعنے مسلم) افراد سے فوج کو بھرا جا رہا ہے مسٹر پانڈے اور مسٹر ستیہ مورتی کے سوالات سے یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ہندو فوجی بھرتی کی حمایت اسوقت کرینگے جب تمام صوبوں سے رنگروٹوں کی بھرتی کا موقع آئے گا اور یہ یقین ہو جائے گا کہ فوج میں ہندو عنصر کو نمایاں غلبہ حاصل رہے گا

آپ کو معلوم ہے کہ کانگریسی ہندوؤں کا شروع سے ہی یہ طریقہ ہے کہ ان کو جب کبھی خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ انکے کسی طرز عمل سے مسلمانوں کے دل میں کھٹک پیدا ہونے کا احتمال ہے تو وہ جھٹ سے کسی مسلمان کو گواہوں کے کٹہرے میں لاکھڑا کرتے ہیں جو قرآن اٹھا کر یقین دلاتا ہے کہ ہندو کا کوئی طرز عمل مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہیں اسمبلی کے اندر ان کو مولانا آزاد تو مل نہیں سکتے تھے جو بالعموم ان فرائض کو سر انجام دیا کرتے ہیں۔ یہاں مسٹر آصف علی صاحب تشریف لائے اور نہایت معصومیت کے ساتھ فرمایا

"حکومت اور کانگریس کے درمیان سوال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو فوج میں کیوں بھرتی کیا جا رہا ہے جیسا کہ مسٹر جناح کا خیال ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ برطانی مفاد کے لیے جنگ میں ہندوستان کی شرکت کہاں تک حق بجانب ہے"

(ہندوستان ٹائمز اکتوبر ۹ ۱۹۳۸ء)

اب کوئی مسٹر آصف علی صاحب سے جا کر یہ پوچھے کہ حضرت! اگر آپکا ارشاد بجا ہے تو یہ مسٹر ستیہ مورتی جو مرکزی اسمبلی میں کانگرسی گروپ کے چیف وہپ اور "قوم پرستوں" کے نمائندے ہیں اپنے سوالات میں بار بار پنجاب کا کیوں ذکر فرماتے ہیں اُن کو صرف "ایک فرقہ" کی بھرتی سے کیوں شکایت ہے؟ وہ

حکومت کو کیوں مجبور کرتے ہیں کہ تمام صُوبوں پر فوجی بھرتی کا دروازہ کھول دیا جائے ؟ وہ مدراس کے "بہادر دل" کا اور اُن کی فوجی خدمات کا ذکر کرکے فوج میں اُنکی قلت کا کیوں رونا رُوتے ہیں ؟ انکا یہ ارشاد کس لیئے ہے کہ مدراس سب سے زیادہ حکومت کو ٹیکس ادا کرتا ہے ؟ مسٹر پانڈے سوالات کے دَوران میں کیوں پنجاب کے پٹھانوں پہ آوازہ کَستے ہیں وہ حکومت سے کس لیئے درخواست کر رہے ہیں کہ صوبجات متحدہ اور بہار سے بھی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے ؟ اِن واقعات کی موجودگی میں مسٹر آصف علی صاحب کا نہایت جرائت سے یہ فرمانا کہ :-

"حکومت اور کانگریس کے درمیان سوال یہ نہیں ہے کہ فوج میں مُسلمانوں کو کیوں بھرتی کیا جارہا ہے"

صاف بتا رہا ہے کہ یہ "ریکارڈ" گراموفون کی کسی کمپنی کا ہے !

افسوس مسٹر آصف علی صاحب اسموقع پر اس سلوک کو فراموش کر بیٹھے جو خود اُنکے ساتھ دہلی میونسپلٹی کے الیکشن میں کانگرسی ہندوؤں نے کیا تھا !

ابھی کچھ اور

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ہمارے سامنے اسمبلی کے کانگرسی ارکان کے اور بیانات بھی ہیں اور وہ افکار و خیالات بھی جو قوم پرست ہندو لیڈروں اور ہندو اخبارات نے ظاہر فرمائے ہیں ۔

مسٹر پانڈے اور مسٹر ستنیہ مورتی کے بیانات سے آپ کو یہ تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ حضرات "قومی فوج" کی تشکیل کے لیئے کس قدر بے چین ہیں اور قومی فوج کے معنی ہیں ۔ اس عسکری طاقت کے جس پر ہندوؤں کا قبضہ اور غلبہ ہو اور یہ غلبہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے کہ جب حکومت' پنجاب کے "صرف ایک فرقہ" کے لوگوں کو نظرانداز کرکے ہندوستان کے تمام صوبوں سے فوجی بھرتی کرے اور آبادی کے تناسب سے فوج میں ہر فرقہ کو داخلہ کا حق دیا جائے ۔ یعنی جب فوج میں ہندوؤں کی اکثریت ہوجائے تو کہا جائے گا کہ اب قومی فوج کی تشکیل عمل میں آگئی ہے ۔ پھر ہر ہندو کا فرض ہوگا کہ اس قومی فوج کی حمایت کرے اور اور اس کی بھرتی کے لیئے جو کچھ اُسکے بس میں ہو کر گزرے اس نیشنل آرمی (قومی فوج) کی نوعیت

کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا انبالہ کے مسٹر شام لال صاحب کا وہ بیان پڑھیئے جو آپنے اسمبلی میں فوجی بل کی مخالفت کرتے ہوئے دیا آپنے فرمایا:-

"تاہم اس مخالفت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں سے یہ کہا جائے کہ نہیں "قومی فوج" میں بھی بھرتی نہ ہونا چاہیئے"۔ (اسمبلی کی کارروائی مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۸ء)

یعنی فوجی بل کی جو مخالفت کیجارہی ہے وہ اسلیئے کہ اسکا مقصد قومی فوج کی تشکیل نہیں بلکہ اُسکے ذریعہ تمام ہندو اکثریت والے صوبوں کو نظرانداز کرکے صرف پنجاب کے ایک "فرقہ" کے افراد کو فوج میں بھرتی کیا جائیگا حالانکہ کہا یہ جارہا تھا کہ فوجی بل کی مخالفت کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی برقرار رہے، تقریر و تحریر اور رائے کی آزادی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو اور سرحد کے پٹھانوں اور فلسطین کے عربوں کو تباہ ہونے سے بچایا جائے مگر جب اصل حقیقت کھلی تو معلوم ہوا کہ ہندوؤں کو نہ سرحد کا خیال ہے نہ فلسطین، عراق اور عربی ممالک کا۔ نہ انکو آزادی رائے اور مدنی حقوق کے تحفظ سے کوئی غرض ہے اور نہ برطانی شہنشاہیت کی مخالفت سے۔ ان کو غرض صرف "قومی فوج" سے ہے جو ہندو اکثریت پر مشتمل ہو اور جس میں مدراس، بہار، اور سی پی کے بہادروں کو نمایاں جگہ حاصل ہو۔

اسلامی ممالک کے تحفظ کا جذبہ ہندوؤں کے دلوں میں کس قدر کارفرما تھا اس کا اندازہ تو اس سے لگایئے کہ ادھر فوجی بل کی مخالفت ہو رہی تھی اور اُدھر جنگ کے آثار دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو پراگ میں یہ بیان شائع فرما رہے تھے کہ "انگلستان کا دشمن ہندوستان کا دشمن ہے"۔ (ٹریبون)

قوموں کی تقسیم فوجی اعتبار سے

ہندوؤں کو حکومت سے زبردست شکایت ہے کہ اُسنے ہندوستان کی قوموں کو فوجی نقطۂ نظر سے جنگی اور غیر جنگی میں تقسیم کر دیا ہے اور چونکہ پنجاب کا شمار ان صوبوں میں ہے جن میں جنگی قومیں آباد ہیں اس لیئے فوجی بھرتی کے لیئے قدرتاً اسی کو منتخب کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس انتخاب کے بعد ان صوبوں کو آسانی کے ساتھ نظرانداز کیا جاسکتا ہے جو فوجی اعتبار سے جنگی قوموں کا مسکن نہیں ہیں اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی بھرتی کے اس اصول پر فوج میں ہندوؤں کو قیامت تک بھی اکثریت حاصل نہ ہوسکے گی!

یہی وجہ ہے کہ فوجی اور غیر فوجی کی تقسیم سے عام ہندو نالاں ہیں اور فوجی بل کی مخالفت کی حقیقی وجہ بھی یہی ہے۔ اسمبلی میں فوجی بل پر جو مباحثہ ہوا اُس میں مسٹر جوشی کا ارشاد سُننے کے قابل ہے۔ آپ نے بحث کے دوران میں فرمایا:۔

"ہندوستانی فوج میں بھرتی کے مسئلہ میں حکومت ہند ایک غلط پالیسی اختیار کر رہی ہے سب سے پہلے ان اسباب کی بنا پر جنکو وہی خوب سمجھتی ہے اُس نے مُلک کو جنگی اور غیر جنگی میں تقسیم کر دیا ہے اس تقسیم نے خود حکومت ہند کی راہ میں مشکلات پیدا کر دی ہیں اگر یہ تقسیم باقی نہ رہے تو بھرتی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ بھی باقی نہ رہیں!

صرف یہی نہیں بلکہ حکومت ہند ایک اور غلطی کا بھی ارتکاب کر رہی ہے وہ ایک بہت ہی محدود علاقہ سے فوج میں بھرتی کرتی ہے۔ رنگروٹوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے صرف پنجاب میں بھرتی کو محدود کر دینا خود حکومت ہند کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اگر حکومت تمام مُلک سے بھرتی کرے تو فوجی بھرتی کو روکنے کے لیے ۱۵۰ مقرر دس بھی کافی نہیں ہو سکیں گے[1]،، (اسمبلی کا مباحثہ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۳۸ء)

مُلاحظہ فرمایا کہ فوجی بل کی مخالفت کیوں کی گئی؟ اور کانگرسیوں کو رنج کس بات کا ہے؟ اُن کو صرف یہ شکایت ہے کہ حکومت پنجاب سے اور پنجاب سے بھی ایک فرقہ کے افراد کو کیوں فوج میں بھرتی کرتی ہے۔ کیوں فوجی معاملات پر ہندو اکثریت کو غلبہ حاصل کرنے نہیں دیتی! ہندوؤں کی حقیقی خواہش تو یہ ہے کہ حکومت ہند کانگرس کے ہندو لیڈروں اور مہاتما گاندھی سے مشورہ کرے اور ان کی ہدایت پر فوجی تشکیل عمل میں لائے۔ چنانچہ اسمبلی کے مباحثہ کے دَوران میں سردار منگل سنگھ نے نہایت صفائی سے کہا:۔

---

[1] یہ اس بیان کی طرف اشارہ ہے جو مسٹر میکسویل نے فوجی بل کی حمایت کرتے ہوئے دیا۔ مسٹر میکسویل نے کہا تھا۔ "اپریل ۱۹۳۷ء سے اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ نئے دستور کے نفاذ کے بعد پبلک اجتماعات میں فوجی بھرتی کے خلاف کثرت سے تقریریں کی جا رہی ہیں ۱۹۳۷ء میں اپریل سے دسمبر تک صرف پنجاب کے ۱۷ جلسوں میں ۱۵ مقررین نے فوجی بھرتی کے خلاف تقریریں کیں۔ لیکن دسمبر ۱۹۳۷ء سے اب تک صرف پنجاب میں اس مقصد کے لیے ۱۳۰ جلسے کئے گئے،، دیکھئے یہ تقریریں اور جلسے سب پنجاب ہی میں ہو رہے تھے!! ۱۲

جناب ایک ضروری سوال ہمارے سامنے ہے وہ یہ کہ ہمارا یہ مطالبہ کیوں ہے ؟ فوجی بھرتی کے خلاف ایجی ٹیشن کس لیے برپا کیا جا رہا ہے ؟ ہمارے صوبہ میں ۲۸۰ جلسے کیوں منعقد ہوئے اور کیوں ان میں لوگوں سے کہا گیا کہ فوج میں بھرتی نہ ہونا ؟ حکومت ہند اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے معلوم کر سکتی ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے مگر بجائے اس سوال کو حل کرنے کے وہ فوجی بل پیش کر رہی ہے۔

"اگر جناب آپ کی خواہش ہے کہ فوج میں لوگ بھرتی ہوں تو اس قسم کا بل پیش نہ کیجیے بلکہ لیڈروں کے پاس جائیے۔ مہاتما گاندھی کے پاس جائیے اور ان سے کہیے کہ ہم اسوقت مشکلات میں ہیں اور ہم کو اس ملک کی امداد کی ضرورت ہے اور کانگرس سے معاملہ طے کیجیے اور پھر دیکھیے کہ ہندوستان آپکا کس طرح معتمد حلیف بنتا ہے۔"

(کارروائی اسمبلی مورخہ ۷ استمبر ۱۹۳۸ء)

مطلب یہ ہے کہ ہندو نہ صرف فوج میں اپنی اکثریت چاہتا ہے بلکہ دفاعی وسائل کی تشکیل میں حکومت کا مشیر خاص بھی بننا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کانگرسی ہندو حکومت کو جو مشورہ دے حکومت کا فرض ہے کہ اس کو قبول کرے۔ اس کی مرضی ہے کہ حکومت فوج جیسے اہم معاملہ میں گاندھی جی کی رائے پر عمل کرے اور ہندوستان کی عسکری طاقت کو کلیتاً ہندوؤں کے ہاتھ میں دیدے اور جب یہ صورت عملی شکل اختیار کر لے گی تو پھر ہندوؤں کو نہ فلسطین کا خیال رہے گا اور نہ سرحدی قبائل پر بمباری کا۔ وہ فوجی کنٹرول کے لیے برطانیہ سے دس قدم آگے بڑھنے کے لیے تیار رہے اگر ایسا نہیں اور فوج میں صرف ایک فرقہ کو بھرتی کرنے کی پالیسی قایم رہی تو اسے بار بار فلسطین یاد آتا رہے گا اور فلسطین کی تباہی اسکے لئے سوہان روح بنی رہے گی۔

ہندو اخبارات اور فوجی بل

یہ تو تھیں اسمبلی کی تقریریں جن میں نہایت وضاحت اور صفائی سے ہندوؤں نے اپنا منشا ظاہر کر دیا ہے اب ذرا قوم پرست اور کانگرسی اخبارات کا جائزہ لیجیے کہ وہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں

اور ان کے نزدیک فوجی بل کی مخالفت کے بڑے اسباب کیا ہیں؟ اگر آپ ہندو اخبارات کا جائزہ لیں گے تو یہ دیکھکر آپ کو سخت حیرت ہوگی کہ اسمبلی کے ہندو ممبران کی طرح وہ بھی اس امر کے شاکی ہیں کہ حکومت نے صرف ایک صوبہ کو فوجی بھرتی کے لئے کیوں مخصوص کر لیا ہے اور ایک صوبہ کے صرف ایک فرقہ پر اس کی یہ نظر عنایت کیوں ہے؟ کیوں تمام صوبوں کے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا؟ اور اس کے لئے مدراسیوں، بہاریوں، بنگالیوں اور یوپی کے ہندو سورماؤں کو فوجی معاملات میں کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے؟

اخبار "پائنیر" لکھنؤ نے فوجی بل کی مخالفت کرنے والوں کی دکھتی رگ پکڑتے ہوئے لکھا تھا۔

"فوجی بھرتی کے مسودۂ قانون پر مسٹر جناح نے حکومت کا ساتھ کیا دیا کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے ان پر سخت اور شدید نکتہ چینی شروع کر دی۔ فلسطین اور وزیرستان میں برطانیہ جو کچھ کر رہا ہے اس کا حوالہ دے دیکر یہ کہا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کا مقدس ترین فرض ہے کہ وہ برطانی فوج کا بائیکاٹ کر دیں مگر یہ دلیل دیتے وقت ان مشکلات کا احساس نہیں کیا گیا جو فوجی بائیکاٹ کے بعد ہزاروں مسلم گھرانوں کو پیش آئینگی۔ ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کا تناسب ۷۰ فیصدی ہے اور اکثر مسلمان سپاہی پنجاب سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کانگریس کی طرف سے فوجی بھرتی کے خلاف پروپیگنڈہ کا نتیجہ صرف پنجاب ہی کو برداشت کرنا پڑیگا آخر فوجی بھرتی کے خلاف یہ خوشخبریاں راجپوتانہ اور مہاراشٹر میں کیوں نہیں سنائی جائیں؟..... فوجی بھرتی کے خلاف صرف مسلمانوں میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے تاکہ فوج میں ان کا فیصدی تناسب گھٹ جائے اور ان کی جگہ کو پر کرنے کے لئے جاٹ، سکھ اور مرہٹے آجائیں" (مندرجہ ہندوستان ٹائمز ۳ ستمبر ۱۹۳۸ء)

اس کے جواب میں "ہندوستان ٹائمز" میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معاصر "پائنیر" کا خیال کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"اس نظریہ کی صداقت کو نظر انداز کر دیجئے کہ ہندوستان میں فوجی اور غیر فوجی کی تقسیم غلط ہے نیز اس کو بھی جانے دیجئے کہ نام نہاد فوجی طبقہ سے باہر بھی بہترین جنگی سپاہی موجود ہیں جنھوں نے برطانی حکومت کے آغاز میں اپنی قوت و خدمت کے بہترین مظاہرے کئے ہیں۔ یہ حیرت انگیز امر ہے

کہ کوئی معقول پسند حکومت کسی خاص صوبہ یا کسی خاص فرقہ کے ہاتھ میں جنگی قوت کا اجارہ دیدے اگر یہ صحیح ہے کہ فوج میں مسلمانوں کا تناسب ۶۰ فیصدی ہے اور ہمارے معاصر (پائنیر) کی یہ بیان کردہ حقیقت کہ مسلمان سپاہی زیادہ تر پنجاب ہی سے بھرتی کئے جاتے ہیں درست ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے فوجی حکّام برطانیہ اور باقی ہندوستان کے لئے خطرہ پیدا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر ریاست کو فوج میں نمائندگی کا اور ہر فرقہ اور طبقہ کے لوگوں کو فوجی خدمات بجالانے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں آبادی اس قدر کثیر ہو، یہ افسوسناک بات ہے کہ صرف ایک فرقہ کے لوگوں کو جنگی مقاصد کے لئے تربیت دیجائے اور باقی ہندوستان کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔" (ہندوستان ٹائمز ۲ ستمبر ۱۹۳۸ء)

دیکھا آپ نے کہ اخبار پائنیر کے خیالات کی کس طرح حرف بحرف تائید کی گئی ہے! فلسطین اور وزیرستان تو خواہ مخواہ بہانا بنایا گیا ہے اصل غرض تو یہ ہے کہ "ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر ریاست کو فوج میں نمائندگی کا حق حاصل ہے" اور جب ان کا یہ حق غصب کیا جا رہا ہے تو ناممکن ہے کہ فوجی بل کی مخالفت نہ کیجائے۔ ہندوؤں کو افسوس اس بات کا نہیں کہ برطانی فوج کو عربوں اور پٹھانوں کے خلاف استعمال کیا جائیگا بلکہ اس بات کا ہے کہ "کسی خاص فرقہ کے ہاتھ میں جنگی قوت کا اجارہ دیدیا جائے" سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ "صرف ایک فرقہ کے لوگوں کو جنگی مقاصد کے لئے تربیت دینا اور باقی ہندوستان کو چھوڑ دینا" اگر حکومت آج سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کو بھرتی کر کے فوج میں ہندو اکثریت کا ثبوت دیدے تو پھر قوم پرست اور کانگریسی اخبارات اور لیڈروں کو کوئی افسوس ہوگا اور کوئی شکایت نہ ہوگی اگر برطانیہ فلسطین اور سرحد کو اسی ہندو فوج کے ذریعہ زیر و زبر کرڈالے تو اس وقت نہ تو آزادیٔ رائے کا کوئی سوال پیدا ہوگا نہ مدنی حقوق کی حفاظت کی خلش طبیعت کو پراگندہ کریگی اور نہ جارحانہ اور غیر جارحانہ حملوں کی تقسیم پر غور کرنے کا موقع ملے گا۔

اخبار "ہندوستان ٹائمز" جو کانگریس کی آواز ہے اور قوم پرست اخبارات کی صفِ اوّل میں جس کا شمار ہوتا ہے ہم اس کے مقالہ افتتاحیہ پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں خیال ہو سکتا تھا کہ "ہندوستان ٹائمز" جیسا قوم پرست اخبار تو کم از کم فوجی بل کی مخالفت میں اپنے قوم پرستانہ

دلائل پیش کریگا اور ساتھ ہی یہ بھی بتائیگا کہ بل کی مخالفت میں بقول مسٹر آصف علی "مسلمانوں کی بھرتی کا سوال نہیں ہے" بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ ہندوستان کی مرضی کے خلاف فوج کو استعمال کرنیکا حق برطانیہ کو دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ مگر جب معاصر محترم کا لیڈنگ آرٹیکل اس موضوع پر سامنے آیا تو یقین کرنا پڑا کہ پورے ہندوستان کا قوم پرست طبقہ اور ہندوؤں کا ایک ایک فرد چاہتا ہے کہ منڈیوں ملازمتوں، کمپنیوں اجارہ داریوں اور اقتصادی و سیاسی اداروں پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستانی فوج پر بھی قبضہ کیا جائے اور مسلمانوں کا جو عنصر وہاں نظر آتا ہے اسکی جگہ پر مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کو بٹھا دیا جائے! اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بل کی مخالفت کا منشا فوج میں مسلمانوں کی بھرتی نہیں ہے بلکہ ایک اصول ہے یعنی آزادیٔ رائے کا تحفظ اور سول لبرٹی کا احترام!

بہرحال "ہندوستان ٹائمز" اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے۔

"جہانتک ہندوستانی فوج کو مستحکم کرنے کا سوال ہے ہم مسٹر اوگلوی کی رائے کا احترام کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن مسٹر چیٹو پادھیا کا یہ سوال کہ قومی مدافعت کے لئے صوبوں کو بھی فوجی امداد کی اجازت دیجائے ایک ایسا سوال ہے جس کو مجوزہ فیڈریشن کے پیش نظر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسٹر اوگلوی کے جواب نے اس پر غور و فکر کی راہ بالکل ہی بند کردی ہے۔ صوبوں اور ریاستوں کی خودمختاری کا یہ حیرت انگیز فیڈریشن ہے کہ جس میں قومی مدافعت کے لئے ایک مخصوص صوبہ اور ایک مخصوص طبقہ سے فوج بھرتی کیجاتی ہے"

ہندوستان کے باشندوں کو جنگی اور غیر جنگی میں تقسیم کرنا خودغرض پارٹیوں کا کام ہے جو بنیادی حقیقت کے خلاف ہے اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی فوج میں ہر صوبہ سے بھرتی کیجائے تاریخی[1] ثبوت موجود ہیں کہ مدراس اور بنگال کی فوج نے اپنی فوجی قابلیت کے بہترین جوہر

---

[1] بلاشبہ مدراسیوں کی شجاعانہ کارگذاریوں کے تاریخی ثبوت موجود ہیں "سر ویسلے ہیگ" کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ "فوج کے لئے وہ اعلیٰ قابلیت جسکے فقدان کی بنا پر مدراسیوں پر فوجی بھرتی کے سلسلہ میں پابندیاں عائد کردی گئیں تھیں اٹھارھویں صدی کے اختتام سے پہلے ہی معلوم ہوچکی تھی۔ اور اسی فوج نے جس جنگی میدان میں قدم رکھا ان کی حقیقت ظاہر ہوتی گئی اور برما کی تیسری جنگ نے تو حکام کو یقین دلادیا کہ سوائے چند مستثنیات کے مدراس کی پیادہ فوج فن سپاہ گری کے لحاظ سے قطعاً بیکار رہے، شاید یہ وہی تاریخی ثبوت ہے جس کی طرف معاصر "ہندوستان ٹائمز" نے اشارہ کیا ہے! ۱۲ منہ

دکھائے ہیں لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے اور ذمہ دار حکام نے یہ محسوس کیا کہ بعض صوبوں میں تعلیمی ترقی کے ساتھ لوگ اس قابل ہو گئے ہیں کہ حکومت کے ہر اقدام کی افادیت اور قیمت کا از خود اندازہ لگائیں تو ذمہ دار حکام نے فوج کے لیے اسی خاص خطہ کو منتخب کر لیا۔

مسٹر چھٹو پادھیائے کونسل آف سٹیٹ میں اس امر کی تحریک کرتے ہوئے کہ فوج، سوار، توپ خانہ اور ہوائی محکمہ میں صوبہ مدراس سے اچھے اور موزوں آدمی بھرتی کیے جائیں۔ گورنر جنرل سے درخواست کی تھی اسکے جواب میں سر ڈاوڈ نے جنگی طبقات کا قصہ چھیڑ دیا۔ سر ڈاوڈ نے جس انداز میں مدراس کا ذکر کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ بمبئی اور بنگال جیسے صوبوں میں انکے نزدیک جنگی قابلیت اور حربی اسپرٹ موجود ہی نہیں ہے!

ایک ایسی ترمیم جس کا منشا یہ تھا کہ ان ذاتوں سے جن کی نمائندگی فوج میں کافی نہیں ہے، معاملہ کو بالکل صاف کر دیتا ہے۔ مگر کمانڈر انچیف کی طرف سے اس مطالبہ کا کیا جواب دیا گیا؟ .... یہ خیال کہ آبادی کا ایک حصہ امن کے زمانہ میں اپنا فرض ادا کر سکتا ہے اور دوسرا حصہ جنگی مقاصد کی احسن طریقہ سے تکمیل کر سکتا ہے اس کا ہر جگہ مذاق اڑایا جائے گا (ہندوستان ٹائمز ۱۹ ستمبر ۳۸ء)

غور فرمائیے کہ ہندوستان ٹائمز کے مقالہ افتتاحیہ میں بھی اس بات کا رونا رویا گیا ہے کہ "نیشنل ڈیفنس" کے لیے فوجی بھرتی کا دروازہ تمام صوبوں پر کیوں نہیں کھولا جاتا۔ فوج کے لیے صرف ایک صوبہ کو اور ایک مخصوص فرقہ کو کیوں منتخب کر لیا گیا ہے؟ ہندوستان کو جنگی اور غیر جنگی طبقات میں تقسیم کر کے برطانیہ اپنے لیے اور ہندوستان کے لیے کیوں مشکلات پیدا کر رہی ہے اسی کے ساتھ مدراس بنگال اور بمبئی کے سورماؤں کی بہادری و شجاعت کا تذکرہ کیا جاتا ہے! ان واقعات کے بعد کس کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ فوجی بل کی مخالفت کو وطن پروری، امن پسندی اور حکومت دشمنی پر محمول سمجھے اور ہندوؤں کو ملک کا سب سے بڑا ہمدرد قرار دیدے؟

نتائج

ان تمام دستاویزوں پر جو اپنی اپنی جگہ مستند ہیں، غور کیجیے۔ اور بار بار غور کیجیے کہ فوجی بل کی مخالفت سے ہندوؤں کا منشا کیا تھا؟ کانگرسی گروپ نے یک زبان ہو کر کیوں اسکے خلاف طوفان کھڑا کیا اور جگہ جگہ کیوں

فوجی بھرتی کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ اب ذرا نتائج پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ پہلے تو

(۱) مخالفت میں یہ دلیل پیش کی کہ بل مدنی حقوق اور آزادیٔ تقریر و تحریر پر ایک کاری ضرب ہے جسے ہندوستان کا قومی شعور برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ خود کانگریسی صوبوں میں آزادیٔ رائے کی مٹی پلید کیجا رہی ہے اور آزادیٔ رائے اور حریت تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد کیجا رہی ہیں۔

(۲) پھر مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے اور مسلم لیگ کو بدنام کرنے کے لئے اپیل کی گئی کہ ہندوستانی فوج کو فلسطین کے عربوں کے خلاف استعمال کیا جائیگا۔ اور سرحدی قبائل پر اس کے ذریعہ بمباری کیجائیگی گویا کانگریسی ہندو اسلامی سیاست اور مسلمانوں کے بڑے ہی ہمدرد ہیں اور وہ ہندوستانی فوج کو ان مقاصد کے لئے استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ مگر واقعات نے ثابت کر دیا کہ

(۱) فوجی بل کی مخالفت اس لئے کی گئی کہ حکومت کی پالیسی فوج کو ہندو بنانیکے خلاف ہے۔

(۲) مرکزی اسمبلی میں اور کونسل آف اسٹیٹ میں حکومت پر زور ڈالا گیا کہ وہ اپنی موجودہ پالیسی کو ترک کر کے تمام صوبوں کو فوجی اور جنگی حقوق عطا کرے اور صوبہ مدراس۔ یوپی۔ بنگال اور بمبئی سے بھی فوج میں سپاہی بھرتی کرے۔

(۳) مرکزی اسمبلی میں ہر کانگریسی ممبر نے حکومت کے خلاف یہ فرد جرم عائد کی کہ وہ صرف پنجاب سے اور پنجاب میں صرف ایک فرقہ (یعنی مسلم) کے لوگوں کو کیوں فوج میں بھرتی کرتی ہے اس کو چاہئیے کہ جنگی اور غیر جنگی طبقات کا امتیاز قائم نہ کرے اور ہر صوبہ کی فوجی قابلیت سے فائدہ اٹھائے۔

(۴) اسمبلی میں حکومت پر زور ڈالا گیا کہ وہ جنگ کے موقع پر ہندوستان کی حفاظت کے لئے صوبوں کو بھی فوجی امداد کی اجازت دے یعنی کانگریسی صوبے خود فوجی بھرتی کا کام حسب منشا شروع کر دیں اور حکومت ان کی فوجوں سے ہندوستان کی حفاظت کا کام لے۔

(۵) اسمبلی میں کہا گیا کہ سوال فوجی بھرتی کا نہیں ہے بلکہ اس بات کا ہے کہ حکومت ہندوستان کی اکثریت سے اس معاملہ میں مشورہ کیوں نہیں کرتی؟ اگر حکومت ہندو لیڈروں سے کانگریس اور مہاتما گاندھی سے درخواست کرے کہ وہ آجکل بڑی مصیبت میں مبتلا ہے اسلئے فوج کے لئے آدمی مہیا کئے جائیں تو کانگریس اور کانگریسی ہندو فوجی بھرتی کی مخالفت نہیں کرینگے اور ہندوستان برطانیہ کا معتمد علیہ حلیف بنجائیگا

(۶) ڈاکٹر مونجے کا فوجی کالج ہندو نوجوانوں میں فوجی اسپرٹ پیدا کر رہا ہے۔ صدر ہندو مہاسبھا ہندو فوج قائم کرنے کا وعظ ہندوستان بھر میں کرتے پھرتے ہیں۔ گویا ایک طرف خود فوجی مہم کے لئے تیاری اور دوسری طرف فوجی بل کی مخالفت جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہندو ہندوستانی فوج پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(۷) صوبہ یو۔پی۔سی۔پی۔مدراس۔بہار وغیرہ کی حکومتوں کی اسکیم کہ صوبوں میں فوجی کالج کھولے جائیں طلبا کی فوجی تربیت کیجائے اور ان کو جنگ کے لئے تیار کیا جائے۔ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندو حکومت کی موجودہ پالیسی اور جنگی اور غیر جنگی تقسیم کے خلاف خود فوج مرتب کرنا اور اس سے کام لینا چاہتے ہیں۔

(۸) اسمبلی میں کانگریسی ہندوؤں کے بیانات نہایت واضح ہیں۔ ان کے بعد قوم پرست اور کانگریسی اخباروں کا درجہ ہے جنھوں نے نہایت صفائی سے بتادیا کہ ہندوؤں کا اصل اعتراض یہ ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو زیادہ تعداد میں فوج میں کیوں بھرتی کیا جاتا ہے۔ آخر مدراس بمبئی اور یوپی کے صوبے بھی تو ہیں جہاں کے سورماؤں نے برطانی حکومت کے آغاز میں اپنی جنگی قابلیت کے جوہر دکھائے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ فوج میں مسلمانوں کا تناسب ۰۷ فیصدی ہے؟ حالانکہ مدراس کو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے مگر وہاں کے باشندوں (ہندوؤں) کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا؟ زیادہ صفائی کے ساتھ یہ کہ مسلمانوں کی جگہ سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کو کیوں نہیں دیجاتی اور صرف مسلمانوں پر فوجی نوازشات کر کے حکومت اپنے لئے اور ہندوستان کے لئے کیوں مصیبت مول لے رہی ہے؟

مسلم لیگ اور فوجی بل

ہم نے مسلم لیگ کی نسبت ابھی تک اپنے کسی خیال کا اظہار نہیں کیا کیونکہ یہ بحث ہمارے اصلی موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ کانگریسی ہندو اسمبلی میں فوجی بل کی مخالفت کر کے ہندوستان پر اور خصوصاً مسلمانوں پر جو "مفت کرم داشتن" کا احسان جتا رہے تھے وہ سرتاسر خودغرضی، مسلم دشمنی اور فرقہ پرستی پر مبنی تھا اور اصل منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام صوبوں سے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کرنے کا اصول تسلیم کر لیا جائے اور سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی اکثریت سے ہندوستان میں ایک ایسی فوج کی تشکیل دیجائے جس میں مہاتما گاندھی اور کانگریس کا پورا پورا ہاتھ ہو۔

رہا مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کا رویہ اور اس کی جانب سے فوجی بل کی حمایت سو اسکے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ کہنا نہیں چاہتے اور درحقیقت کانگریس اور ہندوؤں کی نسبت بھی ہم نے ابھی تک اپنی طرف سے کچھ

نہیں کہاہے بلکہ دوسروں کے منہ سے اگلوایاہے اسی طرح اس امر کا فیصلہ بھی ہم دوسروں پر ہی چھوڑتے ہیں کہ مسٹر جناح نے فوجی بل کی کہاں تک حمایت کی ہے، اور نتیجہ کے اعتبار سے اس حمایت کا مرتبہ کیاہے کانگرس کے ایک ذمہ دار رکن مسٹر ایم کے سنتانم اسکے متعلق اپنا فیصلہ اس طرح صادر کرتے ہیں:۔

"حکومت ہند کو فوجی بل کی حمایت بہت ہی گراں پڑی ہے۔ اسنے ان ترمیموں کو منظور کیا ہے جنہوں نے بل کی روح سلب کرلی ہے۔ اس کا نفاذ صوبائی حکومتوں کی منظوری کے بغیر نہیں ہوسکے گا اسی طرح جس کسی شخص پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا جائے گا اس کی منظوری صوبہ کی حکومت سے حاصل کرنی ہوگی۔ علی ہذا سزا کی میعاد میں بھی تخفیف کرکے صرف ایک سال مقرر کردیگئی"........

"اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے بل کی صحیح طور پر حمایت نہیں کی بلکہ اس نے ایک ایسا مشکوک رویہ اختیار کیا جبکا منشا مسٹر جناح کی قیادت کا بچاؤ تہا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی ان کو مسلمانان ہند کا نمائندہ تسلیم کرنیسے انکار کرچکی تہی لیگ پارٹی اسکے اقتدار کو قایم رکھنا چاہتی تھی"۔

"اس رویہ سے لیگ کو چند روز کے لیے خوشی حاصل ہوجائیگی کہ اسنے اسمبلی کے اندر کانگرس پارٹی کو شکست دیدی اور حکومت کو باور کرادیا کہ اگرچہ وہ اقلیت میں ہے مگر اس نے اسمبلی میں اپنا توازن قایم کرلیاہے"۔ (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ء)

یہ شہادت کسی مسلمان کی نہیں کسی مسلم لیگی کی نہیں۔ کسی "ٹوڈی اور رجعت پسند" کی نہیں بلکہ کانگرس کے ایک ذمہ دار رکن کی ہے کہ مسلم لیگ نے بل کی حمایت تو کی مگر ساتھ ہی اس کی روح بھی نکال لی اور دراصل بل کی حمایت کرنا اسکا مقصد ہی نہ تہا بلکہ کانگرس کی حماقتوں کا ردعمل تہا جو اس سے ظہور میں آیا! رہا یہ معاملہ کہ فوج کو فلسطین، وزیرستان اور دیگر اسلامی ممالک کے خلاف استعمال کیا جائے گا تو اسکا جواب صرف اتنا ہی ہے کہ ہندو جو چاہیں توجیہات قایم کریں مگر مسلمانوں کے سامنے تو قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے

مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا

جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کریگا اسکا ٹھکانا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیگا!

نیز یہ حدیث شریف :-

سباب المسلم فسوق وقتالہٗ کفر

مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کا قتل کفر ہے۔

مگر ہاں! یہ تو ارشاد ہو کہ کانگرس نے ہمیشہ "فرقہ پرستوں" کو یہ الزام دیا ہے کہ وہ مُلازمتوں کے پیچھے پیچھے دَوڑے پھرتے ہیں اور آبادی کے تناسب سے حقوق مانگ کر قوم پرورانہ معیار سے بہت نیچے گر گئے ہیں۔ ذرہ دیکھے کہ اسمبلی کے مباحث میں کانگرسی لیڈروں نے کیا اسی کا رونا نہیں رویا کہ فوج میں آبادی کے تناسب سے تمام فرقوں کو ملازمتیں ملنی چاہئیں اور صرف ایک فرقہ کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی پالیسی حکومت کو ترک کردینی چاہیے؟ فیھا ایات لقوم یعقلون ۔

حقایق و عبر

رازی

(۱) قضیۂ فلسطین

جولائی ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتہ میں تقسیم فلسطین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے مسلمانان لاہور کا ایک عام جلسہ ہوا۔ جس میں حضرت علامہؒ بوجہ ناسازی طبیعت خود تو تشریف نہ لا سکے لیکن انہوں نے ایک بیان ارسال فرمایا جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی ہے اسے میں ایسی ہی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی اور صاحب درد جو مشرق قریب کی سیاست سے واقف ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگریزوں کو اب بھی بیدار کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انگلستان کے نام پر جو وعدے عربوں سے کر رکھے ہیں انہیں ایفا کریں۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ہنوز تقسیم فلسطین کے مسئلہ کا آخری فیصلہ نہیں کیا۔ اس لئے ابھی مسلمانان عالم کے لئے موقعہ ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس امر کا اعلان کر دیں کہ جس مسئلہ کا حل ارباب مدبرین تلاش کر رہے ہیں وہ صرف فلسطین کا مسئلہ نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی کا مسئلہ ہے۔

مسئلہ زیر نظر کو اگر تاریخی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی رو سے فلسطین کا مسئلہ حضرت عمرؓ کے داخلہ بیت المقدس سے بہت عرصہ پیشتر سے ہی یہودی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر ہاکنگ نے بتایا ہے فلسطین سے یہودیوں کی ہجرت بالکل رضاکارانہ تھی اور ان کے مذہبی صحائف کا بیشتر حصہ اس ارض مقدس سے باہر لکھا گیا تھا۔ نہ ہی یہ مسئلہ عیسائیوں کا مسئلہ ہے جدید تاریخی تحقیقات کی رو سے تو راہب پطرس کے وجود تک میں بھی شبہ ہونے لگ گیا ہے۔ اگر اسے فرض بھی کر لیا جائے کہ صلیبی لڑائیاں اس امر کی کوشش ناتمام تھی کہ فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنا لیا جائے تو صلاح الدینؒ

کے فتوحات نے اس مقصد کو پاش پاش کر کے رکھدیا تھا۔ ان حالات کے ماتحت میں تو فلسطین کے مسئلہ کو خالص اسلامی مسئلہ قرار دیتا ہوں۔

مسلمانان مشرق قریب کے متعلق برطانوی ملوکیت کے دل میں کیا کیا منصوبے ہیں۔ ان کی نقاب کشائی جس طرح رائل کمیشن کی رپورٹ نے کی ہے۔ اس سے پیشتر کم ہی ایسا ہوا ہوگا۔ فلسطین کو یہودیوں کا مسکن بنانے کا تخیل تو محض ایک آڑ تھی۔ درحقیقت برطانوی ملوکیت مسلمانوں کی ارض مقدس میں خود اپنا ڈیرا جمانا چاہتی تھی۔ لیکن جیسا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے کہا ہے۔ یہ ایک نہایت خطرناک تجربہ ہے جو انگریزوں کی بحیرہ روم کی مشکلات کا حل نہیں بن سکتا۔ مشکلات کا حل تو ایک طرف۔ یہ مسئلہ تو برطانوی ملوکیت کی آیندہ مشکلات کا پیش خیمہ ہے۔ ارض مقدس اور مسجد عمرؓ کی فروخت۔ جو عربوں کو مارشل لا کے ڈنڈوں کے زور سے اور انکی نیاضی کے جذبات کو اپیل کر کے حاصل کی گئی ہے۔ کسی عمدہ تدبر کا ثبوت نہیں دیتی۔ بلکہ یہ اس امر کی آئینہ دار ہے کہ انگریز کی سیاسی بصیرت کا کس طرح سے دیوالہ پٹ گیا ہے ایک قیمتی زرخیز زمین کا یہودیوں کے حوالہ کر دینا اور بے برگ و گیا صحرا کا ایک قطعہ۔ معہ چند دراہم کا سدعربوں کو دیدینا کسی صورت میں بھی سیاسی بصیرت نہیں کہلا سکتی۔ یہ ایک نہایت گرا ہوا سودا ہے جو اس بلند پایہ قوم کے ہرگز شایانِ شان نہیں اور ان کی عزت کو بٹہ لگا رہا ہے جس قوم کے نام پر عربوں کو آزادی کے وعدے دیئے گئے تھے۔

میرے لئے مشکل ہے کہ میں اس مختصر سے بیان میں فلسطین رپورٹ کی جزئیات پر بحث کر سکوں۔ لیکن دور حاضرہ کی تاریخ مسلمانان ایشیا کے لئے عبرت و بصیرت کے ایسے واقعات پیش کرتی ہے جن سے انہیں سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ تجربہ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کی اقوام کا سیاسی وجود اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ عرب اور ترک فوراً متحد ہو جائیں۔ ترکوں کو باقی مسلمانان عالم سے علیحدہ رکھنے کی پالیسی اب تک کارفرما ہے۔ چنانچہ ہم آئے دن سنتے رہتے ہیں کہ ترکوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ ھٰذا کذب عظیم۔ یہ ایک عظیم الشان افترا ہے۔ اس قسم کے شر انگیز پروپگنڈا کا شکار وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں فقہ اسلامی کے تصور کی صحیح تاریخ کا علم نہیں۔ وہ عرب جن کا مذہبی شعور اسلام جیسے مذہب کا اولین گہوارہ بنا

کہ جس مذہب نے نمایاں کامیابی کے ساتھ ایشیا کی مختلف اقوام کو باہمدگر پیوست کر دیا۔ وہ ان عواقب و نتائج کو کبھی بھول نہیں سکتے جو آزمائش کی گھڑی میں۔ ترکوں کا ساتھ چھوڑ دینے کی وجہ سے انکے سامنے آئے

پھر عربوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انہیں ان عرب سلاطین کے مشوروں پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہیئے جو خود اس قابل نہیں ہیں کہ ضمیر کی آزادی کے ساتھ مسئلہ فلسطین کے متعلق ایک آزاد رائے قائم کر سکیں فلسطین کے عربوں کو جو کچھ بھی فیصلہ کرنا ہو۔ معاملات کو سوچ سمجھ کر خود اپنی بصیرت کے ماتحت فیصلہ کرنا چاہیئے۔

پھر موجودہ وقت ایشیا کے عجمی اسلامی ممالک کے سیاسی مدبرین کے لئے بھی بڑی آزمائش کا وقت ہے الغائے خلافت کے بعد۔ یہ مسئلہ سب سے پہلا سیاسی اور مذہبی بین الملی مسئلہ ہے جس کا سامنا کرنے کے لئے تاریخی شواہد انہیں مجبور کر رہے ہیں۔ مسئلہ فلسطین شاید انہیں مجبور کر دے کہ وہ سوچیں کہ برطانوی۔ فرانسیسی ادارہ۔ جس کا غلط نام لیگ اوف نیشنز رکھ دیا گیا ہے۔ اس کا ممبر رہنے میں ان کی پوزیشن کیا رہتی ہے۔ اور شاید یہی مسئلہ ان کے لیے ایک "مشرقی اقوام کی لیگ" قائم کرنے کی عملی تجاویز پر غور کرنے کا محرک بن جائے"

یہ جولائی ۱۹۳۷ء میں کہا گیا تھا۔ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ عالم اسلامی کے اس مفکر اعظم کو اللہ تعالےٰ نے کس قدر دوررس نگۂ بصیرت عطا فرمائی تھی۔ کہ جو حوادث ہنوز پردۂ افلاک میں چھپے ہوتے ان کا عکس اس کے آئینۂ ادراک میں بہت پہلے آجاتا۔ سب سے اہم چیز جس کی طرف اس بیان میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ عربوں نے عین وقت پر جو ترکوں کا ساتھ چھوڑا۔ تو انہیں اس کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا۔ آیئے ہم یہ بھی دیکھیں کہ وہ کونسی سازش تھی جس نے عربوں سے ترکوں کا ساتھ یوں چھڑوا دیا۔ وہ کونسی حکمت عملی تھی جسکی وجہ سے عرب اپنوں سے کٹ کر بیگانوں کے ہو گئے۔ سینٹ فلبی نے اکتوبر ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

"سنہ ۱۹۱۳ء میں شریف حسین کا بڑا لڑکا امیر عبداللہ اپنے چھوٹے بھائی فیصل کے ساتھ قسطنطنیہ جاتے ہوئے مصر سے گذرا۔ لارڈ کچنر جو اس وقت مصر میں برطانوی ایجنٹ تھا۔ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور ازراہ تواضع امیر عبداللہ کو الوداع کہنے کے لئے ملا۔ اور مسٹر اسٹورس کی معیت میں (جواب سر ہیں) سلطنت حجاز کے اس نمایندہ کا اس باب میں شکریہ ادا کیا کہ اُس کے والد شریف حسین۔ برطانوی

ہندوستان سے مکہ جانے والے حاجیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ گفتگو نہیں ہوئی۔ بایں ہمہ اس ملاقات سے آئندہ گفت و شنید کا دروازہ ضرور کھل گیا۔ امیر عبداللہ نے ترکی ہائی کمشنر مقیم قاہرہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ کیونکہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اور یقیناً اس قابل کہ اسے بنظر اشتباہ دیکھا جاتا۔ اس واقعہ کو ایک سال گذر گیا ۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں امیر عبداللہ پھر قاہرہ سے گذرا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب جنگ کے بادل افق یورپ پر منڈلا رہے تھے۔ لارڈ کچنر پھر امیر عبداللہ سے ملا اور اس دفعہ نہایت احتیاط سے سیاسیات پر بھی بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو امیر عبداللہ قسطنطنیہ میں تھا۔ ۲۲۔ اگست ۱۹۱۴ء کو وہ پھر قاہرہ میں واپس آیا۔ لارڈ کچنر اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ لیکن مسٹر سٹورس نے امیر عبداللہ کو۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے۔ اس کے والد کے نام ایک خط دیا اور دوستانہ گفتگو کے ضمن میں یہ بھی جتا دیا کہ حکومت برطانیہ اس بات کی مخالفت نہیں کرے گی کہ عربوں کو پھر سے خلافت مل جائے۔ اس دانہ کو پھینکے ہوئے ایک ماہ گذر گیا تو مسٹر سٹورس نے ایک معتبر قاصد کے ہاتھوں حسب ذیل مضمون کا خط امیر عبداللہ کے پاس بھیجا۔

"لارڈ کچنر۔ شعبۂ جنگ کے سکرٹری نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے دریافت کروں کہ کیا آپ عربوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں ابھی تک اسی خیال پر قائم ہیں۔ ہر چند لارڈ موصوف نے پہلے آپ کو جواب دے دیا تھا کہ وہ اس بارے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن اب چونکہ ترکوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ضرور لڑائی میں ہمارے دشمنوں کا ساتھ دینگے۔ اس لئے اب یہ بات برطانوی حکومت کے اختیار میں ہے کہ وہ آپ کو ہر قسم کی امداد دیدے"

اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا تو دو ہفتہ بعد مسٹر سٹورس نے ایک اور خط میں لکھا کہ

"چونکہ ترکوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ لڑائی میں جرمن کا ساتھ دینگے۔ لہذا یہ موقعہ نہایت موزوں ہے کہ عرب اپنے مطالبات حاصل کر لیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے پہلے عریضہ کا جواب نہیں دیا۔ اب مجھے امید ہے کہ آپ میرے سوال کا جواب جلد مرحمت فرمائیں گے۔"

اس خط کا نہایت مختصر اور مبہم سا جواب موصول ہوا۔ جس کے بعد مسٹر سٹورس نے تیسرا خط لکھا کہ
اب چونکہ ترک۔ جرمن کے ساتھ میدان جنگ میں اتر آئے ہیں۔ اس لئے ہم شریف مکہ کی
ہر طرح سے مدد کرنے پر تیار ہیں۔"

امیر عبداللہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ "یہ بات میرے والد کے اختیار میں نہیں ہے۔ تاوقتیکہ وہ عربوں کے ساتھ مشورہ نہ کرلیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے وعدہ کیا کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں حتمی تجاویز لکھ کر بھیجیگا۔

امور بالا سے واضح ہوگیا ہوگا کہ عربوں کے ساتھ اس قسم کے عہد و پیمان کی ابتدا خود انگریزوں کی طرف سے کی گئی تھی۔ ترک عربوں کو بہت کچھ دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن انگریزوں نے جو گفت وشنید ۱۶-۱۹۱۵ میں عربوں کے ساتھ کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز اُن کو ہزار کچھ دینے کا وعدہ کئے جاتے تھے۔ شریف حسین نے سب سے پہلے یہ شرط پیش کی تھی کہ عدن کو چھوڑ کر باقی تمام عربی ممالک کی کامل آزادی کو تسلیم کرلیا جائے۔ سر ہنری مک ماہن نے اپنے مشہور و معروف خط (مورخہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء) میں اس شرط کو خفیف سی ترمیمات کے ساتھ منظور کرلیا تھا۔ شریف حسین خوش تھا کہ انگریزوں نے ترکوں سے کہیں زیادہ وعدے دے دیئے ہیں۔ اور کسی کو اس بات کا گمان تک بھی نہ تھا کہ فتح کے بعد یہ وعدے پورے نہیں ہونگے۔ شریف حسین خلیفۃ المسلمین کے باغی کی حیثیت سے ترکوں کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں انگریزوں۔ فرانسیسیوں اور روسیوں نے۔ شریف حسین کے مشورہ کے بغیر ایک معاہدہ کرلیا جس کی رو سے ان تمام مواعید میں جو مک ماہن نے اپنے خطوط میں عربوں سے کر رکھے تھے۔ نمایاں تبدیلیاں کر ڈالیں۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریزی حکومت یہودی لیڈروں کے ساتھ ساز باز کر رہی تھی۔ کہ انہیں فلسطین واپس دلا دیا جائے گا۔ قریب اٹھارہ ماہ تک عرب نہایت جاں فشانی سے ترکوں کے خلاف انگریزوں کی طرف سے لڑے" اس عرصہ میں انگریزوں نے ان کے کان میں بھنک تک نہ پڑنے دی کہ اتحادیوں نے ان تمام وعدوں کو توڑ مروڑ کر فسخ کر ڈالا ہے۔ جو ان سے اس سے قبل کئے گئے تھے۔ عربوں کو اس بات کا علم نومبر ۱۹۱۷ء میں ہوا جب روس کی بالشویک حکومت نے ۱۹۱۶ء کے مذکورہ صدر خفیہ معاہدہ کو شائع کردیا۔ چونکہ راز کھل چکا تھا اس لئے انگریزوں نے بلفور کا اعلان بھی شائع کردیا۔ اُس کے ایک

ماہ بعد بیت المقدس بھی فتح ہو گیا جیسا کہ رائل کمیشن نے خود تسلیم کیا ہے۔ اس فتح میں عربوں کی امداد شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ شریف حسین کو انگریزوں کی خفیہ چالوں کا پتہ تو چل گیا لیکن اُس کے لئے اب حالت یہ تھی کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ فتح دمشق کے بعد لڑائی قریب قریب ختم ہو گئی۔ اور اب "مالِ غنیمت" کے حصے بخرے ہونے شروع ہوئے۔ فرانس اور برطانیہ دونوں کی نگاہ اس عرب پر تھی۔ جس کی امداد ان کی فتح کا باعث بنی تھی۔ اس غرض کے لئے اب گذشتہ عہد و میثاق کے الفاظ کو نئے نئے معانی کا جامہ پہنایا جانے لگا۔ آزادی کی جگہ انہیں انتداب (MANDATE) کا پروانہ دیا گیا۔ اور عرب کا ایک حصہ یہودیوں کا مسکن بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا۔"

دورِ تہذیب کی اس داستانِ عدل و انصاف میں ایک ورق کی ابھی اور گنجائش تھی۔ وہ کس طرح سے لکھا گیا۔ یہ لارڈ ہیلی فیکس (یعنی سابق وائسرائے ہند لارڈ ارون) کی زبانی سنیئے۔ انہوں نے ۲۹ جنوری ۱۹۳۶ء کو عرب کے لارنس کے مجسمہ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے فرمایا۔

"لارنس۔ بیسویں صدی کے صلیبی جنگ کے مجاہد کی حیثیت سے۔ ان اقوام و مقاصد کی خاطر جو اس کے نام کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہیں گے۔ آکسفورڈ سے مشرق کی جانب روانہ ہوا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ لارنس کی زندگی کا یہ شعبہ اُس وقت شروع ہوا جب کہ اس کا ملک ایک سخت آزمائش کے مرحلہ سے گذر رہا تھا۔ جو اسکے لئے اس قدر شاندار خدمات سرانجام دینے کا موجب بنا۔ وہ ایک مدت سے فلسطین اور عرب کے باشندوں کو آزادی دلانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جنگِ عظیم کے ردِّ عمل کے ذریعے سے اس کے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گئے۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگوں نے اس کام میں حصہ لیا۔ لیکن۔ جیسا کہ اُس کے رفقائے کار کو خود تسلیم ہے۔ اس بغاوت کی آتشیں رُوح لارنس ہی تھا جس نے ترکوں کے استبداد اور بد نظمی کی زنجیروں کو توڑ کر صحرا نشینوں کو پھر سے آزاد کرا دیا۔"

نوعِ انسانی پر بالعموم۔ اور فلسطینی عربوں پر بالخصوص اس "مجاہدِ اعظم" کے کس قدر عدیم النظیر احسانات ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ

ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر۔
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار (اقبالؔ)

اپنوں سے کٹ کر غیروں سے مل جانے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ فلسطین کے عربوں نے تو پھر اپنی فقید المثال شجاعت۔ بسالت۔ مجاہدت۔ عزمِ راسخ۔ استقلال۔ تمنائے موت۔ ذوقِ شہادت اجتماعیت۔ مرکزیت۔ سمع و طاعت سے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اور جیسا کہ حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔ بعید نہیں کہ ان کی قربانیاں دول عربیہ میں بالخصوص اور تمام عالمِ اسلامی میں بالعموم اتحاد و یک جہتی کی وُہ روح پھونک دیں کہ جس سے تمام دنیائے اسلام میں ایک حیاتِ تازہ پیدا ہو جائے۔ لیکن۔ اے کاش۔ اس سے کہیں ہندوستان کا فریب خوردہ مسلمان بھی کچھ سبق حاصل کرے۔ اور سمجھ لے کہ خواہ انگریز ہو خواہ ہندو۔ مسلمان کا کوئی ولی دوست نہیں ہوسکتا۔ کہ یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جو سینوں کے راز سے واقف ہے۔ جب اس نے فرمادیا کہ لایالونکم خبالا۔ یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے تو اس میں تمام غیر مسلم شامل ہیں۔ اور مولانا حسین احمد صاحب یہ فرما کر کہ " جواہر لال ہندو ہے۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے[۱]"
اپنی بات کی پچ تو کر سکتے ہیں۔ لیکن قرآنی حقائق کو نہیں جھٹلا سکتے۔ یاد رکھئے جہاں مسلمانوں کو اپنوں سے الگ کر کے غیروں کے ساتھ ملانے کا منصوبہ دل میں ہوگا۔ وہیں کوئی نہ کوئی لارنس

---

[۱] زمزم مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۳۸ء

موجود ہوگا۔ کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی (اقبال)

(۲) مخلوط انتخاب کی برکتیں

آپ کو یاد ہوگا کہ مہاتما گاندھی کو جب خدشہ پیدا ہوا کہ اچھوت اس سلوک کی بناء پر جو ہندو جاتی قرہا قرن سے ان کے ساتھ روا رکھتی چلی آرہی ہے۔ کہیں "سیاسی اچھوت" ہی نہ بن جائیں اور ہندوؤں سے الگ ہو کر اپنے جداگانہ قومی تشخص کا دعویٰ نہ کردیں جس سے ہندوؤں کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے تو ان کا قلب حزیں اس مظلوم فرقہ کی زبوں حالی سے تڑپ اٹھا اور انہوں نے پونا میں مشہور پران تیاگ برت رکھا جس میں یہ کہا کہ اگر کمیونل اوارڈ کے سلسلہ میں اچھوتوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تو میں جان دیدوں گا۔ کچھ حضرات پنچ بن کر آگئے اور انہوں نے اچھوتوں سے کہا کہ دیکھو اتنی سی بات پر ایسی عظیم الشان ہستی کی جان خطرے میں ڈال دینا کہاں کی انسانیت ہے۔ تم اپنے مطالبہ کو چھوڑ دو۔ مہاتما جی وعدہ کرتے ہیں۔ اور تمام ہندو جاتی اس وعدہ پر گواہ ہے کہ تمہیں اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر حقوق دیئے جائیں گے۔ اور کسی معاملہ میں تفریق نہیں کی جائے گی۔ فلسطین کے عربوں کی طرح یہ بیچارے بھی ان وعدوں پر اعتبار کر بیٹھے اور مخلوط انتخاب پر رضامند ہوگئے۔ اس کے بعد آج تک ان وعدوں کو کس طرح سے نباہا گیا۔ یہ داستان طول طویل ہے۔ لیکن اس کا اندازہ ایک حال ہی کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اچھوتوں کے لیڈر، مسٹر ایم۔ سی۔ راجہ۔ نے مدراس اسمبلی میں ایک بل پیش کرنا چاہا جس سے مقصد یہ تھا کہ مدراس کے مندروں میں اچھوتوں کے داخلہ پر کوئی پابندی نہ عائد کی جائے۔ مدراس کے وزیر اعظم۔ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے اُس بل کا

ص۲۔ لارنس کے ایک بھائی "پیک پاشا" (مسٹر ایف۔ جی۔ پیک) آج کل بھی خیر سے فلسطین میں عربوں کے بہی خواہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اگلے دنوں ٹائمز آف انڈیا (معصوم) میں ان کا فوٹو شائع ہوا تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو خدا معلوم اُس میں کتنے لارنس اور کتنے پیک پاشا نظر آئیں گے۔

مسودہ تیار کیا مہاتماجی نے اس کو ہٹا دیا۔ بل اسمبلی میں پیش ہوا۔ لیکن مسٹر ایم۔ سی۔ راجہ کیا دیکھتے ہیں کہ خود جناب وزیر اعظم اس کی مخالفت میں کھڑے ہوگئے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ انکی اپنی جماعت کے اچھوت ممبران کی مخالفت میں کانگریسی اراکین کے ساتھ ووٹ دے رہے ہیں۔ چنانچہ بل مسترد ہوگیا۔ اس واقعہ پر مسٹر راجہ اور مہاتما گاندھی کے درمیان ایک مختصر سی خط و کتابت ہوئی ہے جو ارباب بصیرت کے لئے فکر و تدبر کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ مسٹر راجہ نے اپنے خط میں مہاتماجی کو لکھا۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہمارے فرقہ کی اکثریت جداگانہ انتخاب کے حق میں تھی تاکہ وہ اسمبلی میں آزادانہ طور پر اپنے حقوق کی محافظت کر سکے تو آپ نے ان کو ہندوؤں کے دائرے کے اندر رکھنے کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگادی۔ جس پر میں اس فرقہ کو مخلوط انتخاب پر آمادہ کرنے کے لئے ایک بڑی حد تک ذمہ دار بنا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ اس بارے میں کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی کہ ہم اپنی منشاء کے مطابق اپنے نمائندگان کا انتخاب کریں تاکہ وہ اپنے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرسکیں۔ اس داستان کا آپ کو بھی علم ہے اور مجھے بھی۔ لیکن میں نے اسے دہرایا اس لئے ہے کہ میں آپ پر واضح کردوں۔ کہ ہم اس میثاق پر کس طرح سے پابند رہے ہیں اور اس کے برعکس مدراس کی کانگریس پارٹی کس طرح اس سے پیچھے ہٹ گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ہماری جماعت کے نمائندگان کو اونچی ذات کے ہندوؤں کی کورانہ تقلید کرنی پڑ رہی ہے۔ اور وہ معاملات جن کا ہماری جماعت پر سخت مضر اثر پڑتا ہے ان میں بھی وہ بیچارے کس طرح حکومت کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انتخابات کے شروع میں ہی میں نے اس بات کے خلاف احتجاج کیا تھا کہ کانگریس اچھوتوں میں سے اپنے مطلب کے آدمی چنکر نامزد کر رہی ہے۔ "پھر آپنے کہا تھا کہ میں اپنی جماعت کو ان شرائط کے ماتحت انتخاب کے اندر شامل ہونے دوں جو مسٹر ستیہ مورتی نے پیش کی تھیں۔ ان شرائط میں ایک یہ بھی تھی کہ ان معاملات میں

جو اچھوتوں سے متعلق ہوں یہ ضروری نہیں کہ اچھوت کانگریس پارٹی کی ہمنوائی میں ووٹ دیں۔ بلکہ وہ اپنے جداگانہ فیصلہ کے ماتحت ووٹ دیا کرینگے بلیکن مدراس اسمبلی میں مندروں کے داخلہ کے بل پر جو بحث وتمحیص ہوئی ہے اس نے اس مکروہ حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ اچھوتوں کے نمائندوں نے۔ کانگریس پارٹی کے ربط وضبط کے ماتحت۔ کسطرح اس بل کی مخالفت میں ووٹ دیئے ہیں جو خود ان کے اپنے مفاد میں تھا۔ کیا کوئی بات اس سے بھی زیادہ غیر فطری اور ذلت آفریں ہوسکتی ہے؟ اس سے تو صاف عیاں ہے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں نے کسطرح اچھوتوں کے نمائندوں کو اپنی مرضی کے تابع کر رکھا ہے۔ آپکو معلوم ہی کہ یہ بل کیا تھا؟ اسمیں صرف اس بات کی اجازت طلب کیگئی تھی کہ اچھوتوں کو بھی مندروں میں پوجا پاٹ کے لئے جانے دیا جائے۔ کہیئے اس میں کونسی جور وتعدی کی بات تھی؟ یہ وہ بل تھا جسکے ساتھ خود آپکی اشیرباد شامل تھی۔ وہ بل تھا جسکا مسودہ خود وزیر اعظم نے تیار کیا تھا اور اسے خود آنجناب نے منظور کیا تھا . . . . . . جب بل پیش ہوا تو مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے اسکی مخالفت شروع کردی اور کہا کہ اس بل کو واپس لیلو ہم خود اسی مضمون کا ایک بل۔ مدراس کیلئے نہیں بلکہ مالابار کیلئے پیش کر دینگے۔ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ کی تقریر کا اثر یہ ہوا کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کیساتھ اچھوتوں کے نمائندوں نے بھی اس بل کی مخالفت میں ووٹ دیئے۔ اور بل مسترد ہوگیا۔ . . .

ان واقعات نے مجھے تو اس نتیجہ پر پہنچنے کیلئے مجبور کر دیا ہو کہ ہم نے ہندوؤں کے وعدوں پر اعتماد کرکے پونا کے پیثاق کو تسلیم کرنے میں کسی عقلمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ کانگریس کے زیر قیادت مخلوط انتخاب نے ہماری مدد کرنے کے بجائے کانگریس کو اس قابل بنادیا ہے کہ وہ ہماری رہی سہی آزادی کو بھی تباہ کر دے اور خود ہمارے اپنے بھائیوں کے ہاتھوں سے ہمارا گلا کٹوا دے۔ دوران بحث میں مَیں نے مسٹر راجہ گوپال اچاریہ سے سوال کیا کہ کیا آپنے اس بل کی مخالفت کیلئے آپ کی (مہاتما گاندھی کی) منظوری حاصل کرلی ہے؟ مجھسے کہا گیا کہ اس بات کا جواب بعد میں دیا جائیگا۔ لیکن مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے اسکے جواب دینے سے عمداً پہلو تہی کی۔

مجھے امید ہے کہ آپ مدراس کی کانگریسی حکومت کے اس طرزِ عمل پر نہایت سنجیدگی سے غور فرمائیں گے اور مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں گے ......"

یہ خط ۲۵ اگست کو لکھا گیا تھا۔ جب ۱۲ ستمبر تک اس کا کوئی جواب نہ ملا تو مسٹر راجہ نے بذریعہ تار یاد دہانی کرائی جس کے جواب میں ۱۴ ستمبر کو حسب ذیل خط مہاتما جی کی طرف سے موصول ہوا۔

"..... میں چاہتا ہوں کہ آپ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ پر اعتماد رکھیں۔ انہیں اس بارے میں پوری آزادی دینی چاہیئے کہ وہ معاملہ کو جس طرح بہتر سمجھیں سنبھالیں۔ اگر آپ ان پر اعتماد نہیں کریں گے تو یقیناً آپ وہی راہ عمل اختیار کریں گے جو آپ کو بہتر نظر آتی ہے۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ راجہ گوپال سے بڑھکر اچھوتوں کا کوئی اور بہی خواہ نہیں ہے۔ آپ ان کے پاس جائیے۔ ان سے بات کیجئے۔ اور اگر آپ انہیں اپنا ہم نوا نہ بنا سکیں تو اُن سے متفق ہو جائیے۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا۔"

جواب ملاحظہ فرمالیا آپ نے۔ ہے نا وہی بات کہ

بوسہ جو ہم نے مانگا انگوٹھا دکھا دیا

مسٹر راجہ نے ۱۶ ستمبر کو دوسری چٹھی کے دوران میں لکھا۔

"میں تو صرف اتنی درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان وعدوں پر ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیے جو پران تیاگ برت کے زمانہ میں ہم سے کئے گئے تھے۔ اور جن کی آج یوں مٹی پلید ہو رہی ہے۔ وہ برت آپ نے اس لئے رکھا تھا کہ وہ کمیونل آوارڈ جس کی رو سے اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق حاصل تھا۔ بدلوا دیا جائے۔ اور انہیں مخلوط انتخاب پر رضامند کر لیا جائے۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ان سے چھوت پن کی لعنت دور کر دی جائے گی .... لیکن اگر ہمیں مندروں میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تو ہم ہندو کس طرح سے تسلیم کئے جا سکتے ہیں اور اگر ہم ہندو نہیں ہیں تو پھر ہمارا ہندوؤں کے ساتھ مخلوط انتخاب چہ معنی دارد! کیا یہ محض اس لئے نہیں کہ ہندو جاتی ہماری تعداد کو مسلمانوں اور دیگر فرقوں کے خلاف اپنی اکثریت قائم رکھنے کے لئے استعمال

کر رہی ہے . . . . . کیا آپ کا اخلاقی فرض نہیں کہ آپ اچھوتوں کے ساتھ عہد و پیمان کے معاملہ کو محض ایک سیاسی چال قرار نہ دیں بلکہ اس کو اپنے ضمیر کا مسئلہ سمجھیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ اس مسئلہ کے متعلق اپنی "اندرونی روشنی" سے مشورہ کریں گے تو آپ ذرا او صاف صاف بات کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اور اپنے متبعین کی ذہنیت بدلنے میں تھوڑی سی قربانی بھی فرمائیں گے"

مہاتما گاندھی نے ۵ ر اکتوبر کو اس کے جواب میں لکھا۔

"آپ کے اس خط سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ میں راجہ گوپال اچاریہ جی کی پاس داری نہیں کر رہا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ اچھوتوں کے معاملہ میں خود میرے جیسے مستعد ہیں۔ اس لئے مجھے تو ان پر اعتماد ہے . . . . . یہ مسئلہ در اصل سناتن دھرمی ہندوؤں کی قلب ماہیت چاہتا ہے یہ آہستہ آہستہ ہی ہوگا . . . ."

اس کے بعد مسٹر راجہ نے ۷ ر اکتوبر کو اپنے خط میں لکھا۔

" . . . . آپ خود تو سناتنی ہندوؤں کے دل کو نرم کر نہیں سکے اور مجھ سے کہتے ہیں کہ راجہ گوپال اچاریہ جی پر اعتماد کرو . . . . . اگر اچھوتوں کو انہی کی کوششوں کے نتائج کا انتظار کرنا ہے تو انہیں قیامت تک منتظر رہنا چاہیئے۔ اس انداز سے اچھوتوں کی ہمدردی کرنا ایسا ہی ہے جیسے برطانیہ اور فرانس نے زیکوسلاویکیا کی قربانی سے یورپ میں امن قائم کر لیا ہے"

خط و کتابت اتنی ہی شائع ہوئی ہے۔ یہ ہندوؤں اور اچھوتوں کا اپنا معاملہ ہے۔ کہدیا جائے گا کہ تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ تم اس پر رائے زنی کرو۔ اس لئے ہم خاموش رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں مسلم قومیت پرست۔ متحدہ قومیت اور مخلوط انتخاب کے علمبرداروں سے اتنا دریافت کر لینے کا تو حق ہے کہ وہ ذرا بتائیں تو سہی کہ ہندو جاتی کا جب اپنے سیوتوں سے یہ سلوک ہے تو مسلمان ملیکش ان سے کیا توقع کر سکتے ہیں۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری　—　بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردن

حیرت ہے کہ جو بات "اچھوتوں" کے لیڈر کی سمجھ میں آگئی وہ امت وسطیٰ اور خیر الملل کے قائدین کرام کے ذہن میں کیوں نہیں آسکتی!

(۳) سوراجیہ کے معنی

مہاتما گاندھی سے ہزار مرتبہ لوگوں نے پوچھا کہ حضور! کبھی اتنا تو بتا دیا ہوتا کہ سوراجیہ کے معنی کیا ہیں لیکن انہوں نے آج تک بتا کے ہی نہیں دیا۔ بارے مسٹر ستی۔ ستے۔ وار تے۔ پارلیمنٹری سکرٹری۔ وزیر تعلیم مدراس نے اس عقدہ کو حل کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ اصطلاح دراصل مہاراشٹر کی انتظامی تقسیم کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ جو دو وسیع حلقوں میں منقسم تھا۔ سوراجیہ اور مُغل راجیہ۔ سوراجیہ کے معنی وہ خطہ تھا جو براہِ راست مرہٹوں کے ماتحت تھا۔ اور مغل راجیہ سے مراد وُہ خطہ تھا جس پر یا تو مغلوں کا براہِ راست تسلّط تھا یا وہ مغلوں کا باجگزار تھا" (مدراس میں۔ ۲۹ر ستمبر ۱۹۳۸ء)

معلوم ہوگئے آپ کو سوراجیہ کے معنی۔ یعنی ایسا نظام سلطنت جو براہِ راست ہندوؤں کے ماتحت ہو۔ بندے ماترم کا نعرہ اسوقت کی ایجاد ہے۔ جب بنگال کے ہندو مسلمان حکمرانوں کی سلطنت مٹانے کے درپے تھے (خواہ ایک ناول میں ہی سہی)۔ یہ آج متحدہ قومیت کا قومی ترانہ ہے۔ اور سوراجیہ اسوقت کی ایجاد ہے جب مرہٹے مغل بادشاہوں کے تسلّط سے آزاد ہو کر خود مختار ہونے کی سازشیں کر رہے تھے۔ یہ متحدہ قومیت کا قومی نصب العین ہے۔" ان دونوں کے اجتماع کا نام ہے ——— مکمل آزادی ———

(۴) زمین۔ آسمان کا فرق

3 3 4 7 5

نوجوانوں کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر ٹیگور نے نصیحت کی تھی کہ ۔ ۱۴

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس زمین سے محبت کرو۔ اور ہر اس چیز سے جو اسپر ہے" (اسٹیٹسمین۔ ۱۱/۴ ۳۸)

لیکن ایک مردِ مؤمن کا نوجوانوں کے نام یہ پیغام ہے کہ

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں۔ نظر آتی ہے اسکو اپنی منزل آسمانوں میں (اقبالؔ)

اسے کہتے ہیں زمین ،، آسمان کا فرق۔ جس کے پاس قرآن نہیں۔ اس میں بلند نگہی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات قدسی صفات پر سرزمین ہند جس قدر بھی ناز کرے کم ہے آپ پیغمبر نہ تھے لیکن آپکا انداز دعوت و اصلاح پیغمبرانہ تھا، آپکے دورِ زندگی میں ہندوستان کے مذہبی و سیاسی حالات قریب قریب بالکل ویسے ہی تھے جن میں آج اسلامیانِ ہند گھرے ہوئے ہیں ضرورت ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے جس ربانی ہدایت اور انشراح صدر سے کام لے کر اُن نامساعد حالات کا مقابلہ کیا تہا آج بھی اُس روشنی، راہ کو فراہم کر کے ملتِ اسلامیہ کا تحفظ اور شریعتِ الٰہیہ کا احیاء کیا جائے"

انھیں حالات کے پیشِ نظر ادارہ الفرقان نے "مجدد نمبر" شائع کیا جانا طے کر لیا جو تقریباً ڈہائی سو صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ آخر رمضان المبارک میں شائع ہو گیا ادارہ نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کی تیاری کی ہے اور الحمد للہ کہ ملک کے اکابر علماء و مشائخ مشاہیر اہل قلم و اربابِ تحقیق کے بلند پایہ مقالات اور محققانہ مضامین کا غیر معمولی سرمایہ فراہم ہو گیا ہے +

اعلیٰ اڈیشن کی قیمت عہ غیر معمولی اڈیشن کی قیمت عہ

مستقل خریداروں کو مفت دیا جائیگا۔ نئے خریداروں کو بھی مفت دیا جائے گا بشرطیکہ وہ چندہ خریداری بہت جلد دفتر کو روانہ کردیں۔ (چندہ سالانہ الفرقان اعلیٰ اڈیشن تین روپے، معمولی اڈیشن دو روپے)

منیجر "الفرقان" بریلی۔ یوپی

Printed at the Jayyed Press, Delhi Published by Z. A. K. from Tolue Islam Office, Delhi